

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

پاکینہ

ماہنامہ

جنوری 2013

نگران اعلیٰ

معمار جہاں

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

سال نو مبارک

وقت سراج اپنے نئے ناول کے ساتھ.....

عینی جعفری پرچہ پائیں.....
www.paksociety.com

اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں



نمبر گیری
0301-7203290
0334-963091



مستقل عنوانات

- | | | | | |
|-----|--------------|-----------|--------------|---------------------|
| 294 | آمنہ حماد | ادارہ 16 | میرا انتخاب | دین کی باتیں |
| 297 | پاکیزہ بھنیں | مدیرہ 273 | سندھ لیسے | بہنوں کی محفل |
| 298 | پاکیزہ بھنیں | 286 | خوش واقفہ | پاکیزہ ڈائری |
| 300 | ادارہ | 289 | روحانی مشورے | جلت رنگ |
| 302 | | 292 | ہومیوکلینک | میرا شہر گنگنائی ہو |

شعبہ نمبر اشتہارات محمد نواز خان 0333-2256789 نمبرہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

اشتہارات نمبرہ لاہور فراز علی تارڑ 0332-4214400 رانا حمید 0323-2895528

ماڈل : زارا گل میک اپ : روز بیوٹی پارلر فوٹو گرافر : موسیٰ رضا

جلد 40 • شمارہ 10 • جنوری 2013 • ذریعہ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com



مدیرہ اعلیٰ
عذرار رسول
مدیرہ
انجم انصار
معارف
آمنہ حماد

اداریہ

مدیرہ 15 مجھے کچھ کہنا ہے

سلسلے وار ناول

رفعت سراج 18 امانت

ناہید سلطانہ اختر 138 زندگی

مکمل ناول

عنیقہ محمد بیگ 212 جانِ جان

ناولٹ

کبھی دیکھ کر کبھی دل قیصرہ حیات 52

سفر زیست کہاں کی بڑھ رہی صائمہ قیصر 105

افسانے

کچھ مٹی کے رائے شکیلہ رفیق 47

انارکلی 89 مدیحہ عدنان

تحفہ کوٹھڑی 131 رضوانہ پرنس

ٹولڈ لائن 167 سکینہ فرخ

چیر لیڈر 177 عنیزہ سید

اجالون کا سفر 189 نسرین خالد

امتحان 199 نگہت سیما

خصوصی مضامین

وہ آئے بڑے ہیں 256 نرہت اصغر

بیا و ملائے محو اقبال 271 شہناز

پبلشر و پروڈیوسر: عذرار رسول • مقام اشاعت: 63-فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمیشن ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

ہم کس قدر ناشکرے لوگ ہیں، اس کا اندازہ ہمیں کبھی نہیں ہوتا۔

زندگی میں کوئی بات، کوئی مرحلہ، ہماری پسند کے مطابق نہ ہو تو ہم اپنی بد قسمتی کا رونا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے، میری قسمت میں سکھ لکھا ہی نہیں ہے۔ ہم کبھی یہ نہیں سوچتے، دشواری، حادثات، مشکلات سے کوئی بھی زندگی خالی نہیں ہوتی۔

بعض لوگوں کو حادثات تباہ نہیں کرتے بلکہ وہ حادثے سے متاثر ہو کر جس رد عمل کا اظہار کرتے ہیں، وہ انہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ حوادث سے الجھ کر مسکرانا جانتے ہیں۔ وہ بد نصیبی کے ہر تیر کے سامنے سینہ سپر ہو کر بھی مسکراتے ہیں جبکہ بعض کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام تر کامیابیاں اور خوشیاں پلیٹ میں رکھ کر ان کو پیش کر دی جائیں۔

اس کے لیے مجھے آپ سے صرف یہی کہنا ہے کہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے پھر دیکھیں کہ پریشانی کے بادل کس تیزی سے ہٹتے ہیں اور مسائل کی رات کتنی جلدی ختم ہوتی ہے۔ شکر گزاری کا یہ واقعہ میں نے پڑھا آپ بھی پڑھیے ”ایک شخص کا پرس چوری ہو گیا۔ اس رات اس شخص نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا۔ مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، پہلے تو اس بات پر کہ اس سے پہلے میرے یہاں کبھی چوری نہیں ہوئی، دوسرے اس لیے کہ چور نے صرف میرا پرس لیا، میری جان نہیں لی، تیسرے اس لیے کہ یہ میں تھا جس کے ہاں چوری ہوئی، اللہ کا شکر ہے میں نے کسی کے ہاں چوری نہیں کی اور سب سے بڑھ کر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے امتحان کے لیے منتخب کیا اور ایک چھوٹی پریشانی دے کر بڑی مصیبت کو ٹال دیا۔“

کیا کبھی ہم نے اس انداز میں شکر ادا کیا ہے، نہیں، میں نے بھی نہیں کیا..... تو آئیں..... آج میں آپ اور ہم سب اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور ہر وقت اور ہر حالت میں ادا کریں گے..... کہ وہ کبھی برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیا کرتا..... اور شکر ادا کرنے والوں کو ہمیشہ زیادہ دیا کرتا ہے۔ جی ہاں اور یہی سال نو کا پیغام ہے، آپ سب کو نیا عیسوی سال مبارک ہو۔

مگر (ہاں) جہنم کی راہ (پر انہیں پہنچا دے گا) اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ اللہ پر (بہت) آسان ہے (۱۶۹) اے لوگو تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (اللہ کے سچے) رسول (محمد ﷺ) سچائی کے ساتھ آئے ہیں پس (اب) تمہاری خیر (اسی میں) ہے کہ (ان پر) ایمان لے آؤ اور اگر (ان کی نبوت سے) انکار کرو گے تو اللہ (کا کچھ نقصان نہیں اسی) کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ دانا اور حکمت والا ہے (۱۷۰) اے اہل کتاب اپنے دین میں (بے جا) زیادتی نہ کرو اور اللہ پر سوا سچ کے (جھوٹ) نہ کہو سوا اس کے کہ مسیح (یعنی) عیسیٰ مریم کے بیٹے اللہ کے رسول ہیں اور اس کے (اس) حکم (سے پیدا ہوئے) ہیں جس کو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی روح ہیں پس اللہ پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور تین (اللہ) نہ کہو (اس کہنے سے) باز آؤ (یہی) تمہارے حق میں بہتر ہے سوا اس کے نہیں کہ اللہ (تو) ایک (ہی معبود) ہے اس کی پاکی (بیان کرو) اس (نقص) سے کہ اس کا کوئی لڑکا ہو (اور اسے لڑکے کی کیا حاجت کیونکہ) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ (سب کا) کار ساز بس ہے (۱۷۱) مسیح اللہ کا بندہ ہونے سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے اور نہ مقرب فرشتے (اس سے انکار کر سکتے ہیں) اور جو کوئی اس کے بندے ہونے سے انکار کرے اور غرور کرے تو (یہ سمجھ لے) اللہ ان سب کو اپنی طرف اٹھائے گا (اور ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا دے گا) (۱۷۲)

(سورۃ نسا آیت نمبر ۱۶۹ تا ۱۷۲)

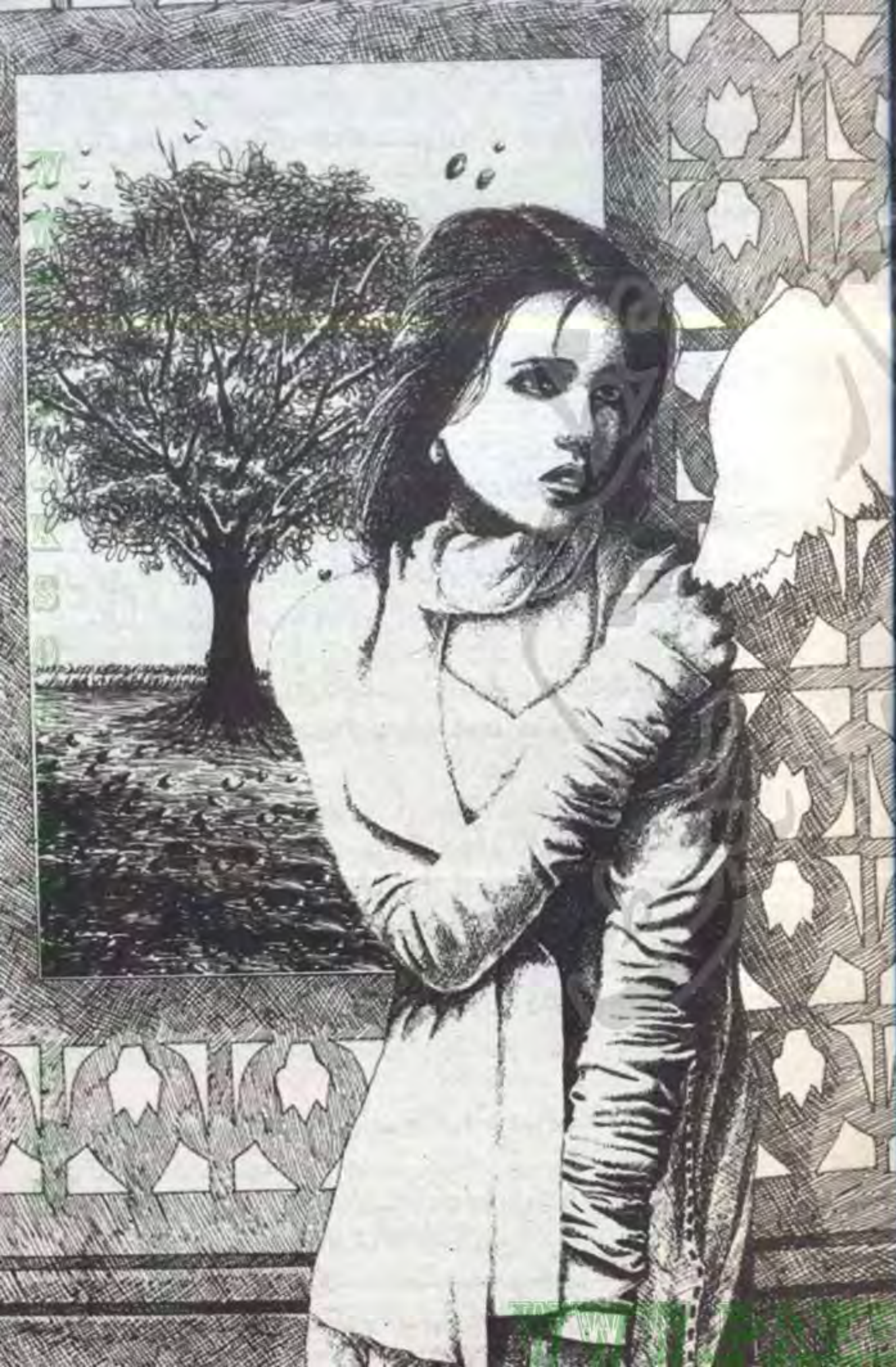


آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد

دوست، دشمن سب آپ ﷺ کے معترف ہو گئے اور خراج و تحسین کا یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے اور قیامت تک رہے گا کیونکہ اللہ نے اپنے محبوب کا ذکر اس طرح بلند کیا ہے کہ اس ذکر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ اپنے مقصد حیات میں جس احسن طریقے سے کامیاب ہوئے وہ دنیائے عالم کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ ﷺ صرف اپنے چند احباب کے ساتھ کلمہ حق کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اٹھے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے عرب و عجم آپ ﷺ کا مطیع اور ہم نوا ہو گیا۔ عدد ۲ کی خصوصیت: ”اس شخص کی صفات اور طریقے سب پر غالب رہیں گے۔“ دنیا کی پوری تاریخ میں سے کوئی بھی انسان ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا ہے جو اپنی ہستی و صفات میں اس قدر کامل ہو اور اس کا سب سے بڑا ثبوت، دی ہنڈرڈ میں آپ ﷺ کا سرفہرست ہونا ہے۔ نیز تاریخ انسانی میں تمام بلند پایہ افکار و خیالات کے حامل افراد بھی کسی نہ کسی انداز سے آپ ﷺ کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے آرہے ہیں جن کا تعلق نہ صرف اسلام سے ہے بلکہ دوسرے مذاہب عالم سے بھی ہے اور جب وہ تعصب سے مبرا نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو سب آپ ﷺ کی بلند پایہ ہستی کے سامنے گھٹنے ٹیکتے نظر آتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ سے بڑھ کر انسانیت کا نجات دہندہ اور خیر خواہ انہیں نہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا ثبوت آپ کی سیرت طیبہ پر بے شمار کتب کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہے۔ پوری دنیا میں ہر زمانے اور ہر صدی میں آپ ﷺ کی ذات اقدس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق جاری و ساری ہے اور ہر تحقیق کا حتمی نتیجہ آپ ﷺ کی سر بلند ذات کو زبردست خراج تحسین ہے کیونکہ آپ ﷺ جیسی بلند پایہ، عظمتوں کی حامل ہستی کو بھرپور خراج تحسین خوب صورت الفاظ کے پھولوں کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔



قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس



امانت لہو سے سینچے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
 بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
 رفعت سراج جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
 بدن پر سایہ دیوار و در آسان کتنا ہے
 شکست خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
 ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے
 زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی
 امانت..... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی
 اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے
 چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُر درد مگر خوب صورت تحریر

ڈاکٹر مہرجان شدید ڈپریشن میں اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ آنکھوں میں جیسے انگارے دھک رہے تھے۔ شدید غصے نے انہیں مضطرب کیا ہوا تھا۔ وہ بار بار وال کلاک کی طرف دیکھتی جاتی تھیں۔ وال کلاک سے نظریں ہٹتیں تو دروازے پر جا لگتیں۔ جیسے شدت سے کسی کا انتظار ہو۔ بالآخر دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔۔۔۔۔“ مہرجان کی آواز میں محکم تھا۔ ان کا ادھیڑ عمر ملازم اصیل خان سر جھکائے اندر داخل ہوا۔

”دروازہ بند کر دو۔“ مہرجان نے سابقہ انداز میں کہا۔ اصیل خان نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔۔۔۔۔

اور اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مہرجان جیسے چیل کی طرح اس پر جھپٹیں۔۔۔۔۔ اور اصیل خان کا گریبان دبوج لیا۔

”کتنی معصوم شکل ہے تمہاری۔۔۔۔۔ لگتا ہے سب مر گئے ہیں ساری دنیا میں بس ایک ہی نیک آدمی زندہ بچا ہے۔“ مہرجان اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکاریں۔

”آپ نے دو الی بیگم صاحبہ؟“ حیرت انگیز طور پر اصیل خان کا لہجہ پرسکون تھا۔ جیسے مہرجان اس سے کوئی بہت خوشگوار بات کر رہی تھیں۔

”مجھے نیند نہیں آئے گی اصیل خان۔۔۔۔۔ ہاں زہر کھا کر ہمیشہ کی نیند سو سکتی ہوں۔“

”زہر کھائیں آپ کے دشمن۔“ اصیل خان بہت مؤدبانہ انداز میں بولا۔

”ہاں تو پھر تم زہر کھا لو۔۔۔۔۔“ مہرجان نے اس کے گریبان کو زور سے جھٹک دیا اور ہانپنے لگیں۔ اصیل خان اب بھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”رابی کی خود سری نے میرے اندر ایک آگ سی لگا دی ہے اصیل خان۔“ مہرجان ہانپتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”سب کی اپنی، اپنی مجبوریاں ہیں بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔“ وہ اسی طرح پرسکون انداز میں بات کر رہا تھا۔

مہرجان نے قہر برساتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے کھینچتے ہوئے ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

”شکل دیکھو اپنی۔۔۔۔۔“ وہ غرائیں۔

”نہیں دیکھ سکتا بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔ مدت سے آئینہ نہیں دیکھا۔“ اصیل خان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”خبیث انسان۔۔۔۔۔“ مہرجان نے پاگلوں کی طرح اسے دو ہتھ مارے اور زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا سا گیا مگر فوراً ہی سنہل گیا۔ مہرجان نے پھر وحشت بھرے انداز میں اسے دو چار ہاتھ مارے اور نڈھال سی ہو کر ایک طرف گرنے لگیں۔ اصیل خان نے لڑکھڑاتی ہوئی مہرجان کو سنبھالا، انہیں بہ مشکل کھینچتا ہوا بیڈ تک لایا اور آہستگی سے لٹا دیا۔۔۔۔۔ وہ اب بے ہوش ہو چکی تھیں۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا مہرجان کے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

سب انسپکٹر جابر علی یونیفارم میں ملبوس آف موڈ میں ناشتا کر رہا تھا۔ برآمدے میں ایک پلنگ کے سامنے چھوٹی سی پرانی لکڑی کی ٹیبل پر ناشتا لگا ہوا تھا۔

صابرہ بچن سے چائے لے کر اس کی طرف بڑھی تھی کہ جابر علی جیسے برس پڑا۔

”برہان کہاں ہے؟ آج صبح وہ مسجد میں بھی نظر نہیں آیا۔“

”اس نے گھر پر ہی نماز پڑھ لی تھی۔“ صابرہ نے دبے دبے لہجے میں جواب دیا۔

”دو قدم پر تو مسجد ہے، جوانی میں یہ حال ہے۔“ جابر علی نے اسی طرح غصے میں صابرہ کو گھورتے

ہوئے کہا۔

”نماز تو پڑھ لی۔۔۔۔۔ رات دیر تک جاگ کر پڑھتا رہا۔۔۔۔۔ امتحان بھی سر پر ہیں۔“ صابرہ نے پھر بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”دنیا داری کے لیے جاگ سکتے ہیں، دین کی خاطر میٹھی نیند قربان نہیں کر سکتے۔“ جابر علی بڑبڑایا۔

”اب کیا دوبارہ سو گیا ہے۔۔۔۔۔ ناشتا نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ یونیورسٹی کی بس نکل گئی تو زیادہ کرایہ دے کر رکشا، ٹیکسی میں جائے گا۔ میں رشوت خور پولیس آفیسر نہیں ہوں سمجھیں۔۔۔۔۔ حلال روزی کما تا ہوں، حرام کا مال نہیں ہے کٹانے کے لیے۔۔۔۔۔“ اسی لمحے برہان ہاتھ میں فائل اور کتابیں لیے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے باپ کو نظر انداز کر کے ماں کو مخاطب کیا۔

”میں جا رہا ہوں امی۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔“

”ناشتا تو کر لو بیٹا۔۔۔۔۔ خالی پیٹ کیا خاک پڑھائی ہوگی۔۔۔۔۔“ صابرہ نے بڑے پیار سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

”میں ناشتا چھوڑ دیتا ہوں مگر پوائنٹ مٹ نہیں کرتا۔“ برہان نے انجانے میں جیسے باپ کو کچھ بتایا۔

”بہت احسان کرتے ہو ہم پر۔۔۔۔۔ یونیورسٹی میں پچاس روپے والا برگر کھا لیتا ہوگا۔“ برہان نے گہری سانس لے کر جیسے خود کو پرسکون کیا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گیا۔ ماں تڑپ کر رہ گئی۔ بیٹا بغیر ناشتا کیے چلا گیا تھا۔

”ایک پیالی گرم چائے لے آؤ۔۔۔۔۔ بعد میں سوگ کر لینا۔۔۔۔۔“ جابر علی نے گم صم کھڑی صابرہ کو متوجہ کیا۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔ میں کیوں سوگ کرنے لگی۔۔۔۔۔ اللہ میرے پیاروں کو جیتا رکھے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے بچن کی طرف بڑھی۔

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟ کیا آج کالج نہیں جائیں گی۔۔۔۔۔؟“ جابر علی نے صابرہ سے پوچھا۔

”تیار ہو رہی ہیں۔“

”اولاد کے اتنے نخرے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ نوکرانی کی طرح ایک، ایک کے سامنے ناشتا لگاتی ہو۔۔۔۔۔ بڑی ہو چکی ہیں ان سے کہو صبح اٹھ کر تمہاری مدد کیا کریں۔۔۔۔۔ پڑھ رہی ہیں تو کیا ہم پر احسان کر رہی ہیں؟“ صابرہ کے سینے سے ایک آہ سرد خارج ہوئی۔

”شبینہ، ستارہ۔۔۔۔۔ بیٹا ناشتا کر لو۔“ صابرہ نے بیٹیوں کو آواز دی اور بچن میں چلی گئی۔

جابر علی نے ایک دھکے سے ٹیبل کو پیچھے دھکیلا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہرجان اور ان کی چھوٹی بہن گل جان ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی تھیں دونوں اپنی اپنی جگہ کسی سوچ میں گم تھیں۔ مہرجان نے کاٹا پلیٹ میں رکھ کر بہت غور سے گل جان کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو گل جان! ٹھیک سے ناشتا کرو۔“ گل جان چونک پڑی پھر زبردستی مسکرائی۔

”جی بی بی جان کر رہی ہوں۔ آپ یہ خاگینہ لیں ناں میں نے اسپیشلی آپ کے لیے بنایا ہے۔ آپ کو بہت پسند ہے ناں؟“ گل جان نے پلیٹ مہرجان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم خاگینہ بناتی ہی بہت اچھا ہو۔“ انہوں نے مشینی انداز میں بہن کی تعریف کی لیکن وہ بہن کے منہ سے تعریفی کلمات سن کر بھی خوش نظر نہیں آئی ہنوز کسی خیال کے حصار میں تھی۔

”یہ رابی اور رومانا کالج چلی گئی ہیں یا پڑی سو رہی ہیں؟“ مہرجان نے نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے ذرا

تجزیہ پیش کیا۔

”کچھ.....! بہت پراؤڈ ہیں یا تمہاری ماما۔ تمہاری ہمت ہے جو ایسی ماں کے ساتھ رہتی ہو۔“ کا ناز نے صاف گوئی سے کہا۔

”ماں تو ماں ہوتی ہے کا ناز وہ جیسی بھی ہیں میری ماں ہیں میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ ان کی وجہ سے سب لوگ ہم سے اسٹیل ٹریٹ کرتے ہیں۔ بہت عزت دیتے ہیں۔“ رومانے بھی سچائی کے ساتھ اپنی دوست کو دل کی بات کہہ دی۔

”تم تو ہو ہی اتنی اچھی، میں بھی تمہیں اتنا ہی پیار کرتی ہوں جتنا تم اپنی ماما سے کرتی ہو۔“ کا ناز کھلکھلائی اور کٹے ہوئے سیب کی قاشیں رومانہ کو پیش کیں۔

”ویسے ڈاکٹر صاحبہ کا نام مہر جان کے بجائے مہربان ہوتا تو اچھا تھا۔ سنا ہے نام کا شخصیت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔“ کا ناز نے سیب کی قاش اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا اور یوں ہنسی جیسے اپنی نکتہ رسی پر خود کو دوا دے رہی ہو۔ رومانہ کی بات پر کچھ سوچتے ہوئے مسکرائے لگی۔

☆☆☆

صابرہ نے کچن سے باہر آ کر ادھر ادھر دیکھا جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو پھر اسے سامنے شبیہ نظر آ گئی جو اپنے لمبے بال سلجھانے میں مصروف تھی۔

”شبینہ بیٹا میں تمہارے ابا جان کا یو نیفارم دھورہ ہوں۔ ذرا ہانڈی دیکھتی رہنا کہیں جل نہ جائے اور ہاں ستارہ سے کہنا اپنے ابا کے دو جوڑے کپڑے استری کر دے۔“

”امی ابھی ہم کالج سے آئے ہیں، سانس تو لینے دیں۔“ ستارہ نے کمرے سے جھانک کر بڑی بیزار سی کہا۔

”کپڑے استری نہ ہوئے تو بھی ابا جان نے غصہ کرنا ہے ہو گئے تو بھی..... انہیں تو بس برسنے کا بہانہ چاہیے۔“ ستارہ بڑبڑانے کے انداز میں کہہ کر پھر کمرے میں گھس گئی۔

”بہت زبان چلتی ہے..... اگر کسی دن انہوں نے تمہاری کتر کتر کرتی زبان سے کچھ سن لیا ناں تو گھر بٹھا دیں گے۔ اتنی محنت کرتے ہیں، نوکری کرنا کوئی آسان ہے۔ افسروں کی الٹی سیدھی باتیں برداشت کرنا۔ بعض اوقات چوبیس چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی کرنا وہ بھی آخر انسان ہیں۔“ صابرہ نے ناراضی سے کہا اور ایک طرف رکھا ہوا چابرو کا یو نیفارم اٹھا کر باتھ روم کی طرف چل پڑی۔

ستارہ پاؤں پختی باہر آ گئی۔ شبینہ برش سے ٹوٹے ہوئے بال نکال رہی تھی۔ اس نے دھپ دھپ کی آواز پر گردن موڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا۔

”یہ تمہیں اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟“ وہ بالوں کو برش سے کھینچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”بابا پر گئی ہوں..... کوئی اُن سے بھی کسی دن ہمت کر کے پوچھ لے کہ انہیں اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟“ یہ کہہ کر ستارہ کچن میں گھس گئی تھی۔ شبینہ نے اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا جیسے بہن نے اسے لا جواب کر دیا ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان کی بڑی بیٹی رابی (رابعہ) غصے میں بھری بیٹھی تھی اور گل جان اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے جتن کر رہی تھی۔

کی ذرا رک کر پوچھا۔

”چلی گئی ہیں بی بی جان۔“ گل جان نے ادب سے جواب دیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔

”یہ رابی کی لڑکے کے چکر میں تو نہیں پڑ گئی؟“ مہر جان کی آنکھوں میں شلوک کے سائے تھے وہ بہن سے پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں، نہیں بی بی جان ایسی کوئی بات نہیں۔“ گل جان نے جلدی سے کہا۔

”پھر وہ سہراب خان کا رشتہ کیوں ٹھکرا رہی ہے؟“ ان کے لہجے میں غم و غصے کی کیفیت تھی۔

”ابھی کم عمر ہے، اچھے برے کی تمیز نہیں۔“ گل جان نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

”تم تو اس عمر میں حرفوں کی بن چکی تھیں۔ ویسے یہ بڑی خطرناک عمر ہوتی ہے۔ میں تو چاہتی تھی ان دونوں لڑکیوں کو سات پردوں میں چھپا کر پالوں مگر ایسا کر نہیں سکی۔ لوگ کیا کہتے اتنی بڑی نیوروسرجن ڈاکٹر مہر جان کی بیٹیاں چٹی ان پڑھ۔“ یہ کہہ کر مہر جان طنزیہ مسکرائیں۔ گل جان کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے وہ خاموشی سے چائے بنا رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان کی چھوٹی بیٹی رومانہ (رومانہ) اپنی عزیز از جان دوست اور پڑوسن کا ناز کے گھر گئی ہوئی تھی دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کی گہری دوست تھیں۔ کا ناز کے والدین حیات نہیں تھے اسے اس کے دادا شاہ عالم نے پالا تھا۔ جوان کی کل کائنات تھی۔

”کاناز کل رات تم نے مجھے فون کیا نہ میری کال ریسیو کی۔“ رومانہ شکوہ کر رہی تھی۔ ”تمہیں کیا پتا مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔“ رومانہ کے لہجے میں بہت دکھ تھا۔

”رومانہ کل دادا جان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ میں ان کے ساتھ اسپتال میں تھی۔ جلدی میں اپنا سیل فون بھی گھر بھول گئی تھی۔“ کا ناز نے فون نہ کرنے کی وجہ بتائی۔ ”اور تین بجے رات تو ہم اسپتال سے آئے تھے۔ اتنا تھک گئی تھی کہ آتے ہی سو گئی۔“ اس نے مزید وضاحت کی۔ ”اسی وجہ سے آج کالج بھی نہیں جاسکی۔“

”اور تمہاری وجہ سے میں نے بھی کالج کی چھٹی کی، تمہیں تو پتا ہے ناں ماما کسی قیمت پر چھٹی نہیں کرنے دیتیں مگر میں نے کہا میری بیک بون میں بہت درد ہو رہا ہے۔ پیٹ درد کا کہتی تو وہ جھٹ کوئی میڈیسن دے دیتیں۔“ رومانہ نے بڑی معصومیت سے بتایا۔

”تو وہ تمہیں ایکس رے کے لیے لے کر نہیں گئیں؟“ کا ناز ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”تھینک گاڈ، آج ان کے اسپتال میں کوئی بہت سیریس Casualty آئی تھی وہ بہت ہی بڑبڑ میں گئی تھیں مگر کہہ کر گئی تھیں کہ درد زیادہ ہو تو ڈرائیور کے ساتھ اسپتال چلی آنا۔“

”یار 100 ڈکلیٹر مرے تھے تو تمہاری ماما پیدا ہوئی تھیں..... چلو اتنا خیال تو رکھتی ہیں۔“ کا ناز بولی اور سامنے رکھے ہوئے سیب کاٹنے لگی۔

”خیال تو بہت رکھتی ہیں بہترین ڈریس، بہترین کھانا پینا، بہترین زندگی.....“

”لیکن بات اپنی ہی منواتی ہیں۔“ کا ناز رومانہ کی بات کاٹ کر برجستہ بولی۔

”وہ شہر کی بہت بڑی نیوروسرجن ہیں شاید اسی وجہ سے کچھ پراؤڈ ہیں۔“ رومانہ نے بڑی سادگی سے اپنا

”بیٹا بی بی جان آپ کی ماں ہیں، وہ آپ کے لیے اچھا ہی سوچیں گی۔“ گل جان نے پیار سے رابی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اس وقت رابی کے بیڈ روم میں اس کے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

”کبھی ماں لگی ہی نہیں پتھر کا مجسمہ، ہونہ۔..... اٹھارہ، بیس سال بڑا ہے سہراب خان مجھ سے۔ یہی رہ گیا ہے میرے لیے..... اتنا ہی اچھا ہے تو خود کر لیں، بیس سال سے اکیلی ہیں۔ اس عمر میں تو کسی ساتھی کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔“ گل جان نے دہل کر رابی کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”بس بیٹا بس، بری بات ہے، ماں کی بے عزتی نہیں کرتے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔“

”آپ اس ظلم میں اُن کا ساتھ دیں گی؟ اگر آپ کی اپنی سگی بیٹی ہوتی اور اس کی شادی کسی بڑھے سے ہوتی تو آپ کیا محسوس کرتیں؟“

”وہ بڑھا نہیں ہے اور ویسے بھی بہت بڑا خاندان ہے اس کا۔ بارہ پشتوں سے جاگیردار ہیں۔“ گل جان نے اپنا کرب چھپاتے ہوئے رابی کو سمجھانے کی کوشش۔

”آخر ماں کو میری شادی کی اتنی جلدی کیا ہے؟“ رابی چڑ کر پوچھ رہی تھی۔

”تمہارے سر پر باپ کا سایہ نہیں، تمہارا کوئی بھائی نہیں، زندگی موت کا کیا بھروسہ بیٹا۔“ گل جان نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

”آپ دونوں بہنوں کے سر پر بھی باپ کا سایہ نہیں ہے۔ آپ دونوں کا بھی کوئی بھائی نہیں، دونوں کے شوہر نہیں ہیں۔ سہراب خان سے آپ شادی کر لیں یا اماں کی کروادیں، سچ جوڑ ہے۔“ رابی غصے اور اشتعال میں جیسے پاگلوں کی طرح بول رہی تھی۔ گل جان سکتے کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی پھر بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر بولی۔

”بیٹا عورت ذات کی جھکی نظر اور دھیمی آواز اس کا پردہ ہوتی ہے۔ اتنا اونچا نہیں بولتے۔ مردوں کی طرح غصہ نہیں کرتے۔“

”جب الٹی چھری سے ذبح ہوتے ہیں تو حلق سے ایسی ہی آوازیں نکلتی ہیں۔“ یہ کہہ کر رابی اپنی جگہ سے اٹھی دھپ دھپ کرتی آگے بڑھی اور واش روم میں گھس کر دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ گل جان کے چہرے پر گویا ساری کائنات کا ملال سمٹ آیا تھا۔ کرب کی ایسی انتہا تھی کہ شاید نزع کی کیفیت سے کچھ کم۔

☆☆☆

جابر علی بھاری بوٹ اتار کر جیسے سکون کی سانس لے رہا تھا۔ شرٹ اتار کر دور پھینک دی تھی۔ بنیان پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ صابرہ حسب معمول فوراً چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”وہ تھوڑی دیر میں خالہ انوری آپ سے بات کرنے آئیں گی، میں نے سوچا آپ کو پہلے سے بتا دوں۔“ صابرہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”ارے بھی وہ تو ہفتے میں تین چار مرتبہ آ جاتی ہیں۔ آج کوئی خاص بات ہے؟“ جابر علی نے صابرہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اپنے اسی اکھڑ انداز میں پوچھا۔

”وہ میں نے آپ کو بتایا تو تھا..... شبینہ کے لیے کوئی رشتہ دیکھا ہے۔“

”لاٹری نکلنے کا انتظار کرو۔“ جابر علی نے ٹکڑا توڑ جواب دیا اور جلدی جلدی چائے کے دو تین گھونٹ بھرے۔

امانت

”کیا مطلب؟ لڑکیوں کی شادی نہیں کریں گے۔ لڑکیوں کے رشتے آنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔“ صابرہ نے دبے لہجے میں سمجھانا چاہا۔

”ابھی عمر ہی کیا ہے، لوگوں کی تیس تیس سال کی بیٹھی ہوتی ہیں۔ تمہیں آفت آر ہی ہے۔“ جابر علی نے غصے سے اپنی سادہ و مسکین سی بیوی کو گھورا۔

”جب اچھے، اچھے رشتے ٹھکرادیے جاتے ہیں تب یہ نوبت آتی ہے کہ لڑکیاں باپ کی دہلیز پر بڑھا پے کا استقبال کرتی ہیں۔“ صابرہ کو شوہر کی بے پروائی ہضم نہیں ہوئی۔

”ارے ابھی تو آنا شروع ہوئے ہیں۔ دو چار اور آنے دو، دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو میرے پاس شادی بیاہ پر خرچ کرنے کے لیے کوئی پیسہ نہیں ہے اور قرض ادھار سے مجھے نفرت ہے۔“

”لیکن ایک دن شادی تو کرنا ہی ہے۔ لڑکیوں کی بہت ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں اچھا ہوتا ہے۔“ جابر علی نے زور سے چائے کا کپ ٹیبل پر پٹخا اور صابرہ کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھا۔

”بھاگی جا رہی ہیں..... تمہارے قابو میں نہیں ہیں؟ صاف صاف بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ جابر علی نے پولیس والوں کے خاص شکی انداز میں صابرہ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ صابرہ نے گویا اپنا سر پیٹ لیا بات کہاں سے کہاں چلی گئی تھی۔ ”اچھے رشتے بھی قسمت سے ملتے ہیں۔ ہاں کہتے ہی شادی تو نہیں ہو جانی، ہم ان سے سال بھر کا وقت مانگ لیں گے۔“ صابرہ نے آہستگی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”سال بعد چھپتر بھٹے گا؟“ جابر علی نے گھورا۔

”برہان کی پڑھائی مکمل ہونے والی ہے۔ آخری امتحان رہتا ہے اس کے بعد وہ انجینئر بن جائے گا۔ اس کی پانچ چھ تنخواہیں جمع کر کے شبینہ کی شادی کر دوں گی۔“ صابرہ نے اپنی پلاننگ گوش گزار کی جسے سنتے ہی جابر علی اور بھڑک گیا اور مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

”ہاں، تمہارے بیٹے کے لیے نوکری دروازے کے باہر ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ ارے دنیا ڈگریاں لے کر سالوں سے جوتے پتھار رہی ہے، تم شیخ چلی بنی خواب دیکھتی رہو۔“

”دنیا کے بچوں کو نوکریاں ملتی بھی ہیں۔ سب کے سب بے روزگار تو نہیں ہیں۔ کیا خبر برہان بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جائے اور اسے بہت اچھی نوکری مل جائے۔ اتنی محنت تو کر رہا ہے میرا بچہ۔“ صابرہ نے مامتا بھرے لہجے میں برہان کا تصور کرتے ہوئے جواب دیا۔

”جب اسے نوکری مل جائے گی تب شادی بیاہ کی باتیں کرنا۔ خیالی پلاؤ پکانے کی ضرورت نہیں۔ اب جاؤ اور فضول میرا دماغ نہ کھاؤ۔“ جابر علی نے بیزارگی سے کہا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔ صابرہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چائے کا خالی کپ اٹھا کر پین کی طرف چل دی۔

☆☆☆

شبینہ کپڑے استری کر رہی تھی کہ ستارہ بہت خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ شبینہ اس کے غیر معمولی انداز اور شریر مسکراہٹ کو ابھن بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”شکر ہے اس گھر میں مہنگائی سے ہٹ کر بھی کچھ اچھی اچھی باتیں ہونے لگیں۔“ ستارہ نے بستر پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے بڑے شریر لہجے میں کہا۔

”شکر ہے اس بات پر کہ آج تم خوش نظر آرہی ہو ورنہ تو ہر وقت شکل پر بارہ ہی بچے رہتے ہیں۔“ اس نے کپڑے پر استری پھیرتے ہوئے ایک نظر ستارہ پر ڈال کر کہا۔

”تمہاری شادی کی باتیں ہو رہی ہیں آپا جو مجھے بھی کچھ اچھی امیدیں اور حوصلہ دے رہی ہیں۔“

”جس گھر میں لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں شادی بیاہ کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ تو ایسی کوئی خاص بات نہیں۔“

”ہاں..... فی الحال تو کئی سال تک باتیں ہی ہوتی رہیں گی۔“ ستارہ نے بڑی ادا سے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تو شبینہ نے گردن موڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب...؟ آج تو بڑی الجھی الجھی باتیں کر رہی ہو۔ ہر بار مطلب پوچھنا پڑ رہا ہے۔“

”مطلب یہ کہ جب تک برہان بھائی کو نوکری نہیں ملے گی گھر میں کسی کی شادی، منگنی ہونے کا امکان نہیں ہے۔ امی! ابا جان سے کہہ رہی تھیں کہ اتنا اچھا رشتہ قسمت سے ملتا ہے۔ ابا جان بولے پیسے نہیں ہیں۔“ ستارہ متسخرانہ انداز میں مسکرائی۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ ایک تنخواہ میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ امی کو خود ہی سوچنا چاہیے وہ کیوں ابا جان سے ایسی باتیں کرتی ہیں۔“ شبینہ نے بڑی بردباری اور سنجیدگی سے کہا۔

”مسئلہ لے کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ مسئلے کا حل نکالنا چاہیے۔ ابا جان تو بس ایک دم گرجے لگتے ہیں۔“

ستارہ نے برا سامنہ بنایا۔

”تو تم بتا دو کوئی حل..... بیٹھی ہر کسی میں کیڑے نکالتی رہتی ہو۔“ شبینہ نے ستارہ پر تنقید کی اور استری شدہ کپڑا بہت احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔

”امی حل بتا بھی رہی تھیں مگر ابا جان ان کا مذاق اڑانے لگے۔ امی نے کہا کہ رشتہ دیکھ لیتے ہیں شادی تب کریں گے جب برہان بھائی کو نوکری مل جائے گی۔ ابا جان تو یہ سنتے ہی پہلے سے زیادہ گرم ہو گئے۔“

ستارہ نے بہت تلخ لہجے میں کہا اور بستر پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ شبینہ نے ایک نظر بہن کی طرف ڈالی اور ایک شرٹ جھٹکتے ہوئے بولی۔

”امی کو پتا بھی ہے ابا جان اپنی کہی ہوئی بات پر قائم رہتے ہیں۔ اُن کے منہ سے جو نکل جائے پتھر پر لکیر ہوتا ہے پھر ابا جان سے کیوں بحث کرتی ہیں۔“

”ہم سب سامعین نہیں ہیں جو صرف بیٹھے سنتے رہیں۔ ہمارے پاس بھی کہنے کو بہت کچھ ہے۔“ ستارہ بڑبڑائی۔

”جلنے کڑھنے سے بھلا کچھ حاصل ہوتا ہے؟“ شبینہ استری کپڑے پر پھیرتے ہوئے بولی۔

”کیجا ٹھنڈا ہوتا ہے..... دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔“

”حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھو ستارہ۔ جلنے سے تمہارا ہی نقصان ہوگا۔“

”ہائے یہ جلن..... اس عمر میں تو کسی کے عشق میں جل مرنا چاہیے۔“ ستارہ نے شرارت سے خوفزدہ سی شبینہ کو مزید دہلایا۔

”منہ بند کرو اپنا ابا جان نے سن لیا تو.....“ شبینہ نے سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

”کیوں ڈر ڈر کے مر رہی ہو آپا۔ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ کوئی ہمیں چاہے اور ہم اس کی خاطر دنیا سے نکل لینے نکل کھڑے ہوں۔“ ستارہ کو سہمی ہوئی شبینہ کو تنگ کرنے میں مزہ آنے لگا۔

”خدا کے لیے ستارہ منہ بند کرو۔“ اس نے ہبہرا کر ٹوکا۔

”سنا ہے عشق کی آگ جلا کر خاک کر دیتی ہے اور بندے کو خاک ہونے میں بہت مزہ آتا ہے۔“ ستارہ کو گدگدی ہو رہی تھی۔ شبینہ نے ایک جھٹکے سے استری کا پلگ نکالا اور استری لے کر ستارہ کی طرف بڑھی۔

”میں تمہیں اس گرم استری سے چھوٹی ہوں پھر مجھے بتانا جلنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔“ اس نے استری لہرائی۔

”استری اور عشق کا فرق سمجھو آپا۔“ وہ خود کو بچاتے ہوئے لڑھک کر دوسری طرف ہو گئی۔ شبینہ اپنی مسکراہٹ بہ مشکل روک رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان اسپتال کے اپنے آراستہ و پیراستہ روم میں ایک کم عمر لڑکی کا چیک اپ کر رہی تھیں۔ لڑکی کی ماں قریب کھڑی تھی۔

”کب سے دورے پڑ رہے ہیں اسے؟“ مہر جان نے لڑکی کی ماں سے سوال کیا۔ لڑکی کی ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”جب سے وہ بد بخت روگ دے کر گیا ہے۔“

”طلاق ہو گئی ہے اسے؟“ مہر جان نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی نظر میں دکھ و تاسف کے تاثرات واضح تھے۔

”لگتا ہے تم نے بہت چھوٹی عمر میں اس کی شادی کر دی تھی۔“ مہر جان اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اس کی شادی نہیں ہوئی ڈاکٹر صاحبہ۔“ لڑکی کی ماں نے مجرم کی طرح سر جھکا کر مہر جان کے سر پر گویا بم پھوڑا تھا۔

”مگر..... مگر یہ تو پریگنٹ ہے۔“ مہر جان بھونچکاسی اس کی ماں کو دیکھنے لگیں۔

”اسی وجہ سے تو اسے دورے پڑ رہے ہیں۔“ عورت نے نظر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ ”کھڑے کھڑے گر جاتی ہے، ہاتھ پیر مڑ جاتے ہیں۔“ وہ مزید بولی۔

”میرے خدا یا۔“ ششدر سی مہر جان اس پندرہ سولہ سال کی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔

”میں اسے دوسرے شہر لے جاؤں گی کیونکہ ڈاکٹر نے بچہ ضائع کرانے سے منع کیا ہے۔ وہ کہتی ہے چار مہینے کا حمل ہے، اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔“ لڑکی کی ماں کہہ رہی تھی اور مہر جان کی آنکھوں میں انگارے دھک رہے تھے۔

”صرف اس کی جان کو رو رہی ہو۔ دو جانیں جائیں گی ایک نہیں۔ تمہیں اپنی اولاد کا خیال ہے جو اس کی کوکھ میں ہے وہ اس کی اولاد ہے۔“ مہر جان نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”تم تجیسی غیر ذتے دار عورتوں کو تو ماں ہی نہیں بننا چاہیے۔ شادی نئے کپڑے اور زیور کا نام نہیں ہوتی۔ یہ ایک ذتے داری کا نام ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحبہ، میں اپنا قصور مانتی ہوں۔ آپ اسے کوئی دوا دے دیں۔ میں اسے اس شہر سے دور لے جاؤں گی۔ سارا انتظام کر لیا ہے میں نے۔“ عورت بالکل مجرموں کے انداز میں بات کر رہی تھی جبکہ لڑکی ایک طرف آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

”اچھا..... سارا انتظام کر کے میرے پاس آئی ہو۔ ایک بے گناہ معصوم جان کو کچرے میں پھینک کر بیٹی کو واپس لے آؤ گی اور دنیا کو بتاؤ گی کہ یہ مریم ہے..... برائی پھیلتی ہے اس وجہ سے ہے کہ مائیں افیم کھا کر

سوئی رہتی ہیں۔ چلی جاؤ یہاں سے میں تم جیسے ظالموں کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتی کسی اور نیوروسرجن کو دکھاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ میرا اسپتال ہے قاتلوں کی پناہ گاہ نہیں۔“ مہرجان اس بری طرح دھاڑی کہ عورت تھر تھر کاہنے لگی اور جلدی سے اپنی بیٹی کو سہار لے کر بیڈے تارنے لگی۔ مہرجان غصے سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”دادا جان آپ کو اتنا بھی خیال نہیں کہ میں اکیلی ہوں کھٹ سے بیمار پڑ جاتے ہیں۔“ کاناز اپنے دادا شاہ عالم کے کندھے سے سر ٹکائے لاڈ کرتے ہوئے بولی۔ شاہ عالم کاناز کے سر پر بہت شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

”تمہارے اندر تو میری جان انگی ہوئی ہے ورنہ کب کی اڑان بھر لیتا۔ اس دنیا میں کیا رکھا ہے سوائے میری ایک پیاری سی پوتی کے۔“

”اچھا اب یہ اڑنے وڑنے کی باتیں نہ کیا کریں۔ میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔“ کاناز نے بڑے دلار سے کہا۔

”چلو پھر کوئی اور بات کرتے ہیں۔ ایسی بات جسے سن کر تم خوشی سے ناچنے لگو۔“ شاہ عالم نے بہت محبت بھرے اور خوشگوار لہجے میں کہا۔

”میں ناچ چکی..... میرا مطلب ہے آدھے گھنٹے پہلے رومانے فون کیا تھا کہ وہ ابھی میرے پاس آنے والی ہے۔“ کاناز نے شاہ عالم کے کندھے سے سر اٹھا کر ٹکاک کی طرف دیکھا۔

”یقیناً رومانہ کی آمد، رومانہ کا ذکر اس سے بڑی تو کوئی خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔“

”Obviously۔“ کاناز نے بڑے اسٹائل سے جواب دیا۔

”بے شک وہ تمہاری سلطنت رومانہ ہے۔ تین گھر چھوڑ کر اس کا گھر ہے اور تمہارا استقبال یہ ایسا ہوتا کہ گویا وہ سمندر پار سے آرہی ہو۔“

”بچی دادا جان جب وہ آتی ہے یا میں اس سے ملنے جاتی ہوں تو لگتا ہے پہلی بار مل رہے ہیں۔“ کاناز نے بڑی سادگی اور معصومیت سے اپنے دل کی بات کی۔

”اللہ آپ دونوں کی دوستی کو ہمیشہ قائم رکھے۔“ شاہ عالم نے پوتی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی۔

”حالانکہ دادا جان ہم روز کالج میں ملتے ہیں مگر وہاں مزہ نہیں آتا۔ بیک بھی بس چھوٹی سی ہوتی ہے اور کلاس میں لیکچرار ہمیں ساتھ بیٹھنے نہیں دیتیں کہ آپ دونوں بہت باتیں کرتی ہیں۔“

”ٹھیک تو کہتی ہیں، ویسے بیٹا ایک بات تو بتاؤ..... یہ چند گھنٹوں میں اتنی ساری باتیں کہاں سے جمع ہو جاتی ہیں۔ اتنی خبریں تو اخبار کے رپورٹر کے پاس بھی نہیں ہوتیں۔“ شاہ عالم نے مذاق کیا اور کاناز نے بڑے دلار سے ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

”دماغی امراض کی ماہر ہیں ہماری اماں۔ دیکھ لینا ایک دن ہم بھی ان کے پیشدہ ہوں گے۔“ رابی ریوٹ سے چینل تبدیل کرتے ہوئے رومانہ سے کہہ رہی تھی۔ جو جلدی جلدی کتابیں بیک میں رکھ رہی تھی۔

”میں جلدی میں ہوں آپا، واپس آ کر یہ درد بھری کہانی ضرور سنوں گی۔“

”طنز کر رہی ہو..... مگر یاد رکھنا رومانہ ایک دن تمہاری باری بھی آئے گی۔“

”ایک، ایک، ایک سیکنڈ قیمتی ہے آپا..... بڑی مشکل سے کمبا سنڈ اسٹڈی کے بہانے کاناز کے گھر جانے کی اجازت ملی ہے۔“

”بھئی بھئی مجھے خیال آتا ہے اماں نے ہمیں کچرے سے اٹھا کر تو نہیں پالا۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہہ کر ٹی وی بند کیا اور ریوٹ ایک طرف اچھال دیا۔ رومانہ اپنی دھن میں تھی اس نے اپنے کپڑوں پر ایک نگاہ ڈالی۔

”آپا یہ ڈریس ٹھیک ہے ناں؟“

”جہنم میں جاؤ۔“ رابی پھیل کر صوفے پر لیٹ گئی۔

”میں تو جنت میں جا رہی ہوں، اپنی دوست کاناز کے گھر۔“ رومانہ شرارت سے ہنسی۔

”تنگ جوتے پہنے ہوئے ہیں ہم سب نے۔ ذرا دیر کو اتارتے ہیں تو سکون ملتا ہے۔ واپس تو اسی جہنم میں آؤ گی۔“ رابی زہریلے لہجے میں بولی اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ رومانہ نے ایک نظر بہن پر ڈالی اور بیک اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اصیل خان نظر کی عینک لگائے لاؤنج میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ گل جان دور بیٹھی ایک کُرتے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ ڈائننگ میں ملازمہ برتن وغیرہ اٹھا رہی تھی۔ خاموش ماحول میں برتنوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اسی وقت گھر کے مین گیٹ پر..... ہارن کی آواز سنائی دی تھی۔ اصیل خان نے چونک کر عینک اتاری اور کھڑا ہو گیا، جلدی جلدی اخبار لپیٹا اور آگے بڑھنے لگا۔ گل جان بدحواس ہو کر ایک طرف بڑھی پھر رک کر بڑی ناگواری سے اصیل خان کو مخاطب کیا۔

”اصیل خان۔“

”جی گل جان بی بی؟“ اصیل خان باہر جاتے جاتے رک گیا اور بہت مؤدبانہ انداز میں گویا ہوا۔

”کتنی بار کہا ہے یہاں لاؤنج میں مت بیٹھا کرو..... کسی دن بی بی جان نے دیکھ لیا تو..... پہلے ہی زندگی کے عذاب کیا کم ہیں۔ رحم کرو خود پر۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گئی۔ اصیل خان سر جھکائے مخالف سمت جا رہا تھا۔

☆☆☆

مہرجان لاؤنج میں داخل ہوئیں، انداز میں شاہانہ پن اور ملکاؤں جیسا کردار تھا۔ ان کا باوردی ڈرائیور بیک اٹھائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ مہرجان نے لاؤنج میں رک کر ادھر ادھر نظر دوڑائی وہ بنظر غائر جائزہ لے رہی تھیں۔ ڈرائیور نے ان کا بیک ٹیبل پر رکھا اور سر جھکا کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

”تم جاؤ ریٹ کرو۔ رات آٹھ بجے مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔ گاڑی تیار رکھنا۔“ مہرجان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ڈرائیور لاؤنج سے چلا گیا۔ اسی وقت مہرجان کی نظر صوفے پر پڑے ایک فیشن میگزین پر پڑی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر میگزین اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔ چہرے پر غم و غصے کے تاثرات واضح ہونے لگے۔

”گل جان۔“ انہوں نے بلند آواز میں گل جان کو گویا طلب کیا۔ گل جان ایک جانب سے میز پر پڑتی آئی تھی وہ بہن کے لہجے کے سارے موسموں سے آگاہی رکھتی تھی۔ پنا سوال جواب کے وہ سمجھ گئی تھی کہ پھر عدالت لگی ہے۔

”اتنا آسان نہیں ہے، خالہ تو ان سے بس تھوڑی سی چھوٹی ہیں۔ وہ تک ڈرتی ہیں اور ہمیں بھی ڈراتی رہتی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے خالہ نے ہی بیڑا غرق کیا ہے۔“ کاناز نے بے ساختگی سے کہا اور پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا۔

”خالہ کو کچھ نہ کہو وہ بہت اچھی ہیں۔ اتنی اچھی ہیں کہ کسی کو آج تک اتنی اچھی خالہ نہیں ملی ہوگی۔“ روما نے گل جان کے تصور میں کھو کر بات کی۔

”ویسے یہ بات تو ہے، خالہ سر سے پاؤں تک محبت ہیں۔ تمہاری ڈکٹیٹر اماں جان سے تو بالکل مختلف ہیں۔“ کاناز نے اتفاق کیا۔

”ان کی وجہ سے تو وہ گھر گھر لگتا ہے ہر وقت مصروف رہتی ہیں۔ بہترین کوکنگ کرتی ہیں۔ ہر وقت گھر کو سجاتی بناتی رہتی ہیں۔ اماں جان کے دوست وغیرہ اچانک آجاتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں اتنا سارا کھانا تیار کر لیتی ہیں۔“ روما بول رہی تھی اس کے لہجے میں خالہ کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

”ایک بات سمجھ نہیں آتی خالہ اتنی پیاری ہیں۔ سب کام کر سکتی ہیں پھر ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟“ کاناز نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

”میں نے ایک مرتبہ اماں جان سے پوچھا تھا کہ آپ نے خالہ کی شادی کیوں نہیں کی بس اماں جان کا پارا ایک دم ہائی ہو گیا بولیں..... ضروری تو نہیں ہر لڑکی کی شادی ہو۔ فضول باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔“ روما نے برا سامنہ بنا کر بتایا۔

”اگر خالہ کی شادی ہو جاتی تو وہ آئیڈیل بیوی ہوتیں۔“ کاناز بولی۔

”ہوں..... اپنے گھر کی ملکہ ہوتیں ہمارے گھر میں تو وہ نوکرانی بنی ہوئی ہیں۔“ روما نے دکھ سے کہا۔

”چلو چھوڑو ڈپریشن ہونے کی ضرورت نہیں۔ آؤ ٹینس کھیلتے ہیں۔“ کاناز اٹھتے ہوئے بولی۔ روما بھی فوراً کھڑی ہو گئی جیسے وہ اپنے محسوسات سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔

☆☆☆

”میں عمر کی اس منزل پر آ پہنچی ہوں کہ خود کشی کر کے حرام موت نہیں مرنا چاہتی۔“ گل جان کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے، حلق میں پھندے لگ رہے تھے۔

”مجھے تم پر کبھی رحم نہیں آیا گل جان۔“ مہر جان نے گل جان کو ایک طرف دھکا دیا اور وارڈروب کی طرف بڑھیں۔ گل جان لڑکھرائی تھی مگر فوراً سنبھل گئی۔

”مجھے تمہارے آنسوؤں سے نفرت ہے۔ ہزار بار کہا ہے میرے سامنے آنسو مت بہایا کرو۔“ مہر جان نے وارڈروب سے اپنا ایک ڈریس نکالتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں کوشش تو کرتی ہوں اتنے آنسو بہا چکی ہوں مگر یہ دریا اترتا ہی نہیں۔“ وہ بھیگی آواز میں بڑے کرب سے بولی۔

”اوئی (Operation theatre) میں کھڑے کھڑے میرے پاؤں سو ج گئے۔“ مہر جان اپنے کپڑے بنڈ پر پھینک کر اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی بیزاری سے کہہ رہی تھیں۔

”میں ٹب میں گرم پانی لانی ہوں۔ آپ پندرہ بیس منٹ پاؤں گرم پانی میں ڈبو کر رکھیں۔ تھکاوٹ اتر جائے گی۔“ یہ کہہ کر گل جان واش روم کی طرف بڑھی جہاں اس نے مہر جان کو آرام دینے والی ہر شے رکھی

”جی بی بی جان؟“ اس نے بہت شائستہ لہجے میں مسئلہ جاننے کی کوشش کی۔

”یہ کون لے کر آیا ہے؟“ مہر جان نے میگزین گل جان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”مجھے علم نہیں۔“ وہ پریشان نظر آنے لگی۔

”تمہیں تو آج تک اپنے حسین سپنوں سے فرصت نہیں ملی..... گھر کا کوئی ہوش ہے؟“

”شاید رومال لائی ہوگی کالج سے۔“ گل جان نے دبے دبے لہجے میں بات کی۔

”کالج میں یہ فیشن میگزین پڑھائے جاتے ہیں۔ تم نے کبھی اندر سے کالج کی شکل دیکھی ہوتی تو کچھ پتا ہوتا۔“ پرائیوٹ انٹر پاس وہ بھی تھوڑا کلاس میں۔“ مہر جان کے انداز میں بیزاری اور بے مروتی تھی۔ چالیس پینتالیس سال کی گل جان اس طرح سر جھکائے بہن کی لعن طعن سن رہی تھی جیسے کوئی آٹھ دس سال کی بچی ہو۔

”لڑکیاں اس طرح کے میگزین پڑھنا شروع کر دیں تو پھر تمہارے جیسے ہی ہو جائیں گی۔“

”میں نے کسی کو پڑھتے نہیں دیکھا شاید کوئی نوکر لایا ہو۔“ گل جان نے بڑے صبر و سکون سے جواب دیا۔

”ہاں، نوکروں کو یہ انگلش میگزین بہت اچھی طرح پڑھنا آتے ہیں۔“ مہر جان نے طنز یہ مسکرا کر کہا۔

”میرا مطلب ہے تصویریں دیکھنے کے لیے۔“ گل جان نے جھٹ وضاحت کی۔

”پتا کرو اس گھر میں کس کو شوق ہے یہ بیہودہ تصویریں دیکھنے کا۔“ مہر جان نے میگزین ایک طرف دے مارا اور اپنے بیڈ روم کی طرف قدم بڑھا دیے گل جان نے دیر سے رکی سانس سینے سے آزاد کی اور آگے بڑھ کر میگزین اٹھا لیا۔

☆☆☆

”اللہ تمہارے گھر آ کر تو اپنے گھر جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“ روما نے کتاب بند کر کے بڑی بیزاری سے ایک طرف رکھی پھر گہری سانس لے کر شرارت سے کاناز کی طرف دیکھ کر بولی۔

”کاش کوئی جادو کے زور سے ان گھڑیوں کی ٹک ٹک روک دے۔“

”حالانکہ تمہارا گھر تو میرے گھر سے زیادہ خوب صورت ہے اور اس گھر میں رہنے والے سارے کے سارے لوگ بھی خوب صورت ہیں۔“ کاناز نے مسکرا کر روما کی طرف دیکھا جیسے اس کے چہرے پر اپنی بات کا تاثر بھی نوٹ کر رہی ہو۔

”اور وہ سارے کے سارے خوب صورت لوگ ہماری اماں جان کے خوف سے تھر تھر کانپتے رہتے ہیں۔“ روما کے ہونٹوں پر بڑی اداس سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ کاناز نے بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

”تمہاری اماں سب کو اتنا ڈراتی کیوں ہیں؟“ کاناز نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”کاش پتا چل جائے۔“ روما نے اسی طرح اداسی سے جواب دیا۔

”مگر لگتا ہے رابی آپا ان سے بالکل نہیں ڈرتیں۔ تم بھی رابی آپا جیسی بن جاؤ ورنہ ڈر ڈر کر بد صورت ہو جاؤ گی۔“

”مجھے اس وجہ سے بھی بہت ڈر لگتا ہے کہ رابی آپا اماں جان سے کیوں نہیں ڈرتیں۔“ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

”اس لیے کہ وہ تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں ناں جو ڈر گیا وہ مر گیا۔“ کاناز نے لاابالی پن سے بات کی۔

مہرجان نے پاؤں ٹب سے باہر نکالے تو گل جان جلدی سے اس کے پاؤں تو لیے سے خشک کرنے لگی۔
”پتا کرو رو ما گھر آگئی یا ابھی تک وہیں جمی بیٹھی ہے۔ گھر میں تو دل ہی نہیں لگتا۔“ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولیں۔

”میں پتا کرتی ہوں، آپ کے لیے چائے لاؤں بی بی جان؟“ اس نے آہستہ آواز میں سر جھکا کر پوچھا۔
”اتنی چائے پی ہے آج کہ معدہ جل رہا ہے۔ دل تو کم بخت جلتا ہی رہتا ہے۔“ گل جان کے دل میں ورد کی بیسیں اٹھنے لگیں اس نے بڑی ہمدردی اور دکھ سے مہرجان کی طرف دیکھا۔

”جب سے میں آئی ہوں رابی کو نہیں دیکھا..... کیا کر رہی ہے؟“ مہرجان کو اب اچانک رابی کا خیال آیا، گل جان کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

”جی میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے کمزوری آواز میں کہا اور باہر کی طرف بڑھی۔
”ہاں..... اسے میرے کمرے میں بھیج دو اللہ کا عذاب ہے میرے سر پر۔ چلتی کیسے ہے جیسے زمین پھاڑ ڈالے گی۔“ مہرجان بڑبڑائیں۔ ”اور ہاں سنو.....“ انہوں نے جانی ہوئی گل جان کو روکا۔ گل جان رک گئی مگر پلٹی نہیں۔

”اسے یاد دلاتی رہا کرو کہ وہ ڈاکٹر مہرجان کی بیٹی ہے۔ ماں کے بغیر اس کی کوئی حیثیت ہے نہ شناخت۔“

”جی میں اکثر اسے یاد دلاتی ہوں۔“ گل جان کے لہجے میں بلا کی مظلومیت تھی۔

”دادا جان دعا کریں ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوں۔“ کاناز کے انداز میں بلا کا بچپنا اور کچا پن تھا۔ وہ روما کو خدا حافظ کہنے گیٹ تک جا رہی تھی۔ شاہ عالم مغرب کی نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے اس لیے ان کے ہمراہ چل رہے تھے۔ کاناز کی احمقانہ فرمائش پر بہت لطف اندوز ہوئے اور مسکرانے لگے۔

”ارے بھئی اب تم دونوں بڑی ہو چکی ہوں کچھ دنوں بعد تم دونوں کی شادیاں ہو جائیں گی، دونوں اپنے اپنے گھر میں..... خدا معلوم کس کا گھر مشرق میں کس کا مغرب میں۔“

”ہائے اللہ، آپ وضو سے ہیں بد دعا تو نہ کریں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم ایک دوسرے سے دور ہوں۔“
”تو پھر تم دعا مانگو کہ شادی کے بعد بھی تم پڑوسیں بن جاؤ۔ ایک گلی میں تم دونوں کے گھر ہوں۔“ شاہ عالم نے مسئلہ حل کیا۔

”آخر ہم دونوں کا ایک ہی گھر کیوں نہیں ہو سکتا۔“ کاناز جھکی روما مسکرانے لگی۔

”ایسا کر لیتے ہیں۔“ شاہ عالم نے اسی طرح پُر سکون انداز میں جواب دیا۔
”کیا کر لیتے ہیں؟“ کاناز ہونق سی ہو کر پوچھنے لگی۔ روما خاموش رہ کر دادا پوتی کی گفتگو انجوائے کر رہی تھی۔

”بھئی ایسا گھر دیکھ لیتے ہیں جہاں دو بھائی شادی کے لیے تیار بیٹھے ہوں، ایک سے تمہاری کر دیں گے دوسرے سے روما کی۔“ شاہ عالم دل ہی دل میں دونوں لڑکیوں کی معصومیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑکی ذرا سی میچور ہو جائے تو شادی کے ذکر پر شرماتے لگتی ہے۔ کانثس ہو جاتی ہے مگر کاناز تو یوں بولے چلی جا رہی تھی جیسے موسم پر اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہو۔

ہوئی تھی۔ مہرجان نے گل جان کی پشت کی طرف بڑی بیزاری سے دیکھا۔ اس کے نیک عمل کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔

”یہ دونوں لڑکیاں نظر نہیں آرہیں؟“ جابر علی گھر آچکا تھا اور اپنے معمول کے مطابق مخصوص جگہ پر بیٹھ کر شام کی چائے پی رہا تھا۔

”شبینہ کی سہیلی فائزہ کی سالگرہ ہے، دونوں وہیں گئی ہیں۔“ صابرہ نے ہاتھ میں تھال پکڑی ہوئی تھی وہ بڑی تندہی سے چاول صاف کر رہی تھی۔

”یہ جو لڑکیاں دوستانے پالتی ہیں ناں یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہ دوستیاں ہی لے ڈوبتی ہیں۔“ جابر علی نے چائے کا گھونٹ بھر کر بد مزاجی سے کہا۔

”کبھی کبھی گھر سے نکلتی ہیں۔“ صابرہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔
”زمانہ خراب ہے، ہوش کی دوا کرو صابرہ۔“ جابر علی نے سابقہ انداز میں کہا۔

”اگر میں نے کسی سے کوئی الٹی سیدھی بات سنی تو یاد رکھنا ایک منٹ تمہیں اس گھر میں نہیں رکھوں گا۔ اپنی ذمے داری محسوس کرو میں نے کہا تھا کہ بیٹیوں کی ماں بن۔“

”بیٹیاں جہیز میں لے کر نہیں آئی تھی اب بس بھی کریں۔ آجائیں گی تھوڑی دیر میں۔“
”ہاں..... بہت جہیز لائی تھی۔ گھر بھر گیا تھا میرا۔ چار چیزیں لے کر آئی تھی آج تک نخرہ دکھاتی ہے۔ میرے گھر سے نکل کر اپنی اوقات دیکھ لے ایک پولیس آفسر کی بیوی ہے تو چار لوگ سلام کر لیتے ہیں۔“ اسی وقت برہان کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔ اس کے چہرے پر کوفت و بیزاری کی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔

”جب آپ کو ان کی اوقات پتا تھی تو کیوں شادی کی، کسی سیٹھ کی بیٹی سے کر لیتے۔“ لگتا تھا آج برہان کی برداشت جواب دے گئی۔ جابر علی نے اپنے خاموش طبع بیٹے کے منہ سے پہلی بار جرات مندانہ کلمہ سنا تو جیسے بھونچکا رہ گیا پھر بڑے ضبط سے گویا ہوا۔

”باپ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے؟“
”اللہ کے سامنے بھی پانچ وقت کھڑا ہوتا ہوں اور اس سے دل کی باتیں کرتا ہوں۔“ برہان نے سنجیدگی سے کہا۔

”جانتا ہوں بڑا نیک پرہیزگار ہے۔ بڑا آیا ماں کا حمایتی۔“ جابر علی اندر ہی اندر غصے کی آگ سے بھسم ہو رہا تھا مگر بظاہر بہت ضبط کر رہا تھا۔ جوان بیٹا سامنے کھڑا ہو جائے تو پھر بہت سوچنا پڑتا ہے۔ ”حرام نہیں کھلاتا ہوں دن رات جان خطرے میں ڈال کر رزق حلال کماتا ہوں تب ہی آج یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہو۔“ جابر علی ٹیبل دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ کا احسان مانتا ہوں ابا جان مگر کوئی بھی انسان اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ شاید یہ آپ کے کھلائے ہوئے رزق حلال کا ہی اثر ہے۔ میرے اگزام ہو رہے ہیں تھوڑی سی خاموشی چاہیے۔“
برہان بڑی جرأت سے اپنی بات کر کے واپس کمرے میں چلا گیا۔ جابر علی نے آگ برساتی نظروں سے صابرہ کی طرف دیکھا اور بڑبڑانے لگا۔

”ایک ہی بیٹا پیدا کیا ہے۔ پانچ چھ بیٹوں کی ماں بن جاتی تو پوری آری تیار کرتی میرے خلاف۔“ صابرہ نے اب کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی ابھی خاموش سی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”دادا جان ہم ایک بندے سے بھی شادی کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کی دو بیویاں ہوتی ہیں بلکہ میں نے تو سنا ہے تین بھی ہوتی ہیں۔“ کائنات کے انداز میں بر جستگی تھی البتہ روماء قدرے جھینپ گئی تھی۔ اسے کائنات کی یہ بات واقعی احمقانہ لگی تھی۔

”لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم۔“ شاہ عالم نے بڑے زور شور سے لا حول پڑھی۔

”آپ لا حول کیوں پڑھ رہے ہیں دادا جان۔ یہ تو گدھے کی آواز سن کر پڑھتے ہیں۔“ کائنات نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

”گدھے کی آواز سن کر ہی نہیں گدھے کی باتیں سن کر بھی پڑھ لیتے ہیں۔“ شاہ عالم نے ہلکی سی چپت کائنات کے سر پر لگائی۔ روماء ہنس کر بے حال ہو گئی۔ کائنات نے برا سامنہ بنایا تھا۔

☆☆☆

”جب ابا جان کی طبیعت کا پتا ہے تو کیوں امی کو امتحان میں ڈالتی ہو۔“ برہان، شبینہ اور ستارہ سے آف موڈ میں بات کر رہا تھا جو سالگرہ کی تقریب سے بہت خوش خوش واپس آئی تھیں اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی تقریب پر تبصرہ کر رہی تھیں کہ برہان نے ایک دم آکر سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

”بھائی ہم روز روز تو کہیں نہیں جاتے۔ پورے تین مہینے بعد ہم کسی دوست کے گھر گئے تھے وہ بھی انویٹیشن پر۔“ ستارہ نے منہ بنایا۔

”پورے دو مہینے میں نے پیسے جمع کیے تھے گفٹ کے لیے۔“ شبینہ بھی بولی۔

”اتنا زور لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ تحفے تحائف اپنی حیثیت کے مطابق ہی دینا چاہیے۔“ صابرہ بھی بہن بھائی کی آواز سن کر کمرے میں آگئی تھی۔

”امی حیثیت تو ہماری بہت اونچی ہے۔ میری کلاس فیلونشا کے ابو بھی پولیس افسر ہیں، یہ بڑی سی کار میں بیٹھ کر کالج آتی ہے۔“ ستارہ نے برا سامنہ بنا کر ماں کو جواب دیا۔

”ہماری حیثیت وہ ہوتی ہے جو ہمارے ماں باپ طے کرتے ہیں۔ کیوں دیکھتی ہو... لوگوں کی کاریں، کوٹھیاں... تمہیں تو فخر ہونا چاہیے کہ تمہارا باپ رشوت خور نہیں ہے۔“ برہان نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

”امی دیکھیں بھائی جان ابا جان کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔“ ستارہ بسوری، شبینہ البتہ سنجیدگی سے ادھر ادھر پڑی چیزیں اٹھا کر قرینے سے رکھنے لگی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شکر ہے تمہارا باپ گھر میں وہ کمائی لاتا ہے جس میں کسی کی مجبوری اور آہیں نہیں ہوتیں۔ پاک صاف روزی..... یہ بھی خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔“ صابرہ نے سمجھایا۔

”ہم ابا جان کی ہر سختی اسی لیے برداشت کر لیتے ہیں کہ وہ رشوت کی دنیا میں خود کو بچانے کے لیے بہت مشکلات سے گزرتے ہیں۔ پتا نہیں کس کس سے کیا کیا کچھ سنتے ہوں گے۔“ برہان نے بہنوں کو نصیحت کی جس کی اس ماحول میں سخت ضرورت تھی کیونکہ حد سے زیادہ سختی بغاوت کے جذبات ابھارتی ہے۔ برہان ایک کنٹرول لائن ہر صورت قائم رکھنا چاہتا تھا۔ باپ کی سخت مزاجی کو جسٹی فائی کرنا اس کی محتاط طبیعت کا تقاضا تھا۔ وقت کی مجبوری تھی۔ ستارہ کو تو بھائی کے خیالات سن کر سخت مایوسی ہوئی وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

”ایک اور ابا جان۔“ صابرہ نے پریشان ہو کر برہان کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

صابرہ صحن میں شوہر کا بستر بچھا کر جگ میں پانی بھرنے کچن میں چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ اپنے بستر پر

اصلی اور نقلی کا فرق

کہتے ہیں ہٹلر نے اپنی کئی نقلیں تیار کر رکھی تھیں یعنی ہو بہو ہٹلر سے ملتے جلتے ہم شکل افراد اکٹھے کر رکھے تھے۔ ایک جرمن آفیسر کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ اصل ہٹلر سے ہم کلام ہے یا نقلی سے تو اس نے کہا ”سر! آج میں نے ایک ہزار یہودی قتل کیے۔“ تو ہٹلر نے بے ساختہ کہا۔ ”شاباش!“ تو جرمن افسر فوراً بولا۔ ”آپ اصلی ہٹلر نہیں ہیں کیونکہ صرف ایک ہزار یہودیوں کو قتل کرنے پر ہٹلر شاباشی نہیں دے سکتا۔“ ذہنی آزمائش کے امتحان میں طلبہ کو ایک تصویر دی گئی جس میں ایک شخص پولیس کی وردی پہنے چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ پتا کرنا تھا کہ وہ اصلی پولیس والا ہے یا نقلی۔ ایک لڑکے نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ نقلی ہے۔“ امتحان نے پوچھا۔ ”کیسے؟“ لڑکے نے کہا۔ ”سر! اگر یہ اصلی ہوتا تو اس کا ہاتھ بھی اپنی جیب میں نہ ہوتا۔“

مرسلہ: جبین نیاز، ملتان۔ اقتباس: مزاحیات، ڈاکٹر یونس بٹ

”تم کتنی دلچسپ باتیں کرتے ہو اصیل خان۔ اچھا چلو بعد میں جائے نماز پر بیٹھ کر خود پر ہنس لینا میرے لیے بڑے مگ میں اچھی سی کافی بنا کر لاؤ۔۔۔۔۔ مجھے بہت کام کرنا ہے، کل پانچ بڑے میجر آپریشنز ہیں۔“

”جی، آپ چلیں میں ابھی لایا۔“ اصیل خان نے اٹھ کر جائے نماز تک کرنا شروع کر دی۔ مہر جان بڑے کروفر سے چلتے ہوئے اندر کوشی میں جا رہی تھیں۔

☆☆☆

رابی اپنے بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی گل جان بہت محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”خالہ، اماں شروع ہی سے ایسی ہیں؟“ رابی سوچتے سوچتے گل جان کی طرف دیکھنے لگی۔ گل جان رابی کے سوال پر شپٹای گئی پھر زبردستی مسکرائی۔

”وہ بہت اچھی ہیں بیٹا۔۔۔۔۔ اصل میں شروع ہی سے ان پر بہت ذمے داریاں رہیں اسی لیے وہ بہت سنجیدہ ہیں مگر میری بہن دل کی بہت اچھی ہیں۔“ گل جان نے ایک سرد آہ دل میں دبانے کی کوشش کی۔

”کمال ہے آپ اماں کی تعریف کرتی ہیں۔۔۔۔۔ آپ؟“ رابی نے مسخرانہ کہا۔

”کیوں نہ کروں میری سگی بہن ہے۔“ گل جان نے نظر جھکا کر آہستگی سے کہا تھا۔

”آپ انہیں اپنی بہن سمجھتی ہیں مگر وہ تو آپ کو اپنی ملازمہ سمجھتی ہیں۔“ اس نے صاف گوئی بلکہ بڑے پھلکھو پن سے کہا۔

”چھوڑو بیٹا کوئی اور بات کرو۔“ گل جان نے گویا اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔

”میرے پاس نہیں ہے کوئی اور بات۔۔۔۔۔ مجھے بتائیں وہ بہن کس طرح اچھی ہو سکتی ہے جو اپنی بہن کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا رہی ہو۔ پوری ایک نوکرانی کی تنخواہ کی بچت ہے۔“

”شاید وہ مجھ سے زیادہ مجبور ہوں۔“ گل جان کے ڈھیروں آنسو دل پر گرے۔ ”بیٹا اب تم ادھر ادھر اپنا ذہن نہ الجھاؤ۔ شادی کر کے اپنے گھر جاؤ اور اپنی مرضی کی زندگی گزارو۔“

”شادی کر لوں۔۔۔۔۔ اس بڑھے سہراب خان سے؟“ رابی نے غصے سے گل جان کی طرف دیکھا۔

لیٹ چکا تھا۔ وہ شروع سے ہی کھلے صحن میں سونے کا عادی تھا۔ بارشوں کے موسم میں دگنا چڑچڑاہو جاتا تھا کہ بند کمروں میں اس کا دم گھٹتا تھا۔ خود پر جبر یا کوئی قدغن تو اسے لمبے بھر کو برداشت نہیں تھی۔

”وہ تنخواہ کا لفاظیہ میں نے تمہارے بچے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ سنبھال کر رکھ دینا۔“ اس نے قدرتی ہوا اور پیڈل فین کی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بہت نرم اور اچھے موڈ میں صابرہ سے کہا۔ ویسے بھی صرف تنخواہ پر گزارہ کرنے والوں کا موڈ مہینے میں ایک دن ضرور بہت اچھا ہوتا ہے جس دن انہیں تنخواہ ملتی ہے۔

”کتنے ہیں؟“ صابرہ کو بھی یہ ماہانہ خبر خوشخبری کی طرح محسوس ہوتی تھی۔

”دبیتس ہزار، دو ہزار میں نے رکھ لیے ہیں اپنے خرچے کے۔“ جابر علی نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

صابرہ اس کے پاؤں دبانے لگی۔

”ستارہ کہتی ہے اس کی سہیلی کا باپ بھی پولیس افسر ہے اس کے ہاں بقرعید پر چھ بکرے ذبح ہوتے ہیں۔“

”ہاں سارا سال دو ٹانگوں والے بکرے کاٹنا ہوگا اسی لیے عید پر چار ٹانگوں والے بکرے کاٹنا ہے۔ ارے ہم خود کتنے کو تیار ہیں مگر حرام کھانے کو تیار نہیں۔ سمجھایا کرو اپنی اولاد کو۔“

”اللہ کا شکر ہے بچے سمجھ دار ہیں سب سمجھتے ہیں اور بچوں کی طرح آئے دن فرمائشیں نہیں کرتے۔“

صابرہ نے جابر علی کو اپنی طرف سے مطمئن کرنے کی سعی کی۔

”انسان چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے تو سکون سے رہتا ہے۔ حسرتیں پالنے سے امیدیں پوری نہیں ہوتیں۔“ جابر علی نے یہ کہہ کر کروٹ بدلی۔ ”اب تم بھی جا کر سو جاؤ آج کل ایمر جنسی چل رہی ہے، جانے کس وقت فون کی گھنٹی بج جائے۔ ہم تو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔“ جابر علی کہہ رہا تھا۔ صابرہ چار پانی سے اتر گئی اور ایک وفادار، ہمدرد بیوی کی طرح اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی جو دن میں کئی مرتبہ یاد دلاتا تھا کہ وہ ان کی خاطر بڑی مشکلیں اٹھا کر رزق حلال کماتا ہے۔

☆☆☆

اصیل خان لان کی ہلکی روشنی میں بہت خضوع و خشوع سے عشا کی نماز پڑھتا نظر آ رہا تھا۔ مہر جان کافی دیر سے اپنے کمرے کے اطالوی طرز کے درجے سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ ان کا جسم بید کی طرح لرزنے لگا یوں لگا جیسے اب وہ پاگللوں کی طرح چیخ پڑیں گی۔ وہ چند لمحے اپنی سانسوں کو کنٹرول کرتی رہیں پھر درجے سے ہٹ گئیں۔

وہ نماز مکمل کر کے دعا مانگ رہا تھا اس کے خاموش آنسو اس کی داڑھی کو بھگور رہے تھے۔ مہر جان وہ بے پاؤں اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اصیل خان کا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔

اصیل خان کو جیسے زبردست کرنٹ لگا تھا۔ یہ کون اس کی تنہائی میں خلل ہوا تھا۔ وہ اپنا آنسوؤں سے بھیجا چہرہ پاس کھڑے ہوئے شخص کو دکھانا نہیں چاہتا تھا اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس نے ہتھیلیوں سے آنسو صاف کیے مگر اب بھی آنکھیں تو بھیگی ہوئی تھیں اور بھیگی ہوئی آنکھیں بہت بولتی ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اس کے بھید کھولیں۔ مہر جان کا ہاتھ ہنوز اس کے کندھے پر تھا۔

”اصیل خان سات مرتبہ پیدا ہو کر مر جاؤ تمہارا رے آنسوؤں میں اتنا دم نہیں ہے کہ قرض اتار سکیں۔ اچھا یہ تو بتاؤ کیوں رو رہے ہو؟“ مہر جان کے انداز میں مسخر تھا۔

”رو کہاں رہا ہوں بیگم صاحبہ، اپنے اوپر ہنس رہا ہوں۔“ مہر جان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”بڑھا نہیں ہے البتہ عمر میں تم سے کافی بڑا ہے پکی عمر کے مردوں میں سنجیدگی ہوتی ہے۔ کم عمر بیوی کو بہت اچھی طرح سنبھال لیتے ہیں۔ اصل بات تو پُر خلوص ساتھی ملنا ہے اور جس عورت کو پُر خلوص ساتھی مل جائے وہ بہت نصیبوں والی ہوتی ہے۔“

”ہاں، مجھے پہلے ہی پتا ہے آپ کو اماں نے میرے پیچھے لگا دیا ہے مگر آپ اچھی طرح جان لیں میں کسی صورت سہراب خان سے شادی نہیں کروں گی۔ چاہے اماں مجھے گولی مار دیں۔“ رابی کے لہجے میں اٹل پن تھا۔ ”بیٹا پھر تمہاری شادی کہاں کریں؟“ گل جان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا جیسے وہ انجانے اندیشے سے کانپ رہی تھی۔

”میں اس وجہ سے تو انکار نہیں کر رہی کہ مجھے اپنی پسند سے شادی کرنی ہے مگر ایسی کیا مصیبت آئی ہے کہ میں ایک بڑھے سے شادی کروں۔ شادی کے بغیر بھی زندگی گزر جاتی ہے جیسے آپ کی گزر رہی ہے۔“ رابی جھلا کر بولی۔

”بیٹا تم دونوں بہنوں کے لیے رشتے ڈھونڈنا بہت کٹھن کام ہے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی شادیاں غیر خاندان میں نہیں ہوتیں۔ بڑھا ہو، جوان ہو جو بھی ہو خاندان کا ہی ہونا چاہیے اور اس وقت خاندان میں تمہارے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں ہے۔“ گل جان نے بہت سادہ طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”خاندان..... ہمارا کون سا خاندان ہے۔ ایک آپ، ایک اماں، ایک بہن پھر آپ کس خاندان کی بات کر رہی ہیں؟ ہم نے تو آج تک اپنا کوئی رشتہ دار نہیں دیکھا۔“

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔ ہمارا بہت بڑا خاندان ہے۔ ہم زمیندار لوگ ہیں۔ بس بی بی جان کو پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ بابا نے ان کی خواہش یہ سوچ کر پوری کر دی کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا۔ بابا، بی بی جان کو ایک وارث کی طرح تیار کر رہے تھے وہ کہتے تھے یہ میرا بیٹا ہے۔ میری پگڑی اور بیٹھک اس کے پاس میری امانت ہوگی۔“ گل جان بول رہی تھی اور رابی بڑی محویت سے سن رہی تھی۔

”یہ جو تمہاری اماں کا اسپتال ہے ناں اس کا نقشہ ہمارے مرحوم بابا ہی نے بنوایا تھا۔“

”تو خاندان کے لوگ ہم سے کیوں نہیں ملتے؟“ رابی اپنی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

”ہم اُن سے نہیں ملتے۔“ گل جان نے آہستگی سے کہا۔

”کیوں؟“ رابی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”بی بی جان کو پسند نہیں ہے، وہ دیہاتی لوگ ہیں بی بی جان کا مزاج نہیں ملتا۔“ گل جان نے جواب دیا۔

”اور یہ سہراب خان کیا پیرس میں رہتا ہے۔ یہ خاندان کا ہے تو دیہاتی بھی ہوگا۔“ رابی نے تلخی سے کہا۔

”وہ باہر سے پڑھا ہے۔ بہت پڑھا لکھا ہے اس نے پہلی شادی کسی میم سے کی تھی پھر بعد میں اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی اب تین بیویاں دیہاتی ہیں اس کی رشتے دار ہیں۔“ گل جان روانی میں بول رہی تھی۔

رابی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تین، تین بیویاں..... اماں تین بیویوں کے شوہر سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔“ رابی ہذیانی انداز میں چلائی۔ گل جان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”وہ ان بیویوں سے خوش نہیں ہے۔ پڑھی لکھی بیوی چاہتا ہے۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ خاندان میں کوئی لڑکا نہیں ہے، وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ گاؤں لے کر نہیں جائے گا بات ہوگئی ہے۔“ گل جان نے آہستہ آواز میں کہا۔

”ڈاکٹر صاحبہ ہرگز میری ماں نہیں ہو سکتیں۔ کوئی ماں چار مرتبہ کے شادی شدہ سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتی چاہے اس کی بیٹی بوڑھی ہو جائے۔“ رابی نے غصے سے مٹھیاں جھنجھ کر کہا۔ ”میں سہراب خان سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ میری لاش لے کر جائے گا۔“ رابی اپنی بے قابو سانسوں کو کنٹرول کرتے ہوئے بہ مشکل بولی۔ انہوں نے پریشان ہو کر اسے چکارنا چاہا تو رابی نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”آپ چلی جائیں میرے کمرے سے..... ظالم کا ساتھ دینے والا ظالم ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اپنی بہن سے اتنی ہمدردی ہے تو خود کر لیں سہراب خان سے شادی یا اماں کی کروادیں۔“ رابی پر پاگل پن سوار ہو گیا تھا وہ بستر سے اتر کر گل جان کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ گل جان آنسو پیٹی ہوئی کمرے سے باہر چلی آئی۔

☆☆☆

اصیل خان صبح، صبح تازہ سبزی لے کر آیا تھا۔ وہ سبزی کے شا پر کچن میں رکھ کر لاؤنج میں واپس آیا تو دیکھا مہرجان دونوں پاؤں نیبل پر رکھ کر نیل فائل سے اپنے ناخن بنارہی تھیں۔ اصیل خان سر جھکا کر باہر کی طرف جانے لگا تو مہرجان نے اسے روکا۔

”اصیل خان ادھر آؤ تم گھر کے سینئر سرونٹ ہو، تمہیں ایک خوشخبری سنانی ہے۔“ اصیل خان بنا کچھ بولے موڈ بانہ کھڑا ہو گیا۔

”میں رابی کی شادی کر رہی ہوں۔“ اب اصیل خان چونک پڑا تھا۔ اس کا وجود جیسے آندھیوں کی زد میں تھا۔ اس نے بے پناہ حیرت سے مہرجان کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھا رشتہ ہے۔ رابی کو پھولوں کی طرح رکھے گا۔“ مہرجان معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بول رہی تھیں۔ اب اصیل خان کے چہرے پر قدرے سکون دکھائی دیا۔

”سہراب خان کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میرے سب سے بڑے ماموں کا سب سے بڑا بیٹا ہائی فائی کو ایفانڈ، رئیس ابن رئیس۔ تم ہی کہو رابی کو اس سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے؟“ مہرجان کی مسکراہٹ بہت پُر اسرار تھی۔ اصیل خان سناٹے میں کھڑا مہرجان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”آنکھیں نیچی کر تمہاری اتنی ہمت کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔“ اصیل خان نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

Be-Belle®
INNERWEAR

Splendor of Silk &
Comfort of Cotton

طرف بڑھی۔

”خالہ۔“ رابی نے اسے آواز دی۔ اب اس کی پشت رابی کی طرف تھی وہ وہیں رک کر گردن موڑ کر رابی کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ کون تھا؟“ رابی کے لہجے میں کچھ خاص تھا۔

”کون.....؟“ گل جان بری طرح چونک گئی۔

”وہ جو آپ کو راتوں کو یاد آتا ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے پوچھا تھا۔ گل جان شپٹا سی گئی اور پھر مسکرا دی۔

”ارے بیٹا ایسی کوئی بات نہیں، ہمارے گھر میں ہی چار دیواری نہیں ہوتی۔ ہماری سوچ بھی چار دیواری کی قید میں ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر گل جان تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

برہان ٹیبل لیپ کی روشنی میں اسٹڈی کر رہا تھا۔ بہت توجہ دینا تھا کہ صابروہ دودھ کا گلاس لیے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”امی آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“ برہان نے چونک کر سر اٹھایا۔

”تم بھی تو جاگ رہے ہو بیٹا۔ میں نے سوچا آٹھ بجے کا کھانا کھایا ہوا ہے، کیا خبر بھوک لگ گئی ہو جو اب بچہ ہے۔“ ماں نے گلاس اس کے سامنے رکھ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”دماغ کا... کام زیادہ ہو تو دماغ میں خشکی ہو جاتی ہے۔“

”پہلے ہی اتنی مہنگائی ہے۔ خرچے کم کرنے کی ضرورت ہے پھر سب سے زیادہ خرچ میرا ہی ہے۔ ابا جان کا موڈ اسی وجہ سے تو خراب رہتا ہے۔“ برہان نے سنجیدگی سے کہا۔

”ارے نہیں بیٹا، وہ تو تمہاری طرف سے بہت پُر امید ہیں۔ اپنی خوشی سے تمہیں انجینئرنگ پڑھا رہے ہیں۔ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ہی ماں باپ محنت کرتے ہیں۔ انسان کی ساری بھاگ دوڑ اولاد کے لیے ہوتی ہے۔ تم اپنے ابا جان کی باتیں دل پر نہ لیا کرو۔“ وہ بڑی نیک دلی سے بیٹے کو سمجھانے لگی۔ برہان ماں کی سادگی پر مسکرا دیا۔

”میں کیوں اُن کی باتیں دل پر لوں گا۔ باپ ہیں وہ میرے..... مجھے تو ان پر رحم آتا ہے۔ مجھے احساس

Be-Belle®
INNERWEAR

Pakistan's First
2-Layer Fabric Bra!

”معاف کر دیں بیگم صاحبہ۔“ اس نے کانپتی آواز میں معذرت چاہی۔

”اب تم جاسکتے ہو جو خبر ہم نے تمہیں سنانا تھی سنا چکے۔ امید ہے تم یہ خوشخبری سن کر باغ باغ ہو رہے ہو گے۔“ یہ کہہ کر مہر جان ہنس پڑیں۔ اصیل خان یوں چل رہا تھا جیسے خود کو گھسیٹ رہا ہو۔

☆☆☆

رابی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ گل جان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ تسبیح کے دانے گرا رہی تھی دانوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو گالوں پر پھسل رہے تھے۔ وہ کچھ پڑھتی تھی پھر رابی پر پھونک مارتی تھی۔ اس کی آنکھیں رابی پر تکی ہوئی تھیں پھر جیسے اسے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اس نے جھک کر رابی کی پیشانی چوم لی۔ گرم گرم چند آنسو رابی کے چہرے پر گرے تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور نیند بھری آنکھوں سے جن میں حیرت کی انتہائی گل جان کی طرف دیکھنے لگی۔ گل جان بھی اپنی بے اختیاری پر جھل سی کھڑی آنسو صاف کر رہی تھی۔

”آپ سوئی نہیں خالہ؟“ رابی نے نیند سے بوجھل آواز میں پوچھا، لہجے میں تھکرتھا۔

گل جان خاموش رہی۔

”خالہ آپ کیوں رو رہی ہیں، بتائیں ناں؟“ رابی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں بیٹا بس ویسے ہی۔“ گل جان کے حلق میں آنسوؤں کے پھندے تھے۔

”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔ بتائیں مجھے..... اتنی رات کو میرے کمرے میں آ کر کیوں رو رہی ہیں؟ اس وقت ساری دنیا سو رہی ہے آپ کیوں جاگ رہی ہیں؟“ رابی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور گل جان کے کندھوں کو پکڑ کر ہلا رہی تھی۔

”کچھ نہیں بیٹا۔ وہ تمہارے کمرے کی کھڑکیاں کھلی دیکھ کر آ گئی تھی۔ سوچا بند کر دوں۔ آج کل مجھ پر بھی تو بہت ہو رہے ہیں۔“ گل جان اب کافی حد تک خود پر کنٹرول کر چکی تھی۔ بہت صاف اور پُر اعتماد لہجے میں بات کر رہی تھی۔

”میرے کمرے کی کھڑکیاں بند نہ کیا کریں۔ مجھے کھڑکیاں کھول کر سونے کی عادت ہے۔ بند کمرے اور کھڑکیوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے، ڈر لگتا ہے۔“ رابی جھنجھلا کر کہہ رہی تھی۔

”تمہیں ڈر لگتا ہے؟“ گل جان نے چونک کر رابی کی طرف دیکھا۔

”ہاں، پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے بند کھڑکیوں کے پیچھے سے کوئی جھانک رہا ہے۔ کئی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔“ رابی بول رہی تھی اور گل جان اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

”آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ اسے گل جان کی نظروں میں غیر معمولی پن محسوس ہوا۔

”آں ہاں۔“ گل جان اپنے دھیان سے چونک گئی۔

”میں سمجھ گئی کہ آپ کیوں جاگ رہی ہیں اور کیوں رو رہی ہیں۔ یقیناً آپ نے اماں تک میری بات پہنچائی ہوگی اور پھر انہوں نے بہت کچھ کہا ہوگا۔“ رابی نے جیسے اپنے طور پر دل کا حال جان لیا۔

”نہیں..... نہیں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میری بڑی بہن ہیں اگر کچھ بھی کہیں تو میں برا نہیں مانتی۔“ گل جان نے آہستہ سے رابی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”اچھا ہوا میں جاگ گئی، اس بہانے پتا چل گیا کہ آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی ہیں۔“ رابی یہ کہہ کر اپنے بستر پر جا کر بیٹھ گئی۔ گل جان نے سر پر اپنا دو پٹا درست کیا اور مغموم چہرے کے ساتھ پلٹ کر دروازے کی

ہے وہ بہت محنت اور ایمانداری سے ڈیوٹی کرتے ہیں۔“ اس نے ماں کے سکون کی خاطر دودھ پینا شروع کر دیا تاکہ ماں آرام سے سو جائے۔

”تم انجینئر بن جاؤ گے..... اچھی نوکری مل جائے گی تو میں پہلی فرصت میں تمہاری بہنوں کو اپنے گھر کا کرنے کی کوشش کروں گی۔“ انہوں نے بیٹے کی ادھر ادھر پھیر بکھری کتابوں کو سمیٹ کر ایک جگہ رکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہیں امی۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔“ یرہاں سلی دیتے ہوئے بولا۔

”جوان لڑکی چھوٹی نہیں ہوتی، یہ بس ہماری ذمہ داری ہوتی ہے۔ بیٹی ذات جتنی جلدی اپنے گھر جائے اچھا ہوتا ہے۔“ صابرہ نے سمجھایا۔

”آپ پریشان نہ ہوا کریں امی۔ میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں۔“ اس نے یہ کہہ کر دودھ پیا اور گلاس ماں کو تھما دیا۔

بیٹے نے گرم دودھ پیا ماں کی روح میں ٹھنڈک اتر گئی۔ ”اللہ تم جیسی نیک اولاد سب کو دے، آمین ثم آمین۔“ صابرہ دعا دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

روما حسب معمول لیٹ آورز میں کائنات سے بات کر رہی تھی۔ برسوں کا معمول تھا دونوں سونے سے پہلے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ضرور بات کرتی تھیں۔

”گھر میں بڑی ٹینشن ہے کیا بتاؤں۔“ روما کہہ رہی تھی۔

”کوئی نئی بات کرو۔“ کائنات نے شرارت سے کہا۔

”میں سیریس ہوں کائنات، رابی آپا کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اماں ان کی شادی زبردستی کر رہی ہیں ایک اوور اتج بندے سے۔“ روما نے بہت دکھ بھرے لہجے میں اطلاع دی۔

”تو رابی آپا انکار کر دیں ناں۔ وہ کر سکتی ہیں تمہاری طرح ڈرپورک نہیں ہیں۔“ کائنات یہ دھماکا سن کر ذرا پریشان نہ ہوئی بڑے آرام سے حل بتا دیا۔

”اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“ روما نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے لوگوں کے دماغ ٹھیک کرتے کرتے تمہاری اماں کا دماغ الجھ گیا ہے۔ اگر وہ بندہ ننگ ہوتا تو ہم دونوں مل کر اس سے شادی کر لیتے۔“

”کیوں کر لیتے؟“ روما ہونق ہو گئی۔ کائنات کھلکھلا کر ہنس دی۔

”ارے بھی فرض کرو رابی آپا شادی سے انکار کر دے۔ تپ ہیں تو ہم دونوں مل کر اس بندے سے شادی کر لیتے..... آنٹی خوش ہو جاتیں۔ رابی آپا کی جان چھوٹ جاتی۔“

”بالکل احمق ہو تم۔ اماں کے سامنے بھی مذاق میں بھی ایسی بات نہ کرنا تم سے ملنے پر پابندی لگا دیں گی۔“ روما نے بڑے بزرگانہ انداز میں نصیحت کی۔

”ہائے..... میں تو تمہیں ملے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتی۔“ کائنات نے بڑے انداز سے کہا۔

”مجھے بھی بس ہر وقت تمہاری کمپنی چاہیے۔ میرا بس چلے تو ایک پل تم سے جدا نہ ہوں۔“ روما بہت پیار بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ باہر دروازے سے کان لگائے کسی نے اس کے یہ آخری جملے سن لیے ہیں۔

(باقی آئندہ)



کچی مٹی چمکے رائےبرک

شکیلہ رفیق

”بیٹا! کتنی بار میں نے تم سے کہا ہے کہ جھوٹ نہ بولا کرو، اب دیکھو تمہاری پیشانی پر لکھا ہوا آگیا ہے کہ یہ بچہ جھوٹا ہے۔“

”سچ امی؟“ آسیہ کے پیار سے سمجھانے پر وہ بولا۔

”ہاں، ہاں یہ دیکھو صاف لکھا ہے۔ چلو اب جلدی سے سچ بولو۔“ آسیہ نے پچکار کر کہا۔

”میں نے ہوم ورک نہیں کیا۔“ دانش نے سچ بول

دیا۔

میں زیادہ تر انگلیش پڑھائی جاتی ہے اور جو کچھ اور بھی پڑھایا جاتا ہے تو اسے بھی اذہان تک پہنچانے کا ذریعہ انگریزی ہی ہوتی ہے۔ اس لیے آئیے دانش کو گھر پر عربی اور اردو بھی پڑھایا کرتی تھی۔ اسے اپنی قومی زبان سے بے حد لگاؤ تھا اور نہ جانے وہ اس معاملے میں کیوں اتنی جذباتی تھی، اس کی یہی خواہش تھی کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ دانش اردو میں بھی ماہر ہو اور وہ اس دن کی شدت سے غمگین تھی جب دانش اردو کا کوئی لفظ خود بخود پڑھے۔ عزیز اس بات پر اس کا مذاق بھی اڑاتا کہ اس سلسلے میں آئیے بچوں کی طرح جلد باز ہے مگر وہ واقعی بچہ بنی ہوئی تھی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے جب

طریقے کہتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا کہ یہ ایسے دھبے ہیں جنہیں وہ جب چاہے دھو سکتا ہے اور آئیہ اس دن کی منتظر تھی جب یہ دھبے دھل جائیں اور عزیز صاف ستھری شخصیت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا جگمگا رہا ہو۔ ابتدا میں تو ان کی گفتگو کا موضوع یہی باتیں ہوتیں جو کبھی کبھی نئی اختیار کر جاتیں لیکن جب دانش پیدا ہوا تو آئیہ کی توجہ بٹ گئی اور پھر بعد میں تو اس نے عزیز سے اس موضوع پر بات ہی کرنا چھوڑ دی کہ وہ برہم ہو جاتا تھا اور اب چونکہ مصروفیت بھی زیادہ ہو گئی تھی لہذا وہ اپنا زیادہ وقت اور توجہ دانش پر صرف کرنے لگی اور اپنے نظریات اور خیالات کا عکس اس پر اتار کر دیتی کہ یہ مشکل بھی نہیں تھا۔ کچی مٹی سے جیسا چاہو برتن بنا لو البتہ بنی بنائی چیز کو توڑنا پڑتا ہے اور عزیز ٹوٹنے کو ہرگز تیار نہیں تھا لہذا اس نے اپنی توجہ اس نرم سوندھی کچی مٹی پر مرکوز کر دی تاکہ وقت پر ایک مکمل اور خوب صورت برتن تیار ہو سکے جو سب کی توجہ کا مرکز بن جائے اور خوب فائدہ مند بھی ہو۔

چونکہ ان کی مالی حیثیت بھی زیادہ مستحکم نہیں تھی لہذا کوئی ملازم نہ ہونے کے سبب تقریباً سارا کام آئیہ خود کرتی تھی پھر دانش کی پیدائش کے بعد تو وہ مشین کے مانند مصروف ہو گئی۔ وہ تو اس کی اچھی عادت پابندی و دقت کام آگئی ورنہ یہی کام جنہیں وہ خوش اسلوبی سے انجام دے لیتی تھی اس کے لیے عذاب بھی بن سکتے تھے مگر اس نے اپنے ہر کام کا وقت مقرر کر لیا تھا۔ اس لیے سہولت سے ہر کام مکمل ہو جاتا تھا۔ دانش کی آمد کے بعد اس نے اپنے کام کے اوقات تبدیل کر لیے تو شب و روز آسان بھی ہو گئے اور خوشگوار بھی لیکن مصروفیت بہر حال بڑھ گئی اور اس طرح وہ روز بھی آن پہنچا جب وہ دانش کی انگلی تھامے اسے اسکول میں داخلے کے لیے لے گئی۔ دانش اسکول جانے لگا۔ مائیموری اسکولوں

کی کوشش کرنے لگتی تب وہ رکھائی سے کہتا۔ آئیہ چپ ہو جاتی اور دل ہی دل میں سوچتی کہ کیا واقعی یہ غنیمت نہیں ہے کہ عزیز مجھ پر جبر نہیں کرتے بلکہ مجھے اپنے نظریات کے مطابق رہنے کی آزادی دی ہے۔ اگر وہ آمرانہ ذہنیت کے مالک ہوتے اور مجھے سونے کے پتھرے میں بند کر دیتے تب..... اس وقت میں کیا کرتی؟ کرتی میں کچھ بھی نہیں سکتی تھی یا اس کے حکم کی تعمیل کرتی یا پھر اسے چھوڑ دیتی۔ طلاق ہمارے معاشرے میں معیوب اور دشوار ہے لہذا اس کا کہنا ماننے ہی میں عافیت ہوتی، خواہ وہ سب کچھ میرے لیے ناپسندیدہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اس صورت حال میں یہ سب کچھ کیا بہتر نہیں ہے؟ وہ سوچتی..... سوچتی رہتی اور پھر خود ہی دل کو تسلی دے لیتی کہ وہ آہستہ آہستہ عزیز کو بھی اپنی راہ چلا لے گی اور اسے اپنی کامیابی کا یقین یوں بھی تھا کہ عزیز کی ایک دو باتیں ہی تو تھیں جو اسے ناپسند تھیں اور ایک دو بری عادتیں چھڑا دینا ناممکن تو نہیں تھا۔ شاید مشکل ضرور تھا مثلاً تنخواہ کم ہونے کے سبب عزیز برا نہیں سمجھتا تھا کہ کسی کا کام کر دے اور اس سے کمیشن کے طور پر دو چار سو روپے اس سے وصول کر لے جبکہ آئیہ اسے رشوت سمجھتی تھی۔ عزیز سے یہ بات دبے لفظوں میں کہی بھی تھی لیکن اس کے نزدیک یہ رشوت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس مہنگائی کے دور میں جب کام کرنے کی اجرت کم ملے گی تو اتنی رعایت تو ہونی چاہیے کہ اپنی ذہنی اور جسمانی محنت کے نتیجے میں مزید رقم کما سکے اور وہ اسے اپنی محنت کا صلہ کہتا تھا۔ آئیہ کو یہ عادت بے حد کھلتی مگر وہ ایسی ہی مجبور تھی جس طرح عزیز خود..... اسی طرح عزیز کی سگریٹ نوشی اور مہینہ پندرہ دن میں تاش کی بازی جمانا، یہ چند ایسی عادت تھیں جنہیں آئیہ عزیز کی شخصیت کے دھبے کہا کرتی تھی مگر عزیز اسے سمجھنے کے بعد سکون کے خوب صورت

”دیکھا سچ بولتے ہی جھوٹا لکھا ہوا غائب ہو گیا“ آئیہ نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔ ”سچ؟“ دانش نے پھر اسی ادا سے پوچھا اور آئیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دراصل چند منٹ قبل جب آئیہ نے اپنے پانچ سالہ بیٹے دانش سے پوچھا کہ اس نے ہوم ورک کر لیا ہے تب دانش کے اثبات میں سر ہلاتے ہی جھوٹ اس کی آنکھوں میں ٹوٹے تارے کی طرح چمک اٹھا اور آئیہ نے بہت خوب صورتی سے اسے سچ بولنے کی ترغیب دی۔ وہ دانش کو کم عمری سے ہی اچھے برے کی پہچان کراتی رہتی تھی جتنا اور جس طریقے سے اس کا ننھا ذہن قبول کر سکتا تھا اوہ اسے سمجھا دیا کرتی۔ خود اس کی پرورش بھی چونکہ ایسے ہی ماحول میں ہوئی تھی جہاں زندگی کو اپنے مذہب اور معاشرے کے اصولوں کے مطابق گزارنے پر ترجیح دی جاتی تھی لہذا اس کا ذہن بھی چمکتی دھوپ کی طرح روشن اور وسیع تھا۔ گوکہ اس طرح زندگی گزارنا بے حد دشوار تھا مگر اس کے باوجود اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اگر روز و شب دیانت داری سے گزریں تو بہتر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اچھائیوں اور برائیوں سے آگاہ کرنا اپنا فرض اولین سمجھتی تھی۔ اس کا شوہر عزیز بھی بہت اچھا تھا اور دونوں کی ازدواجی زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی عزیز سے کسی بات پر اختلاف بھی ہو جاتا۔ ”تمہاری مرضی تم جیسا چاہو کرو مگر مجھے مجبور نہ کیا کرو۔“ کیونکہ اس کے اصول عزیز کو اکثر سخت محسوس ہوتے اور وہ صاف کہہ دیتا۔ ”دیکھو آئیہ! تمہارے لیے یہ غنیمت نہیں ہے کہ میں تمہیں اپنے خیالات پر چلنے پر مجبور نہیں کرتا گوکہ میں ایسا کرنے کا حق رکھتا ہوں مگر نہیں کرتا لہذا بہتر یہی ہے کہ تم بھی مجھے مجبور نہ کرو اور جس زندگی کو ہم گزار رہے ہیں اسے تلخ نہ بناؤ۔“ جب آئیہ اسے زیادہ قابل کرنے

دنیا بھر میں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی مطبوعات

سپنس ڈائجسٹ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

منگوانے کیلئے ہمارے مقرر کردہ ایکسپورٹرز

ویلکم ٹریڈرز

سے رابطہ کریں

WELCOME TRADERS

189-E, Block-2, P.E.C.H.S, Karachi,

Pakistan

Tel: (92-21) 34545513, 34520214.

Fax (92-21) 3454885.

Cell # 0333-4315950

Email: zaidi@welcome.com.pk

Website: www.welcome.com.pk

کھولے تو دانش اردو فر فر پڑھتا نظر آئے مگر چونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اس لیے وقت کا انتظار تو لازمی تھا۔

جب سے دانش اسکول جانے لگا تھا اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید اسی سبب عزیز نے بھی اپنے کمیشن میں اضافہ کر لیا تھا مگر آسیہ کو اس بات کا ابھی علم نہیں ہوا تھا ورنہ وہ عزیز سے اس سلسلے میں ضرور بات کرتی۔ راز تو جب کھلا جب ایک روز یہ لوگ صدر میں گھوم رہے تھے۔ دانش کی آنکھیں کھلونوں کو دیکھ کر پھٹی ہوئی تھیں۔ عزیز اسے ایک دکان پر لے گیا اور اس وقت پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب دانش نے ایک بہت قیمتی کھلونا لینے کی ضد کی۔

”کیا قیمت ہے بھئی؟“ اس نے دکاندار سے یوں پوچھا جیسے صرف معلومات میں اضافہ ہی مطلوب ہو۔

”صرف پندرہ سو روپے۔“ دکاندار نے اطمینان سے کہا۔

”کیا پندرہ سو..... اور وہ بھی صرف؟“ اس کی بوکھا ہٹ دیکھ کر دکاندار مسکرایا پھر بولا۔

”جی جناب۔“ تب عزیز نے بے بسی سے آسیہ کو دیکھا۔

”وہ دیکھو کتنا پیارا بھالو ہے۔“ آسیہ نے دانش کو ایک اور کونے میں متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں بھالو مجھے گندا لگتا ہے۔“ دانش نے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

”اگلی دفعہ جب آئیں گے تو وہ جہاز بھی دلا دیں گے۔“ آسیہ نے سمجھایا مگر وہ مسلسل اسی جہاز کے لیے ضد کرتا رہا۔ تب عزیز نے آسیہ سے سرگوشی میں کہا۔

”یوں لگتا ہے کمیشن میں مزید اضافہ کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ آسیہ نے پوچھا اور پھر گھر آتے آتے اس نے آسیہ کو اس کا مطلب سمجھایا تو آج پھر بہت عرصے کے بعد ان میں تلخ کلامی ہو گئی۔

”میں نے تم سے کئی بار کہا ہے کہ میں قناعت پسند ہوں جو کچھ تم کماتے ہو اس میں نہیں خوش گزارہ کر لوں گی پھر تم کیوں..... آخر کیوں؟“

”قناعت کے معانی تمہیں معلوم ہیں نا؟“ عزیز نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر پوچھا۔

”ہاں بہت اچھی طرح۔“

”مگر دانش کو نہیں معلوم۔“ عزیز نے کہا تو آسیہ اس کا منہ تکتی رہ گئی تو وہ بولا۔

”آج دکان پر دانش کا منہ اترا ہوا دیکھ کر میرا کلیجا کٹ گیا۔ میں اتنا تہی داماں ہوں کہ اپنے بیٹے کی ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتا۔“ عزیز کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرائے۔

”تم جہی داماں نہیں ہو عزیز، تہی داماں تو وہ ہوتے ہیں جن کا دامن نیکیوں اور اچھائیوں سے خالی ہوتا ہے جو.....“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

”مجھے اس وقت تقریر کی نہیں پیسوں کی ضرورت ہے جس سے میں اپنے معصوم بچے کی خواہش پوری کر سکوں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر زچ ہوتے ہوئے انداز میں بولا۔ تب وہ خاموش ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بحث و مباحثہ اس خواہش کو ضد میں تبدیل کر دے گا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جہاز خریدنے کا یہ چھوٹا سا معاملہ عزیز کی انا کا مسئلہ بن جائے۔ اس لیے وہ خاموشی کو بہتر جانتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اب آسیہ کے خواب پورے ہونے والے تھے کہ دانش اب کوشش کر کے اردو کے الفاظ پڑھ لیتا تھا بشرطیکہ لفظ آسان ہو۔ لفظ پڑھ کر جب وہ معصومیت سے سوالیہ انداز میں آسیہ کی طرف دیکھتا تو وہ خوشی سے بے حال ہو کر بیٹے کو جوم لیتی اور منتظر ہوتی کہ

جب عزیز گھر آئے تو وہ اسے بھی بتائے۔ اگر عزیز گھر پر ہی ہوتا تو وہ دانش کی انگلی پکڑ کر بھاگتی ہوئی عزیز کے پاس جاتی اور اسے بھی اپنی خوشی میں شریک کرتی اور وہ بھی اسے خوب پیار کرتا۔ اسی پیار و لاء اور خوشگوار دنوں کے درمیان وہ تاریخ بھی آ پہنچی جب دانش پیدا ہوا تھا۔ عجب اتفاق تھا کہ دانش کی سالگرہ اور ان کی شادی کی تاریخ ایک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز وہ اپنی شادی کی خوشی بھی منالیتے تھے۔ بس تینوں اکیلے ہوتے اور جی بھر کر خوش ہوتے۔

مگر عزیز اس دہری خوشی کو اس بار زیادہ بہتر طریقے سے منانے کا خواہش مند تھا اور دانش کے ساتھ ساتھ آسیہ کو بھی کوئی اچھا سا تحفہ دینا چاہتا تھا اور یہ دونوں خواہشات پوری کرنے کی ایک ہی صورت تھی یعنی..... کمیشن!

عزیز میں ایک عادت بہر حال اچھی تھی کہ وہ اپنے ہر ارادے کو عملی جامہ پہناتے وقت جلد یا بدیر آسیہ کو اس میں ضرور شریک کرتا تھا اور کوئی کام بھی آسیہ سے چھپ کر کرنے کا قائل نہ تھا۔ اسی لیے جب اس نے آسیہ کو اپنی خواہش اور پھر اس کی تکمیل کے طریقے سے آگاہ کیا تو وہ بولی۔

”مجھے کسی تحفے کی ضرورت نہیں ہے عزیز البتہ دانش کے لیے آپ کچھ ضرور خریدیں مگر اس کے لیے بھی میں یہی کہوں گی کہ وہ آپ کی محنت کی کمائی کا تحفہ ہو تو کتنا اچھا ہو۔“

عزیز نے کوئی جواب نہ دیا غالباً اس خوشی کے موقع کو ناخوشگوار نہیں بنانا چاہتا تھا۔ چند روز ہی گزرے تھے جبکہ سالگرہ میں اب صرف تین روز باقی تھے کہ کوئی شخص عزیز سے ملنے اس کے گھر آیا، سخت سردی کا موسم تھا اور عزیز کوٹلوں کی انگلیٹھی کے پاس بیٹھا ہاتھ پاؤں سینک رہا تھا۔ ایسے موقع پر اجنبی کی آمد سخت کھنکھنے کے باوجود اسے اٹھ کر باہر جانا پڑا۔

کچی مٹی کے راہب

باہر جاتے وقت اس کی پیشانی پر جونا گواری کی لکیریں تھیں واپسی پر وہ خوشگوار لہروں میں بدل چکی تھیں، وہ مسکراتا ہوا آیا اور انگلیٹھی کے پاس بیٹھ کر ہاتھ میں دبے نوٹ گننے لگا۔

”کیا ہے یہ؟“ آسیہ اس کے نزدیک آ کر بولی مگر وہ نوٹ گنتار ہا اور سر اٹھا کر بولا۔

”پونے پانچ ہزار ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”کیسے پانچ ہزار اور کہاں سے آئے؟“ آسیہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ کر بولی۔

”بھئی دراصل یہ شخص صبح دفتر آیا تھا، ایک کام کروانا چاہتا تھا اور دو ہزار سے زیادہ دینے پر رضامند نہیں تھا، میں نے انکار کر دیا کیونکہ میرا مطالبہ پانچ کا تھا۔ آخر کو گھر پر رقم پہنچا گیا، ضرورت مند جو تھا۔ بس اب اس کا کام ہو جائے گا۔“ وہ بہت خوش تھا۔ آسیہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ انکار کیوں کر کرے؟ اپنی ناگواری کو کیسے بیان کرے؟ غم کے سبب آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ دانش اس اندھیرے میں جگنو بن کر دوڑتا ہوا آیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نظر عزیز کے پہلو میں رکھے نوٹوں پر پڑی اور اس نے ایک نوٹ اٹھالیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ آسیہ کا جی چاہا کہ چیخ کر دانش سے کہے کہ اس نوٹ کو ہاتھ نہ لگاؤ کہ یہ تمہارے چھونے کے لائق نہیں کہ اس سے پہلے دانش چیخ اٹھا۔

”ابو جی! ابو جی، دیکھیں میں نے اردو کا ایک جملہ پڑھ لیا۔“

”کیا پڑھا میرے بچے نے؟“ عزیز نے بڑھ کر پوچھا۔

”حصول رزق حلال.... عبادت ہے۔“ وہ رک رک کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ہیرے چمک رہے تھے اور عزیز نے اپنا سر جھکا لیا کہ اس کی آنکھوں کے آنسوؤں پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

ماہنامہ پاکیزہ

جنوری 2013

51

ماہنامہ پاکیزہ

جنوری 2013

50

کہیں ویں چلے کہیں دل

قیصر حیات

چوتھا حصہ



محسن رضانے اپنی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے یحییٰ کو ٹریس آؤٹ کر لے مگر کسی طرح بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہر رات سونے سے پہلے اپنے خفیہ بریف کیس میں سے یحییٰ کا موبائل نکال کر دیکھتا۔

اسے بار بار چھو کر اس کا لمس محسوس کرتا اور اس لمس کے احساس کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیسے اسے یحییٰ سے شدید محبت محسوس ہونے لگی تھی۔ صرف ایک ملاقات کے بدلے میں اس نے اپنا

”کیوں..... ناممکن ہے..... وہ جو تمہاری زندگی سے نکل چکی ہے کیا اس کے غم میں ساری زندگی گزارو گے؟“ نجمہ خفگی سے بولیں۔

”میں ہائر اسٹڈیز کے لیے آسٹریلیا جا رہا ہوں۔“ تو قیر نے گویا انہیں اپنا فیصلہ سنایا۔

”یہ..... یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو؟“ نجمہ یک دم حیرت سے چلاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے، چند روز تک کال آجائے گی۔“ تو قیر ٹھوس لہجے میں بولا۔

”اور تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔“ نجمہ قدرے خفگی سے بولیں۔

”آپ کو بتائے بغیر کیسے جاسکتا تھا ماما۔“ تو قیر ان کی خفگی کے پیش نظر فوراً بولا۔

”ٹھیک ہے، جانا چاہتے ہو تو جاؤ مگر شادی کر کے۔“ انہوں نے بھی گویا اپنا فیصلہ سنایا۔

”نہیں..... ماما! مجھے نہیں معلوم کہ میرا فیوچر کیا ہوگا اور مجھے وہاں ایڈجسٹ ہونے میں کتنے سال لگیں گے۔ میں شادی کر کے کسی اور کو خوار نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ قدرے جھنجھلا کر بولا۔

”تو قیر تم نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔

”ماما! جو باتیں اور فیصلے بعد میں اذیت کا باعث بنیں..... ان کی وجہ سے وقتی طور پر مشکل میں پڑ جانا زیادہ بہتر ہے۔“ تو قیر تاسف سے بولا تو نجمہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

☆☆☆

خدیجہ کی ٹانگوں میں بہت درد تھا۔ ردا ان کے پاس بیڈ پر بیٹھی ان کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھی۔ وہ بالکل خاموش چھت کو گھور رہی تھیں۔ ردا بار بار بارماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ماما! آپ کیوں اتنی خاموش رہنے لگی ہیں۔“

”یہ..... یہ ناممکن ہے۔“ تو قیر نے بری طرح چونک کر کہا۔

”کیا تم رورہے تھے؟“ نجمہ نے پریشان ہو کر اس کے قریب آ کر پوچھا۔

”ن..... نہیں۔“ تو قیر نے گھبرا کر کہا۔

”بائیں۔ شاید میں بھی ردا کے قابل نہیں۔“ تو قیر نے جھکتے چاند کی طرف دیکھ کر سوچا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ نجمہ اس کے کمرے کی طرف آئیں۔

اندھیرا دیکھ کر انہوں نے آگے بڑھ کر لائٹ جلائی تو تو قیر بری طرح ہڑبڑا گیا۔ اور جلدی سے اپنے ہاتھ سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔

”کیا تم رورہے تھے؟“ نجمہ نے پریشان ہو کر اس کے قریب آ کر پوچھا۔

”ن..... نہیں۔“ تو قیر نے گھبرا کر کہا۔

”سچ، سچ بتاؤ کیا بات ہے؟“ نجمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”بس یونہی..... آفس میں کام کا بوجھ ہے..... بس اسی کی تھکن ہے۔“ تو قیر نے بات بناتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! تھکاوٹ اور ڈپریشن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں، تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی ہوں کہ اس وقت تمہارے اندر کیا ہے، بولو، کون ہے وہ؟“ نجمہ نے یک دم بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہ جو بھی تھی، اب نہیں ہے۔“ تو قیر نے اصل بات کا اقرار کیا۔

”ٹھیک ہے اگر وہ تمہاری دسترس میں نہیں تو اس کا ذکر کرنا بیکار ہے مگر زندگی اس کی وجہ سے نہ تو ختم ہوگی اور نہ ہی بے سکون.....“ نجمہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ماما..... آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ تو قیر حیرت سے بولا۔

”رشنا کے پیپرز کے بعد اس کی سرال والے اس کے نکاح کی بات کرنے آرہے ہیں۔ ہو سکتا ہے جلد ہی اس کی رخصتی کرنا پڑے۔ تمہارے ڈیدی چاہتے ہیں کہ رشنا کے ساتھ تمہاری شادی بھی کر دی جائے۔“ نجمہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ..... یہ ناممکن ہے۔“ تو قیر نے بری طرح چونک کر کہا۔

”تم یوں مجھے اذیت میں ڈال رہی ہو.....“ محسن نے آہ بھر کر کہا۔

”اور کاش تم میری اذیت کو سمجھ بھی سکتے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”میں سب سمجھتا ہوں..... مگر مجبور ہوں۔“ وہ بولا۔

”اور میں بس ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم بے بس نہیں ہو۔“ محسن نے خفگی سے کہا۔

”اور..... مجبور تو تم بھی نہیں.....“ وہ بھی غصے سے بولی۔

”پلیز..... چلی جاؤ.....“ وہ اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولا۔

”جانے کے لیے ہی تو..... آئی ہوں.....“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”خدا حافظ! محسن نے جلدی سے کہا۔

”میں بھی ہمیشہ کے لیے یہی کہنے آئی ہوں۔“

اور طیبہ روتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کمرے کی لائٹ آف تھی اور تو قیر ایزی چیئر پر نیم دراز سگریٹ کے گہرے کش لگائے میں مصروف تھا۔ اس کی سوچیں ردا پر ہی انگی ہوئی تھیں، وہ تنہائی میں اپنے رب سے مجازی محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

”یا اللہ! کسی انسان کے دل میں کسی دوسرے انسان کے لیے محبت اور نفرت صرف تو ہی ڈالتی ہے۔ کیا میں اتنا برا انسان ہوں..... میری محبت اتنی ناقابل قبول کہ تو نے ردا کے دل میں اسے داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ اس کا دل میری محبت کو قبول ہی نہیں کر رہا۔“ اسی سوچ میں گم اب وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور پھر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگا۔

”چاند کو پانے کی تمنا میں ہم بے تاب تو رہے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم اس کے قابل ہیں بھی۔“

قیمتی جذبہ اس کے نام کر دیا تھا۔ اور وہ ملاقات بھی کتنی ادھوری ملاقات تھی..... بھلا ایسی ملاقات میں کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟ یہ تو اس کے دل کی نادانی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا مگر وہ کتنی بے وقوفی کر رہا تھا۔ ایک ہیولے سے..... اس کی یاد سے محبت کرتا چلا جا رہا تھا۔

طیبہ کا رشتہ اس کے دور کے رشتے داروں میں طے ہو گیا تھا۔ لڑکا سعودی عرب میں مقیم تھا۔ بی اے پاس تھا اور کسی کنسرکشن کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ خالہ صابرہ تو بے حد خوش تھیں کہ اچانک اتنا اچھا رشتہ آیا اور تمام معاملات طے بھی ہو گئے۔

☆☆☆

منگنی کی رسم کے بعد طیبہ، محسن کے پاس آ کر بہت روئی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تم میرا نصیب نہیں تھیں..... جس کا نصیب تھیں وہ تمہیں مل گیا۔“ محسن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اور جو مل کر بھی نہ ملے تو..... اسے تم کیا کہو گے؟“ طیبہ نے روتے ہوئے پوچھا تو محسن رضا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ محسن نے چونک کر پوچھا۔

”تمہارا دل مجھے قبول نہیں کرتا..... اور اب میرا دل کسی اور کو قبول نہیں کر رہا..... یہ منگنی میں نے اماں کی بے بسی اور گھر کی غربت دیکھ کر کی ہے۔“ طیبہ نے آہ بھر کر کہا۔

”پلیز..... تم اپنی سوچ کو بدلو..... ورنہ.....“ محسن ہونٹ چبانے لگا۔

”ورنہ کیا ہوگا.....؟“ طیبہ نے سوال کیا۔

”ورنہ..... زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔“ وہ آہستہ آواز میں بولا۔

”زندگی تو پہلے ہی مشکل ہو گئی ہے۔ اب مزید اور کیا ہوگی؟“ طیبہ نے جواب دیا۔

ماہنامہ پاکیزہ 54 جنوری 2013

ماہنامہ پاکیزہ 55 جنوری 2013

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ہیلو..... اوہ..... تم؟“ ردا نے مسکرا کر کہا اور وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تو حاتم کو شک سا ہوا۔ ردا بات کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی حاتم بھی کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے دروازے کے باہر جا کھڑا ہوا۔

”اوہ..... ریکی، اتنا بڑا سر پرانز..... لگتا ہے تم نے پہلے سے پلان کر رکھا تھا۔“ ردا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”نہیں یار، مجھے تو خود بھی پتا چلا ہے اور فراز بھی اتنا گھٹا نکلا کہ مجھے کچھ بتایا تک نہیں۔“ دوسری طرف سے رشنا تھی۔

”اچھا تو تم کب ہماری جان چھوڑ رہی ہو؟“ ردا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت جلد.....“ رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”رشنا تمہارے جانے کے بعد میں بہت اکیلی ہو جاؤں گی۔ تمہیں بہت مس کروں گی۔“ ردا ایک دم افسردگی سے بولی تو حاتم نے اس کی بات سن کر گہری سانس لی۔

”اوہ..... اچھا یہ رشنا سے بات کر رہی ہے، میں ردا کے بارے میں کیوں اتنا مشکوک ہو رہا ہوں اور ویسے بھی اب کئی روز سے کوئی ایسا مسج بھی نہیں آیا۔ مجھے اپنی بہن پر مکمل اعتبار کرنا چاہیے۔“ حاتم نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا اور وہاں سے چلا گیا۔

”میرے جانے سے ماما بھی بہت اکیلی ہو جائیں گی کیونکہ تو قیر بھائی بھی آسٹریلیا جا رہے ہیں۔“ رشنا افسردگی سے بولی۔

”کیوں...؟“ ردا نے ایک دم چونک کر پوچھا۔ ”شاید ہائز اسٹڈیز کے لیے لیکن ردا آج کل

وہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہیں۔ ان کے چہرے پر عجیب سی اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ نہ کسی سے بات کرتے ہیں بس ہر وقت سوچوں میں گم رہتے ہیں۔ نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔“ رشنا بھائی

”مگر..... ماما! اتنی جلدی، ابھی تو میرا گریجویشن بھی کمپلیٹ نہیں ہوا، رزلٹ کا انتظار ہے اور.....“ رشنا حیرت سے بولی۔

”وہ بھی ہو جائے گا۔ اور بیٹا سال دو سال بعد بھی شادی تو کرنی ہے نا پھر ابھی کیوں نہیں۔“ نجمہ نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن آپ کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جاؤں یا تو پھر آپ تو قیر بھائی کی بھی شادی کر دیں۔“ رشنا نے ماں کے ساتھ لپٹ کر کہا۔

”وہ تو آسٹریلیا جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”کیا..... آسٹریلیا..... مگر کیوں؟“ ذہ حیرت سے چونک کر بولی۔

”پڑھنے کے لیے۔“ نجمہ نے کہا۔ ”اور آپ نے اجازت دے دی۔“ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”وہ فیصلہ کر چکا ہے۔“ نجمہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی ہے، میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں، ہم دونوں چلے گئے تو آپ یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔“ رشنا خفگی سے بولی۔

”اللہ مالک ہے۔“ نجمہ آہ بھر کر بولیں۔ ”نہیں..... ماما! ایسے نہیں چلے گا۔“ رشنا تیزی سے بولی۔

”بس آپ انہیں روکیں۔“ ”کوشش کر چکی ہوں۔“ وہ ہمت ہار کر بولیں۔ ”ٹھیک ہے پھر میں ہی کچھ کرتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

حاتم لاؤنج میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر بڑی تھا اور ردا پاس بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ٹیبل پر پڑا ردا کا موبائل بجنے لگا تو حاتم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مگر..... ماما! اتنی جلدی، ابھی تو میرا گریجویشن بھی کمپلیٹ نہیں ہوا، رزلٹ کا انتظار ہے اور.....“ رشنا حیرت سے بولی۔

”وہ بھی ہو جائے گا۔ اور بیٹا سال دو سال بعد بھی شادی تو کرنی ہے نا پھر ابھی کیوں نہیں۔“ نجمہ نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن آپ کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جاؤں یا تو پھر آپ تو قیر بھائی کی بھی شادی کر دیں۔“ رشنا نے ماں کے ساتھ لپٹ کر کہا۔

”وہ تو آسٹریلیا جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”کیا..... آسٹریلیا..... مگر کیوں؟“ ذہ حیرت سے چونک کر بولی۔

”پڑھنے کے لیے۔“ نجمہ نے کہا۔

”اور آپ نے اجازت دے دی۔“ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”وہ فیصلہ کر چکا ہے۔“ نجمہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی ہے، میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں، ہم دونوں چلے گئے تو آپ یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔“ رشنا خفگی سے بولی۔

”اللہ مالک ہے۔“ نجمہ آہ بھر کر بولیں۔

”نہیں..... ماما! ایسے نہیں چلے گا۔“ رشنا تیزی سے بولی۔

”بس آپ انہیں روکیں۔“

”کوشش کر چکی ہوں۔“ وہ ہمت ہار کر بولیں۔

”ٹھیک ہے پھر میں ہی کچھ کرتی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

حاتم لاؤنج میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر بڑی تھا اور ردا پاس بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ٹیبل پر پڑا ردا کا موبائل بجنے لگا تو حاتم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”سجھتیں۔“ شمیمہ نے مسکرا کر ان کے گلے میں یا نہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ارے..... تم تو میری پیاری سی بیٹی بھی ہو اور بہو بھی۔“ خدیجہ نے خوش ہو کر اس کی پیشانی

چومتے ہوئے کہا تو ردا نے حیرت سے شمیمہ کی طرف دیکھا اور پھر زبردستی مسکرانے لگی..... خدیجہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

رشنا واش روم سے منہ دھو کر اپنے چہرے کو ٹاول سے صاف کرتے ہوئے کمرے میں آئی.....

اور اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اچھی طرح دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ابھی لوشن پکڑ کر وہ چہرے پر لگا رہی تھی کہ نجمہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”ماما! آپ.....؟“ رشنا نے مسکرا کر ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... تمہیں بتانے آئی ہوں کہ آج شام تمہاری سسرال والے آرہے ہیں۔“ نجمہ نے مسکرا کر اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ بھی تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس کرنے۔“ نجمہ نے اسے آگاہ کیا۔

”کیا میری شادی.....؟ لیکن فراز نے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔“ وہ لوشن لگاتے ہوئے رک کر حیرت سے کہنے لگی۔

”وہ تمہیں سر پرانز دینا چاہ رہا ہوگا۔“ ماما مسکرا کر بولیں۔

”ٹھہریں..... میں ابھی اس سے پوچھتی ہوں..... یہ کیا ڈراما ہے۔“ رشنا خفگی کے سے انداز میں بولی۔

”بیٹا! یہ ڈراما نہیں حقیقت ہے۔ تمہارے ڈاکو منسٹس..... تیار کرنے کے لیے نکاح ضروری ہے۔ اس میں خفگی کی کیا بات ہے۔“ نجمہ نے موبائل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

”ارے نہیں، نہیں بیٹا..... نئی نوپلی دہن سے اب میں ٹانگیں دبواتی اچھی نہیں لگتی۔“ انہوں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں

کے لیے واقعی پریشان تھی۔

”تم نے ان سے کچھ پوچھا نہیں؟“ ردا ایک دم بوکھلا کر بولی۔

”نہیں..... انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہو جاتی ہوں پھر کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں رہتی۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”پلیز رشنا! حوصلہ کرو اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرو..... بلکہ میں تو کہتی ہوں، آسٹرلیا جانے سے پہلے ان کی زبردستی کسی سے شادی کرا دو۔“ ردا نے اپنی رائے دی۔

”یار! ہمارے ماموں کی بیٹی جو یہ ان میں بہت انٹرسٹڈ ہے مگر تو قیر بھائی مانیں تب ناں..... نہ جانے کس کج بخت سے دل لگا بیٹھے۔ جس نے ان کو گھاس نہیں ڈالی..... مگر یہ اس کے غم میں بری طرح بے تاب ہیں۔ دیس نکالا لے رہے ہیں اور جو ان کی حالت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اپنی جان کو ہی کوئی روگ نہ لگا بیٹھیں۔“ رشنا نے ایک آہ بھر کر تفصیل سے بتایا۔

”اللہ نہ کرے.....“ ردا کے منہ سے نادانستہ نکلا تو رشنا چونک پڑی۔

”تمہارے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے تم پر پیار آنے لگا ہے کہ تم میرے بھائی سے میری طرح ہی پیار کرتی ہو۔ محبت کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ ایک سے محبت ہوتی ہے تو اس سے وابستہ سب رشتوں سے پیار ہونے لگتا ہے۔ میری وجہ سے تم تو قیر بھائی کو بھی چاہنے لگی ہو۔“ رشنا نے مسکرا کر کہا تو ردا بوکھلا گئی اور بہانہ بنا کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

فہام آفس سے لوٹا اور اپنے کمرے میں تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر نیم دراز چھت کو گھور رہا تھا۔ شمیم ٹرے میں چائے کے کپ اور پانی کا گلاس رکھ کر لائی اور مسکرا کر اس کے قریب ٹیبل پر رکھا۔

”ارے..... تم کیوں چائے لائیں زاہدہ کہاں

ہے؟“ فہام نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب آپ کے سب کام میں کیا کروں گی۔“ شمیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں.....؟“ وہ چونک کر بولا۔

”بس مجھے آپ کے کام کر کے خوشی جو ہوتی ہے۔“ شمیم نے مسکرا کر محبت سے کہا۔

”آج ممہا کی طبیعت کیسی رہی..... میں ان کے روم میں گیا تو وہ سو رہی تھیں۔“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آج میں سارا دن انہی کے پاس رہی ہوں۔ پہلے سوپ بنا کر دیا پھر ٹائلیں دباتی رہی۔“ شمیم نے مسکرا کر جلدی سے کہا۔

”ریلی.....“ فہام خوش ہو کر بولا۔

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے بھلا؟“ شمیم چونک کر بولی۔

”میں بس یہی چاہتا ہوں کہ تم انہیں خوش رکھو اور ان کی خدمت کرو۔“ فہام نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ کہنے کی بات ہے..... وہ میری خالہ بھی ہیں جناب اور مجھے ان سے بہت محبت ہے۔“ شمیم مصنوعی حلق سے بولی۔

”بس پہلے روز جو بد مزگی ہوئی اس کی وجہ سے سب کے دل پریشان ہو گئے۔“ فہام نے گہری سانس لے کر پانی پیتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری..... بس مجھ سے غلطی ہو گئی تھی.....“ شمیم منہ بنا کر افسردگی سے کہنے لگی۔

”اچھا ہے تم نے جلد ہی اپنی غلطی کو مان لیا۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو شمیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ فہام کا موبائل بجنے لگا تو وہ بات کرتے ہوئے کھڑکی کے پاس چلا گیا۔

”غلطی.....؟“ شمیم نے منہ بناتے ہوئے سوچا۔ ”جس دن میں نے تمہیں پالیا تو پھر بتاؤں گی

کہ کون ٹھیک ہے اور کون غلطی پر۔“ شمیم نے طنزیہ انداز میں فہام کو دیکھ کر سوچا۔

☆☆☆

ردا تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آئی تو شمیم لالچ میں صوفے پر بیٹھی دیکھنے میں مصروف تھی۔ خدیجہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔

”ممہا آپ کو پتا ہے رشنا کی شادی ہو رہی ہے اور مجھے اس کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا ہے۔“ ردا نے ماں کے قریب آ کر جلدی سے کہا۔

”ہاں تو چلی جاؤ بلکہ یوں کرتی ہوں، میں بھی چلتی ہوں۔ اس کی ممہا کو مبارک دے آتی ہوں.....“

آج طبیعت کچھ ٹھیک لگ رہی ہے۔“ خدیجہ نے کہا تبھی فہام فیکٹری جانے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے نکلا تھا۔

”ارے واہ..... آج تو میری سوئٹ ڈول بہت کیوٹ لگ رہی ہے۔“ فہام نے مسکرا کر ردا کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو شمیم نے دونوں کو اس طرح دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

”فہام بھائی..... رشنا کی شادی ہو رہی ہے۔ میں اس کی طرف جا رہی ہوں۔ آج ہم دونوں کا شاپنگ کا ارادہ ہے۔“ ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”رشنا کی شادی ہو رہی ہے، تم نے بتایا ہی نہیں..... چلو اس کی چوائس کے اچھے، اچھے کفٹس لے لینا۔ وہ ہمیں تمہاری طرح ہی عزیز ہے۔“ فہام نے مسکرا کر کہا اور اپنی جیب سے والٹ نکالا اور اس میں سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر ردا کو دینے لگا۔

”یہ رکھو اور اگر کم ہوں گے تو مجھے بتا دینا.....“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا تو شمیم نے گھور کر دونوں کو دیکھا۔

”نہیں..... نہیں، فہام بھائی میرے پاس پیسے ہیں۔“ ردا مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں کئی روز سے آپ کی طرف آنا چاہ رہی

کھیں جیب طے کھیں دل

”وہ تو ہیں لیکن یہ میری طرف سے..... رکھو شاپاش۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو ردا نے مسکراتے ہوئے انہیں اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

”آؤ میں، تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ فہام نے جاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں میں ممہا کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ ردا جلدی سے بولی۔

”تو شمیم کو بھی ساتھ لے جاؤ۔“ فہام نے مسکراتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھ کر کہا تو شمیم نے پھر دونوں کو حلق سے دیکھا۔

”ہاں، ہاں..... شمیم آپ بھی چلیں۔ بہت مزہ آئے گا۔“ ردا نے مسکرا کر شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں، تم اور خالہ جان جاؤ۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، سر میں درد ہے، میں پھر کبھی چلی جاؤں گی۔“ شمیم نے اس کے قریب آ کر زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ فہام نے پریشانی سے پوچھا۔

”سر میں درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا ابھی ٹیبلٹ لے کر ریسٹ کرتی ہوں۔“ شمیم نے منہ بنا کر کہا۔

”اوکے، اپنا خیال رکھنا اور اگر کوئی پر اہم ہو تو فون کر دینا..... اچھا بھئی خدا حافظ۔“ فہام نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

خدیجہ، نجمہ کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ٹیبل پر چائے کے ساتھ بہت سے لوازمات رکھے تھے اور نجمہ بہت محبت سے پلیٹیں اٹھا اٹھا کر ان کے آگے کر رہی تھیں مگر خدیجہ مسکرا کر انکار کیے جا رہی تھیں۔

”میں کئی روز سے آپ کی طرف آنا چاہ رہی

گئی کہاں تو آپ بتیوں جگ بتیوں کے مثال مجموعہ

سرگزشت

ماہنامہ

جنوری 2013ء

کی جھلکیاں

سمندر کے مکین

ایک حیرت انگیز اطوار کے حامل قبیلے کا تذکرہ

زور آور

عشق میں ڈوبے پہلوان کی دلچسپ سرگزشت

سینٹی

امریکا میں آئے طوفان کی حقیقت کا پر لطف جائزہ

میں زخم زخم ہوں

عبرت بھری سچ بیانی کہ اسے اپنوں نے ہی زخم دیا

الکاحیہ

فلمی الف لیلہ، سراب اور دنیا بھر

سے سچے واقعات دلچسپ رودادیں

ہر شمارہ خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

ہوں۔ رشنا میری طبیعت خراب ہو رہی ہے..... سر میں درد ہونے لگا ہے۔ پتا نہیں ایک دم سے کیا ہونے لگا ہے۔“ رونا نے کچھ پریشانی کے عالم میں اٹھتے ہوئے کہا۔

”لیکن ردا.....“ رشنا نے شدید حیرت سے کہا۔
”آئی ایم سوری..... پلیز۔“ رونا نے معذرت کی۔
”اوکے.....“ رشنا نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلیں ماما.....“ رونا نے کہا اور خدیجہ کے ساتھ وہاں سے چلی آئی۔

☆☆☆

حسن کی رگ و پے میں ایک درد سا ٹھہر گیا تھا۔ طبیعت کی بے بسی، اس کی ناکام محبت کا قلق، اس کی برستی آنکھیں، اس کا ٹوٹا دل، اس کے کرچی کرچی ہوتے جذبات نے اس کے دل میں درد کی ایسی ٹیسیں پیدا کر دی تھیں کہ وہ خود بھی بے بس ہو کر مایہ بے آب کی طرح تڑپنے لگا..... طبیعت کی محبت نے اس کے دل کو اس درد سے آشنا کر دیا تھا۔ یہ محبت کتنا زلاتی ہے، کتنا دکھ دیتی ہے، کیسے کیسے تڑپاتی ہے، دل کو چھلانی اور روح کو کچھو کچھو کے لگاتی ہے۔

”بیمنی کاش، تم مجھے نہ ملی ہو تیں..... اگر ملی تھیں تو یوں گم نہ ہوئی ہو تیں۔ میں تمہیں کہاں تلاش کروں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تم مجھے ملو تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دو۔ کہیں تم بھی مجھے یونہی انکار نہ کر دو جیسے آج میں نے طبیعت کو کیا ہے۔“ اس کے دل میں دوسو سے پیدا ہونے لگے۔

”ایسا نہیں ہوگا۔ میری محبت اتنی کمزور نہیں ہو سکتی۔“ اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔

”اگر وہ اس وقت ملے جب وہ کسی اور کی ہو چکی ہو تو پھر..... تم کیا کرو گے؟“ اس کے دل نے سوال کیا۔

”نہیں..... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ مضطرب

”وہ آسٹریلیا جا رہا ہے۔“ نجمہ نے انہیں بتایا۔
”ارے..... تو آپ اسے شادی کر کے بھیج دیں، وہاں جا کر اگر کسی میم سے شادی کر لی تو پھر ساری زندگی اس کی شکل کو ہی ترسیں گی۔ میں تو کہتی ہوں اگر کوئی لڑکی نظر میں ہے تو فوراً اس کی بھی شادی کر دیں۔“ خدیجہ نے انہیں اپنی طرف سے مخلصانہ مشورہ دیا۔
”ارے..... میری تو اپنی بیٹی گھر میں موجود ہے مگر تو قیر شادی کے لیے ہی نہیں مان رہا، کہتا ہے وہاں جا کر کیا حالات ہوں، وہ کیوں اسے بھی پریشان کرے۔“ نجمہ نے ان کی بات پر بتایا۔
”ہاں، کہتا تو وہ ٹھیک ہے..... بچہ تو آپ کا کافی سمجھدار ہے۔“ نجمہ نے کہا۔

”ہاں..... نہ جانے کس منحوس کی اس کو نظر لگ گئی ہے کہ وہ تو شادی کے لیے ہی نہیں رہا۔“ نجمہ آہ بھر کر بولیں تو رونا نے ایک دم چونک کر انہیں دیکھا۔
”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ خدیجہ آہ بھر کر بولیں۔

”معلوم نہیں..... اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن جس نے بھی اس کے ساتھ برا کیا ہے میں اسے بد دعا دیتی ہوں کہ وہ بھی کبھی سکون سے نہ رہے۔“ نجمہ کے یہ کہنے پر ردا ایک دم بوکھلا گئی اس کے چہرے پر ایک دم پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

”آئی ایم سوری ردا تمہیں انتظار کرنا پڑا۔“ رشنا تیار ہو کر آئی اور اس نے ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ رونا نے زبردستی مسکرا کر کہا۔
”اوہ..... آج تو آئی بھی آئی ہوئی ہیں۔“ رشنا نے خدیجہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں گلے ملنے لگیں۔

”ہمیشہ خوش رہو۔ تمہاری مبارک دینے آئی ہوں۔ اچھا اب تم لوگ جاؤ، مجھے جانا ہوگا تو ڈرائیور کو بلا لوں گی۔“ خدیجہ بیٹی کی طرف دیکھ کر بولیں۔
”نہیں ماما..... میں آپ کے ساتھ ہی چلتی

تھی کہ آپ اور رشنا کا شکریہ ادا کر کے آؤں۔ رشنا نے فہام کی شادی میں ردا کے ساتھ بہت کام کیا۔“ انہوں نے نجمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
”ارے شکریے کی کوئی بات نہیں..... دونوں بہنوں کی طرح ہیں۔“ نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”اب ماشاء اللہ رشنا کی بھی شادی ہو رہی ہے۔ بہت مبارک ہو آپ کو۔“ خدیجہ نے دل سے مبارک باد دی۔

”جی..... بہت شکریہ، بس جلدی میں رکھنا پڑی۔“ نجمہ مسکراتے ہوئے بولیں۔
”آئی، رشنا کہا ہے؟ آج ہمارا شاپنگ کا پروگرام ہے۔“ رونا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
”واش روم میں ہے..... بس تیار ہو کر ابھی آتی ہے۔ وہ بھی ناراض ہو رہی تھی کہ میں اس کی اتنی جلدی شادی کیوں کر رہی ہوں لیکن ڈاکو میٹس کا مسئلہ ہے، فراز بس ایک ایک کے لیے پاکستان آ رہا ہے۔“ نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر تو واقعی آپ کو بہت جلدی میں تیاری کرنا پڑ رہی ہے۔“ خدیجہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔
”ہاں، بس کر رہی ہوں۔ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے..... اتنی دور چلی جائے گی میری بیٹی..... یہ سوچ کر دیکھی ہو جاتی ہوں۔“ نجمہ نے ایک دم ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

”رشنا! شادی کے بعد انشاء اللہ کینیڈا چلی جائے گی پھر تو آپ بہت تنہا ہو جائیں گی۔“ خدیجہ نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

”ہاں، سوچا تھا کہ رشنا کے ساتھ تو قیر کی شادی کر دوں گی کہ رشنا کی کمی محسوس نہیں ہوگی مگر اب تو قیر ہے کہ شادی کے لیے مان ہی نہیں رہا۔“ نجمہ نے مایوسی سے کہا۔

”کیوں.....؟“ خدیجہ ایک دم چونک کر پوچھنے لگیں۔

ہو کر اٹھا۔

”ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ اس نے تم سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا۔“ دل نے پھر سوال کیا۔

”اے خدا! ایسا کچھ نہ کرنا..... ورنہ میں مرجاؤں گا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ادھر طیبہ اس کے چھن جانے پر رو رہی تھی۔ اور وہ کس لیے رو رہا تھا اس کے نہ ملنے پر..... نہ چھنے پر..... وہ تو شاید محبت کی متوقع ناکامی پر رو رہا تھا اس کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کے دل کی کسک میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

☆☆☆

طیبہ شادی کے بعد سعودی عرب چلی گئی تھی۔ منگنی کے بعد وہ کبھی حسن رضا کے گھر نہیں آئی۔ حسن رضا نے ایم بی اے میں ٹاپ کیا تھا اور اس نے ہائر اسٹڈیز کے لیے انگلینڈ کا ویزا پلائی کیا ہوا تھا۔ اسے اسکا لرشپ پر باہر بھیجا جا رہا تھا اور اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ سمیرا نے بھی میٹرک کر لیا تھا اور اب وہ کالج جاتی تھی۔ حسن اور احسن نویں، دسویں میں تھے۔ حسن جہاں خوش تھا وہاں ہر وقت اسے یہی فکر کھائے جاتی تھی کہ بچوں کے پاس کس کو چھوڑے۔ دن رات اسی ٹینشن میں گزر رہے تھے۔ کبھی وہ سب کو ہاسٹل میں داخل کرانے کا سوچتا..... تو کبھی باہر جا کر پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیتا۔ مگر ایسا سنہری موقع روز روز نہیں ملتا، وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھا کہ جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے گا تو اچھی نوکریوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور اس کے بہن بھائی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے مگر مسئلہ بچوں کی سرپرستی کا تھا۔ خالہ صابرہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں مگر کسی غیر کے سہارے وہ انہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ کوئی سبیل نظر نہیں آرہی تھی وہ رات رات بھر جاگتا رہتا..... اور اسی سوچ میں گم رہتا۔

چھٹی کے دن وہ صبح سویرے فجر کی نماز کے لیے اٹھا تو اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے حیرت سے موبائل دیکھا۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا اور بات کرنے لگا۔

”اوہ..... نو.....“ وہ بے ساختہ بولا اور موبائل آف کر کے پریشانی سے سمیرا، حسن اور احسن کو اٹھایا۔ ”پچھو حلیمہ کے شو ہر فوٹ ہو گئے ہیں۔ جلدی اٹھو..... ہم سب کو حیدر آباد جانا ہے۔“ حسن نے بہن بھائیوں کو جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی تیار ہونے لگے۔

کفن، دفن کے بعد حسن پچھو حلیمہ کے پاس بیٹھ کر تعزیت کرنے لگا۔ پچھو حلیمہ شوہر کی خدمت کر کے کافی کمزور اور بوڑھی ہو چکی تھیں۔ وہ ایک عرصے سے بیمار تھے۔

”پچھو آپ میرے ساتھ کراچی چلیں..... اب یہاں کس کے سہارے بیٹھی رہیں گی۔“ حسن نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”مگر عدت تو مجھے یہیں کرنا ہوگی۔“ پچھو حلیمہ جانے پر رضامند ہو گئیں مگر عدت کا مسئلہ تھا۔

”پچھو! مجبوری ہے، میں انگلینڈ پڑھنے جا رہا ہوں۔ گھر میں سمیرا، حسن اور احسن اکیلے ہیں۔ آپ ان کے پاس رہیں گی تو میں مطمئن ہو کر جاسکوں گا۔ آپ کراچی چل کر عدت پوری کر لیں۔ اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں۔“ حلیمہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”ٹھیک ہے..... جیسا تم کہتے ہو..... اب ایک تم ہی تو میرا آسرا ہو..... سسرال میں کوئی ہے اور نہ میکے میں جو میرا سہارا بنے۔“ وہ روتے ہوئے بولیں۔

”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی ماں سمجھا ہے۔ ہم چاروں آپ کے بچوں کی طرح ہیں، بس آپ چلنے کی تیاری کریں۔ اگر پچھو پا زندہ ہوتے تو شاید میں بھی آپ کو ساتھ

چلنے کو نہ کہتا..... مگر..... اب نہ تو میں آپ کو اکیلا چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہم آپ کے بغیر رہ سکتے ہیں۔“ حسن نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ رونے لگیں اور اسے دعائیں دینے لگیں۔

پچھو حلیمہ کے گھر میں آنے سے اس کی بہت بڑی ٹینشن ختم ہو گئی تھی۔ اسے قدرت کی منصوبہ بندی پر رشک آنے لگا۔ وہ انسان کی سوچوں سے بالافصلے کرتا ہے۔

پچھو حلیمہ کے گھر میں آنے سے گھر کے کسی حد تک مکمل ہونے کا احساس نمایاں ہو گیا تھا۔ انہوں نے سمیرا کی ساری ذمے داریاں خود اٹھالی تھیں۔ حسن ان کی صحت کا خاص خیال رکھتا، ان کا میڈیکل چیک اپ بھی کروایا۔ اس نے پس انداز کی ہوئی رقم میں سے کچھ پچھو کو اخراجات کے لیے دی اور کچھ اپنے لیے رکھی۔

زندگی کیسے رخ بدلتی ہے، انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے، اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی قسمت کا ستارہ اسے کہاں سے کہاں لے جائے گا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی انگلینڈ جانے کا نہیں سوچا تھا اور قدرت اسے کہاں پہنچانے والی تھی اور خود بخود اس کے راستے کی الجھنیں اور رکاوٹیں دور ہو رہی تھیں۔ وہ جہاز میں بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا اور حیرانی سے زمین و آسمان کے درمیان پرواز کرتے جہاز کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یمنی بہت یاد آرہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اچانک وہ اس کے ساتھ کہیں سے آکر بیٹھ گئی تھی اور اس کے ساتھ سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وہ اسپتال میں یمنی سے ملاقات اور باتوں کا ایک، ایک لمحہ یاد کر رہا تھا۔ اس کا مسکرانا، اسے تسلی دینا، اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنا، اس کے بہن بھائیوں کو تسلی دینا، اسپتال کے ڈیوڑینا اور اس کی ہمت افزا باتیں۔

کھیں دیب۔ جلے کھیں دل

”پلیز..... بی..... اسٹرونگ اینڈ بریو۔ آپ اپنے بہن بھائیوں کے لیے جتنی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس ریلی امیزنگ..... آپ ہمت نہ ہاریں، جو دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں اور ان کے لیے کوشش کرتے ہیں ان کو ہمیشہ اسٹرونگ ہونا چاہیے۔“ وہ اس کی باتوں کو بار بار دہراتا رہا۔ اس کی باتوں سے حوصلہ پاتا رہا۔ اپنی غم آنکھوں سے اس کو تازہ کرتا رہا۔

”کاش! تمہیں کبھی معلوم ہو سکے کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں، تم سے کتنی محبت کرتا ہوں اور تمہیں کتنا یاد کرتا ہوں..... کاش میں کسی طرح تمہیں بتا سکتا.....“ وہ آہ بھر کر سوچنے لگا۔

وہ محبت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جو یک طرفہ ہوتی ہے۔ جس میں دوسرے کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے لیے کیسے جذبات رکھتا ہے۔ اسے کتنا چاہتا ہے اور وہ اپنی جلائی ہوئی آگ میں لمحہ بہ لمحہ خود ہی سلگتا رہتا ہے۔ خود ہی تڑپتا رہتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔

”معلوم نہیں..... ہم تم..... کبھی مل پائیں گے بھی یا..... نہیں اگر پروردگار ملانے پر آئے تو کائنات کی کوئی قوت تمہیں مجھ سے ملنے پر روک نہیں سکتی۔ اے میرے رب میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا..... سوائے اپنی محبت کے..... اپنی چاہت کے..... میری محبت کو مجھ سے ملا دے۔“ اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کی دعا کی سنجیدگی اور خلوص پر مہر ثبت کرنے لگے۔

☆☆☆

یمنی صحت یاب ہو کر اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہو گئی تھی اور جمال صاحب کے لیے یہ بات انتہائی خوشی کی تھی۔ اس کی صحت یابی کے سلسلے میں انہوں نے غریبوں میں کھانا تقسیم کیا۔ خیرات کی، دوست احباب کو پارٹی دی لیکن یمنی کے لیے بیماری

دیکھا۔ ٹائنا اور فضلہ بھی اس کی بے ہودہ گفتگو سن کر حیران رہ گئیں۔

”اگر..... تم کہتے ہو تو چگاڈو کو مار بھگاتے ہیں مگر اب ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔“ دوسرے لڑکے نے جواب دیا۔

”اور اگر چگاڈو نے تمہارے سینے کے ساتھ چمٹ کر تمہارا خون چوس لیا تو تم وہیں مر جاؤ گے۔“ پہلے لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔ یمنی کو انتہائی غصہ آیا اور کھانا وہیں چھوڑ کر وہ لڑکوں کی طرف گئی اور پہلے لڑکے کو تڑاخ سے زوردار تھپڑ لگایا۔ لڑکے بھونچکے رہ گئے۔ اس لڑکے نے بھی اس کو مارنے کی کوشش کی مگر یمنی نے ایک اور تھپڑ اسے لگایا۔

”اگر سوسائٹی میں موو کرنے کے میوز نہیں آتے تو گھر سے باہر مت نکلا کرو..... اور چگاڈو تم کس کو کہہ رہے تھے؟“ یمنی نے اسے کارل سے پکڑ کر غصے سے پوچھا۔

”آپ کو تو نہیں.....“ وہ لڑکا اس کے تیور دیکھ کر ہکلانے لگا۔

”بس..... نکل گئی..... تمہاری ہوا..... دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ ابھی پولیس کو بلواتی ہوں۔“ یمنی نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”میڈم..... پلیز چھوڑ دیں..... ریسٹورنٹ کا ماحول ڈسٹرب ہو رہا ہے۔ آئی ریکویسٹ یو۔“ ہوٹل کے منیجر نے آکر اس درخواست کی۔

”اور آپ بھی ایسے بے ہودہ لوگوں کی لوز ٹاک خاموشی سے سنتے رہتے ہیں کوئی ایکشن نہیں لیتے۔“ یمنی نے منیجر کو ڈانٹا۔

”سوری..... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ منیجر نے کہا۔

”چلو..... اب ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے۔“

یمنی نے دوستوں سے کہا اور سب باہر نکل گئیں۔

”بس آج اتنا ہی کافی ہے۔ میرا موڈ خراب ہو گیا ہے پھر کبھی باہر چلیں گے۔ میں تم لوگوں کو

خیال ذہن سے نکال دیا۔

یمنی اپنی پرانی فرینڈز کے ساتھ آؤٹنگ پر نکلی تھی۔ ٹائنا اور فضلہ اس کی اسکول فیلوز تھیں۔ تینوں انتہائی خوب صورت اور ماڈاس کا ڈلڑکیاں تھیں۔ ان سب میں یمنی سب سے زیادہ معمولی شکل، صورت اور اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے بد صورت دکھائی دیتی تھی مگر چاروں میں بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ یمنی کئی ماہ گھر میں قید رہی تھی اور کہیں باہر نہیں نکل سکی تھی۔ گھر میں اس کی صحت یابی کی خوشی میں دی جانے والی پارٹی میں انہیں انوائٹ نہیں کر پائی تھی اب سب نے مل کر آؤٹنگ کا پروگرام..... بنالیا۔ ان کا پروگرام سارا دن گھومنے اور لچ وڈز بھی باہر کرنے کا تھا۔ یمنی ڈرائیونگ کر رہی تھی اور تینوں اس کے ساتھ میٹھی خوب انجوائے کر رہی تھیں۔

”یار بہت بھوک لگی ہے..... پہلے لंच کرتے ہیں۔“ اینا نے کہا۔

”رائٹ..... میم۔“ یمنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور چاروں ایک ریسٹورنٹ میں لंच کرنے چلی گئیں۔

لंच کے دوران ہی چار پانچ لڑکوں کا ایک ٹولا ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ سب لڑکے شکل صورت اور وضع قطع سے امیر گھرانوں کے لگ رہے تھے، پانچوں ان سے اگلی نیبل پر بیٹھ گئے مگر ان کی نظریں یمنی اور اس کی دوستوں پر تھیں۔ وہ بگڑے ہوئے بد تہذیب رئیس زاوے لگ رہے تھے اور انتہائی فضول قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔

”یار..... ریسٹورنٹ کا ماحول کتنا خوب صورت اور رومینٹک ہے مگر ایک چگاڈو نے اس کی ساری بیوٹی کو خراب کر دیا ہے۔ کم آن یار یہاں سے چلو.....“ ایک لڑکے نے قدرے اونچی آواز میں یمنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یمنی نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے رکی اور اس نے اس لڑکے کی طرف

تھا۔ اس نے جلدی سے میگزین کھولا اور اس شخص کی مختلف تصویروں کے پوز دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ محسن رضا تھا۔ ایم بی میں ٹاپ کرنے پر اس کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ یمنی کی خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس کا کوئی انتہائی قریبی دوست ہو۔ جس کی خوشی اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے انٹرویو پڑھا۔ ایک جگہ محسن نے اس کے کہے ہوئے الفاظ quote کیے تھے۔

”بی بیو اینڈ اسٹرونگ..... جو دوسروں کے لیے کوشش کرتے ہیں انہیں بہت اسٹرونگ ہونا چاہیے۔“ محسن نے اس کا بلا واسطہ انداز میں ایک مختص دوست کے حوالے سے ذکر کیا تھا..... اور محسن نے التجا کی تھی کہ اگر اس کا کھویا ہوا دوست اس کا یہ انٹرویو پڑھے تو اس سے ضرور رابطہ کرے۔ یمنی اسے تقریباً بھول چکی تھی۔ اس نے اپنے ایک پرانے موبائل میں اس کا نمبر شاید save کیا تھا۔ اس نے موبائل دیکھا مگر شاید وہ خود ہی اسے delete کر چکی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر میگزین کے آفس فون کر کے بہت مشکل سے محسن رضا کا نمبر لے لیا مگر بار بار فون کرنے پر اس کا موبائل آف ملا۔

”اس کا موبائل کیوں آف ہے..... کہیں پھر تو کسی نے چھین نہیں لیا..... وہ اپنا موبائل کیسے آف کر سکتا ہے۔ یقیناً کوئی پر اہم ہوئی ہوگی۔“ وہ ہزار باتیں سوچتی مگر اس کا دل بے چین ہونے لگا۔ محسن رضا سے بات کرنے کو ترپنے لگا۔ وہ سارا وقت اس کا نمبر ٹرائی کرتی رہتی مگر وہ نہ ملا۔ اس نے بڑی دقتوں سے انٹرویو کرنے والے صحافی کے ذریعے پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ محسن رضا پٹھن کے لیے انگلینڈ جا چکا ہے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اسے خوشی بھی تھی محسن کو اس کی محنت کا صلہ..... مل رہا تھا مگر یہ افسوس تھا کہ وہ اسے اس کی کامیابی پر مبارکباد نہیں دے سکی تھی۔ اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ اس کا

کا یہ عرصہ ایک خاص مقصد لیے ہوئے تھا۔ اس عرصے میں اس نے جتنا قدرت کے بارے میں سوچا تھا اتنا ہی انسان کی بے بسی اور محتاجی پر غور و خوض کیا تھا۔ اس کی سوچ کافی حد تک بدل چکی تھی۔ اس کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ اس کے اندر کا ضدی پن، کھنڈرا پن اور سرکشی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی خاص سفر سے واپس آئی ہو اور اس سفر کی کٹھن راہوں نے اس کی خاص تربیت کی ہو، اس کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہ ڈیڈی اور مہما کے ہزار بار سمجھانے کے باوجود بھی رونما نہیں ہو سکی تھیں۔ اب ایمن کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ وہ بغیر کسی بحث و تکرار کے ایمن کی ہر بات مان لیتی۔ ایمن بھی اکثر اس کے رویے پر حیران ہوتیں مگر اسے کسی بھی بات کا احساس نہ دلاتیں۔

جمال نے یمنی کو نئے کالج کا وزٹ کرایا تھا اور یمنی کو کالج پسند آیا تھا۔ اس نے وہاں خوشی، خوشی داخلہ لے لیا تھا۔ کلاس شروع ہونے میں کچھ روز باقی تھے اور اس کا دل ایک بار پھر گاؤں جانے کو چاہنے لگا تھا مگر جمال احمد اور ایمن نے اسے جانے نہ دیا کیونکہ پچھلی بار اسے وہاں بھیجنے سے جو کچھ ہوا تھا اس سے وہ ڈر گئے تھے۔

یمنی فارغ تھی اور ان دنوں اسے کتابیں پڑھنے کا جنون ہو گیا تھا۔ جمال احمد بھی کتابیں پڑھنے کے بہت شوقین تھے اور ان کی اسٹڈی میں ہر طرح کی اور ہر موضوع پر تحقیق شدہ کتب موجود تھیں۔ یمنی کا زیادہ تر وقت جمال کے اسٹڈی روم میں گزرتا۔ تمام ویلکی میگزینز بھی وہیں رکھے ہوتے تھے۔ وہ ایک روز یونہی میگزینز کو کھول کر دیکھنے لگی تھی دو ماہ قبل کے ایک میگزین کا سرورق دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے ایک کونے میں ایک جانی پہچانی شخصیت کی تصویر چھپی تھی اور اس کا انٹرویو اندر کے صفحات میں

ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ یعنی نے کہا تو سب خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

گھر آ کر وہ بہت مضطرب رہی اور سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہی۔ اسے بار بار ان لڑکوں کے کہے ہوئے جملے یاد آتے تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگتیں۔

”یا اللہ تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا ہے۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔“ وہ سسکنے لگی اور خدا سے ڈھیروں شکوے کرتی سو گئی۔ اس نے خواب میں اپنے آپ کو گاؤں کی حویلی میں اماں بشیراں کے پاس دیکھا جو اس کے ماتھے کو محبت سے چوم رہی تھیں۔

”بیٹا..... رو کیوں رہی ہو؟ ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ اماں بشیراں کی بات پر وہ مسکرا دی اور اچانک اماں بشیراں کو دل کا دورہ پڑا اور وہ وہیں تڑپنے لگیں اور مر گئیں۔ یعنی یک دم گھبرا کر اٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی فجر کا ٹائم ہو رہا تھا۔ اذانیں شروع ہو گئی تھیں لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجنے لگی۔ بیلز مسلسل ہو رہی تھیں یعنی اٹھ کر لاؤنج میں گئی اور ریسیور کان سے لگایا۔

”ہیلو.....“ یعنی بہ مشکل بولی۔

”ہیلو..... یعنی بیٹا! جمال احمد کو اور ایمن کو بتا دو کہ اماں بشیراں فوت ہو گئی ہے۔ ظہر کے بعد جنازہ ہے۔ جلد گاؤں پہنچ جائیں اور تم بھی ضرور آنا۔ بشیراں مرتے ہوئے تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔ بیٹا کو کہنا..... رونا منت ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ ماں جی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور یعنی کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے؟ مجھے کیا بتایا جا رہا ہے..... مجھ سے کون کون محبت کرتا ہے۔“ وہ سوچنے لگی اس نے ماں، باپ کو خبر سنائی مگر نہ خواب بتایا اور

نہ ہی اماں بشیراں کی خواہش..... وہ تو اپنے آپ میں کہیں گم ہو کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ زندگی کا ایک باب ختم ہونے پر اس کے اندر سوچ کا ایک نیا ور کھلا تھا اور محبت کا ایک نیارنگ اس پر آشکار ہوا تھا۔

☆☆☆

ردا اپنے کمرے میں پریشان کھڑکی کی طرف منہ کر کے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

”یا خدا یا..... مجھے کس بات کی اتنی سزا مل رہی ہے۔ اگر میرا دل اس کی طرف مائل نہیں ہو رہا تو میں کیا کروں؟“ ردانے سسکی بھر کر سوچتے ہوئے کہا۔

”خدا کرے وہ بھی کبھی سکون سے نہ رہے۔“ نجمہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ ہونٹ بھیجنے کر سسکنے لگی اور کچھ سوچتے ہوئے توقیر کا نمبر ملایا۔ پھر کال ڈراپ کر دی۔

”کیا کروں.....؟ مجھے اس سے بات کرنی چاہیے یا نہیں۔“ ردانے پریشانی سے سوچا اور پھر توقیر کا نمبر ملایا۔

”ردا..... آپ.....؟“ توقیر نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ مجھے آپ کی وجہ سے نہ جانے کیا کچھ سننے کو مل رہا ہے۔“ ردانے سسکی بھر کر ایک دم شکایتی لہجے میں کہا۔

”لیکن..... میں نے تو آپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا.....“ توقیر چونک کر بولا۔

”مگر سب یہ تو جانتے ہیں کہ آپ کس وجہ سے شادی نہیں کر رہے۔“ ردانے نم آنکھوں سے آہ بھر کر کہا۔

”اب آپ کیا چاہتی ہیں؟“ توقیر نے گہری سانس لے کر کہا۔

”آپ جو یہ یہ سے شادی کر لیں۔“ ردا گہری سانس لے کر بولی۔

”یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ.....؟“ توقیر نے

افردگی سے پوچھا۔

”آپ کی ماما کی خواہش ہے۔“ ردانے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اور آپ کی خواہش کیا ہے؟“ توقیر نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اپنی ماما کی خواہش پوری کر دیں۔“ ردا آہ بھر کر بولی۔

”یہ جانے بغیر کہ میری خواہش کیا ہے..... میں آپ کی خواہش کیسے پوری کر دوں۔“ توقیر آہ بھر کر بولا۔

”آپ کیوں الجھ رہے ہیں اور مجھے بھی الجھا رہے ہیں۔“ ردانے جھنجھلا کر کہا۔

”جب ہم دونوں ہی الجھ گئے ہیں تو کیوں نہ ایک دوسرے کو سلجھا دیں۔ ردا اب بھی وقت ہے آپ اپنے دل کو.....“ توقیر نے التجائی انداز میں کہا۔

”دل ہی تو نہیں مانتا۔“ ردانے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میری کوئی غلطی..... خامی، خطا، گناہ کچھ تو بتائیں۔“ توقیر نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔

”معلوم نہیں..... مگر میرا دل آپ کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ تو میں کیا کروں؟“ ردانے آہ بھر کر شکستہ لہجے میں کہا۔

”پلیز اپنے دل کو سمجھائیں۔“ توقیر نے افسردگی سے زور دے کر کہا۔

”کیا آپ اپنے دل کو کسی اور محبت کے لیے فورس کر سکتے ہیں؟“ ردا گہری سانس لے کر بولی۔

”نہیں.....“ توقیر آہ بھر کر بولا۔

”میں بھی نہیں کر سکتی۔“ ردا گہری سانس لے کر بولی۔

”کیا آپ کسی اور سے؟“ توقیر نے چونک کر پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں اور پلیز..... مجھے کسی بھی بات

کھیل دیپ طے کھیل دل

کے لیے مجبور مت کریں۔“ ردا گہری سانس لے کر بولی اور موبائل آف کر دیا تو توقیر پریشان ہو گیا۔

☆☆☆

حاتم اپنے آفس میں لیپ ٹاپ پر کچھ میلو چیک کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات تھے۔ اس کے موبائل پر میسج ٹون آئی۔ اس نے چونک کر میسج پڑھا اور اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ وہ لیپ ٹاپ وہیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا ایک اور میسج آیا تو اس نے نمبرری ڈائل کیا مگر اب کے نمبر آف ملا۔ فہام ایک فائل پکڑے اس کے کمرے میں آیا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں دیکھ کر چونکا۔

”کیا تم ابھی تک ان میسج کی وجہ سے پریشان ہو رہے ہو؟“ فہام نے حاتم کے قریب آ کر گہری سانس لے کر کہا۔

”کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، مجھے کیوں میسج کر رہا ہے۔ آپ کو عاصم کو یا پھر کسی اور کو کیوں نہیں کرتا.....؟“ حاتم نے غصے سے کہا۔

”اس لیے کہ تم ایموٹل ہو اور جلدی غصے میں آ جاتے ہو۔ میں ایسی باتوں کو نوٹس نہیں کرتا اور عاصم lightly لیتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے ردا اور تم

میں دراڑ ڈال کر ہمارے گھر میں لڑائی جھگڑا ڈالنا چاہتا ہے۔“ فہام گہری سانس لے کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“ حاتم نے یک دم چونک کر کہا۔

”ہم سب اپنی بہن سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ سارے خاندان کو معلوم ہے..... اس محبت سے

کون..... کتنا جیلس ہو رہا ہے، ہمیں کیا معلوم۔“ فہام نے گہری سانس لے کر کہا تو حاتم نے اسے چونک کر دیکھا۔

”حاتم! اپنے اندر یقین کو مضبوط کرو..... اپنے

بات کرتے ہوئے فہام، حاتم کو بخور دیکھ رہا تھا۔
 ”او کے..... شہزاد صاحب..... میں یہ ساری باتیں آپ سے میننگ میں کروں گا، تھینک یو۔“
 فہام نے مسکرا کر بات ختم کرتے ہوئے کہا۔
 ”حاتم میں اس بار بزنس ٹور پر تمہیں جرمی بھیج رہا ہوں۔“ فہام نے گہری سانس لے کر کہا۔
 ”مجھے..... کیوں؟“ حاتم نے حیرت سے پوچھا۔
 ”میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھی بزنس کا زیادہ سے زیادہ معلوم ہو۔“ فہام نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”لیکن..... میں؟“ حاتم پریشانی سے بولا۔
 ”میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم کیوں اپ سیٹ ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ روز کے لیے آؤٹ آف دی اسکرین ہو جاؤ، اپنی ساری توجہ بزنس کی طرف دو، وہاں تمہارا موبائل نمبر چینج ہوگا، جو صرف میرے پاس ہوگا۔ اس کے بعد کیا پروجیکشن بنے گی اسے بعد میں دیکھ لیں گے۔ فی الحال تم جانے کی تیاری کرو۔“
 ”او کے.....“ حاتم نے گہری سانس لے کر کہا۔
 ”پرسکون ذہن کے ساتھ جاؤ۔ میں ہوں ناں تمہارے پیچھے..... گھبرانے کی کوئی بات نہیں..... اور سنو صرف بزنس ہی نہیں کرنا..... وہاں گھومنا پھرنا بھی ہے، او کے۔“ فہام نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو حاتم بھی مسکراتے لگا۔

☆☆☆

ریحانہ کے چہرے پر قدرے سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد بہن کی طرف آئی تھیں اور انہیں دل ہی دل میں ڈرتا کہ آیا آج ضرور شمیمہ کی شکایتیں کریں گی کیونکہ بیٹی کی حرکتوں سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف تھیں۔
 ”شمیمہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اسے ہر وقت میرے کھانے پینے اور دوائیوں کی فکر رہتی

اور میک اپ کے ساتھ وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔
 تھکے تھکے انداز میں وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔
 ”آج تو قیر نے شادی پر مجھے بالکل avoid کیا جیسے مجھے جانتا ہی نہ ہو۔“ ردانے سوچا۔
 ”اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ میرے راستے میں نہیں آئے گا۔“ ردانے سوچا۔
 ”وہ ہمیشہ مجھ سے بہت اچھے طریقے سے بات کرتا رہا ہے اور میں بھی اس کی عزت کرتی تھی۔ اس نے اجانک محبت کا اظہار کیا تو اس سے ناراض کیوں ہونے لگی۔ شاید میرا دل اس کی محبت کو قبول نہیں کر رہا۔ نہ جانے کیوں..... وہ اچھا ہے، ڈینٹ ہے، ویل ایجوکیٹڈ ہے پھر بھی..... میرا دل؟“ ردانے اپنے آپ سے پوچھا وہ جھنجھلا کر انھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی جیولری اتارنے لگی۔ خدیجہ کمرے میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے داخل ہوئیں۔
 ”رشنا کی شادی ٹھیک سے ہو گئی بیٹا؟“ خدیجہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں..... بہت اچھی..... دولہا بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔“ ردانے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”اللہ رشنا کا نصیب اچھا کرے..... بہت خواہش تھی کہ میں بھی شادی میں جاؤں مگر..... اپنی طبیعت کی وجہ سے ہمت نہ کر پائی۔“
 ”ہاں..... میں نے آئی کو بتا دیا تھا کہ آپ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے نہیں آسکیں۔“ ردانے جلدی سے کہا۔
 ”اچھا بیٹا اب تم آرام کرو۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

فہام اپنے ویل فرنشڈ آفس میں چیئر پر بیٹھا موبائل پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ حاتم آفس میں داخل ہوا تو فہام نے اشارے سے اپنے سامنے چیئر پر بیٹھنے کو کہا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

ہوئے کہا۔ ”تمہاری اس خاموشی کی وجہ بھی مجھے معلوم ہے۔“ فہام نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور سسکی بھر کر اس کے ساتھ لپٹ کر رونے لگا۔
 ”ارے میری جان، کیوں رو رہے ہو..... یار میں نے تمہیں باپ کی feeling کے ساتھ پالا ہے۔ کوئی جو کچھ بھی کہے یا مانڈ کرے، ہمارا رشتہ ہمیشہ مضبوط ہی رہے گا۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔“ فہام نے اس کا ہاتھ چوم کر چپ کرواتے ہوئے کہا تو خدیجہ نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور زرب لب مسکراتے لگیں۔
 ”فہام بیٹا تم اس گھر اور میرے ان بچوں کے لیے ڈھال ہو، کبھی انہیں کمزور نہ ہونے دینا۔“ خدیجہ مسکراتے ہوئے بولیں۔
 ”مما یہ آپ کیا بات کر رہی ہیں، آپ کے ذہن میں یہ سوچ بھی کیسے آئی، فہام تو صرف زندہ ہی آپ لوگوں کے لیے ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ماں کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ شمیمہ ایک دم اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اس نے فہام کو ماں اور بھائی کو اپنے ساتھ لگاتے دیکھ کر گہری سانس لی اور معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمانے لگی۔
 ”آئی ایم سوری عاصم..... تم میری وجہ سے ہرٹ ہوئے ہو، پلیز مجھے معاف کر دو۔“ شمیمہ نے عاصم کے قریب آ کر شرمندگی سے کہا۔
 ”بھابی! آپ..... میں تو آپ سے بالکل ناراض نہیں۔“ عاصم نے بوکھلا کر جواب دیا۔
 ”تو پھر جلدی سے مسکرا دو۔ تم مسکراتے ہوئے اچھے لگتے ہو۔“ شمیمہ مسکراتے ہوئے بولی تو عاصم بھی مسکراتے لگا۔ فہام نے مسکرا کر سب کو دیکھا۔

☆☆☆

ردا ابھی رشنا کی شادی سے لوٹی تھی۔ جدید ڈیزائننگ کے خوب صورت جوڑے میں میچنگ جیولری

رشتوں اور محبت پر اعتبار کرو..... جب انسان میں یقین کمزور پڑتا ہے تو وہ مٹی کے ڈرے سے بھی ہلکا ہو جاتا ہے پھر کسی پر اعتبار نہیں رہتا۔ نہ اپنے آپ پر، نہ دوسروں پر۔“ فہام نے اس کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا تو اس نے گہری سانس لے کر او کے کہا تو فہام مسکرا دیا۔
 خدیجہ بہت پریشان صوفے پر بیٹھی تھیں اور عاصم بھی ان کے ہمراہ دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا مگر خدیجہ بار بار عاصم کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
 ”عاصم بیٹا! کیوں اتنے خاموش رہتے ہو..... بیٹا پہلے کی طرح بات چیت کیوں نہیں کرتے.....؟“ خدیجہ نے پریشانی سے پوچھا۔
 ”کوئی بات نہیں ممما، میں تو بس یونہی.....“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
 اسی وقت فہام سلام کرتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا۔ وہ فیکٹری سے لوٹا تھا۔ اپنا بیگ سائنڈ ٹیبل پر رکھ اس نے دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔
 ”ماں، بیٹے میں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”کچھ نہیں۔“ خدیجہ گہری سانس لے کر بولیں تو عاصم خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگا۔
 ”عاصم آج تم فیکٹری بھی نہیں آئے..... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ فہام نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔
 ”ہاں.....“ اس نے آہستہ آواز میں کہا۔
 ”لیکن میں آبرو کر رہا ہوں کہ تم کچھ اپ سیٹ ہو..... کیا بات ہے؟“ فہام نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں.....“ عاصم نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ فہام اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔
 ”جو کچھ تمہارے دل میں ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ فہام نے اسے اپنے ساتھ لگاتے

ہے۔“ خدیجہ نے بہو کی طرف دیکھ کر تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”آپا..... میں نے تو اسے یہی سمجھا کر بھیجا ہے کہ مجھ سے زیادہ میری آپا کی عزت اور خدمت کرنا۔“ ریحانہ نے مسکرا کر شمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور ماشاء اللہ وہ ویسے ہی کر رہی ہے۔ میرا تو دل خوش ہو کر اسے بہت دعائیں دیتا ہے۔“ خدیجہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”آپا! جب بیٹی کی سسرال والے اس کی تعریف کرتے ہیں تو ماں، باپ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔“ ریحانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ریحانہ! کیا تم اس گھر کو شمیلہ کی سسرال سمجھ رہی ہو؟ بھئی یہ تو اس کا اپنا گھر ہے۔“ خدیجہ مصنوعی خفگی سے بولیں تو شمیلہ مسکرا دی۔ لاؤنج میں رکھا ٹیلیفون بجنے لگا تو وہ اٹھ کر فون سننے لگی۔

”خالہ جان آپ کا فون ہے..... کوئی مسز احمد آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔“ شمیلہ نے واپس آ کر خدیجہ سے کہا۔

”اوہ..... ہاں، مجھے ان کے فون کا انتظار تھا۔ ریحانہ تم چائے پیو..... میں ابھی آتی ہوں۔“ خدیجہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا! شکر ہے کہ تم یہاں ایڈجسٹ ہو گئی ہو..... مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ میں کتنی خوش ہو رہی ہوں یہ جان کر کہ تم آپا کی اتنی خدمت کر رہی ہو۔“ ریحانہ نے مسکرا کر شمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”فہام کو اپنی مٹھی میں کرنے کے لیے سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔“ شمیلہ نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں کہا تو ریحانہ نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تو..... کیا..... تم یہ سب کچھ دل سے نہیں کر رہیں۔“ ریحانہ نے یک دم گھبرا کر کہا تو اس کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ خدیجہ فون بند کر

کے واپس آ چکی تھیں۔

”میں مسز احمد کو بھی بتا رہی تھی کہ میری بہولا کھوں میں ایک ہے۔ اس نے تو ایسا میرے دل میں گھر کر لیا ہے، کیا بتاؤں۔“ خدیجہ نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ریحانہ گھبرا کر شمیلہ کی طرف دیکھنے لگیں اور ایک گہری سانس لے کر زبردستی مسکراتے لگیں۔ شمیلہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور ریحانہ فکر مندی سے اسے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

بیڈ پر ایک بیگ کھلا پڑا ہوا تھا تو قیر اپنی وارڈ روب کھول کر اس میں سے کپڑے نکال کر اس میں رکھ رہا تھا۔ سائنڈ ٹیبل کی دراز سے بھی۔۔۔ اپنی چیزیں نکال کر وہ اس میں رکھنے لگا جیسی نجمہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”تو قیر یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ انہوں نے اسے چیزیں رکھتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”جانے کی تیاری.....“ تو قیر نے گہری سانس لے کر کہا۔

”کیا مطلب..... کب.....؟“ نجمہ نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

”صبح.....“ تو قیر نے نم آنکھوں سے کہا۔

”اتنی جلدی..... ابھی تو رشنا کی شادی کو چار دن ہوئے ہیں اور تم بھی جا رہے ہو۔ میں گھر میں بالکل اکیلی کیا کروں گی بے نجمہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”میں نے ڈیڈی سے بات کر لی ہے۔ وہ بہت جلد پاکستان آرہے ہیں آپ کے پاس..... پھر آپ اکیلی نہیں ہوں گی۔ ویسے بھی رشنا کی شادی اتنی جلدی میں رکھی گئی کہ وہ نہیں آپائے۔“ تو قیر نے مسکرا کر ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر..... تم تو نہیں ہو گے ناں۔“ نجمہ نے سسکی بھر کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... اس کا ڈریس بہت اچھا ہے ناں۔“
شمیلہ نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔
”ڈریس نہیں..... میری ڈول زیادہ کیوٹ
ہے۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا۔
”اب چلو بھی..... دیر ہو رہی ہے۔“ خدیجہ
نے جلدی سے کہا تو سب باہر نکل گئے۔
☆☆☆

ردا، شمیلہ اور خدیجہ شادی ہال میں جی چیر زپر
بیٹھی ادھر ادھر لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ فہام، خاور اور
دوسرے دوستوں کے ساتھ بڑی تھا۔ خاور کی فیملی میں
سے کوئی بھی ان کے پاس نہیں آیا تھا اور شمیلہ کو اس
بات پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ منہ پھلائے کبھی موبائل
نکال کر چیک کرنے لگتی تو کبھی اسے آف کر کے ادھر
ادھر دیکھنے لگتی۔ اس کا موڈ خاصا آف ہو رہا تھا۔
”یہ اچھی شادی ہے۔ جس میں میزبان
مہمانوں کو ڈھنگ سے پوچھ بھی نہیں رہے۔ ہم لوگ
جب سے آئے ہیں کوئی ایک بھی ہمارے پاس نہیں
آیا۔“ شمیلہ نے شکایتی لہجے میں خدیجہ سے کہا۔
”بیٹا! شادی بیاہ میں ایسے ہی ہوتا ہے اور
خاص طور پر لڑکی کی شادی پر گھر والوں کو کوئی ہوش
نہیں ہوتا۔ ویسے بھی جب ہم آئے تو فوراً ہی بارات
آگئی۔“ خدیجہ مسکرا کر بولیں تو ردا کا موبائل بجا اور
وہ بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔
”خاور کی ماما آپ کو پوچھ رہی ہیں۔ آئیں
میں آپ کو ان سے ملواتا ہوں۔ ردا بڑی ہے اسے
یہیں رہنے دیں۔“ فہام نے ان کے قریب آ کر
کہا اور شمیلہ، خدیجہ کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔
روحیل اپنی بوڑھی ماں جی کا ہاتھ پکڑے آہستہ
آہستہ چلتا ہوا ردا کے قریب والی ٹیبل کے پاس آیا۔
روحیل بلیک پنٹ کوٹ پہنے اپنی سفید رنگت، ٹکین شیو
کے ساتھ انتہائی ہینڈسم اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔
”بیٹا! میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔ اب مجھ سے

مسکرانے لگے لیکن ردا کے چہرے پر پریشانی کے
آثار نمایاں ہونے لگے۔
☆☆☆
ردا سفید گھیر دار فراک، چوڑی دار پاجامے
لائٹ میک اپ اور جیولری کے ساتھ بہت خوب
صورت لگ رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آئی تو
خدیجہ بھی بہت ڈینٹ لگ رہی تھیں۔
”ماشاء اللہ..... میری بیٹی تو آج پری لگ رہی
ہے۔“ خدیجہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا تو ردا وحشیہ سے مسکرائی پھر یک دم سنجیدہ ہو گئی۔
شمیلہ بھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر باہر نکلی اور لاؤنج
میں آتے ہوئے... دونوں کی باتیں سننے لگی۔
”کیا بات ہے، تم چہرے سے کچھ ادا اس لگ
رہی ہو۔“ خدیجہ نے چونک کر پوچھا۔
”نہیں..... ماما ایسی کوئی بات نہیں۔“ ردا نے
بڑا کر کہا تو شمیلہ معنی خیز انداز میں تجسس ہو کر
آنکھیں گھمانے لگی۔
”تمہارے چہرے پر چھائی اداسی مجھے کچھ اور
ہی بتا رہی ہے، کیا بات ہے؟“ خدیجہ نے ردا کے
قریب آ کر بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں..... ماما ایسی کوئی بات نہیں۔“ ردا
زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔
”بھئی، آپ لوگ تیار ہیں نا؟“ فہام نے
اندر آتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔ وہ تیار ہو کر
گاڑی نکالنے باہر گیا تھا۔
”واؤ..... آج تو میری سوئٹ ڈول فیری لگ
رہی ہے۔“ فہام نے انتہائی خوشی سے مسکراتے
ہوئے کہا اور اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی
چومنے لگا تو شمیلہ جلدی سے لاؤنج میں داخل ہو گئی۔
”بھئی..... آج تو سب بہت زبردست لگ
رہے ہیں لیکن میری ڈول تو سب سے پیاری لگ
رہی ہے۔“ فہام نے ردا کی طرف دیکھ کر کہا۔

کو بغور پڑھتی رہی اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
”تمہارا اور میرا کیسا رشتہ ہے۔ تمہارے
ہونے سے میں irritate ہوتی تھی اور اب جانے
سے دُکھی ہو رہی ہوں۔“ ردا نے آہ بھر کر سوچا شاید
میں نے اسے جھٹلا کر اس کا دل توڑا ہے۔ اس کی
محبت کی ناقدری کی ہے لیکن میں نے تو اسے اپنے
دل کی بات صاف، صاف بتائی ہے۔ میں نے اس
کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا۔
میں اسے کسی فریب میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ آہ بھر
کر سوچنے لگی اور سارا دن مضطرب رہی۔ نہ اس سے
ڈھنگ سے کھانا کھایا گیا۔ سارا وقت مضطرب اور
بے چین رہی۔ رات کو سب کھانا کھانے لگے تو تب
بھی وہ بہت خاموشی تھی۔
”ردا گڑیا..... کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں؟ کیا
کوئی پرابلم ہے؟“ فہام نے اس کی طرف بغور دیکھ
کر پوچھا۔
”نہیں..... نہیں۔“ ردا نے یک دم بوکھلا کر
جواب دیا۔
”شاید گھر میں فارغ بیٹھ کر بور ہو رہی
ہے۔“ شمیلہ نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف
دیکھ کر کہا۔
”بیچے! اب رزلٹ تک تو انتظار کرنا پڑے گا
پھر یونیورسٹی میں ایڈمیشن کراؤں گا، ٹینشن کی کیا
بات ہے؟“ فہام نے مسکرا کر بڑی محبت سے کہا۔
”یار..... عاصم اسے گھماؤ، پھراؤ، انجوائے
کراؤ۔ ہاں یاد آیا۔ میرے دوست خاور کی بہن کی
کل شادی ہے آپ سب کو بھی جانا ہے۔“ فہام نے
سب کی طرف دیکھ کر کہا۔
”نہیں..... میں نہیں۔“ ردا نے گھبرا کر کہا۔
”نو..... ایکسکپوز..... ماما، شمیلہ، عاصم آپ
سب کو جانا ہے۔ خاور میرا بہت کلوز فرینڈ
ہے، اوکے؟“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب

”آپ فکر نہیں کریں، میں جلد آ جاؤں گا.....“
توقیر نے آہستہ سے کہا۔
”توقیر..... خدا کے لیے مت جاؤ۔ میں
تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔“ نجمہ نے غم آنکھوں
سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
”میرا جانا ہی بہتر ہے۔“ اس نے انہیں اپنے
ساتھ لگا کر تقریباً روتے ہوئے کہا۔
”تم اس کی وجہ سے جا رہے ہو ناں خدا
کرے..... وہ بھی خوش نہ رہے۔“ نجمہ غصے سے
چلاتے ہوئے بولیں۔
”نہیں..... ماما، کوئی بد دعا نہیں دیں۔ جو لوگ
قسمت میں نہ ہوں اس میں ان کا نہیں بلکہ قسمت کا
قصور ہوتا ہے۔ کسی لڑکی کے لیے آپ ایسے مت
کہیں کیا پتا اس کی بھی کوئی مجبوری ہو۔“ اس نے
ماں کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے
ہوئے کہا۔
”تم..... تم اس سے اب بھی.....“ نجمہ نے
غصے سے کہا۔
”ہاں..... بہت محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا
رہوں گا۔“ توقیر نے بات کاٹتے ہوئے زخمی
مسکراہٹ سے کہا۔
☆☆☆
ردا ایک گہری نیند لے کر اٹھی تو اس نے اپنا
موبائل آن کیا۔ اس میں مس کالز تھیں اور ساتھ ہی
میجر وہ ان باکس کھول کر پڑھنے لگی۔
”آج میں آسٹریلیا جا رہا ہوں..... تمہاری
محبت کا زخم لیے اور شاید کبھی نہ آنے کے لیے..... اپنا
بہت خیال رکھنا good bye forever“
ردا کے چہرے پر یک دم اداسی سی چھانے لگی اور دل
بھی مضطرب ہونے لگا۔ وہ توقیر کا میسج تھا اور کالز بھی
اسی کی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز
اس سے چھین گئی ہو۔ وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے میسج

”ماں جی..... آپ گھر سے باہر نہیں جاتیں ناں..... اسی لیے بہت تھک جاتی ہیں۔“ روکیل نے مسکراتے ہوئے ان کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔
”بیٹا! یہ سانس کا مسئلہ کچھ چھین لینے دے تو کہیں جاؤں ناں!“ ماں جی نے منہ بنا کر افسردگی سے کہا۔

”روکیل بیٹا آج شادی پر مجھے وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے۔“ ماں جی نے یک دم موڈ بدل کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اب وہ اپنے بستر پر آرام سے بیٹھ چکی تھیں۔

”کون سی لڑکی.....؟“ روکیل نے چونک کر بھویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔
”وہی جس نے مجھے پانی پلایا تھا۔ اور جس کی فیملی سے میں اور تم ملے تھے۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو روکیل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیوں..... اس میں کیا خاص بات تھی۔ مجھے تو وہ بس ایک عام سی لڑکی لگی تھی۔“ روکیل نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
”نہیں..... وہ عام نہیں تھی۔ اس میں نہ جانے کیا بات ہے کہ وہ میرے دل میں ہی اتر گئی ہے۔ وہ اتنے پیار سے باتیں کر رہی تھی اور مسکرا رہی تھی کہ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔“ ماں جی نے مصنوعی خفگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور یقیناً آپ نے اسے اپنی بہو بنانے کا سوچا ہوگا۔“ روکیل نے مسکراتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔
”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ ماں جی نے ایک دم خوش ہو کر کہا۔

”بیٹا کس کا ہوں؟ آپ کا اور آپ کیا سوچتی ہیں مجھے فوراً پتا چل جاتا ہے۔“ روکیل نے ایک دم مسکرا کر کہا۔
”ویسے بیٹا تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں غلط

”یہ میرا بیٹا روکیل ہے۔“ ماں جی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تو فہام نے بھی اس کے قریب آ کر ہاتھ ملایا۔
”میں یاور کا فرینڈ ہوں۔“ روکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”اور میں فہام..... یاور کے بڑے بھائی خاور کا فرینڈ۔“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”پھر تو حسن اتفاق کہیے کہ دونوں بھائیوں کے فرینڈز آپس میں مل رہے ہیں۔“ روکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”nice to meet you“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا تو روکیل نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔
”اللہ آپ کی بیٹی کا نصیب اتنا ہی اچھا کرے۔ جتنی اچھی وہ خود ہے۔“ ماں جی نے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”آمین.....“ خدیجہ مسکراتے ہوئے بولیں تو شمیم نے بھی زبردستی مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور سب ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

فیملی فنکشن میں پہلی بار آئے ہیں اور میں اپنے دوست کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔“ روکیل نے جلدی سے کہا۔
”اور ہم بھی پہلی بار ہی آئے ہیں۔ آئی مین..... میں خاور بھائی کے فرینڈ فہام کی سسٹر ہوں۔ اس لیے میں بھی کسی کو زیادہ نہیں جانتی۔“ ردا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
”آئی سی پلیز آپ تشریف رکھیں میں ماں جی کو ہی دیکھنے آیا تھا لیکن لگتا ہے ماں جی آپ کے ساتھ بہت comfortable ہیں۔ ماں جی میں یاور کے ساتھ بڑی ہوں۔“ روکیل نے مسکراتے ہوئے ماں جی سے کہا اور ان سے اجازت لے کر وہاں سے چلا گیا۔

”بیٹا! اگر تم ماسٹرنہ کرو تو میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ، تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ ماں جی نے مسکرا کر ردا سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئی اور ماں جی بہت محبت بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

کافی دیر بعد خدیجہ اور شمیم فہام کے ساتھ سب لوگوں سے ملاقات کر کے لوٹیں تو شمیم کے چہرے پر اب بھی ناگواری کے تاثرات تھے۔
”یہ لوگ کچھ زیادہ ہی بڑی ہیں۔ کسی نے ایک بار بھی ہمیں اسٹیج پر بیٹھنے کو نہیں کہا۔“ شمیم نے شکوہ کیا مگر خدیجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
وہ دونوں چلتی ہوئی اپنی ٹیبل پر آئیں تو ردا کسی عورت کے پاس بیٹھ دیکھ کر چونکیں۔
”یہ میری ماما..... اور بھابی ہیں۔“ ردا نے ماں جی سے ان کا تعارف کرایا۔
”آپ کی بیٹی بہت اچھی اور پیاری ہے۔“ ماں جی نے خدیجہ کی طرف دیکھ کر کہا اتنے میں روکیل بھی ان کے پاس آ گیا۔

”بیٹا! مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ ان سے پانی مانگا تو مجھے پانی دینے آئی تھیں۔“ ماں جی جلدی سے بولیں۔
”آئی..... ایم سوری، اکیچو نیلی..... ہم اس

زیادہ چلا نہیں جاتا پھر سانس پھولنے لگی ہے۔“ ماں جی نے خالی ٹیبل کو دیکھ کر قدرے کانپتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک ہے، آپ یہاں بیٹھیں..... میں یاور کو دیکھ کر آتا ہوں۔“ روکیل نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔
ماں جی ٹیبل پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ ردا نے فون پر بات کرتے ہوئے قبضہ لگایا، ماں جی نے اس کی طرف چونک کر دیکھا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ردا کو دیکھ کر نہ جانے انہیں کیوں عجیب سی خوشی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ انہیں بہت پیاری اور اچھی لگ رہی تھی۔ ردا نے موبائل پر بات ختم کی تو ماں جی نے اس کی طرف بغور دیکھا اور مسکرا کر گویا ہوئیں۔

”بیٹا! آپ کی ٹیبل پر پانی کی بوتل ہے، مجھے اس میں سے ایک گلاس پانی تو دینا۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے ردا سے کہا تو ردا نے مسکراتے ہوئے گلاس میں پانی ڈال کر ان کے سامنے رکھا اور ان کے قریب کھڑی ہو گئی۔
”شکریہ..... بیٹا اللہ آپ کو خوش رکھے۔ کیا نام ہے آپ کا؟“ ماں جی نے پانی پی کر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔
”ردا.....“ ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے تمہاری طرح۔“ ماں جی مسکراتے ہوئے بولیں۔
”آپ کو اور پانی چاہیے؟“ ردا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں بیٹا.....“ ماں جی مسکراتے ہوئے بولیں۔ ردا وہاں سے جانے لگی تو روکیل وہاں آ گیا۔
”آپ.....؟“ روکیل نے انتہائی حیرت سے ردا کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”بیٹا! مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ ان سے پانی مانگا تو مجھے پانی دینے آئی تھیں۔“ ماں جی جلدی سے بولیں۔
”آئی..... ایم سوری، اکیچو نیلی..... ہم اس

☆ ☆ ☆

رات کافی زیادہ گزر چکی تھی اور بہت دیر سے رخصتی ہوئی۔ لوگ بہت زیادہ تھک گئے تھے اور اکثریت کے چہروں پر تھکاوٹ اور ناگواری کے تاثرات تھے۔ ماں جی کا تھکاوٹ سے برا حال ہو رہا تھا مگر روکیل دوست کی محبت میں مجبور انہیں بار بار بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ جیسے ہی رخصتی ہوئی وہ ماں جی کو لے کر فوراً گھر آ گیا۔ وہ بری طرح تھک چکی تھیں، روکیل انہیں ان کے کمرے میں لے گیا۔
”آف شادی نے تو بہت ہی تھکا دیا ہے۔“ ماں جی نے منہ بنا کر گھٹنوں کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

صورت تھی۔ لیکچر ختم ہوتے ہی سب اسٹوڈنٹس باہر جانا شروع ہو گئے۔ جیسے ہی یمنی باہر جانے کے لیے اپنی سیٹ سے اٹھی اور چند قدم چلی تو آزر نے جان بوجھ کر اپنی ٹانگ اس کے آگے کر دی۔ یمنی بے خیالی میں اس کے ساتھ ٹکراتے ہوئے گرنے لگی۔

”اوہ..... سوری..... اچانک لائٹ آف ہونے سے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا۔“ آزر نے مسکرا کر کہا تو سب لڑکے قہقہہ لگانے لگے۔

یمنی نے کھینچ کر اسے ایک زور سے تھپڑ لگایا۔ ”اب لائٹ آن ہوئی یا نہیں.....؟“ یمنی نے غصے سے کہا تو سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ آزر کو بھی ایسی توقع نہیں تھی۔

”یو.....“ وہ غصے سے چلا یا۔

”شٹ اپ..... مسٹر.....“ اس نے اپنی ٹانگ لہرا کر اتنی تیزی کے ساتھ اس کے گھٹنے پر ماری کہ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اس کے ساتھی لڑکے پریشان ہو گئے۔ یمنی اسے غصے سے گھورتی ہوئی کلاس روم سے باہر چلی گئی اور ہر طرف اک افراتفری سی پھیل گئی، حمہ بھی حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ آزر اٹھا اور بے انتہا بے عزتی محسوس کرتے ہوئے کلاس روم سے باہر نکل گیا۔

”آزر نے بھی تو حد کر دی..... کیا ضرورت تھی خواہ مخواہ اسے اتنا tease کرنے کی۔“ اس کے دوست جواد نے کہا۔

”تم نے اسے پہلے کیوں نہ منع کیا۔ پہلے تو اس کے ساتھ قہقہے لگاتے رہے تھے۔ شکر کرو، تم بچ گئے ہو۔“ فرخ نے جواد سے کہا۔

”یار..... ہم نے اسے خواہ مخواہ underestimate کیا..... چلو اب آزر کو دیکھتے ہیں۔“ واصف نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں..... چلو۔“ اور سب لڑکے باہر نکل گئے۔

لڑکوں نے اسے اپنی طرف بلایا۔

آزر نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور ان کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے اس کی نظر یمنی پر ٹپک گئی۔ وہ قدرے طنزیہ مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

”یار..... اتنا حسن تو آج تک میں نے پورے ورلڈ میں نہیں دیکھا۔ جو آج اس کلاس روم میں دیکھ رہا ہوں۔ پورا روم چمک رہا ہے۔ میری تو آنکھیں چند ہیار ہی ہیں۔“ آزر نے کہا۔

”کہاں ہے حسن؟“ اس کے ساتھی لڑکے نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”یار تمہیں واقعی کچھ دکھائی نہیں دے رہا..... یا پھر تمہاری آنکھوں میں بھی اسے دیکھ کر سیاہی بھر گئی ہے۔“ آزر نے یمنی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ یمنی ان کی باتیں سنتی رہی مگر خاموشی سے اپنے موبائل کے ساتھ بیٹھی لڑکی بھی وہ سب باتیں سن رہی تھی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ نقاب پوش لڑکی نے پوچھا۔

”یمنی جمال.....“ وہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”میں حمہ عابد ہوں.....“ اس نے اپنا تعارف کرایا مگر یمنی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے موبائل کے ساتھ بدستور مصروف رہی۔

نیل بچتے ہی پروفیسر راضیہ کلاس روم میں داخل ہوئیں تو سب اسٹوڈنٹس بہت ڈپلن سے اپنی جیسز سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ”Sitdown“ کہہ کر تعارف کا مرحلہ طے ہوا پھر وہ ابتدائی لیکچر دینا شروع ہوئیں تو یمنی بہت توجہ سے انہیں سنتی رہی اور اپنی نوٹ بک میں پوائنٹس لکھتی رہی۔ حمہ بھی لکھتے ہوئے بار بار اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بہت روانی سے لکھ رہی تھی۔ اور اس کی ہینڈ رائٹنگ بہت خوب

”ڈرائیور کیوں..... میں اور تمہاری ماما خود تمہیں کالج ڈراپ کرنے جائیں گے۔ کیوں ایمن.....؟“ جمال صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔ ہماری بیٹی کا آج کالج میں پہلا دن ہے۔“ ایمن نے بھی مسکرا کر یمنی کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے محبت سے کہا۔

”ڈیڈی میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ کالج ہی تو جانا ہے۔ یہ کون سی اہم بات ہے۔“ یمنی نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”تمہارے لیے نہیں مگر ہمارے لیے یہ بہت اہم اور خوشی کی بات ہے۔“ جمال صاحب نے مسکرا کر کہا اور دونوں اس کو کالج ڈراپ کرنے چلے گئے۔ وہ کالج میں داخل ہوئی تو اس کے لیے سب کچھ بہت عجیب اور نیا تھا..... وہ کلاس روم ڈھونڈتی ہوئی مطلوبہ روم میں داخل ہو گئی۔ وہ بہت اعتماد کے ساتھ دوسری رو میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ایک نقاب پوش لڑکی بیٹھی تھی جس کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر سفید تھے کہ یمنی نے ایک دم چونک کر اس کے سفید خوب صورت ہاتھوں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر لڑکوں کا ایک گروپ بیٹھا تھا جو بار بار اسے دیکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ ابھی لیکچر شروع ہونے میں کچھ ٹائم تھا۔ اسٹوڈنٹس کلاس روم تلاش کرتے ادھر آ رہے تھے کیونکہ سب کا کالج میں فرسٹ ڈے تھا۔ اس لیے چہروں پر خوشی بھی تھی اور آنکھوں میں حیرانی بھی کہ وہ ہر شے اور ہر چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ایک انتہائی خوب صورت اسمارٹ سرخ و سفید رنگت والا لڑکا اسٹائلش ڈریس پہنے اور برانڈڈ گلاسز لگائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ لڑکوں کے گروپ نے ہاتھ ہلا کر اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”ہائے..... آزر come here“

یمنی کا کالج میں پہلا دن تھا۔ جمال صاحب نے اس کا ایڈمیشن شہر کے سب سے بہترین اور مشہور کالج میں کروایا تھا۔ اس کالج میں ان کا اپنا بھی بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا کیونکہ وہ اس کے سب سے بڑے ڈونر تھے۔ یمنی تیار ہو کر ڈائنگ ٹیبل کے پاس آئی۔ جمال صاحب اور ایمن ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ جمال صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”آج میرے بیٹے کا کالج میں فرسٹ ڈے ہے۔ آئی وٹ یو بیسٹ آف لک.....“ انہوں نے کھڑے ہو کر محبت سے اس کو اپنے ساتھ لگا کر چومتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو ڈیڈی..... آپ ڈرائیور سے کہیں مجھے کالج ڈراپ کر دے۔“ یمنی نے بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

سوج رہی ہوں۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”کچھ ایسا غلط بھی نہیں سوچا۔“ روجیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر میں بات چلاؤں۔“ ماں جی نے خوش ہو کر کہا۔

”آپ کی مرضی ہے لیکن یہ بات اچھی طرح کنفرم کر لیجیے گا کہ وہ واقعی ہی اچھی لڑکی ہے، آئی میں اس کا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہ ہو، مجھے ایسی لڑکیاں ہرگز پسند نہیں۔“ روجیل نے مسکرا کر کہا۔

”فضول باتیں مت کرو، وہ دیکھنے سے ہی اچھی لڑکی لگی ہے۔“ ماں جی نے منہ بنا کر کہا۔

”ٹھیک ہے..... آپ اپنی لڑکی کے بارے میں سوچیں، میں تو سونے جا رہا ہوں۔“ وہ ماں جی کو کنبل اوڑھا کر بیڈ کے تنکے درست کر کے کمرے سے نکل گیا۔

”آج میرے بیٹے کا کالج میں فرسٹ ڈے ہے۔ آئی وٹ یو بیسٹ آف لک.....“ انہوں نے کھڑے ہو کر محبت سے اس کو اپنے ساتھ لگا کر چومتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو ڈیڈی..... آپ ڈرائیور سے کہیں مجھے کالج ڈراپ کر دے۔“ یمنی نے بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

سوج رہی ہوں۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”کچھ ایسا غلط بھی نہیں سوچا۔“ روجیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر میں بات چلاؤں۔“ ماں جی نے خوش ہو کر کہا۔

”آپ کی مرضی ہے لیکن یہ بات اچھی طرح کنفرم کر لیجیے گا کہ وہ واقعی ہی اچھی لڑکی ہے، آئی میں اس کا کسی کے ساتھ کوئی افیئر نہ ہو، مجھے ایسی لڑکیاں ہرگز پسند نہیں۔“ روجیل نے مسکرا کر کہا۔

”فضول باتیں مت کرو، وہ دیکھنے سے ہی اچھی لڑکی لگی ہے۔“ ماں جی نے منہ بنا کر کہا۔

”ٹھیک ہے..... آپ اپنی لڑکی کے بارے میں سوچیں، میں تو سونے جا رہا ہوں۔“ وہ ماں جی کو کنبل اوڑھا کر بیڈ کے تنکے درست کر کے کمرے سے نکل گیا۔

TY.COM

لفظوں کے موتی

☆ کسی کو بھی معلوم نہیں اس کا اگلا شکار کون ہوگا۔

☆ جب آپ پہلا قدم اٹھالیتے ہیں، تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر واپسی نہیں ہوتی، گھڑا بے شک کچا ہو پھر بھی پار پہنچا دیتا ہے۔

☆ موت ایک بہت بڑے صبر کی مالک ہے اور وہ کبھی بے صبری نہیں ہوتی۔

☆ ہمت بھی عجیب پھولے ہوئے غبارے جیسی ہوتی ہے۔ ذرا نا موافق بات کی سوئی چھبی، شکل ہی نہیں حالت اور حالات تک بدل دیتی ہے۔

☆ یہ دنیا مکافات عمل کا نام ہے آج کسی کی راہ میں تم پتھر رکھو گے تو آنے والا وقت تمہاری راہ میں پہاڑ بن جائے گا۔

☆ خاموشی ایسے پردے کا نام ہے جس کے پیچھے لیاقت بھی ہو سکتی ہے اور حماقت بھی ہو سکتی ہے۔

☆ وہ بات اکثر بہت انمول ہوتی ہے جس میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں۔

☆ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدرمرجان

چھوڑ کر ایک فلیٹ کرایہ پر لے کر رہ رہا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ اپنی غیر موجودگی میں اس کے دادا کو اس کے پاس چھوڑ کر گیا تھا اور اس کا دادا اکبر علی کافی سخت مزاج انسان تھا۔ اور وہ آزر پر کافی سختی کرتا۔ بہت زیادہ روک ٹوک اور پوچھ گچھ سے آزر کو چڑھنے لگی تھی اور دادا سے جھگڑ کر اس نے ایک فلیٹ کرایہ پر لے لیا۔ جہاں وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ بھر پور عیش اور مستیاں کرتا۔ رات گئے تک وہ

چھوڑوں گا۔“ وہ انہیں دھکا دے کر اپنی وارڈروب میں سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ ایک خانے سے ریو اور نکال کر اس نے اسے پینٹ کی جیب میں ڈالنا چاہا۔ تو جواد نے آگے بڑھ کر اس سے ریو اور چھیننے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں ریو اور سے گولی بھل کر اس کے پاؤں میں لگ گئی۔ سب گھبرا گئے۔ آزر بری طرح تڑپنے لگا۔

”جلدی سے اسے اسپتال لے چلو۔“ فرخ نے کہا اور وہ دونوں اسے جلدی سے اٹھا کر فلیٹ سے باہر لے گئے۔

آزر اپنے ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے انتہائی خود سر، ضدی اور مغرور تھا۔ ماں ایک معمولی تعلیم یافتہ عورت تھی۔ اور باپ بھی معمولی بزنس سے ہیرا پھیریاں اور دو نمبر کام کر کے اب ایک امیر اور کامیاب بزنس مین بن چکا تھا۔ زندگی کی اچھی روایات اور اخلاقی قدروں کا لحاظ یا کسی قسم کا کوئی تصور بھی ان کے خاندان میں ناپید تھا۔ ماں، باپ کی اپنی دنیا تھی اور آزر کی دنیا میں دخل دینے کا حق اس نے کسی کو نہیں دیا تھا۔ نہ تو اس کی تربیت اخلاقی اقدار پر ہوئی تھی اور نہ ہی مذہبی..... ماں شیم اختر سے مسز شمی عظیم بن کر قیمتی اور ماڈرن ڈریسز، میک اپ اور جیولری پہنے یا تو پارلرز کے چکر لگاتی یا پھر ایسی پارٹیز میں جانی جہاں نو دولت خواتین اپنے ملبوسات اور زیورات کی بھرپور نمود و نمائش کرتیں۔ آزر کیا کرتا ہے، کہاں جاتا اور اس کی کیا سرگرمیاں ہیں۔ نہ ماں کو کچھ علم ہوتا اور نہ ہی باپ کو۔ باپ آئے روز بزنس ٹورز کے سلسلے میں بیرون ممالک کے چکر لگاتا رہتا اور آزر کو کھلے پیسے دے کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتا۔ اب گزشتہ چھ ماہ سے اس کی ماں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ امریکا سیٹلڈ ہو گئی تھی تاکہ وہ آزر کو بھی فیوجہ میں امریکا ہی میں سیٹ کر دے۔ آزر ڈیفنس میں اپنا تین کنال کا بنگلا

سے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ اس کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ حمزہ سسکیاں بھر رہی تھی اور یمنی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ یمنی نے اپنا کالا سیاہ ہاتھ اس کے سفید سر میں ہاتھ پر رکھا۔

”بہت کوشش کرتی ہوں مگر ان محرومیوں کو ختم نہیں کر سکتی۔“ حمزہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا۔

”تمہاری اس خامی کو اب میں دور کروں گی۔“ یمنی نے بڑے اعتماد اور خلوص سے کہا تو حمزہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ چس ختم کرو، میں تمہارے لیے کولڈ ڈرنک لے کر آتی ہوں۔“ یمنی اپنی سیٹ سے اٹھی اور جلدی سے اس کے لیے ایک کولڈ ڈرنک لے کر آ گئی۔

”آپ نے کیوں تکلف کیا؟“ حمزہ نے قدرے گھبرا کر کہا۔

”تم جب تک اپنی پرستش سے خوف ختم نہیں کرو گی، تب تک پر اعتماد نہیں ہو سکتیں۔“ یمنی نے کہا۔

”تو کیا کروں؟“ حمزہ نے چونک کر پوچھا۔

”کہو..... یمنی ایک نہیں دو کولڈ ڈرنکس لے کر آؤ اور اس کے ساتھ برگر بھی کیونکہ مجھے بھوک لگی ہے۔“ یمنی نے اتنے اعتماد سے کہا تو حمزہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

”that's good“ یمنی نے مسکرا کر کہا اور کولڈ ڈرنک اس کی جانب بڑھائی۔

”صرف یہ..... برگر کہاں ہے؟“ حمزہ نے جلدی سے کہا تو یمنی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی سیٹ سے اٹھی۔

”excellent اب ایک نہیں دو برگر لاؤں گی۔ ایک تمہارے لیے..... اور.....“

”دوسرا بھی میرے لیے.....“ حمزہ جلدی سے اس

صرف خوش ہوں۔ متاثر نہ ہوں.....“ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے یمنی نے ٹھوس لہجے میں اور متاثر کن الفاظ میں کہا تو حمزہ خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔

”کیوں..... کیا ہوا۔ کیا تم میری باتوں سے ہرٹ ہو رہی ہو؟“ یمنی نے اس کی آنکھوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”محرومیاں انسان کو کبھی پر اعتماد ہونے نہیں دیتیں۔“ حمزہ نے آہ بھر کر جواب دیا۔

”کیسی محرومیاں.....؟“ یمنی نے حیرت سے پوچھا۔

”چھوٹی چھوٹی نامکمل خواہشات بڑھتے بڑھتے ایسی محرومیاں اور complexes بن جاتی ہیں جو کسی آسیب کی طرح انسان کے وجود کے ساتھ چمٹی رہتی ہیں اور ہزار کوشش کے باوجود بھی... ان سے چھٹکارا نہیں ملتا..... میں قرآن پاک کی حافظہ ہوں اور اللہ کی ذات پر مکمل یقین بھی رکھتی ہوں اور ایمان بھی۔ اس نے مجھے بہت عطا کیا ہے مگر بہت کچھ چھینا بھی ہے اس کی عطائیں مجھے اتنا خوش نہیں کرتیں جتنا کہ اس کا چھیننا مجھے دکھی کرتا ہے۔“ حمزہ نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

”اس نے تم سے کیا چھینا ہے؟“ یمنی نے کولڈ ڈرنک ختم کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”میرے ماں، باپ اور دو بہن بھائی بچپن میں ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور تب سے اب تک میں اپنے چچا اور چچی کے رحم و کرم پر ہوں۔ انہوں نے میری پرورش اور تربیت بہت اچھی کی ہے مگر وہ خوشی، سکون، اعتبار اور اعتماد نہیں دیا جو شاید تمہارے والدین نے تمہیں دیا ہے۔“ حمزہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے اپنا نقاب چہرے سے ہٹا دیا۔ اسے صرف یمنی دیکھ پارہی تھی۔ وہ ٹشو پیپر سے اپنے چہرے کو صاف کرنے لگی۔ یمنی حیرت

”کیوں..... کیا میرے سر پر سینگ لگے ہوئے ہیں یا دانت ڈریکولا کی طرح باہر ہیں۔“

”عجیب ہے مجھ میں؟“ یمنی نے پر اعتماد لہجے میں مسکرا کر پوچھا۔

”وہ..... وہ آپ۔“ حمزہ کچھ کہتے ہوئے رکی۔

”آپ نہیں تم، تم میں اعتماد کی بہت کمی ہے۔ کہنا چاہتی ہو کھل کر کیوں نہیں کہتیں۔“ یمنی نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... شاید۔“ حمزہ نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تم بہت خوب صورت ہو۔ میں کس شے کی کمی ہے، اپنے آپ کو کرٹشل کا شوق مت بناؤ..... جس کی خوب صورتی کو دیکھ کر لوگ

”اوہ..... آئی سی..... تو پھر؟“ اس نے خیر انداز میں پوچھا۔

”وہ..... وہ۔“ حمزہ رک رک کر بولی۔

”آئی ایم شیور..... وہ میرے تھپڑ سے اسپتال میں ایڈمٹ نہیں ہوا ہوگا۔ ضرور کوئی اور بات ہوگی۔“ اس نے اسی بے پروائی سے جواب دیا۔

”نہیں، اس کے پاؤں میں گولی لگی ہے۔“ حمزہ نے جلدی سے بتایا۔

”تو اب آپ کیا چاہتی ہیں کیا میں اسپتال کی خیریت پوچھنے جاؤں؟“ یمنی نے اس انداز سے سوال کیا کہ حمزہ شرمندہ ہو گئی۔

”میں تو یونہی بتا رہی تھی۔“ حمزہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا لو چس کھاؤ۔“ یمنی نے چس کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو حمزہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور بیٹھ گئی۔

”آپ کتنی عجیب لڑکی ہیں، میں نے آج تک آپ جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔“ حمزہ نے اس سے چس لیتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیا میرے سر پر سینگ لگے ہوئے ہیں یا دانت ڈریکولا کی طرح باہر ہیں۔“

”عجیب ہے مجھ میں؟“ یمنی نے پر اعتماد لہجے میں مسکرا کر پوچھا۔

”وہ..... وہ آپ۔“ حمزہ کچھ کہتے ہوئے رکی۔

”آپ نہیں تم، تم میں اعتماد کی بہت کمی ہے۔ کہنا چاہتی ہو کھل کر کیوں نہیں کہتیں۔“ یمنی نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... شاید۔“ حمزہ نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

”میرا خیال ہے تم بہت خوب صورت ہو۔ میں کس شے کی کمی ہے، اپنے آپ کو کرٹشل کا شوق مت بناؤ..... جس کی خوب صورتی کو دیکھ کر لوگ

دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا۔ ان کے ساتھ ہوٹلنگ کرتا، ڈرنک کرتا اور بھی بہت کچھ کرتا..... وہ اپنی لائف کو اب خوب انجوائے کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک کسی بھی انسان کی نہ تو کوئی عزت تھی اور نہ ہی کوئی احترام..... جو چیز اسے پسند آتی وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرتا..... چاہے اس کے لیے اسے کسی شخص کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ اس کے اندر سرکشی کے ساتھ بے حسی اور فرعونیت کا عنصر نمایاں ہو رہا تھا۔ بدتمیز، بے باک اور بد لحاظ جوان..... آزر ایک ایسی دلدل میں ڈھنس رہا تھا، جس کا اسے نہ تو کوئی احساس تھا اور نہ ہی کوئی شعور..... راہ چلتی لڑکیوں سے مذاق کرتا، ان سے بدتمیزی کرنا اس کے لیے بہت عام سا مشغلہ تھا۔ یمنی جمال کو چھیڑتا بھی اس کے لیے ایک عام سی بات تھی مگر اس کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ یمنی جیسی معمولی شکل کی لڑکی یوں ری ایکٹ کرے گی۔ اس کے رد عمل نے اسے یوں مجبوظ الحواس کر دیا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے نہ صرف ہڈیاں بکنے لگا بلکہ..... قدرے جنونی بھی ہو گیا تھا اور اب وہ اسپتال میں ایمر جنسی روم میں پڑا تھا۔ اس کے دوست پریشان حال اسپتال میں جمع تھے..... اور اس کے آپریشن کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ڈرتے ہوئے اس کے ماں باپ کو بھی انفارم نہیں کر رہے تھے کہ کہیں ان پر ہی کوئی الزام نہ آجائے۔

☆ ☆ ☆

یمنی کیفے ٹیریا میں بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی تھی کہ حمزہ قدرے پریشان اس کے پاس بھاگتی ہوئی آئی۔

”یمنی کیا آپ کو معلوم ہوا کہ آزر اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔“ حمزہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”کون آزر؟“ یمنی نے بے پروائی سے چس کا پیکٹ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

”وہی آزر جسے کل آپ نے تھپڑ مارا تھا۔“

حمزہ نے بتایا۔

ماہنامہ پاکیزہ 84 جنوری 2013

کی بات کاٹے ہوئے بولی تو دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

☆☆☆

آزر کو ہوش آچکا تھا اور آپریشن کر کے اس کے پاؤں سے گولی نکال دی گئی تھی۔ اس کے دوست وہیں تھے۔ وہ سب اس کا دل بہلانے کو اس سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے مگر آزر کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

”یار تمہارا آپریشن بالکل ٹھیک ہو چکا ہے اور اب چند دنوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے..... پھر ادا اس کیوں ہو رہے ہو؟“ جواد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں.....“ آزر نے برا سامنے بنا کر جواب دیا۔

”اگر تم چاہتے ہو تو تمہارے پیرنٹس کو انفارم کریں؟“ فرخ نے پوچھا۔

”نہیں، وہ کیا کریں گے سوائے بار بار مجھے کال کرنے کے۔“ آزر نے بیزاری سے جواب دیا۔

”پھر تمہارے چہرے پر اتنی افسردگی کیوں چھائی ہوئی ہے۔ کیا وہ یاد آرہی ہے؟“ اسامہ نے مذاق کرتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔

”شٹ اپ.....“ آزر نے غصے سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تو سب خاموش ہو گئے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”آئی ایم سوری۔“ آزر قدرے توقف کے بعد بولا..... مگر پھر بھی سب خاموش رہے۔

”تم لوگ بار بار اس کا ذکر کر کے مجھے نارچ کرنے کی کوشش کرتے ہو اور مجھے اس سے اپنی انسٹ فیل ہوتی ہے۔“ آزر نے گہری سانس لیتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

”آئی ایم سوری یار..... تم نے تو اس کو بہت سیرسلی لیا ہے۔ just leave it now“

اسامہ نے لائٹ موڈ میں کہا۔

”کاش میں بھی اس بات کو تمہاری طرح بہت لالچلی لے سکتا۔“ آزر نے غصے سے جواب دیا۔

”تم کب سے اتنے sensitive ہونے لگے؟“ جواد نے حیرت سے پوچھا۔

”جب سے میری انسٹ ہوئی ہے میرے اندر اک آگ سی بھڑک رہی ہے۔“ آزر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”یار اب ہم تمہیں یہ مشورہ تو نہیں دیں گے کہ تم بھی جا کر اسے ایک پھٹر لگا دو، اس لیے ایسی انتقامی باتیں سوچنے کا کیا فائدہ، پلیز کول ڈاؤن ناؤ۔“

فرخ نے اپنی رائے دی۔

”ہاں..... یار اب چھوڑو بھی اس بات کو..... کیوں سر پر سوار کر کے بیٹھے ہو۔ کبھی موقع ملا تو بدل لے لینا۔ be brave“ جواد نے کہا جو اس کا سب سے قریبی دوست تھا۔

”cheer up now“ اسامہ نے کہا..... تو آزر نے زیر لب مسکرا کر سب دوستوں کی طرف دیکھا۔

”یہ ہوئی نا بات.....“ فرخ نے کہا اور سب مسکرا کر آزر کی طرف دیکھنے لگے۔

☆☆☆

فہام پینٹ کوٹ میں ملبوس آفس جانے کے لیے تیار ہو کر لاؤنج میں آیا تو خدیجہ صوفی پر بیٹھی موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ ردا انتہائی خوشی میں کمرے سے بھاگتے ہوئے لاؤنج میں آئی۔

”فہام بھائی! میں پاس ہو گئی اور میرا A“ گریڈ آیا ہے۔ میں ابھی انجی کمپیوٹر پر رزلٹ دیکھ کر آئی ہوں۔“ ردا نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا تو فہام نے خوشی سے اپنے دونوں بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے محبت سے چوما۔

”مبارک ہو..... واہ..... آج تو میری گڑیا گریجویٹ ہو گئی۔“ فہام نے خوشی سے کہا تو شمیمہ

فہام کا آفس بیگ لے کر کمرے سے باہر نکلی اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لگے دیکھ کر چوکی۔

”فہام..... آپ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں۔“ شمیمہ نے بیگ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”بھئی..... اب تو میں آفس نہیں جا رہا..... میری گڑیا پاس ہوئی ہے۔ آج میں اسے خوب گھماؤں گا، پھر آؤں گا..... شاپنگ کراؤں گا اور رات کو ہم سب ڈنر کے لیے باہر جائیں گے۔“

فہام نے ردا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو شمیمہ کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔

”رات کو تو ہم نے.....؟“ شمیمہ نے آہستہ آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے سارے پروگرام کینسل..... آج صرف ردا کی success celebrate ہوگی۔“ فہام نے ایک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو شمیمہ نے چونک کر اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر ردا کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں..... ردا کی خوشی سے بڑے کر ہمیں کچھ عزیز نہیں۔“ شمیمہ نے چونک کر اسے دیکھا اور جلدی سے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”that's good“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو..... خدا تمہیں ہمیشہ کامیابیاں دے..... اور تمہیں بہت خوش رکھے“ خدیجہ نے محبت سے بیٹی کو چومتے ہوئے کہا۔

”آمین.....“ فہام نے جلدی سے کہا تو سب مسکرانے لگے۔

☆☆☆

ماں جی لاؤنج میں صوفی پر بیٹھی تھیں پڑھنے میں مصروف تھیں۔ روچیل آفس سے تھکا ہوا آیا اور ماں جی کے قریب خاموشی سے صوفی پر بیٹھ گیا اور صوفی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا کیونکہ ماں جی

آنکھیں بند کیے ورد پڑھنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں تو وہ مسکرا ہوا تھا۔

”الہ تمہیں لمبی زندگی، خوشیاں اور محبت دے۔“ ماں جی نے روچیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بیٹا کھانا لاؤں؟“ ماں جی نے روچیل کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... ابھی مجھے بھوک نہیں ہے، پہلے فریش ہو جاؤں پھر بعد میں کھاؤں گا۔“ روچیل نے انگریزی لیتے ہوئے جواب دیا۔

”بیٹا! آج میں نے یاد رکھی امی کو فون کیا تھا۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے روچیل سے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”کیوں.....؟“ روچیل نے یک دم چونک کر پوچھا۔

”وہ اس لڑکی ردا کے لیے۔“ ہمیں یاد ہے ناں؟“ ماں جی نے مسکرا کر کہا۔

”ماں جی..... آپ کو کیا ہو گیا ہے، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ روچیل نے حیرت سے کہا۔

”بیٹا! میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ تمہاری اور ردا کی بات چلائیں۔“ ماں جی نے خوش ہو کر رازدارانہ انداز میں کہا تو وہ چونکا۔

”ماں جی! آپ تو واقعی سیریس ہو گئی ہیں۔“ روچیل نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کھیں دیب جلے کھیں دل

کھیں بند کیے ورد پڑھنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں تو وہ مسکرا ہوا تھا۔

”الہ تمہیں لمبی زندگی، خوشیاں اور محبت دے۔“ ماں جی نے روچیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بیٹا کھانا لاؤں؟“ ماں جی نے روچیل کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... ابھی مجھے بھوک نہیں ہے، پہلے فریش ہو جاؤں پھر بعد میں کھاؤں گا۔“ روچیل نے انگریزی لیتے ہوئے جواب دیا۔

”بیٹا! آج میں نے یاد رکھی امی کو فون کیا تھا۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے روچیل سے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

”کیوں.....؟“ روچیل نے یک دم چونک کر پوچھا۔

”وہ اس لڑکی ردا کے لیے۔“ ہمیں یاد ہے ناں؟“ ماں جی نے مسکرا کر کہا۔

”ماں جی..... آپ کو کیا ہو گیا ہے، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“ روچیل نے حیرت سے کہا۔

”بیٹا! میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ تمہاری اور ردا کی بات چلائیں۔“ ماں جی نے خوش ہو کر رازدارانہ انداز میں کہا تو وہ چونکا۔

”ماں جی! آپ تو واقعی سیریس ہو گئی ہیں۔“ روچیل نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... وہ لڑکی ایسی میرے دل میں سمائی ہے، وہ مجھے بھولتی ہی نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ابھی جا کر تمہارے رشتے کی بات پکی کر آؤں۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا اور ان کے چہرے پر خوشی

ماں جی لاؤنج میں صوفی پر بیٹھی تھیں پڑھنے میں مصروف تھیں۔ روچیل آفس سے تھکا ہوا آیا اور ماں جی کے قریب خاموشی سے صوفی پر بیٹھ گیا اور صوفی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا کیونکہ ماں جی

آنکھیں بند کیے ورد پڑھنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں تو وہ مسکرا ہوا تھا۔

”الہ تمہیں لمبی زندگی، خوشیاں اور محبت دے۔“ ماں جی نے روچیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بیٹا کھانا لاؤں؟“ ماں جی نے روچیل کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... ابھی مجھے بھوک نہیں ہے، پہلے فریش ہو جاؤں پھر بعد میں کھاؤں گا۔“ روچیل نے انگریزی لیتے ہوئے جواب دیا۔

”بیٹا! آج میں نے یاد رکھی امی کو فون کیا تھا۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے روچیل سے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

انارکلی

مدیحہ عدنان

رفعت نے کونے والا کمر مہمان کے لیے تیار کر دیا تھا جو صرف خاص الخاص مہمانوں کے لیے وقف تھا۔ ضرور کوئی بہت خاص مہمان آرہا تھا ورنہ شہباز جیسے بے دید، کنجوس اور موقع پرست شخص سے کسی کی مہمان نوازی کی امید ہی عبث تھی۔ اس نے تو کبھی اپنے سگے رشتے داروں کو منہ نہیں لگایا، ہمسایوں سے سلام دعا کی ضرورت نہیں سمجھی۔

”ضرور ہی سردار سائیں کا کوئی خاص مہمان



ہے“ فہام نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
”تھینک یو فہام بھائی۔“ ردا نے مسکرا کر فہام کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مائی ڈیئر..... تم مجھے تھینکس نہیں صرف آرڈر کیا کرو۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو ردا مسکراتے لگی۔
شمیلہ آنکھیں گھما کر اسے دیکھ کر کھانا کھانے لگی۔

”آج ڈنر پر حاتم بھائی کو بہت miss کر رہے ہیں۔“ عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”تم اسے مس نہ کرو..... وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔“ فہام نے اپنا موبائل نکال کر حاتم کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

”یار..... حاتم..... بہت مبارک ہو، آج ہماری سوٹ ڈول نے بہت اچھے مارکس سے بی اے پاس کر لیا ہے۔“ فہام نے قدرے بلند آواز میں خوش ہو کر کہا۔

”ریٹلی..... یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔“ حاتم خوش ہو کر بولا۔

”لو..... تم ردا سے بات کرو۔“ فہام نے ردا کو موبائل پکڑاتے ہوئے حاتم سے کہا اور حاتم ردا سے گفٹ کے متعلق پوچھنے لگا۔ وہ چاکلیٹس کی فرمائش کرنے لگی۔

”اچھا ذرا فہام بھائی کو فون دو۔“ حاتم نے ہنستے ہوئے کہا تو ردا نے موبائل فہام کو دے دیا۔
”فہام بھائی..... وہ میجر پر اہلیم؟“ حاتم نے رازدارانہ انداز میں فہام سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں یار..... ایسا کوئی مسئلہ نہیں..... سب ٹھیک ہے، تم فکر نہیں کرو۔“ فہام نے مسکرا کر تسلی دیتے ہوئے کہا، خدیجہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو فہام اٹھ کر ایک طرف جا کر باتیں کرنے لگا اور خدیجہ کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

(باقی آئندہ)

کے رنگ نمایاں ہونے لگے۔

”اوہ..... ماں جی آپ تو حد کر رہی ہیں۔ بھلا اتنی جلدی اور وہ بھی لڑکی کو جانچے بغیر۔“ روہیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس لیے مجھے اس کے بارے میں کچھ جانچنے کی ضرورت نہیں۔ یاور کی امی کہہ رہی تھیں کہ وہ کل ردا کی امی سے بات کریں گی۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو روہیل ایک گہری سانس لے کر ماں جی کی طرف دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

ساری فیملی ایک چائیز ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے میں مصروف تھی۔ ردا خاص طور پر تیار ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ٹیبل پر کافی زیادہ گفٹس رکھے تھے اور وہ چہرے سے بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔

”ہاں..... بھئی فہام بھائی کی گریجویٹ ڈولی! اب کیا ارادے ہیں؟“ عاصم نے مسکرا کر ردا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو فہام بھائی کو ہی پتا ہے کہ میرا کس یونیورسٹی میں ایڈمیشن کرانا ہے۔“ ردا نے مسکراتے ہوئے فہام کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں..... میں کل ہی تمام یونیورسٹیز کے بارے میں انفارمیشن لیتا ہوں اور جس سبجیکٹ میں ردا ماسٹرز کرنا چاہے اس میں ایڈمیشن کرادوں گا۔“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں..... یہ I.T کا زمانہ ہے کوئی کمپیوٹر کورس کروادیں۔“ شمیلہ نے منہ بنا کر بیزاری سے کہا۔

”نہیں، نہیں میری گڑیا ماسٹرز کرے گی۔ یہ میری خواہش ہے اور ردا کا خواب۔ اور اسے معمولی کورسز کرنے کی ضرورت نہیں اتنا تو وہ جانتی

ہوگا جس کا یوں شاندار استقبال کیا جا رہا ہے۔“ یہ ان تینوں کا خیال تھا کیونکہ سردار ہی ایسی شخصیت تھا جس سے شہباز دبتا تھا اور نہ تو وہ کسی کو خاطر میں لانے والا بندہ نہیں تھا اور اس اکڑ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سردار سائیں کا کم دار تھا۔ علاقے میں اس کا بڑا ٹیکا تھا۔

☆☆☆

نادرہ، شہباز کی پہلی بیوی تھی۔ اس کی بچپن کی منگ اور سکے تائیا کی بیٹی جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے شادی کرنی پڑی۔ وہ اس سے پانچ برس بڑی تھی مگر خاندان اور برادری کی وجہ سے وہ اس وقت مجبور ہو گیا تھا لیکن شادی کے گیارہ سال بعد اس نے رفعت سے اپنی پسند سے شادی کر لی۔ تائیا، تائی وفات پا چکے تھے۔ نادرہ کے بھائی اپنے گھریا والے تھے اور پھر سردار کا کم دار ہونے کی حیثیت سے سب ہی اس سے دبتے تھے۔ سونا نادرہ بھی رو پیٹ کے خاموش ہو گئی لیکن اس کا پلڑا پھر بھی ہمیشہ بھاری رہا اس لیے کہ وہ شہباز کے دو بیٹوں کی ماں تھی جبکہ رفعت کی اوپر تلے تین بیٹیاں ہوئیں۔ سانولی سلونی، دہلی پتلی رفعت تین بچیوں کی پیدائش کے بعد موٹی اور بھدی ہوئی تھی۔ سانولی رنگت میں سیاہی گھل گئی۔ لکڑیاں پھونک پھونک کر چہرے کا برا حال ہو گیا۔ محنت کش ہاتھ بھدے اور بدنما ہو گئے۔ نادرہ تو یوں بھی عمر کی زیادہ تھی اس کے چہرے اور گردن پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ بالوں میں چاندی اتر آئی لیکن پہلی بیوی ہونے کا طغتنہ برقرار تھا۔ صندل شہباز کی چھوٹی بہن تھی وہ ابھی پندرہویں برس میں لگی تھی۔ وہ اپنی دونوں بھائیوں کی بد مزاجی اور لڑائی جھگڑے کی عادی تھی۔ دونوں سوکنوں میں روایتی حسد اور دشمنی تھی۔ اکثر اوقات تو لڑائی جھگڑا مار کٹائی تک پہنچ جاتا۔ یہ روز کے تماشے تھے جن میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔

صندل نے ایک نظر دھلے دھلائے صحن پر

ڈالی۔ سرخ اینٹوں والا صحن چمک رہا تھا۔ کونے میں لگا رنگ آلود ٹلکا بھی قدرے بہتر نظر آ رہا تھا۔ صحن میں کچھی چار پائیوں پر نئی نکور چادریں بچھائی گئی تھیں شہباز نے صرف اتنا بتایا تھا کہ کوئی خاص مہمان آرہے ہیں، گھر کو اچھی طرح صاف ستھرا کیا جائے کھانے کا اچھا انتظام ہو اور سب لوگ اچھی طرح تیار ہو جائیں۔ اس مختصر سے پیغام کے بعد وہ گھر سے نکل گیا اور گھر والے صبح سے اپنے اندازے لگانے میں مصروف تھے۔

صندل جھاڑو ایک طرف رکھ کر برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔ صحن کے کونے میں لگا یہ درخت کئی پرندوں کی پناہ گاہ تھا۔ گرمیوں میں گھر کی عورتیں اس درخت کے سائے میں چار پائی ڈال کر بیٹھ جاتیں۔ یہیں سبزی بنائی جاتی، چاول چنے جاتے۔ اس کی چھاؤں میں میٹھی سی ٹھنڈک تھی۔ دن بھر کے کاموں سے تھک کر صندل جب اس کے سائے میں آکر بیٹھتی تو اسے بے حد سکون ملتا۔ یہیں اس کی آنکھیں خواب بنتیں۔ اس کے چہرے پر امیدوں کے رنگ اترتے۔ اس کی خواہشوں کے پیچھے اس درخت کی شاخوں پر اترتے اور خوشیوں کے گیت گاتے۔ زندگی کے تھکا دینے والے شب و روز میں چند گھنٹے اس پیڑ کے نیچے وہ اپنی مرضی سے گزارتی۔

رفعت نے نہادھو کر نیا سرخ ریشمی جوڑا پہنا دیا۔ اس کے بے تحاشا وزن پر عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے گھٹکر لے بالوں میں سرخ پرانہ ڈالا، آنکھوں سے سرمے سے کالی کیوں اور کانوں میں جھمکے پہنے۔ اس کے خیال میں وہ ابھی تک اس گھر کی دلہن تھی اسے مہمانوں کی آمد پر اسی طرح تیار ہونے کا تجربہ تھا۔ نادرہ البتہ کافی عرصے سے اس طرح کے سنگار سے دستبردار ہو چکی تھی۔ اس نے سادہ کالے دھاگے کی کڑھائی کا سفید سوٹ پہنا اور سادہ کڑھائی والی چادر اوڑھ لی۔ دفعتاً بیرونی دروازے

پر شور سا ہوا۔ صندل نے پھرتی سے سر پر دوپٹا ڈالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

آنے والا شہباز تھا اس کے ساتھ تین مرد اور چار عورتیں تھیں۔ اجنبی چہرے اور اجنبی نام۔ صندل تیزی سے بھائیوں کو بتانے بھاگی۔

”کون لوگ ہیں..... یہ ہماری ذات برادری کے تو نہیں لگ رہے بلکہ اس گاؤں کے بھی نہیں ہیں۔“ رفعت نے چادروں میں لپٹی عورتوں کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”بھائی کے جاننے والے ہوں گے۔ کسی کام کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔“ صندل نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

”بڑے خاص مہمان لگتے ہیں۔ تیرا بھائی کیسے مسکرا کر باتیں بگھار رہا ہے۔“ رفعت نے دروازے کی جھری سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

”صندل مہمانوں کے لیے روٹی پانی کا انتظام کرو۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ اپنی بھابی سے کہہ میٹھی لسی بھی بنادے خوب سارا گڑ ڈال کر۔“ شہباز نے باہر سے ہانک لگائی۔ صندل تیزی سے باورچی خانے کی جانب بڑھی۔

عجیب مہمان تھے تعارف ہوا اور نہ سلام دعا ہوئی۔ رفعت کا ماتھ ٹھنکا کہ کہیں یہ لوگ صندل کے رشتے کے لیے نہ آئے ہوں۔ اس نے فوراً باورچی خانے میں کام کرتی نادرہ سے اس بات کا ذکر کیا۔

”ہوں..... شاید..... ہو سکتا ہے لیکن شہباز کو ہم سے بھی تو تعارف کروانا چاہیے۔ ہمیں تو ایک مرتبہ بھی مہمانوں سے ملنے کے لیے نہیں کہا..... بس کھانے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔“ نادرہ تیوری چڑھا کے بولی۔ رفعت نے جا کر مہمانوں کو دھیرے سے سلام کیا اور صندل کے ساتھ مل کر دسترخوان لگانے لگی۔

مہمانوں کی طرف سے روکھا پھیکا سا جواب آیا۔ مہمان عورتیں لگتا تھا بے حد کم گو ہیں، مرد بھی

ایک دوسرے سے کم کم بات کر رہے تھے۔ کوئی گرم جوشی، نہ بے تکلفی اور نہ تعارف کی ضرورت سمجھی گئی البتہ کھانا خوب سیر ہو کر کھایا گیا۔ رفعت کو ہتک کا احساس ہوا تو وہ پیر پختے ہوئے باورچی خانے میں چلی آئی۔ نادرہ پیڑھی پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔

”بڑے عجیب لوگ ہیں، نہ جانے کون ہیں اس قدر بداخلاقی اور بدتہذیب..... بھوکے ندیدے۔ صرف کھانے سے مطلب ہے لگتا ہے صرف دعوت اڑانے یہاں آئے ہیں۔“ نادرہ نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور آرام سے چاول کھاتی رہی۔ صندل کی البتہ خوب دوڑیں لگ رہی تھیں۔ کبھی لسی، کبھی پانی، کبھی روٹیاں، کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا۔ نادرہ نے بچوں کا کھانا پچھواڑے میں ہی بھجوا دیا تھا۔

کھانے کے فوراً بعد مہمان واپسی کے لیے کھڑے ہوئے شہباز نے صندل کو آواز دی، صندل پھر کی طرح حاضر ہو گئی۔

”اسے اندر مہمانوں والے کمرے میں لے جاؤ۔“ شہباز نے سیاہ چادر میں لپٹی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ سانولی سلونی، کھڑے نقوش والی وہ کم عمر لڑکی تھی یہ مشکل سترہ برس کی ہوگی۔ صندل حیرت سے شہباز کی شکل دیکھنے لگی۔

”بھلا یہ لڑکی کون ہے اور یہاں کس لیے آئی ہے؟“ اس نے غور سے لڑکی کو دیکھا۔ اس کے نوعمر چہرے پر سرا۔ بے چھائی تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ جھکی پلکوں میں اضطراب چھپا ہوا تھا۔ وہ فرمانبرداری سے سر ہلانے لگی۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ وہ شہباز جیسے بارعب بھائی کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”جلدی کمرے میں لے جا اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھنا۔ یہ مہمان نہیں تیری چھوٹی بھابی ہے۔“ شہباز نے گویا دھماکا کیا۔

بھلا دو بیویوں کی موجودگی میں اسے تیسری بیوی کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی۔ صندل کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ اسے تو... رہ رہ کر رانی پر ترس آ رہا تھا۔

”یہ غریبی اور مجبوری بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ انسان سے زندگی کے سب حق چھین لیتی ہے۔“ وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے باروچی خانے میں داخل ہوئی جہاں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ جن پر ڈھیروں کھیاں بھنھنا رہی تھیں۔ شہباز کسی کام سے باہر نکلا تھا، اندر رفعت کے کمرے سے بین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے ہی بین نادرہ نے اس وقت کیے تھے جب رفعت دلہن بن کر اس گھر میں آئی تھی لیکن آج نادرہ خاموش تھی اور رفعت کو چپ کروانے والا کوئی نہیں تھا۔ شہباز سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ غصے میں دونوں بیویوں کی ایسی ٹھکائی کرتا تھا کہ کئی دنوں وہ اپنے زخموں پر مرہم رکھتی رہتیں۔ نادرہ نے تو اس سے بات کرنا ہی کم کر دی تھی لیکن رفعت سے اس کا اکثر جھگڑا ہو جاتا جو رفعت کی پٹائی پر ہی ختم ہوتا۔

صندل کو باروچی خانے میں کام سمیٹنے کافی دیر ہو گئی۔ وہ جانتی تھی آج سارا کام اسی کو کرنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد شہباز ہاتھ میں کچھ تھیلے تھامے اندر داخل ہوا اور سیدھا رانی کے کمرے میں چلا گیا۔ صندل نے ایک گہری سانس بھری اور پھر کام میں مصروف ہو گئی۔

”بے چاری رانی۔“ اس کے بے بس دل نے آہ بھری۔

☆☆☆

رانی کی آمد نے گھر میں ہلچل مچا دی۔ رفعت اسے جلانے کے لیے روزنت نئے شوخ رنگوں کے ریشمی جوڑے پہنتی مگر ہر رنگ میں وہ عجیب مضحکہ خیز لگتی۔ اپنے بے حد گھنگرا لے بالوں میں گھنگروؤں

”ہاں، ماموں کا قرض اتر گیا، ممانی اور چھوٹو کا علاج ہو گیا۔ میری بہن کی وجہ سے ماموں کے گھر باقاعدگی سے اناج اور فصل بھی پہنچ جایا کرے گی۔ ہم جیسوں کی خوشی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ اس نے حالات کے ساتھ بہت جلدی سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ یوں جیسے سیاہ پتھروں پر بارش کا پانی ٹھہر جائے۔

”ادا سائیں تم سے عمر میں بہت بڑے ہیں۔ اس بات کا دکھ تو ہو گا تمہیں؟“ صندل کو رانی سے بے حد ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ صندل اپنے بھائی کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ نہ صرف مزاج کا سخت تھا بلکہ کٹھور پن اور خود غرضی بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”میں اپنے دکھوں کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔ دکھ انسان کو ختم کر دیتے ہیں اور میں ابھی جینا چاہتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی انہونی نہیں ہوئی ایسا تو ہمارے ہاں عام ہوتا ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں شادی شدہ مردوں کے ساتھ آرام سے بیاہی جاتی ہیں اور جن لڑکیوں کے سر پر ماں باپ یا بڑے بھائی جیسے سائبان نہیں ہوتے ان کے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ برا سلوک ہوتا ہے یہ تو پھر بھی قابل قبول ہے۔“ رانی نے اپنی خالی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا کوئی نقش نہیں تھا۔

”تم نے مہندی نہیں لگائی؟“ صندل نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”جس دلہن کے ہاتھ مہندی سے خالی ہوں اس کا دل بھی ارماتوں سے خالی ہوتا ہے۔“

”تم تھوڑی دیر آرام کر لو میں باہر کا کام سمیٹ لوں ورنہ دونوں بھابھیاں شور کریں گی۔“ صندل نے گہری سانس بھر کر کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ بے حد غیر متوقع تھا۔ شہباز پینا لیس برس کا بچی عمر کا مرد اور پانچ بچوں کا باپ تھا۔

میں گولا سا انک گیا۔

”اوہ، شاید اسی لیے تمہاری شادی ادا سے کر دی گئی۔ کیا ہوا تھا تمہارے ماں باپ کو اور ادا سے تمہاری شادی کس طرح ہو گئی؟“

”وہ پچھلے سال سیلاب میں ڈوب گئے تھے بلکہ ہمارا سارا گاؤں ہی ڈوب گیا تھا۔ میں اور میری بہن اللہ کے کرم سے زندہ بچ گئے اور اس گاؤں میں اپنے ماموں اور ممانی کے پاس آ گئے۔ اپنے گھر کی چھت نہ رہے تو کوئی بھی چھت سائبان نہیں ہوتی۔ میرا ماموں سردار سائیں کی زمینوں پر مزارع کا کام کرتا ہے۔ اس پر سردار کا بہت قرض چڑھ گیا تھا، اس کے مویشی بھی رہن رکھے گئے۔ اس نے تمہارے بھائی سے بھی قرض لے رکھا تھا۔ وہ بھی کیا کرتے اس عمر میں ممانی کو آنکھوں کی بیماری ہو گئی۔ ماموں کے چھوٹے بیٹے کو گردے کی تکلیف ہو گئی۔ شہر لے جا کر دونوں کا علاج کروانا پڑا۔ ماموں غریب بندے قرض نہ دیتے تو کیا کرتے قرض بڑھتا ہی چلا گیا اور اس قرض کو اتارنے کے لیے میری بہن کی شادی سردار سائیں سے اور میری شادی تمہارے بھائی سے کرنا پڑی یوں ماموں کا قرض اتر گیا اور ہم یتیم اور بے سہارا بہنوں کا گھر بس گیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔“ اس کی شکل صورت کی طرح آواز بھی خوب صورت تھی۔

”لیکن سردار سائیں کی تو پہلے ہی تین بیویاں ہیں۔“ صندل حیرت سے بولی۔ درحقیقت اسے رانی کے حالات سن کر دلی دکھ ہوا تھا۔ سردار کی عمر پچپن، ساٹھ کے قریب تو ہو گی۔

”تو تمہارے بھائی کی بھی تو پہلے سے دو بیویاں موجود ہیں۔ بیویوں کی تعداد سے مردوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تم خوش ہو کیا؟“ صندل نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

”چھوٹی بھائی؟“ صندل کا سر گھومنے لگا۔ وہ حیرت سے گنگ ہو گئی۔

”چھوٹی بھائی اب تک تو رفعت تھی تو کیا ادا سائیں نے تیسری شادی کر لی۔“ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ آنکھیں پھاڑے اس لڑکی کو دیکھنے لگی۔ دروازے سے لگی رفعت پر گویا کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

”شہباز کی تیسری بیوی.....“ وہ دیوار کے ساتھ ہی نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ مہمان بیرونی دروازے سے باہر چلے گئے۔ صندل اس لڑکی کو لے کر کمرے میں آ گئی۔

صاف ستھرا کمر شاید اسی کا منتظر تھا۔ بستر پر نئی نکور چادر بچھی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک جانب صوفے لگے تھے۔ بڑی بڑی کھڑکیوں پر سرخ جھالروں والے پردے لٹک رہے تھے۔ فرش پر سرخ رنگ کی دری چمچی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو گھر میں وی آئی پی کی حیثیت حاصل تھی۔ گھر کے دیگر افراد کو یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ صندل نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ صندل سے بہ مشکل تین یا چار برس بڑی ہو گی۔

”رانی۔“ اس کے ہونٹوں سے بہ مشکل اپنا نکلا۔

”میں تمہیں رانی بھائی کہوں گی۔“

”نہیں، تم مجھے صرف رانی ہی کہنا۔ میں تم سے اتنی بڑی نہیں ہوں۔“ اس کے چہرے پر اک اداس سی مسکراہٹ ابھری۔

”ادا سائیں نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ تم کون ہو، کہاں کی ہو، اس گاؤں کی تو نہیں لگتی یوں اچانک ادا سے تمہاری شادی کیسے ہو گئی، تمہارے ماں باپ آسانی سے راضی ہو گئے؟“ صندل اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میرے ماں باپ نہیں ہیں۔“ رانی کے حلق

تاثر انداز میں بولی۔ اس نے لمبے بالوں کا جوڑا اپنایا ہوا تھا۔ سیاہ لباس میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ جھیل جیسی آنکھوں میں اضطراب کے رنگ تھے۔

”جی، آپ میرے ساتھ آئیں آج چودھویں کی رات ہے اور موسم بھی بہت اچھا ہے۔“ صندل نے منسوب انداز میں کہا اور اسے لیے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آنگن میں سناٹا چھایا ہوا تھا، موسم بدل رہا تھا اس لیے سب گھر والے اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے تھے۔ آسمان کی وسعتوں میں چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ وہ دونوں صحن کے کونے میں کچھی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

”تم نے کبھی میرا نام نہیں پوچھا؟“ اس لڑکی نے صندل سے سوال کیا۔

”جی، میں بھلا کیسے پوچھ سکتی ہوں۔ میرے لیے تو آپ بی بی جی ہی ہیں۔“ صندل حیران ہو گئی۔ ”میرا نام روشنی ہے۔ تم مجھ سے باتیں کر سکتی ہو۔ میں تمہاری مہمان ہوں، تمہاری مالک نہیں اور نہ ہی تم میری ملازمہ ہو پھر یہ جھک کیسی۔“ وہ اپنی نرم آواز میں بولی اس کی آواز میں اک خاص قسم کی کھنک تھی۔ ایسی خوب صورت اور مدھر آواز یوں جیسے پازیب کی چھن چھن جیسے کسی جھرنے کے گرنے کی آواز جیسے شیشے پہ پڑتی بوندوں کی آواز۔ جیسے گھنے جنگلوں میں چھپی کوئل کی کوک۔

”ادا سائیں نے آپ سے زیادہ سوال جواب کرنے سے منع کیا تھا جی۔“ صندل نے اسے یاد دلایا۔

”لیکن میں کسی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ بہت گھٹن ہے میرے اندر جسے اگر باہر نہ نکالا تو شاید میرا دل بند ہو جائے۔“ روشنی کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”اللہ خیر کرے، آپ سو سال جنیں۔ کیا ہوا آپ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے

اگلی بار ملوگی تو اسی سے پوچھ لیتا۔“ صندل نے کندھے اچکا کر رانی سے کہا جو کبھی کبھار اپنی بہن سے ملنے جاتی تھی مگر اس کی بہن یہاں نہیں آ سکتی تھی کیونکہ کچھ بھی ہو تھا تو یہ کم دار کا گھر..... اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

”وہ کون سا سارے خاندان سے گھل مل کر رہتی ہے۔ سردار نے اسے علیحدہ حصے میں رکھا ہوا ہے جہاں کسی کا آنا جانا نہیں۔“ رانی نے صندل کو جوابا کہا۔

”چلو ہمیں کیا..... ہمارا کام تو صرف مہمان کی خدمت کرنا ہے اور کیا پتا کون سی بات اسے بری لگ جائے اور وہ ادا سے شکایت کر دے۔“ صندل نے رانی کو تنبیہ کی۔ رانی نے اثبات میں سر ہلادیا۔ دونوں کام سمیٹنے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ رانی نے کافی کام خود ہی اپنے سر لے لیا تھا۔ صندل اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ لڑکی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی کو صندل نے بے حد رشک سے دیکھا۔

”کسی اچھے شیمپو سے سردھوتی ہوگی۔“ اس نے دل میں سوچا اور تخت پر رکھے برتن اٹھا کر باہر آ گئی۔ ”نہ جانے کون لڑکی ہے اور کس مصلحت کے تحت ہمارے ہاں پناہ لینے پر مجبور ہے۔“ اس نے خاموشی سے سوچا۔

گھر کے کسی فرد کو اس سے فالتو بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ رانی تینوں وقت کا کھانا اس کے کمرے میں دے جاتی۔ صندل اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی، وہ لڑکی ایک پھیلی کی طرح تھی جسے بوجھنا آسان نہیں تھا۔ صندل اس کے دھلے ہوئے کپڑے نہ کر کے رکھ رہی تھی کہ اچانک اس لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔

”اس کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے میں کچھ دیر کے لیے تازہ ہوا میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ بے

لیے اس کی آنکھوں میں بے حد احترام تھا اور وہ بے حد ادب سے پیش آ رہا تھا جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی واقعی سردار سائیں کی مہمان تھی۔ کچھ بھی تھا شہباز سردار کا بڑا وفادار تھا۔ صندل خاموشی سے اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ صندل کا کمرہ گھر کا سب سے چھوٹا کمرہ تھا۔ کسی زمانے میں یہ اسٹور ہوا کرتا تھا جہاں فالتو کاٹھ کباڑ پڑا ہوتا ہے پھر صندل نے خوب صفائی کر کے اسے اپنے رہنے کے قابل بنایا تھا۔ صندل نے فائٹ چارپائی پر نئی چادر ڈالی اور اس لڑکی کا بستر بچھایا۔ اپنا بستر اس نے کمرے میں رکھے ایک ٹوٹے ہوئے تخت پر بچھادیا۔

لڑکی نیکے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر تنگن تھی یوں جیسے کسی لمبے سفر سے آئی ہو۔ اس کا رنگ صاف اور نقوش خوب صورت تھے۔ عمر اٹھارہ برس کے قریب ہوگی۔ اس نے پیروں میں خوب صورت ڈوریوں والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ کانوں میں سونے کی بالیاں اور ناک میں پڑی سرخ نگینے والی لونگ اس کی حیثیت کا پتا دے رہی تھیں۔ صندل منسوب ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں جی؟“ اس نے باادب لہجے میں پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ اتنے میں رانی ہلکا سا دروازہ بجا کر کھانا اور پانی لے آئی۔

”آپ آرام سے کھانا کھا لیجیے، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ صندل نے کہا اور رانی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

”کچھ بتایا نہیں اس نے کہ وہ کون ہے اور اس طرح پر اسرار طریقے سے کیوں آئی ہے۔“ رانی پر جس انداز میں پوچھنے لگی۔

”نہیں، ادا نے منع کیا ہے کہ کوئی سوال جواب نہیں کرے گا لیکن کچھ دنوں میں پتا لگ ہی جائے گا۔ آخر تمہاری بہن بھی تو سردار کے گھر بیٹھی ہے

والا پراندہ ڈالتی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں پہنتی اور ہونٹوں پر تیز رنگوں کی سرخی لگاتی۔ رانی کی آمد نے اسے نفسیاتی طور پر عدم تحفظ کا شکار کر دیا تھا۔ وہ ہر حال میں رانی سے بہتر نظر آنا چاہتی تھی اور رانی کو ان چیزوں اور ہارسنگار سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ اس عمر میں تھی جب لڑکی سنگار کے بغیر ہی حسین لگتی ہے۔ شہباز تو اس کا دیوانہ تھا ایک تو وہ کم عمر اور حسین تھی دوسرے وہ کسی قسم کی بحث نہیں کرتی تھی بس اپنے کام سے کام رکھتی۔ رفعت تو اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی اور رانی کو تنگ کرنے کی وجہ سے ہی اس نے شہباز سے دوسرے زبردست مار بھی کھائی۔ نادرہ تو رانی سے الجھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی البتہ رفعت کا حسد اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتا۔

رانی کی سب سے زیادہ صندل کے ساتھ بنتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہتیں۔ رفعت صندل کو خوب ٹوکتی لیکن اسے کیا فرق پڑتا، اسے تو رانی کی صورت میں ایک سہیلی مل گئی تھی۔ ایک دن شہباز سرمئی رنگ کی چادر میں سرتاپا لپیٹی ایک اور لڑکی کو گھر لے آیا۔ ہر ایک کا ماتھا ٹھنک گیا۔ ابھی رانی کے بیاہ کو دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ وہ ایک اور لڑکی لے آیا لیکن شہباز نے آتے ہی سب کی غلط فہمی دور کر دی۔

”یہ سردار سائیں کی مہمان ہیں..... کچھ وجوہات کی بنا پر انہیں حویلی میں نہیں ٹھہرایا جا سکا کہ ان کی آمد کی خبر دشمنوں کو نہ ہو جائے۔ یہ چند دن یہاں رہیں گی پھر سردار سائیں ان کا کوئی اور بندوبست کر دیں گے۔ تم سب لوگ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ کسی شکایت کا موقع نہ دینا ورنہ میں سردار سائیں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ صندل تم انہیں اپنے کمرے میں لے جاؤ اور کوئی ان سے فضول قسم کے سوال جواب نہ کر لے، سمجھ آئی۔“ شہباز نے صندل کو اشارہ کیا۔ مہمان کے

چاندنی نے اداسی سے ان دونوں لڑکیوں کی سمت دیکھا۔ اس بیڑ کی بوڑھی شاخوں پر جھریاں نمودار ہو چکی تھیں۔

”چلیں بی بی جی اندر چلتے ہیں۔ بہت رات ہو چکی ہے۔“ صندل کی آواز ابھری۔ اس کے دل کا بوجھ اس کی روح کو بھی بوجھل کر رہا تھا۔

”کتنی خوب صورت چاندنی ہے..... ٹھنڈی میٹھی اور روپیلی۔ مجھے چاندنی راتیں بہت پسند ہیں، دل چاہتا ہے ساری رات جاگتی رہوں۔“ روشنی نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کر لیں۔ صندل خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے دیوار پر ان دونوں کے سائے بہت واضح نظر آرہے تھے۔

”آپ کا دکھ بہت بڑا ہے جی۔ اللہ سائیں آپ کو اتنا حوصلہ بھی دے۔ آپ سردار کے خاندان سے ہیں وہ آپ کے بارے میں کچھ اچھا ہی سوچیں گے۔“ صندل نے اسے تسلی دی۔

”عورت کا کوئی خاندان نہیں ہوتا۔ خون کے رشتے محض ضرورت کے رشتے ہوتے ہیں۔ یہ مردوں کا معاشرہ ہے جو عورت کی قربانی سے خوش ہوتا ہے۔ اس کا حق بھیک میں بھی دینے کا روادار نہیں ہوتا۔ ایک پاکیزہ بی بی کی موت سے اس کی کہانی ختم نہیں ہوتی۔ جرم کے نشان باقی ہیں اس لیے سزا کا فیصلہ ضرور ہوگا۔ میں ذہنی طور پر خود کو ہر سزا کے لیے تیار کر رہی ہوں۔ یہی عورت کا مقدر ہے کہ اسے اس جرم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے جس کے بارے میں اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ گناہ مردوں کے سزائیں عورتوں کو..... کتنا عجیب دستور ہے یہاں کا۔“ روشنی نے پیروں میں چلیں پھینیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ملال کے رنگ نمایاں تھے۔

سردار سائیں کے گھرانے کا اتنا اہم راز جو لوگوں سے ابھی تک مخفی تھا صندل کو ایک بھاری بوجھ کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ لوگ سردار کے متعلق

”آپ کیسے ان کے متعلق اتنا جانتی ہیں؟“ صندل کو لگا کہ یہ پہلی اب اتنی مشکل نہیں رہی۔

”اس لیے کہ میں انہی کی بیٹی ہوں۔ تمہارے سردار کی بھانجی..... جسے وہ دنیا کے سامنے اپنا نہیں کہتے لیکن ان کا غیرت مند خون مجھے شتر بے مہار چھوڑنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ مجھے اپنے ماں باپ کی غلطیوں کا کفارہ بھی ادا کرنا ہے لیکن میں نے اپنے ماں باپ کو معاف کر دیا ہے۔ مجھے ان سے کوئی جگہ نہیں۔ میں زندگی سے اپنا حق وصول کرنے والوں کو مجرم نہیں سمجھتی۔ اگر میری ماں نے غلط قدم اٹھایا تو اس کی ذمے دار فرسودہ رسم و رواج اور معاشرے کی لاقانونیت تھی۔“ روپیلی چاندنی میں اس کا اداس چہرہ اور بھی حسین لگ رہا تھا۔ فضا میں ٹھنڈک اتر آئی تھی اور یہ ٹھنڈک صندل کو اندر تک سن کر رہی تھی۔

”آپ یہاں سے کہاں جائیں گی؟“ اس نے خوفزدہ ہو کر سوال کیا۔

”خدا جانے، ابھی منزل کا تعین نہیں ہوا۔“ اس نے تاروں بھرے آسمان پر ایک نظر ڈالی۔ صندل کے دل پر بھاری بوجھ آپڑا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کی زندگی میں کتنی آزمائشیں تھیں۔

”کافی عرصے بعد کسی سے اتنی باتیں کی ہیں۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا، میں اپنے ماں باپ کے متعلق جان کر کبھی شرمندہ نہیں ہوئی۔ وہ اپنے عمل کے خود ذمے دار تھے۔ اگر میری ماں فرار نہ ہوتیں تو ان کی شادی زندگی بھر نہ ہو پانی کہ ذات برادری میں ان کے جوڑ کا کوئی نہ تھا۔ ہاں ان کے چچا کا بیٹا جو ان سے اٹھارہ برس چھوٹا تھا شاید ان کا نصیب بنتا۔ میری ماں نے بے شک انتہائی غلط قدم اٹھایا لیکن میرے نزدیک وہ ایک غلط عمل کا رد عمل تھا۔ بعض دفعہ مردہ لوگوں کے گناہ ان کے ساتھ دفن نہیں ہوتے بلکہ زندہ لوگوں کو ان کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔“ بوڑھا برگد کا درخت افسردگی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

ماں باپ کے ساتھ شہر کی شادی کی تقریب میں گئی تھیں اور وہیں کرنٹ لگنے سے ان کی وفات ہو گئی تھی۔“ صندل کو یاد آیا۔ کافی عرصے تک لوگ اس واقعے کو دہراتے رہے تھے۔ گاؤں کے اس طرح کے واقعات کی کہانی یہاں نسل در نسل سنی جاتی ہے۔ صندل نے بھی اپنی بڑی بوڑھیوں سے ایسا سنا تھا۔ ”وہ فوت نہیں ہوئی تھیں بلکہ اس کے کافی عرصے تک زندہ رہیں۔ انہیں فوت ہوئے تو محض چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔“ روشنی نے گویا دھماکا کیا۔ صندل گم صدم سی اس کی شکل دیکھتی رہی۔ وہ کون سے راز تھے جن میں وہ شریک ہونے جا رہی تھی۔ وہ ان کا بوجھ اٹھا بھی سکتی تھی یا نہیں۔

”آپ کو کیسے پتا کہ وہ زندہ تھیں پھر ایسی روپوشی کی زندگی کیوں گزاری انہوں نے؟“ صندل کا مارے حیرت کے پرا حال تھا۔ روشنی ایک کے بعد ایک انکشاف کر رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی کسی پراسرار اور پرانی حویلی کے بند کمروں کے دروازے باری باری کھولتا ہے۔

”کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتیں تو سردار کا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔ دنیا اور معاشرہ انہیں کاری قرار دے دیتا۔ درحقیقت وہ اپنے ہی ملازم کے ساتھ فرار ہو گئی تھیں اور ان کے خاندان والوں نے انہیں مردہ قرار دے کر اپنی عزت بچالی۔“ سالوں پرانی بات تھی لیکن شاید عورت کا ماضی کبھی پرانا نہیں ہوتا۔

”کسی نے انہیں ڈھونڈا نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے سردار تو زمین کی تہ میں سے بھی اپنی عورتیں نکال لیتے ہیں۔“ صندل کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

”اٹھارہ سال تک تلاش جاری رہی اور یہ تلاش ان کی موت پر ختم ہوئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک حادثے کا شکار ہو گئیں۔“ روشنی کی آواز دکھ سے بوجھل ہو گئی۔

جی؟“ صندل پریشانی سے بولی کوئی راز تھا جو روشنی کی زندگی سے بڑا تھا اور یقیناً خوشگوار راز نہیں تھا۔ روشنی خاموشی سے آسمان پر جھکتے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ چادر میں چھپا لیے۔

”آپ پڑھی لکھی لکھی ہیں۔ سردار سائیں کے گھر والوں کو تو سارا گاؤں جانتا ہے پر کبھی آپ کے بارے میں نہیں سنا۔“ صندل اپنے بھولپن اور روشنی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے شہباز کی تنبیہ فراموش کر گئی۔ ”ہاں، میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ میں نے ساری زندگی شہر میں گزاری ہے۔ وہیں کالج میں پڑھتی تھی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی اگر کوئی میرے بارے میں جان بھی لے تو کیا بلکہ میں کسی سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ یہ ڈر تو ان لوگوں کو ہے جنہوں نے یوں چوری چھپے مجھے یہاں بھیج دیا تا کہ انہیں لوگوں سے منہ نہ چھپانا پڑے۔“ روشنی نے تنفر سے کہا صندل نے چونک کر اسے دیکھا کیا وہ اسے اپنے راز میں شریک کرنا چاہتی تھی۔

”کون لوگ جی؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے سردار سائیں اور کون؟“ روشنی کے لہجے کی نفرت کسی بڑے راز کی آئینہ دار تھی۔ صندل حیرت سے ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”آپ کے کیا لگتے ہیں وہ؟“ حیرت اور تجسس اسے سوال کرنے پر مجبور کر گیا۔ روشنی نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں اس کے لب ہولے ہوئے لرزنے لگے۔

”تم بی بی پاکیزہ کے بارے میں جانتی ہو؟ تمہارے سردار کی سب سے چھوٹی بہن جو جوانی میں ہی وفات پا گئی تھیں؟“ روشنی کی آواز میں پراسراری کیفیت تھی۔ صندل کو ڈر لگنے لگا۔

”ہاں جی بہت پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنے

پوچھا۔

”ہاں جی، بھلا مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ رانی کبھی کبھار اپنی بہن سے ملنے جاتی ہے سنا ہے خوب عیش کر رہی ہے وہ۔ گھر میں نوکر چاکر ہیں اور گھر بھی خوب سجا سنورا ہے۔ شہر سے سب چیزیں منگوائی جاتی ہیں اور سردار سائیں بھی رانی کی بہن سے بہت خوش ہے۔“ صندل نے مزید معلومات فراہم کیں۔ رانی جب بھی اپنی بہن کے گھر سے آتی تھی سب باتیں صندل کو ضرور بتاتی تھی۔

”رانی کی بہن اس سے کتنی بڑی ہوگی؟“ روشنی نے پوچھا۔ اس کی فراخ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”رانی سے سال ہی تو بڑی ہے۔“

”اوہ گاڈ..... یہ تو سراسر ظلم ہے، نا انصافی ہے۔“ روشنی نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ آنگن سے آتا شور بے معنی ہو چکا تھا۔

”تم نے دیکھا مجھ بے قصور کو مرے ہوئے لوگوں کی غلطیوں کی سزا دی جا رہی ہے اور خود بے قصور اور مجبور لوگوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر خوب عیش کیا جا رہا ہے۔ کتنا دہرا معیار ہے ان طاقت ور لوگوں کا۔ کوئی ان کو بھی پوچھنے والا ہے یا نہیں۔ کوئی ان سے بھی حساب لینے والا ہے؟“

روشنی کے اندر اک جوار بھانا تھا اس کے دل میں نفرت کا آتش فشاں بھٹ پڑا۔ اس نے سختی سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بٹھینچ لیں۔

”دوسروں پر زندگی تنگ کرنے والے کتنی شان و شوکت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ ان ظالم لوگوں سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“ روشنی اپنے آپ میں نہیں رہی تھی۔ صندل پچھتا نے لگی کہ یہ آخر اسے یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

”نہ بی بی جی نہ، آپ یہاں سے جانے کا سوچے گا بھی مت۔ اس گاؤں کی ہر گلی، ہر کوچے میں

”میرے خاندان کو بیچ میں مت لاؤ۔ تمہارے خاندان کو بھی میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ رانی منہ پھیر کر بولی اور تندور روشن کر دیا۔ اک نئی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ رانی کی خاموشی آہستہ آہستہ ٹوٹتی جا رہی تھی۔

”کیا کہا میرے خاندان کو تو کیا جانتی ہے..... تیری طرح بیچ خاندان سے نہیں ہوں میں..... جو پیسوں کے بدلے بیٹیاں بیچ دیتے ہیں۔“ رفعت شروع ہو چکی تھی اور اب اسے چپ کروانا بہت مشکل تھا۔ صندل تیزی سے برآمدے میں کھڑی روشنی کی طرف لپکی۔ صحن میں شور بلند ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے گولا باری جاری تھی۔

”بی بی جی، آپ اندر چلیں۔ یہاں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔“ رفعت اب مغلفات پر اتر آئی تھی۔

”ہوں، تمہاری سب سے چھوٹی بھابی تو بہت کم عمر ہے۔“

”ہاں جی، ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بھائی نے اس سے شادی کی ہے۔“ صندل شرمندگی سے بولی۔

”مجبور اور لاوارث ہوگی؟“ اس نے اندازہ لگایا۔

”ہاں جی ورنہ بھائی سے کیوں شادی کرتی۔“

”مرد ہمیشہ عورت کی مجبوری کا فائدہ کیوں اٹھاتا ہے؟“ اس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔ صندل اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”اس کی بڑی بہن آپ کی نئی ممانی ہے جی۔“

صندل کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

”کیا مطلب؟“ روشنی حیرت سے جامد ہو گئی۔

”مطلب یہ کہ اس کی بڑی بہن سردار سائیں کے نکاح میں گئی ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم ویسے بھی وہ حویلی کے الگ حصے میں رہتی ہے۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو؟“ روشنی نے بے یقینی سے

”دیکھ لینا یہ کم عمر چھمک چھلوا ایک دن کیا چاند چڑھائے گی۔ کب تک اس بڈھے کے ساتھ رہے گی۔ ایسی لڑکیاں جن کا کوئی آگاہ چچھا نہیں ہوتا قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔“ رفعت کی آواز میں زہر تھا۔ اس کے لہجے میں بے تحاشا نفرت تھی۔

”کیوں انجادل جلاتی ہے۔ یہ آگ تجھے ہی جلا کر راکھ کر دے گی کسی اور کا کچھ نہیں جائے گا۔“ نادرہ اپنے بچوں کو نہلانے کے بعد کپڑے پہنانے لگی۔ جب سے رانی گھر میں آئی تھی نادرہ اور رفعت میں لڑائی جھگڑا کم ہو گیا تھا اور اب اکثر دونوں ایک دوسرے سے دکھ سکھ کی باتیں بھی کر لیتی تھیں۔

”کیا تجھے اس کے آنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟“ رفعت نے نادرہ کے سکون کو حیرت سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے تیرے آنے سے زیادہ تکلیف ہوئی تھی۔“ نادرہ نے اسی سکون سے جواب دیا۔ برسوں پرانی بات تھی لیکن وہ منظر آج بھی اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ رفعت کی بولتی بند ہو گئی۔ صندل نے کن انکھیوں سے دونوں کو دیکھا اور گیلا صحن جھاڑو سے صاف کرنے لگی۔ رفعت نے جھنجھلا کر صحن کے دوسرے کونے میں بنے باروچی خانے میں آ کر جھانکا۔

”سورج سر پر آ گیا ہے لیکن مہارانی سے کھانا نہیں پکایا گیا۔ حد ہوئی ہے بڈھرامی کی بھی۔“ رفعت کے لہجے میں پھنکار تھی۔ رانی سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ یونہی زہریلا ہو جاتا تھا۔

”کھانا پک چکا ہے بس روٹیاں لگانے جا رہی ہوں۔“ رانی بے تاثر لہجے میں کہتی باہر نکل آئی۔ برگد کے درخت کے قریب بنے تندور میں روٹیاں لگانے لگی۔

”روٹیاں موٹی پکانا، تمہارے جیسے بھوکے بچے خاندان کی طرح نہیں ہیں ہم لوگ۔“ رفعت ہاتھ نہ کر بولی۔

کوئی ایسی ویسی بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ صندل نے یہ راز اپنے سینے میں ہی دفن کر لیا۔

”عورت کیوں کی ہو یا سرداروں کی اس کے نصیب سے ڈر ہی لگتا ہے۔“ اس نے افسردگی سے سوچا۔ چاندنی کی روشنی میں اداسی سمٹنے لگی۔ وہ دونوں اندر چلی آئیں۔

”بی بی جی، آپ نے مجھ غریب کے دل پر بھاری بوجھ لا دیا ہے۔ میرا تو دل ایسے گہرے رازوں کا بار سہا رہی سکتا ہے یا نہیں۔ آپ کا دکھ بھی بھاری ہے اور آپ کے راز بھی۔ خدا ہی اس مشکل کو آسان کرے۔“ صندل نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

نادرہ صحن میں اپنے بچوں کو نہلا رہی تھی۔ کونے میں لگے نلکے کے قریب رکھی بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی۔ بچوں کو نہلاتے ہوئے اس کے کپڑے بھی گیلے ہو رہے تھے۔ دھوپ تیز تھی لیکن بری نہیں لگ رہی تھی۔ رفعت نے تیز نارنجی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا جس پر گلابی رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ بالوں میں سفید موتیوں والا پراندہ ڈالا تھا۔ سارے گھر والے اس کے عجیب و غریب فیشن سے تنگ آچکے تھے۔

”یہ کیا پہن رکھا ہے تم نے؟“ نادرہ نے اسے دیکھ کر بیزار سے پوچھا۔

”کیوں، مجھے ہار سنار کرنا منع ہے کیا؟ جوان ہوں، سہاگن ہوں گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے تو کیوں نہ بن سنور کر رہا کروں۔ سجنے سنورنے کو کیا صرف وہی چھپکلی رہ گئی ہے۔ دیکھ اب تو وہ میرے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہے۔“ رفعت چمک کر بولی۔

”بھڑکیلے اور شوخ رنگ کے کپڑے پہننے سے اور گسٹروؤں والے پراندے ڈالنے سے عمر کم نہیں ہو جاتی۔“ نادرہ کی بات پر رفعت نے منہ پھیر لیا۔

سردار کے آدمی موجود ہیں۔ آپ جانتی تو ہیں کہ آپ کی ذرا سی غلطی بندوقوں کے منہ کھول دے گی۔ یہاں عورت کا خون بہانا معمولی بات ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ آپ کون ہیں اور آپ کو انجام تک بھی پہنچا دیا جائے گا۔ بی بی جی حوصلہ رکھیں، آپ بے گناہ اور بے قصور ہیں۔ آپ کے ساتھ یہ بے انصافی نہیں ہو سکتی۔“ صندل کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس نے اپنے احمقانہ پن کو خوب کوسا۔ رفعت اور رانی کی لڑائی پس منظر میں چلی گئی۔ روشنی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ صندل کو اس قدر شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

دفعتاً شہباز بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے تھیلے تھے۔ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی آنگن میں سناٹا چھا گیا۔ روشنی تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حیرت کی بات تھی کہ شہباز نے آتے ہی نادارہ، رفعت اور رانی تینوں کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ شاید گھر میں اک اور انہونی ہونے جا رہی تھی۔

☆☆☆

روشنی اداس سی اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی حالت اس پرندے کے مانند تھی جس کے پر کاٹ کر پنجرے میں قید کر دیا جائے۔

کمرے میں رفعت، رانی اور ان کے پیچھے صندل داخل ہوئی۔ رفعت کے ہاتھوں میں وہی بڑے بڑے بھرے تھیلے تھے جو شہباز لایا تھا۔ اس کے چہرے پر مکاری مسکراہٹ تھی۔ صندل کی آنکھیں اداس اور چہرہ ویران تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی۔

”بی بی جی، آپ کے لیے بڑی خوشخبری ہے۔ آپ کا رشتہ سردار سائیں نے بڑے اچھے اور اونچے گھرانے میں طے کیا ہے۔ آج شام آپ کا نکاح ہے۔ یہ آپ کا سامان ہے۔ رانی اور صندل آپ کو

تیار کر دیں گی، آپ بے حد خوش قسمت ہیں۔ ایسے رشتے نصیب والیوں کو ملتے ہیں۔ اونچی حویلی، نوکر چاکر، دولت کی ریل پیل، دو گاؤں چھوڑ کر تیسرا گاؤں انہی لوگوں کا ہے۔ چلتے چلتے صبح سے شام ہو جاتی ہے پر زمینیں ختم نہیں ہوتیں۔ آپ تو جی راج کریں گی راج۔“ رفعت نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ روشنی گم صم سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اتنی جلدی اس کا رشتہ بھی طے ہو گیا اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔ آج اس کی شادی تھی اور اسے علم بھی نہیں تھا۔ وہ بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ رانی نے ایک تھیلے سے سرخ رنگ کا ڈبا نکالا۔ اس میں عروسی جوڑا تھا گہرے سرخ رنگ کا جوڑا جس پر زری اور کندن کا کام کیا گیا تھا۔ زیادہ بھاری نہیں تھا لیکن لگتا تھا کہ بہت اچھی دکان سے لیا گیا ہے۔

”ہائے کتنا خوب صورت جوڑا ہے۔ شلواری قمیص ہے تو کیا ہوا آج کل لڑکیاں لہنگوں اور غراروں کے بجائے شلواری قمیص پہننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔“ رفعت نے آگے بڑھ کر شیفون کا کامدار دوپٹا ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

رانی نے دوسرے تھیلے سے کافی ساری چیزیں نکالیں۔ زیور کے ڈبے، سرخ سینڈل، کاسمیٹکس، پرفیوم، پرس وغیرہ رفعت تو بے حد متاثر ہو گئی۔ صندل زبردستی مسکرا رہی تھی۔

”دیکھیں جی، کتنی خوب صورت چیزیں ہیں۔ بڑے ہی امیر لوگ ہیں اور دل والے بھی۔ شہر میں بھی ان کا گھر ہے ساری چیزیں لگتا ہے شہر سے منگوائی ہیں۔“ رفعت کا ارادہ مزید بیٹھنے کا تھا لیکن شہباز نے اسے باہر سے آواز دے دی مجبوراً اسے اٹھنا پڑا۔ روشنی حیرت سے سب چیزیں دیکھ رہی تھی۔

”آپ خوش نصیب ہیں، کسی کسی کے نصیب میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں۔“ رانی کے لہجے میں



آشوب و فساد

محی الدین نواب کا ایک اور شاہکار
زندہ رہنے کی آرزو مار ڈالنے کی قوت رکھنے والوں سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ یہ طاقت و آرزو سنسنی خیز حالات اور خونیں واقعات رقم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ سال نو کے پہلے شمارے کی خصوصی کہانی

فلک تک چل

اقتدار کی بھول بھلیاں بھی عجیب سبق آموز ہوتی ہیں۔ تاریخی صفحات پر حیدر علی کی جہد مسلسل کا احوال..... **ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر۔**

کشکول

معاشرتی ناسوروں کی ازیت پسندی کسی کل چین نہیں لینے دیتی..... ان کے لینے بھی آنے والے لمحات بے سکونی کا باعث تھے..... **انوار صدیقی کے قلم کی خیزی**

مسافر

کبھی مدھرتال پر بہکتے جذبات تو کبھی احساسات کے بھنور میں تلاطم..... کبھی سائے میں پلٹی محبت تو کبھی کڑی دھوپ میں جلتے بدن..... اسی گردوغبار میں لپٹے اس مسافر کا احوال جسے تحریر کیا **ناصر ملک**

لکڑی کا گلا

مرزا محمذبیک کی حرج محفل شعر سخن اور آپ کے خط

معین

محمد الیاس، منظر امام، ضیاء نسیم، بلگرامی، کاشف ذہیر اور تنویر دیاض کی پرکشش کہانیاں

خیال آ رہا تھا کہ کیا ہوتا اگر روشنی کا انجام کچھ الگ ہو جاتا، خوشگوار اور اچھا..... مگر.....

☆☆☆

روشنی رخصت ہو گئی مگر صندل کے دل پر اک بوجھ آن پڑا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک رکھنے کے باوجود روشنی کی آنکھوں میں خواب تو ہوں گے۔ صندل اس کے بارے میں جتنا سوچتی اتنی اداس ہو جاتی۔ لڑکیوں کے خواب تو یوں بھی ان کی سانسوں کی ڈور سے بندھے ہوتے ہیں۔ روشنی وہ انار کلی تھی جو دھوکے سے دیوار میں چنوا دی گئی تھی۔ برگد کی اداس شاخیں ویران تھیں۔ پرندوں نے کہیں اور بسیرا کر لیا تھا۔

دن گزرتے رہے لیکن صندل کی اداسی میں کمی نہیں آئی۔ وہ اک زرد دوپہر تھی جب رانی سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے تھیلے تھے۔ اس کی آنکھیں قدرے سو جی ہوئیں اور چہرہ سستا ہوا تھا۔ صندل اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی اور حیرانی سے اسے اور اس کے ہاتھوں میں پکڑے تھیلے دیکھنے لگی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے حیرت سے ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا جو رانی نکال رہی تھی۔ گہرا گلابی جوڑا جس پر ڈھیر سارے ستارے ٹٹکے ہوئے تھے۔ گولڈن رنگ کی سستی سی سینڈل، گہرے رنگوں کا میک اپ کا سامان اور سستی سی جیولری۔

”ارے صندل اٹھ جا تیرے ادا نے تیرا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ دیکھ تو کیسا خوب صورت سامان شگن کے طور پر آیا ہے۔ ڈھیر ساری مٹھائی بھی آئی ہے۔ کل تیرا نکاح ہے بڑی خوش قسمت لڑکی ہے تو۔ وقت پر اپنے گھر بار کی ہونے جا رہی ہے۔“ دفعۃً رفعت تیزی سے بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ صندل مارے حیرت کے کچھ بول ہی نہیں سکی۔ ”اتنی جلدی؟“ چند لمحوں بعد اس کے حلق سے

”بی بی جی جہاں دولت ہو وہاں خوبیاں خود خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ کردار تو سب مردوں کا تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔“ صندل کے بجائے رانی نے جواب دیا۔ روشنی خاموشی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ صندل نے گڑبڑا کر رانی کو ٹھوکا دیا۔ ”نہیں بی بی جی، اچھے شریف لوگ ہیں۔ کبھی کوئی غلط بات تو ان کے ساتھ نہیں سنی۔“

”تم نہیں جانتیں ان بڑے لوگوں کی غلط باتیں باہر نہیں نکلتیں۔“ روشنی اب بھی بے یقین تھی۔ وہ ایسے قیدی کی طرح تھی جسے سزا کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔ ”تم نے انہیں دیکھا ہے، دیکھنے میں کیسے ہیں؟“ کچھ بھی تھا روشنی کی زندگی کا نیا باب شروع ہونے جا رہا تھا۔ وہ بے خبر تھی اس لیے تجسس فطری تھا۔ صندل کے گلے میں گولہ سا ٹنگ گیا۔

”اچھے ہیں، اونچے اور گورے چہرے۔“ صندل نے نظریں چرا لیں۔ اسے اپنی آواز کا گھوکھلا پن بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے باہر نکل آئی۔ صحن میں چہل پہل بھی مگر اس کے باوجود اسے ہر طرف اداسی پھیلی محسوس ہو رہی تھی۔ برگد کا درخت بھی اداس تھا۔ فلک پر پھیلے شفق کے رنگ بھی مدھم لگ رہے تھے۔ صندل کی آنکھوں سے چند آنسو نکلے اور مٹی میں جذب ہو گئے۔ سچ ہے عورت کے آنسوؤں کا کوئی مول نہیں ہوتا۔

اس نے روشنی سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ یہ جھوٹ بولنے پر مجبور تھی۔ وہ روشنی کو کس طرح بتاتی کہ اس نے ہونے والا شوہر امیر سکندر ایک ادھیڑ عمر عیاش بدمعاش شخص ہے جس نے پانچ شادیاں کیں۔ دو بیویوں کا انتقال ہو گیا اور اس کی تین بیویاں اس کے جوان بچوں کی مائیں ہیں۔ روشنی کا انجام اس کے سامنے تھا جو جھوٹ اس نے مجبوراً بولے اس کے لیے وہ خواہ کو ساری زندگی معاف نہیں کر سکے گی۔ اسے رہ رہ کر

حسرت تھی۔ خود اسے تو سہاگ کا سرخ جوڑا نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ قیمتی اور خوب صورت چیزوں کی اپنی ہی بات ہوتی ہے۔

یہ سب کیا تھا..... روشنی کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اس کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ انتہائی رازداری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ”کس کے ساتھ ہو رہی ہے میری شادی؟“ چند لمحوں بعد اس نے اجنبی اور سرد لہجے میں پوچھا۔

”جی امیر سکندر نام ہے۔ بہت بڑے اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سردار سائیں کے ملنے والوں میں سے ہیں بلکہ دور پار کی رشتہ داری بھی ہے۔ سردار سائیں کی ممائی کے خاندان سے ہیں۔ میں نے کہا تھا ناں سردار سائیں آپ کے لیے کچھ اچھا ہی سوچیں گے۔“ صندل نے اپنے لہجے میں زبردستی بٹاشت پیدا کی۔

”تم جانتی ہو انہیں؟“ روشنی نے سوال کیا، صندل آنکھیں چرا نے لگی۔

”ہاں جی، انہیں بھلا کون نہیں جانتا۔ ان کے بڑے بھائی بھی سرداری کی پگڑی کے وارث ہیں۔ ان کا اپنے علاقے میں بہت ٹیکا ہے۔ سردار سائیں آپ کے بڑے ہیں انہوں نے کچھ سوچ کر ہی آپ کا رشتہ وہاں طے کیا ہوگا۔“ صندل اس کا سامان سمیٹنے لگی۔

”اور کیا جانتی ہو ان کے بارے میں، کیسے لوگ ہیں وہ؟“ روشنی نے پرجسس انداز میں پوچھا۔ ”بہت اچھے لوگ ہیں جی ان کے خاندان کے لوگ ایکشن میں بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ وزیر بھی بنتے ہیں۔ ان کی عورتیں فیشن بھی کرتی ہیں۔ گاڑیوں میں بیٹھ کر شہر بھی جاتی ہیں۔“ صندل نے کہا۔ ”اوہو، بھئی دولت کے علاوہ اور کیا خوبی ہے ان میں، کردار کے کیسے ہیں؟“ روشنی نے پوچھا۔



نارنگ

سفر زیست کہاں کی پھر پھر

صائم قیصر

”چلو بھی احسن میاں..... پہناؤ رومی بیٹی کو اپنے نام کی انگٹھی۔“ خوب صورت اور وجیہ احسن امتیاز کی والدہ بڑے دلار سے اپنی ہونے والی بہو رومانیہ شہزاد کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ جو کاسنی رنگ کے کامدار جوڑے میں بے حد نازک اور نفیس دلہن بنی بیٹھی تھی۔

بڑے جذب کے عالم میں احسن نے نقرئی انگٹھی رومی کی نازک سی انگلی میں پہنا کر اسے اپنے

اپنا گھر ہے، زمین ہے، مال مویشی ہیں کسی چیز کی نہیں ہے۔“ رانی نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔ اس کی تسلیوں کا کھوکھلا پن بہت واضح تھا۔

صندل کی نظریں اس کے افسردہ چہرے اور آنکھوں پر ہلک گئیں۔ اس کی چھٹی جس کسی انہونی کا اشارہ دے رہی تھی۔ ایسی ہی تسلیاں اس نے روشنی دی تھیں پل بھر میں اسے احساس ہو گیا کہ وہ روشنی کی جگہ کھڑی ہے۔ اس کے روٹے کھڑے ہو گئے۔ کوئی راز تھا جو اس پر آشکار ہونے لگا۔

”کون کم دار ہے وہ؟“ اسے اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہونے لگی۔

”تم نہیں جانتیں، شہباز کی ڈیرے پر ملاقات ہوئی تھی اور کام کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ رانی نے نظریں چرا لیں۔

”میں جانتی ہوں کہ وہ کون ہے۔“ صندل کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ”وہ ایک ادھیڑ عمر شخص ہے جس کی میں تیسری یا چوتھی بیوی بننے جا رہی ہوں۔“ ناں یہی بات ہے ناں؟“ صندل کی آواز لرزنے لگی۔ اس پر جیسے کشف ہونے لگا تھا۔ رانی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”اس کے جوان بچے ہیں اور یہ شادی کسی سودے کی صورت میں طے ہوئی ہے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ میں سب جانتی ہوں۔ میں اپنی پرورش کا تاوان بھرنے جا رہی ہوں۔ ایک اور انارکلی جبر کی دیوار میں چنوائی جائے گی اور جانے یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ سنہری آنکھوں کے خواب کب تک اڑتے رہیں گے۔“ صندل کی کیفیت دیوانوں سی ہو گئی۔ رانی اس کے اندازوں کی درستگی پر انگشت بندھا رہ گئی۔ زبرد دوپہر کی اداسی بڑھنے لگی۔ پہیلی بوجھی جا چکی تھی اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ اس نے تو کبھی ایسی صورت حال کے متعلق خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

”ارے جلدی ہی تو ہوتی ہے لڑکیوں کو اپنے گھر بار کا کرنے کی۔ تو کیا جانے تیرے ادا پر کتنا بوجھ تھا تیرا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ تیری فکر تو اسے اک پل کو چین نہیں لینے دیتی تھی۔ ارے تیرا رشتہ اسی نے تو طے کرنا تھا۔ ہمارے ہاں لڑکیوں بالیوں سے شادی بیاہ کی بات نہیں کرتے۔ بس رشتہ طے کر دیتے ہیں۔“ رفعت نے اس کے پیلے پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کمال تھا اسے تو کبھی ادا کی فکر کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ اپنی شادیوں میں ہی مصروف ہے۔ خدا جانے کہاں اس کا رشتہ طے کیا گیا تھا۔ مارے شرم کے وہ پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔

”یہ رانی تیرے پاس بیٹھی ہے، سامان سمیٹ کر احتیاط سے رکھ دینا“ میں ذرا مٹھائی دیکھ لوں۔“ رفعت نے باہر جانا ہی مناسب سمجھا۔ رانی سامان سمیٹ کر الماری میں رکھنے لگی۔ صندل نے بے تابی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”سچ بتاؤ یہ سب کیا ہے؟ کہاں میرا رشتہ طے کیا ہے؟ کون لوگ ہیں اور اتنی جلدی کرنے کی کیا وجہ ہے؟ کیا میں واقعی کوئی ان چاہا بوجھ ہوں؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”جن لڑکیوں کے سر پر باب نہ ہوں وہ دوسروں کے لیے اُن چاہا بوجھ ہی ہوتی ہیں۔“ رانی کی آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ صندل ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”لیکن تم فکر نہ کرو تمہارا بھائی تمہارا دشمن تو نہیں ہے۔ اس نے تمہارے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔ تمہاری شادی بہت اچھی جگہ طے ہوئی ہے۔ تمہارے بھائی کے جاننے والے ہیں کسی دوسرے گاؤں کے سردار کے کم دار سے رشتہ طے ہوا ہے۔“

سفینہ ان کی زندگی میں آئیں..... اور دو خوب صورت سی بیٹیوں کو پروان چڑھا کر، پڑھا لکھا کر خاموشی سے چلی بھی نہیں۔ لوگوں نے سفینہ بیگم کی موت کا ذمے دار شہزاد احمد کی آزاد طبیعت کو ٹھہرایا..... سامنے دھند میں گھری دھندلی سڑک پر اچانک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے مدھم سا اجالا کر دیا۔ وہ گاڑی اسی طرف آرہی تھیں۔ شہزاد احمد نے غور سے دیکھا اور اتنے میں گاڑی کوٹھی کے مرکزی دروازے پر آن رکی۔ چوکیدار نے ذرا سا جھانکا اور پھر دوڑ کے گیٹ کھولنے کی کوشش کی۔

”ڈکا! چھوٹا گیٹ کھولو۔“ رومانیہ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ چونک اٹھے۔

رومانیہ اندر داخل ہوئی تو باہر کھڑی گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔ وہ سیدھی ٹیرس کے نیچے بنی داخلی سیڑھیوں کی جانب چلتی چلی آئی۔

”رومانیہ!“ خاموشی شہزاد احمد کی آواز سے گونج اٹھی۔

”جی پاپا! آپ جاگ رہے ہیں ابھی تک۔“ اس کے لہجے میں ذرا بھی فکر مندی نہ تھی۔

”اوپر آ جاؤ ٹیرس پہ.....“

”اوکے..... آرہی ہوں۔“ اور کچھ ہی لمحوں میں وہ ان کے سامنے تھی۔

”رات کافی ہو گئی ہے..... کہاں تھیں اب تک؟“ لہجہ نرم ہی تھا۔

”ڈونٹ وری پاپا..... میں..... وہ احسن کے ساتھ تھی۔ رات کے کھانے پہ انوائٹ کیا تھا اس نے۔“

”اوہ..... تمہیں کھانا کھلانے کے پیسے نکل آئے اس کی جیب سے..... ہا ہا.....“ قدرے طنزاً کہا گیا۔

”پاپا! وہ مستقبل کا سرجن ڈاکٹر ہے۔ ابھی اگر کچھ کمی ہے تو انشاء اللہ بعد میں پوری ہو جائے گی۔“ اسے کچھ برا لگا تھا۔

ہو گئیں۔

”ارے آپ! تم تو فوراً پنکھ بجھا دو اس بن جاتی ہو..... اے مومی ڈارلنگ! منع کرو ناں اپنی چھوٹے سے دل والی ماما کو.....“ وہ بے چین سی ہو گئی۔

”مما چپ!“ ننھے سے ہاتھ سکیکنے کی پلکوں سے ٹکرائے۔

”بائی داوے آپ! یہ اپنے وسوسوں سے بھرے دل کو ذرا قابو میں رکھا کرو۔ ارے تمہاری بہن میں کیا کمی ہے۔ خوب صورتی، اعلیٰ تعلیم اور بولڈ نہیں..... بہت سے عیب چھپا دیتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ تینوں خواص آج کے مرد کو ساری زندگی یوں بیوی کا غلام بنا کے رکھتے ہیں کہ مت پوچھو۔“ رومانیہ اپنی ازلی خصوصیات کا ذکر بڑے غرور اور اعتماد سے بہن کے ساتھ کر رہی تھی۔

”ماما! پاپا کا فون ہے.....“ سکیکنے، طاہر عثمانی کا فون سننے میں ٹٹن ہو گئی تو رومی بھانجی کے ساتھ تصاویر سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

شہزاد احمد اپنی وسیع عریض کوشی کے کشادہ ٹیرس پر کھڑے غیر ملکی کمپنی کا تیار کردہ خوب صورت سگار پی رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے سرد ہوا میں اوپر ہی اوپر کہیں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہ بڑے سے آہنی مرکزی دروازے کے پار دور تک جاتی صاف ستھری سڑک پر ٹکی تھی مگر دماغ میں گزشتہ پانچ سال کی تنہائی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ جوانی کے پہلے دور سے ہی کبھی تنہا نہیں رہے۔ بنیادی طور پر وہ پیدائشی امیر شخص رہے تھے۔ سکیکنے اور رومانیہ کی ماں سفینہ بیگم کی زندگی میں آنے کے بعد بھی وہ..... کتنی ہی خواتین کے بہترین دوست بنے رہے۔ تنہا رہنا ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ جیسے کچھ لوگ گناہم رہنا پسند نہیں کرتے یا پھر کچھ لوگوں کو محفل میں رہنا بے حد پسند ہوتا ہے۔

تعریفیں کرواؤ گی..... دو دن ہو گئے مدح سرائیاں کرتے کرتے.....“ ازراہ مذاق سکیکنے چبکی۔

”ہاں جی..... اور کیا خالہ! اتنی پیاری تو لگ رہی تھیں آپ۔“ مومی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

”دیکھو! اپنے نصیب پر رشک ذرا کم..... صرف تم اس رحمن الرحیم کا شکرانہ زیادہ ادا کرو میڈم..... اس دور میں کسی کا سچے دل سے چاہنا..... اور جاہت کا حاصل کر لینا صرف اس پروردگار کی مہربانی ہے اور کچھ نہیں سمجھیں۔“ بہن کے اس لیکچر پہ دھیما سا مسکرا کر وہ ہلٹی۔

”جانتی ہوں، اللہ پاک کی کرم نوازیوں کا کوئی بدلہ اور شمار نہیں..... پر آہم..... آہم جناب ہماری پسند کیسی لگی آپ کو یہ تو کہیے؟“

”ہاں بھئی جانتے ہیں بڑا ہاتھ مارا ہے دوران تعلیم آپ نے..... آپ کے وجیہ پر سنیلٹی والے مستقبل کے ڈاکٹر صاحب..... جناب احسن امتیاز۔ آپ کو مبارک ہوں۔“ سکیکنے بڑے انداز سے بولی۔

”رومی خالہ! احسن انکل بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ڈھیر ساری چاکلیٹیں لانے کا پراس بھی کیا ہے۔“

”اب دیکھتے ہیں کہ اکلوتے لاڈلے کی موٹی سی اماں تمہارے لیے کیسی ساس ثابت ہوتی ہیں۔“ سکیکنے مستقبل کے اندیشوں پہ نگاہ کر کے بولی۔

”آپی! وہ اچھی ہیں تو بیٹے کی پسند کو فوراً اپنانے چلی آئیں۔ اور پھر ممکنہ کی تقریب میں کیسے دھیمے اور شگفتہ انداز میں ہم سب سے باتیں کرنی رہی تھیں۔ باوقار سی خاتون ہیں ناں! رومانیہ کو درحقیقت وہ بہتر ساس لگی تھیں۔“

”چلو اللہ کرے تمہاری زندگی شاندار گزرے۔ امی کی کمی کبھی محسوس نہ ہو، ایسی متالے تمہیں ساسو ماں سے۔“ ماں کی یاد اور بہن کے مستقبل کی دعا کرتے ہوئے سکیکنے کی آنکھیں نم

تام کر لیا۔ عقب میں کھڑے رومی کے والد شہزاد احمد اور بہن سکیکنے نے اس محبت کے ساتھ تالیاں بجائیں کہ پورا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ رومی بھی احسن کو انگوٹھی پہنا چکی تھی..... اور اب سکیکنے آنکھوں میں بہن کی محبت اور ماں کا سا پیار لیے اس کے سامنے بیٹھی مبارک باد دے رہی تھی۔ خوشی سے آنکھوں میں آئے آنسو لیے وہ دو لہا، دہن کی بے مثال جوڑی پہ نازاں و فرحاں تھی۔

”مبارک ہو رومانیہ!“

جواباً رومانیہ نے بڑے فخریہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”سدا خوش رہو، خدا تمہیں بری گھڑی اور بد نظر سے بچائے۔“ سکیکنے کی دعائیں حسین تحفوں کے مانند اپنی جھولی میں سمیٹتے ہوئے رومی نے ایک فاتح کی طرح احسن امتیاز کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر جچی مسکراہٹ اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔

”اب تم میری ہو..... مبارک ہوں تمہیں یہ ساری خوشیاں۔“ احسن پیار بھرے دھیمے لہجے میں کان کے قریب آ کر کہہ رہا تھا۔ وہ شرماتے شرماتے بھی اپنی شرارتی ہلکی نہروک سکی اور سر جھکا کے ہنس دی۔

”چلیں..... ذرا فوٹو سیشن ہو جائے..... باقی لوگ پلیز ہٹ جائیں یہاں سے.....“ کیمرا مین نے فرمان جاری کیا اور زندگی بھر کے لیے یادگار رہنے والی تصاویر بنانے لگا۔ سکیکنے اس کا پلو درست کر کے مطمئن سی اسٹیج سے اتر آئی۔

☆☆☆

”کیسے لگ رہے تھے ہم؟“ سکیکنے آپی! سچ بچ بتائیں۔“ رومی لاؤنچ میں کارپٹ پہ اونڈھی لیٹی اپنی منگنی کی ڈھیر ساری تصاویر کو دیکھتے ہوئے سکیکنے سے پوچھ رہی تھی اور وہ اپنی پانچ سالہ بیٹی مومی کو فراک پہنانے میں مگن تھی۔

”ارے بڑی خود پسند ہو رومی تم! بھئی کتنی

”اچھا جی..... وہ کیسے؟“ وہ ہنوز دلچسپی لیتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”دیکھیں ناں..... قسمت کے لکھے کا رونا روتے ہوئے کسی ایسے فرد کے ساتھ جو نہ آپ کی عادات سے میل کھاتا ہو اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے کہ پہلے اپنی پسند تلاش لی جائے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو..... مگر سمجھوتا کس بلا کا نام ہے آخر؟“ شاید وہ آئیڈیلزم کو ناپسند کرتے تھے۔

”سمجھوتا مجھے سخت ناپسند ہے، نفرت ہے مجھے سمجھوتے کرنے والے لوگوں سے۔ پہلے سوچتے نہیں اور بعد میں آپس کی مجبوریوں کو سمجھوتے کا نام دے دیتے ہیں۔“ اس کی آواز اور لہجے میں عجیب سا چڑچڑاہٹ آ رہی تھی۔

”اوہ..... خدا کے لیے یہ بورنگ سی گفتگو چھوڑیں اور لاؤنج میں چلیں طاہر..... اماں زرینہ نے قبوہ تیار بھی کر لیا ہے۔“ ٹیکینہ نے بات ختم کر دی۔

☆☆☆

وجیہ عثمانی کو مشتاق سیدھا رومی کے بیڈ روم میں لیے چلا آیا۔ جہاں رومی اور ٹیکینہ فیملی پہلے سے بے حد پرسکون ماحول میں گپ شپ میں مگن تھے۔

”ارے وجیہ! یار سوری..... میں مسرور گڈز کمپنی کے کاغذات گاڑی میں ساتھ ہی لے آیا۔“ طاہر بھائی اسے دیکھتے ہی بول پڑے۔

”چلیں کوئی بات نہیں طاہر بھائی..... بھابی کو سجا سنورا دیکھ کر ویسے بھی آپ بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔“ سادہ مگر بھولے سے چہرے والا وجیہ بڑی اپنائیت سے ان کی بھول کو ٹال گیا۔ بچے رومی کو چھوڑ کر چاچو سے چپک گئے تھے اور وہ ان سے یوں مل رہا تھا جیسے کئی دن بعد نظر آئے ہوں۔

”میں ذرا..... اماں زرینہ کو چائے کا کہتی

ناں۔“ طلحہ کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بھئی دیکھو رومی بی بی! ہمیشہ سے انسان کی زندگی میں دکھ اور سکھ کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ اسی طرح اپنے بے حد پیاروں سے ملنا بچھڑنا بھی..... یہ تو قانون قدرت ہے..... ہاں مگر صبر سے کام لو اور اگر مناسب سمجھو تو..... ٹیکینہ کو اپنی والدہ کی جگہ تصور کرو۔“ طاہر بھائی کے شفیق لہجے سے اسے قدرے ڈھارس ہوئی تھی۔ انگلیوں کی پوروں سے اس نے امدتے آنسو سمیٹ لیے۔

”پاپا نے شادی کا کیا کہا ہے تمہاری؟“ ٹیکینہ نے موضوع بدلا۔

”ہم م..... ویل..... پاپا نے سب کچھ مجھ پر ڈال دیا ہے، تم جانتی ہو حسب عادت..... اور پھر اہم بات احسن کی ہاؤس جاب کا مکمل ہونا ہے۔“

”اب اس میں کتنی دیر ہے، یار تمہارا اکیلا پن دیکھا نہیں جاتا ہم سے۔“ ٹیکینہ بہن کی فکر میں تھی۔

”صرف تین ماہ..... یوں گزرنے والے ہیں۔“ رومی نے چٹکی بجا کر گویا تین ماہ اڑا دیے۔

”چلو جی..... شکر کریں گے، تمہیں ہم سفر مل جائے گا۔“ طاہر بھائی جو بہت مخلص سے بندے تھے بڑے پیار سے بولے۔ وہ چپک اٹھی۔

”واقعی طاہر بھائی، ہم سفر کی تلاش یا پھر اپنے پسندیدہ ہم سفر کی تلاش میرے لیے جانے کیوں اس قدر اہمیت رکھتی تھی کہ بس مت پوچھیں۔ واقعی اگر کوئی خوب رو اور اسٹینڈرڈ کا بندہ نہ ملتا احسن کی طرح کا تو..... شاید ابھی میں اس تلاش کو اور وقت دیتی۔“

”اوہ..... تم بھی بہت سی دوسری لڑکیوں کی طرح آئیڈیلزم پر یقین رکھتی ہو؟“ طاہر بھائی ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتے ہوئے وہ پوچھ رہے تھے جس پر اس کا چونکا لازم تھا۔

”یہ آئیڈیلزم نہیں ہے طاہر بھائی..... میرے خیال میں تو عقلمندی ہے۔“

ہوئے بولی۔

”خالہ!“ وہ منمنایا..... ”وہ تو مومی بدتمیز کرتی ہے ناں، روتے ہوئے میں تو نہیں۔“

”اوکے، اوکے..... چلو ہاتھ دھو کر سیدھے کھانے کی میز پر پہنچو..... چلو شایاش۔“ وہ انہیں دھکیل کر ٹیکینہ کے گلے لگ گئی۔

”اوہو..... واؤ آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔“ اس کی نگاہ ٹیکینہ کے عقب میں طاہر عثمانی پہ پڑی۔ اس کے فیورٹ لوگوں میں سے ایک..... اس کے اکلوتے بہنوئی۔

”ہاں جی! بڑے بڑے گھروں کے بڑے لوگوں سے ملنے.....“ متانت بھرے لہجے میں کچھ ہی دیر طاہر بھائی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ کچھ ہی دیر میں کھانے کی ٹیبل پر بھرپور شور اور تعریفیں چلنے لگیں۔

”یہ کوفتہ بریانی کھانے کے لیے میں یہاں جا آتا ہوں۔“ طاہر کھانے کا بھرپور لطف اٹھاتے ہوئے بولے۔

”اور میں رومی کی خوشامد میں بالکل نہیں کہوں گی کہ یہ تو میری بہن نے تیار کی ہے۔ بھئی اماں زرینہ اور مشتاق نے مل کر یہ شاہکار بریانی بنائی ہے۔“ ٹیکینہ کوفتہ بریانی کی پلیٹ صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”تمہیں امی کے ہاتھ کے کوفتے یاد ہیں؟“ رومی کے منہ میں ایک ننھا سا کوفتہ گردش کر رہا تھا۔

”طاہر ہے..... تا عمر انسان ماں کے ہاتھ کے کھانے کو مس کرتا ہے رومی..... اس کا کوئی بدلہ ہے بھلا؟“ لہجے میں آنسو کی گھلاوٹ تھی۔

”ویسے یار! امی نے کچی چیٹنگ کی ہے..... تمہاری شادی پہ کتنی خوشی منائی تھی انہوں نے اور..... میری دفعہ..... مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔“

ماں کی یاد میں اس کی آواز رندھی گئی۔

”خالہ! پلیز رونا نہیں، مانو کو اچھا نہیں لگے

”ہاں، ہاں ٹھیک ہے، تمہاری پسند ہے تو کیا کہہ سکتا ہوں؟“ بے پروائی سے کہا گیا۔ ”بس تمہیں خود ذرا..... احتیاط سے رہنا ہوگا۔ یو کے نہیں پاکستان ہے یہ..... یہاں بعض لوگ دوستوں کے گھیس میں دشمن بھی ثابت ہوتے ہیں۔“

”نہیں پاپا..... آپ کا اشارہ اگر احسن کی طرف ہے تو ایسا بالکل نہیں۔ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور پاکستان کی ساکھ کا سہرا بہت حد تک متوسط طبقے کے سر ہے۔“ وہ احسن کی محبت پر بھرپور اعتماد رکھتی تھی۔

”ویل! یہ اب تم پر ہے..... ٹیکینہ شادی کے بعد ایک پرسکون زندگی گزار رہی ہے، امید کرتا ہوں کہ تم بھی.....“

”بھینکس پاپا جانی، آپ کی دعا چاہیے۔“ وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

☆☆☆

اماں زرینہ اور مشتاق مل کے کھانا ڈانگ ٹیبل پر سجا رہے تھے۔ دونوں کی حیثیت گھر کے فرد جیسی تھی حالانکہ دونوں نے کچھ عرصہ قبل ہی باورچی خانے کی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ رومائیس نے اپنی لمبی پلکوں پہ مسکارے کا آخری سچ دیا ہی تھا کہ داخلی سیڑھیوں سے دھب دھب کی آواز سے چڑھتے ٹیکینہ کے دونوں بچوں کا شور سنائی دیا۔

”خالہ، خالہ!“ طلحہ، مومی سے آگے تھا، وہ میک اپ چھوڑ چھاڑ کے کیوٹ سے طلحہ کو پیار بھری جھنجھی ڈالنے کو دوڑی۔

”خالہ! میرے لیے گولڈن فٹ خریدی ہیں آپ نے یا نہیں؟“ وہ آتے ہی ننھی سی انگلی کے اشارے سے پوچھنے لگا۔

”ہاں جی..... نہ لیتے تو طلحہ صاحب کا رونا اور رونے کے دوران ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے مکے بھی کھانا پڑتے۔“ وہ اسے پیار بھرا طنز کرتے

ہوں۔“ وجہ کے مذاق پہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی سکی نہ کو اپنے سر روینے سے انگور گر کے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور وجہ نے اس کے اس انداز کو سب سے زیادہ محسوس بھی کیا کیونکہ صرف آج ہی نہیں ہمیشہ اسے دل میں بننے والی..... رومانیہ نے جان بوجھ کر انگور ہی کیا تھا۔ وجہ وہ بالکل نہیں جانتا تھا مگر من پسند جستی ہونے کے باوجود اس نے رومی پہ کبھی کوئی اختیار رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ طاہر بھائی نے اکا دکا بار اس سے یہ رشتہ جوڑنے کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ بھی نہیں کہہ پایا۔ اس دل کے مکین نے کوئی اشارہ بھی تو نہیں دیا تھا اپنائیت کا..... وہ ان سے کیا کہتا؟

اماں زرینہ چائے کے لوازمات سے بھری ٹرائی دھکیلتے ہوئے اندر آئی تو وہ دشمن جاں اس کے عقب میں بڑے مغرور اور بے پروا انداز میں تھی۔ ننھے طلحہ کو کندھوں سے اتارتے ہوئے وجہ نے منہ بھر کو نظر بھر کے اسے دیکھا۔ سرخ پھولوں والے پرندہ کالے سوٹ پر سرخ گرم اسکارف گلے میں ڈالے وہ اور بھی شدت سے جیسے اس کی روح میں اترتی چلی گئی۔ کسی اور خوش نصیب کی امانت پہ یوں نظروں سے ڈاکا ڈالتے ہوئے اسے عجیب سی سخت محسوس ہوئی اور وہ سرد دھیرے سے جھٹک کر خود کو سمجھاتے ہوئے چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

اسلام آباد کے نواحی گاؤں سمبل کے بیچوں بیچ دور تک جاتی طویل اور تکی سی سڑک پہ وہ احسن کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھی محو گفتگو تھی۔ دوران گفتگو اس کی نگاہیں سڑک کے دونوں اطراف لگے درختوں کی ان شاخوں پہ ایک رہی تھیں جو آگے تو دور دور تھے مگر سڑک کے دائیں اور بائیں ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو اپنی سرسبز شاخوں سے چھو رہے تھے..... رومی کو ان کے عشق و سرور کا یہ عالم بے حد

متاثر کر رہا تھا۔

”احسن!“ اس نے کچھ دیر کی مستقل خاموشی کو توڑا۔

”ہمم م.....“ وہ بھی شاید قدرت کی خیر صورتیوں کو محسوس کر رہا تھا۔

”دیکھو تو یہ شاخیں کس طرح ایک دوسرے سے مل رہی ہیں۔“

”ہاں رومی! ہمیشہ یہ نظارہ مجھے متاثر کرتا ہے یار۔“

”کہاں لے کے جا رہے ہو؟“

”اوپن ایر تھیٹر دیکھو گی؟“ الٹا وہ پوچھنے لگا۔

”احسن! کتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے، میری تو قافیہ جگمگاتی ہے۔“

”جائے گی نہ، نہ کہیں اور چلتے ہیں.....“ وہ بددلی۔

”چلو پھر..... گرم شال لے کر دوں تمہیں.....“ احسن کے لہجے میں ڈھیر ساری محبت کی گرمی موجود تھی۔ وہ مسکرا دی۔

”تم کیا سمجھتے ہو میرے پاس گرم شال نہیں ہے؟“

”ارے نہیں نہیں..... مجھے غریب کی جرات کہاں کہ آپ جیسی مہمان ہستی کو کسی سے کم تر سمجھوں۔“

طاہر بے ڈھیروں..... گرم لباس اور شانزہ ہوں گی۔“

”پھر.....؟“ اور بھی شدت سے پوچھا گیا۔

”پھر یہ کہ..... وہ میری دی ہوئی نہیں ہوں گی۔“

”ہاں احسن! اب اچھی کہی..... تمہارا دیا ہوا تحفہ تو میرے لیے بے حد اہم اور خاص الخاص ہونا ناں.....“ وہ ہنس دی۔

”تو چلو پھر..... سیدھے مارکیٹ چلتے ہیں، ایک دو گرم شانزہ لے لیتا اور پھر سوپ پی لیتے ہیں، کیسا؟“

”بہت زبردست، ویسے باقی داوے تمہاری امی کا کیا حال ہے؟“ اسے احسن کی ان ہمیشہ اچھی لگتی تھیں۔

”ٹھیک ہیں وہ..... اچھا ہوا یاد دلایا۔ ان کے لیے سوپ لیتا جاؤں گا۔ دو دن سے فرمائش کر رہی

ہے انہوں نے۔“ وہ اگلے موڑ کے بعد مین روڈ پہ نکل آیا۔

”اور ہماری..... آہم..... ہماری شادی کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے انہوں نے؟“ رومی کے لہجے میں امید تھی۔

”وہی..... بعد از ہاؤس جاب..... کہنے لگیں کہ رومانیہ سے کہو بیکار پھرنے کے بجائے جائے نماز پر بیٹھے، تسبیح کرے اور اپنی شادی کی دعائیں کیا کرے۔“ ساری بات احسن نے ہنستے ہنستے سنا دی اور رومی تو بس..... جھوٹ جھوٹ کہتی رہ گئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر صبیحہ جاوید کے اے کلاس سہولیات سے مزین میٹرنی ہوم سے نکل کر گاڑی میں بیٹھنے تک..... رومی، سکی نہ کو انتہائی احتیاط اور محبت سے سہارا دیتے ہوئے لائی تھی۔

”دیکھو، دیکھو آرام سے..... آرام سے تم پچھلی سیٹ پہ لیٹ جاؤ، سکی نہ آپی۔“ وہ سکی نہ کی طبیعت میں اچانک خرابی سے بے حد پریشان تو تھی ہی مگر..... ڈاکٹر صبیحہ کی دی ہوئی خوشخبری بھی بے حد اہم تھی۔ سکی نہ پھر سے ماں بننے والی تھی۔

”آرام سے لیٹی ہونا..... لویہ کشن بھی رکھ لو اپنی کمر کے نیچے۔“ ڈرائیونگ کے درمیان بھی اس کا دھیان پیچھے تھا۔

”ارے میں ٹھیک ہوں اب..... بلکہ اب تو کافی ایکسپرٹ ہو چکی ہوں یار۔ تم اتنی فکر نہ کرو۔“

سکی نہ ہنس دی۔

”ہر بار امی کی ذمے داری ہوتی تھی تمہارے ننھے منوں کو احتیاط سے اس دنیا میں لینڈ کرانا۔ اب مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے، کیا کروں؟“ رومی نے بے بسی سے کہا۔

”سکی نہ آپی! اچھا نہیں کیا یہ تم نے؟“ اچانک سے اسے کچھ یاد آ گیا۔

”کیوں بھی، خدا کی مرضی تھی۔“

”اب میری شادی پہ جو جناح کو دکھانا تھی وہ؟“

”آئیے ہائے، چھوڑو، تمہاری ساسو ماں ہی اتنی سست سی ہیں۔ بلا وجہ لٹکا دیا معاملے کو..... لوگوں کی تو چٹ مگنی پٹ بیاہ ہوا کرتا ہے۔ ہم کیا کریں بھی۔“

”ویسے شاید احسن کے ہاؤس جاب پورا ہونے سے پہلے ہی تم فارغ ہو جاؤ..... کیوں؟“

”بہت دعائیں کرتی ہوں ناں تم احسن کو پانے کی؟“ بہن پہ سکی نہ کو بے اختیار پیار آ گیا۔

”ہاں آپی! حالانکہ کہاوت ہے کہ جس کو تم چاہو اس سے کبھی شادی مت کرو بلکہ اس سے شادی کرو جو خود تمہیں چاہے..... مگر.....“

”مگر.....؟“

”مگر پھر بھی احسن خود میری پسند ہے اور میں اسے دیوانگی کی حد تک پانا چاہتی ہوں۔“ رومی کے لہجے میں بلا کی حدت دیکھ کر سکی نہ کی دعائیہ نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

”یارب! میری بہن کو وہ سب کچھ عطا فرمانا جس کی اسے چاہ ہے۔“

”آپی! اب میں تمہیں بالکل بھی تمہارے گھر نہیں چھوڑ رہی..... چار دن ہمارے یہاں رہو۔ کچھ صحت وحت ٹھیک کریں تمہاری.....“ وہ حسب عادت آرڈر لگا رہی تھی۔ سکی نہ نے مسکرا کر آنکھیں موند لیں۔ جانتی تھی رومی خود ہی بچوں کو بھی لے آئے گی۔

☆☆☆

لان کے اطراف میں بنی کیاریوں میں وقفے وقفے سے جامن اور آم کے گھنے پیڑ شہزاد احمد کی توجہ کا مرکز تھے۔ وہ سفید لان چیئر پہ بیٹھے اپنے کام میں ماہر دو مالیوں سے ان کی جڑوں کے کھوکھلے حصوں کو تازہ مٹی سے پُر کر رہے تھے۔ سبزہ اور ہریالی اس گھر کی خوب صورتی کا خاص حصہ رہی تھی وہ بھی صرف انہی کے شوق اور دلچسپی سے۔ پیڑوں کے

ماہنامہ پاکیزہ 110 جنوری 2013

ماہنامہ پاکیزہ 111 جنوری 2013

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچے سرسرا رہے تھے جن میں سے آتی سورج کی روشنی لان کے سبزے پہ عجب نظارہ پیدا کر رہی تھی۔ رومانیہ گاڑی کی چابی لہراتے ہوئے سامنے روش پہ باہر کی طرف جارہی تھی۔ انہوں نے آواز دے کر اسے بلا لیا۔

”جی پاپا، کیسے ہیں آپ؟“ وہ سبزے پہ اتر آئی۔

”ٹھیک ہوں، بیٹھو یہاں۔“

”مصرف ہیں شاید..... اپنے درختوں کا۔۔۔ علاج کر رہے ہیں؟“ اس نے اندازہ لگایا۔

”ہاں..... جڑیں کھوکھلی ہوں تو..... بڑے بڑے تناور درخت بھی بے جان ہو کے گر جاتے ہیں..... مٹی بھر وار ہاتھا۔“

”پاپا! آپ اپنا خیال بھی رکھا کریں۔“ اسے اور کچھ نہ سوچھا کہنے کو۔

”میری چھوڑو تم سناؤ، احسن کی ہاؤس جاب کہاں تک پہنچی؟“

”دو ماہ رہ گئے ہیں پاپا.....“

”اوہ..... تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔ بھی اس کی والدہ سے ملاقات رکھتے ہیں کسی دن..... بس تاریخ دیں اب ہمیں وہ شادی کی۔“

”پاپا! آپ کو مجھے بھیجنے کی بہت جلدی ہے کیا؟“ انڈی خوشی کو دباتے ہوئے جھوٹ موٹ کا اعتراف کیا۔

”آ..... ہاں ہاں..... اور کیا تمہیں یہیں بٹھائے رکھوں گا تمام عمر.....“ وہ عجیب سے انداز میں کہنے لگے..... رومی کو محسوس ہوا۔ اسے تو پاپا کا اس سے یوں خاص طور پر ہمدردی جتاننا اور کافی عرصے سے بنا کسی خاتون دوست کے تنہا رہنا بھی خاصا کھٹک رہا تھا۔

”اچھا بھئی، احسن کی والدہ سے بات کرنا تو ہمارا کام ہے مگر تم یوں وقت ضائع مت کرو اور اپنی

شادی کے ساتھ ساتھ..... سکیئنہ کے بچے کے لیے بھرپور شاپنگ شروع کر لو۔“

”سکیئنہ آئی کے آنے والے منے کے لیے ٹھیک ہے پاپا مگر میں اپنی شادی یہ سوائے چھ جوڑے اور چند ضروری اشیا کے اور کچھ نہیں لانے والی آپ سے..... ہاں۔“

”کیوں بھئی، کیوں؟ جہیز تو لے جانا ہوگا۔“ وہ قدرے حیران رہ گئے۔

”نہیں پاپا..... میں جہیز وہیز کی تو بالکل قائل نہیں ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اور احسن ایک دوسرے کی مالی حیثیت سے نہیں..... بلکہ ایک دوسرے کی ذات سے محبت کریں۔ بالکل بے لوث ہو کر.....“ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں سنے سنے آئے تھے۔

”ہاں، ہاں..... رومی! جانتا ہوں کہ تمہیں اس کی پروا نہیں مگر تم سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں اس لیے یہ بھی جانتا ہوں کہ اس احسن امتیاز کو تم سے زیادہ..... تمہارے جہیز میں انٹر سٹ ہوگا۔“ انہوں نے بہت واضح طریقے سے حقیقت سے اسے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر اسے بے حد برا لگا۔

”سوری پاپا! آپ ہمیشہ احسن امتیاز کو محض اس لیے بہت ہلکا لیتے ہیں کہ وہ..... میری یعنی ایک نا تجربہ کار کی جوائس ہے مگر آج تک..... آج تک احسن نے کبھی غلطی سے بھول کر بھی ہماری اتنی بڑا جائداد کو ڈسکس نہیں کیا..... معذرت کے ساتھ کہ آپ کی سوچ درست نہیں بلکہ.....“ وہ کچھ سخت الفاظ استعمال کرنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

وجیہ اپنی شاندار گاڑی میں سے اترتا وہ سکیئنہ کے ساتھ ٹیرس پہ دھوپ سینکتے ہوئے مالٹے کھا رہی تھی۔ وجیہ کے ہاتھوں میں لیونڈر کے مہکتے پھولوں کا گلہ دستہ تھا۔ سکیئنہ کی حس شرارت جاگ

دھنچ کے مالٹے کا چھلکا ٹیرس کے نیچے سے گزرتے ہوئے وجیہ کو دے مارا۔

”اوہ..... بھابی حضور! آپ بھی ٹیرس پر ہیں، میں وہیں آ رہا ہوں۔“ اوپر کی جانب دیکھ کر وہ چھلکے کا پٹا خاسہ گیا جو اس کے دائیں گال پہ پھوٹا تھا۔

”بڑی جھک ماری ہے آج تم نے..... گھر آئے مہمان کا یوں سواگت کرتے ہیں کیا؟“ کبھی نہ اچھا لگنے کے باوجود وہ ان کا مہمان تو تھا ناں..... پھر بھی سکیئنہ کا اچانک یہ مذاق سہہ جانا اس کی فراخ دلی کا ایک ثبوت تھا۔ وہ سوچ کے رہ گئی اور کچھ ہی لمحوں میں وہ سامنے تھا۔ سکیئنہ کو get well soon کا کارڈ اور گلہ دستہ پیش کرتے ہوئے وہ جھک سا گیا تھا۔

”جیتے رہو..... جیتے رہو..... خدا کرے کہ ایک خوب صورت سی ناری تمہاری قسمت میں ہو۔“ سکیئنہ تو جیسے اپنے گھر کی ملکہ تھی۔

”آپ..... کیسی ہیں رومانیہ جی؟“ اس کے اتنا امیر کبیر ہونے کے باوجود، انکساری بھری یہ حرکات رومی کو ایک آنکھ نہ بھائی تھیں۔ آنکھ کھولتے ہی تو اس نے پاپا کو دیکھا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد وہی اس کا پہلا آئیڈل ٹھہرے۔ مغرور سے انداز والے ایک امیر آدمی..... اس کا خیال تھا کہ انکساری، محبت اور مروت تو بس نچلے طبقے کے لوگوں کا خاصہ ہے۔ کبھی تو اپنی محنت اور والد کی پنشن کے بل بوتے پہ ڈاکٹر بنتا ہوا احسن اس کے لیے کسی ایڈونچر سے کم نہ تھا۔

”جی وجیہ صاحب! میں ہمیشہ کی طرح فٹ فائٹ ہوں۔“

”چلیں پھر..... ہمارے لیے بھی دو ایک مالٹے چھیل دیں۔“ صاف... لگ رہا تھا کہ بات خواہ مخواہ بڑھانی گئی ہے۔ وہ جواب دیے بغیر مالٹے چھیلنے لگی۔

”بھابی! میں آج خاص طور پر آپ کا پتا کرنے آیا ہوں۔ بھئی! جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ آپ کے

بغیر گھر میں مزہ ہی نہیں آ رہا۔“ وہ مالٹے کی ایک پھاٹک لیتے ہوئے بولا۔

”ہاں میرے دیور راجا! جانتی ہوں تمہاری اور سب کی محبت..... مگر ذرا تھوڑے دن اور انتظار..... سکیئنہ لجاجت سے بولی۔

”آپ چلیں تو سہی بھابی جی..... میں وعدہ کرتا ہوں۔ ان سے زیادہ آپ کا خیال رکھوں گا۔ دیکھیں! صبح طلحہ اور مومی کو اسکول کے لیے تیار کروں گا۔ آپ کا اور بھائی کا ناشتا رانی کے ساتھ مل کر تیار کروں گا..... اور باقی پورا دن بھی آپ کا بیڈ ریسٹ.....“ وہ اسے انگلیوں پہ گنوانے لگا۔

”اگر انہوں نے اتنے کام کرنے کا وعدہ کر ہی لیا ہے تو خدا کے لیے آپ! تم یہ موقع گنواؤ مت اور فوراً اپنے گھر چلی جاؤ۔“ وہ بھی مذاق پر اتر آئی۔

”ہاں بھابی! وعدہ ہے..... خدا کی قسم۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔ رومانیہ اس کے دل میں سکیئنہ کے لیے اتنا پیارا اور کیئر دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جو اس کے اپنے آگے بندھے ہاتھوں کو تھام کر ہنستی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

موتیا، گلاب اور گیندے کے پھولوں سے سجے کمرے میں وہ جھلجھلکی عروسی پہ چودھویں کے چاند کے مانند جلوہ افروز تھی۔ اب وہ رومانیہ شہزاد سے رومانیہ احسن بن چکی تھی۔ آتش گلابی کا مدار لہنگے میں گویا جیسے میدے اور سیندور سے گندھی کوئی گڑیا آن بیٹھی تھی۔ سامنے لگے قد آدم آئینے میں وہ اپنے ہی روپ کو سہہ نہیں پار رہی تھی۔ آج اسے من کی مراد آخر کار مل ہی گئی تھی۔ اس عظیم الشان کامیابی پر دل سنبھالنے نہیں سنبھل رہا تھا۔ اسے تو بس اپنے طیب کا ہی انتظار تھا جیسے۔

وقت وصل آن پہنچا اور احسن امتیاز کریم کلر کی کا مدار شیروانی اور گولڈن دستار میں اس کے قریب

فوراً احسن کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

ناشتے کی ٹیبل پر چائے اور پرائٹس رکھے
دوسرے ہی لمحے احسن کی امی خوشبو اڑاتا مزیدار
آلیٹ اٹھائے آگئیں۔
”لائیں، لائیں امی! بھوک بھی بہت لگی
دیر بھی ہو رہی ہے مجھے.....“ وہ دونوں ہاتھوں
رگڑتے ہوئے بولا۔

”اے یہ تیری موٹی ہاؤس جاب تو لمبی سے
ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کب یہ ختم ہو اور کب تیرا
ولہن لاؤں..... کم از کم تیری ذمے داری تو سونپ
جائے گی اسے۔“

”کیوں امی، اب پرائٹس اور آلیٹ بنائے
نہیں جاتے آپ سے کیا؟“ شرارت سے کہا۔
”خدا خیر کرے..... کیوں نہیں..... بس یہ رو
کی ڈیوٹی نہیں دی جاتی اب مجھ سے اور ہاں
دوسری بات یہ کہ کسی روز لے چل ان امیر زادوں
کے یہاں مجھے..... وہ اکڑو سے شہزاد احمد
طرف..... دن رکھ آؤں میں شادی کے اور اب
ڈاکٹر بیٹے کے لیے یہ ڈھیر سارے جہیز کی لمبی
لسٹ بھی تھا آؤں..... بھئی چھوٹا موٹا بنگلا، نو دس لاکھ
کی گاڑی، زندگی کی شروعات کے لیے تھوڑا بہت
بینک بیلنس تو اب عام سی بات ہو گئی ہے۔ اوپر سے
اگر وہ مغرور آدمی اپنی بیٹی کو کچھ دینا چاہے تو.....
کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ امی نے تو یکدم تفصیل
سے اپنے خواب اسے سنا ڈالے..... وہ بڑے انداز
سے مسکرا دیا۔

”جی جی..... کیوں نہیں امی..... آخر ان
بہترین زندگی کے لیے ہی تو اتنی محنت کرتا رہا ہوں
میں۔ خدا کی قسم..... جانے کتنے سال بیت گئے
امرا کے بیٹوں کو عیش کرتا دیکھتے ہوئے حسرت
یاس میں اب آئے گی میری باری..... اور ویسے

آبیٹھا..... وہ کئی بار احسن سے پہلے بھی مل چکی تھی مگر
یوں اس طرح ملنا تو اللہ اللہ..... اسے قیامت کی
گھڑی سے بھی شدید لگ رہا تھا۔

احسن نے اسے سلام کیا اور ہیرے کی ایک
خوب صورت انگلی اس کی نازک سی انگلی
میں پہنا دی اور پھر گھونگٹ اٹھا کر اسے متوجہ کیا۔
”کیسا لگ رہا ہے رومی؟“ خواب گاہ میں
احسن کی مخموری آواز ابھری۔

”بہت اچھا..... اور سہانا.....“ امدتی خوشی
لہجے میں در آئی۔

”ہماری محبت کامیاب ہوئی اور ہمارا خواب
پورا ہو گیا۔“

”ہاں احسن! خدا کا شکر ہے، ہمارے جذبے
سچے تھے اور منزل ایک..... خدا نے ہمیں سرخرو کیا۔“
”رومی! آج کی رات ہماری زندگی کی پہلی
اہم ترین رات ہے۔ آؤ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام
کر..... ان حسین خوابوں کی سیر کو نکل جائیں جو ہم
نے کئی بار اک دو بجے کے ہجر میں دیکھے تھے۔“
دوسرے ہی لمحے احسن کے گرم اور بھاری ہاتھوں
میں اس کے نرم و نازک کانپتے ہاتھ تھے..... اور پھر
شاید دل بھی۔

ان جانفزالمحات کے فوراً بعد ہی اسے یوں لگا
کہ جیسے اس کی سانسیں بند ہو رہی ہوں، وہ احسن
کے بازوؤں میں جیسے تڑپنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا
اور..... اور پھر ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ گرم
کمبل اس کے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ جسے اس
نے زور سے ہٹا دیا۔ وہ پسینے میں شرابور تھی۔ اس نے
ٹیبل لیمپ کی روشنی میں جانا کہ وہ احسن کی خواب گاہ
میں نہیں اپنے بیڈروم میں محض اک خواب کی کیفیت
سے دو چار تھی۔ اس خواب کا اثر ابھی تک اس کے
دماغ پر طاری تھا اور دل دہائیاں دے رہا تھا کہ اے
کاش! یہ ایک خواب نہیں حقیقت ہوتی..... اس نے

ای! آپ کے عقلمند بیٹے نے میڈیکل کالج کی اینٹری
 پہلی دو تین لڑکیاں امیر گھرانوں کی تاڑ لی تھیں۔“
 ”آئے ہائے..... خدا تجھے نظر بد سے بچائے
 احسن! میرے بچے! یہ چہرہ جو تو نے چاند جیسا پایا
 ہے، بچپن سے ہی خاندان بھر کو پیارا لگتا تھا میرا
 شہزادہ۔“

”امی! خدا اگر احسن دے اور بندہ اس کا فائدہ
 بھی نہ اٹھائے تو..... گھونچو ہی ہواناں.....“ بڑے
 تفاخر سے کہہ کے وہ اپنا اور آل اٹھا کے چلتا ہوا۔

☆☆☆

اگلے ہی دن ویلج میں وہ احسن کے سامنے بیٹھی
 مزیدار سے انار کے جوس سے لطف اندوز ہو رہی
 تھی۔ رات کا خواب فون پر ڈسکس کرنے کے بعد
 احسن نے اسے حقیقی شادی کے پلان بنانے کے لیے
 ویلج ریسٹورنٹ میں انوائٹ کیا تھا۔

”رات اچانک تمہارا فون آنے پر میں اچھا
 خاصا چونک گیا تھا یار۔“ جوس کے سپ لیتے ہوئے
 احسن بتا رہا تھا۔

”احسن! وہ خواب ایسا تھا کہ مجھے لگا جیسے یہ
 سب سچ ہو۔ میری آنکھ کھل گئی تو میں..... کافی
 ڈسٹر بڈ تھی۔“

”ارے، خواب حقیقت بنے گا ایک دن.....
 یہ تو بس ریہرسل کروائی گئی ہے تمہیں.....“ احسن اپنی
 ذومعنی بات پر خود ہی ہنس دیا۔
 ”احسن.....!“ وہ شرما گئی۔

”اچھا خیر چھوڑو یار خوانی باتیں..... کچھ
 حقیقت کی فکر بھی کی جائے۔ دیکھو! میری ہاؤس
 جاب مکمل ہونے والی ہے اور وعدے کے مطابق امی
 اور تمہارے پاپا ہماری شادی کرنے والے ہیں۔ بولو
 کیسے ترتیب دیے جائیں سارے معاملات؟“ اب
 کی بار وہ واقعی سنجیدہ ہو گیا۔

”ایسے کون سے اتنے ڈھیر سارے معاملات

ہیں احسن! جو تم اور پاپا اتنی سنجیدگی سے طے کرنا
 چاہتے ہو؟ میں نے اپنے اور تمہارے ڈر۔سز خریدنا
 ہیں، ضرورت کی کچھ اشیا اور بس.....“ بڑی سادگی
 سے وہ بتانے لگی۔

”واٹ.....؟“ احسن کے لہجے میں بڑی
 حیرت تھی۔ ”یار! تم دوسری مشرقی لڑکیوں کی طرح
 یہ لمبا چوڑا جہیز نہیں خریدو گی کیا؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ اس کا انداز حتمی تھا۔
 ”پر کیوں؟ اس قدر امیر باپ کی بیٹی ہو، کم
 آن رومی! کیا پر اہلم ہے تمہیں بھلا؟“ وہ اچھا خاصا
 پریشان ہو گیا تھا۔

”احسن!“ بڑی بڑی آنکھوں کو مزید پھیلاتے
 ہوئے اس کے لہجے میں کافی حیران کن احتجاج اٹھ آیا۔
 ”میں تو حیران ہوں کہ تمہیں کیا پر اہلم اور کنسرن ہے آخر
 جہیز سے اور خاص کر پاپا کی پر اپری کے ذکر سے۔“

”نہیں یار!“ احسن نے فوراً خود کو سنبھالا۔
 ”مجھے..... تو نہیں مگر میرے رشتے داروں اور
 دوست احباب کو ضرور اعتراض ہوگا تمہارے خالی
 ہاتھ میرے گھر چلے آنے پر۔“

”مگر کیوں؟ یہ ہماری شادی اور ہماری لائف
 ہے، کسی کو بھلا ہم سے کیا کنسرن اور کیا اعتراض؟“
 ”رومی ڈیئر یہ لندن نہیں..... پاکستان ہے،

یہاں خواہ مخواہ کے کنسرنز پیدا کر لیے جاتے ہیں
 خاص طور پر جب کسی سے کوئی خطا ہو جائے اور اس
 پہ ڈھیر ساری تنقید کرنا مقصود ہو، سمجھیں آپ؟“ لہجہ
 نرم مگر بات میں سختی تھی۔

”مگر پھر بھی میں جہیز کے نام پر تجارت والے
 مشرقی رواج کو دل سے سخت ناپسند کرتی ہوں
 احسن۔ دیکھو صاف بات ہے۔ ہم دونوں ایک
 دوسرے کے لیے ضروری ہیں، ہمیں بس یہ ثابت کرنا
 ہے وہ بھی ایک دوسرے کو..... نہ کہ لوگوں کو..... اور
 یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔“

”او کے، او کے یار..... فضول کی بحث میں لگ گئے آتے ہی۔ کھانے کا آرڈر تم دوگی یا میں؟“
احسن نے کمال ضبط کی انتہا کرتے ہوئے خوشگوار انداز میں موضوع بدلا۔

”آف..... میرا دماغ تو کافی گرم ہو گیا تھا۔ تم ہی منگوا لو جو بھی پسند ہو اور ہاں آج بل میں ادا کروں گی۔“ رومانیہ تو اسے آسانی سے متفق ہوتے دیکھ کر نارمل ہو گئی مگر..... ساری ملاقات میں احسن اپنے اندر سے اٹھتے غصے اور متوقع ناکامی پہ مصنوعی مسکراہٹوں سے قابو پا رہا۔

☆☆☆

”جی..... جی میں بول رہا ہوں شہزادہ.....“
رومانیہ کی ہونے والی ساس کا فون تھا..... شہزاد احمد بے حد الٹ ہو گئے۔

”کیسے ہیں شہزاد بھیا آپ؟“ دوسری جانب سے مروتا پوچھا گیا۔

”الحمد للہ..... بالکل فٹ ہوں میں، آپ سے دراصل رومی اور احسن کی شادی کی تفصیلات طے کرنا تھیں مجھے۔“

”ہاں جی..... میں نے بھی تو اسی لیے فون کیا ہے آپ کو.....“

”جی فرمائیں.....؟“ انہیں احسن کی والدہ کے خواہ مخواہ کا باتونی ہونے سے بہت کوفت ہوتی تھی۔

”ارے بھئی فرمانا اور مانا تو کچھ نہیں، گھر کی بات ہے..... بس آپ تو جانتے ہیں کہ احسن کے والد اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ میں نے بیوگی کے باوجود روپیہ اس کی تعلیم پر صرف کر دیا۔ اب تو بس خدا پہ ہی بھروسہ ہے۔“

”جی میں جانتا ہوں.....“ کچھ عجیب سے وسوسے اٹھنے لگے۔

”تو بس پھر برامت مانے گا، میرے احسن کی نہیں..... اپنی بیٹی کی زندگی اور مستقبل کی خوشیوں

کو قائم رکھنے کے لیے آپ کو..... احسن کو سیٹل کر دیا ہوگا اور ایسا صرف تبھی ممکن ہے جب آپ رومی کے نام چھوٹا موٹا بنگلا، کوئی ایک گاڑی واڑی یا بیک بیلنس کر دیں۔“

”آپ جانتی ہیں میرے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔“ ان کے ہونٹوں پہ وہ مسکراہٹ رہتی تھی جو اپنا اندازہ درست ہونے کی صورت میں آجاتی ہے۔

”جی، جی..... شہزاد بھائی! آپ تو بادشاہ آدمی ہیں اور کیا.....“

”آپ نے بجا فرمایا..... مگر.....“

”مگر کیا؟“ ہولایا ہوا جملہ منہ سے نکلا۔
”مگر یہ کہ میں تو یہ سب لوازمات اپنی بیٹی کو دینے کے لیے تیار ہوں..... پروہ لینے کے لیے راضی نہیں۔ اب آپ ہی بتائیں، کیا کروں؟“ عجیب دورا ہے یہ لاکھڑا کیا تھا رومی نے۔

”اچھا..... عجیب لڑکی ہے، اسے اچھی زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں؟“ حیرت سے زیادہ تو دکھ تھا دوسری طرف۔

”اس نے بہت بہترین زندگی گزاری ہے بہن..... وہ تو روپے پیسے میں اس قدر کھیلی ہے کہ اب شاید دولت مندی کے بدلے وہ انسان کی محبت، پُر خلوص جذبات اور احساسات کی طلبگار ہو گئی ہے۔“ سادگی سے حقیقت بیان کی۔

”اچھا بھائی..... ٹھیک ہے، میں دوبارہ فون کروں گی..... وقت ملا تو۔“

”آپ آئیں نارومانیہ سے بات کرنے۔“

”چلو..... دیکھوں گی، ویسے آپ خود اپنی بیٹی کو یہاں کے ماحول اور رواجوں کے متعلق آگاہ کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ فون جواب سنے بغیر بند ہو گیا تھا۔ شہزاد صاحب کچھ پریشان ہو گئے۔

☆☆☆

ایک مہینہ عجیب گوگوسی کیفیت میں گزر گیا۔ ایک طرف احسن کی والدہ کی آمد متوقع رہی اور دوسری طرف سکینہ کی ڈیلیوری میں کافی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ خدا خدا کر کے ننھی سی حمہ اس دنیا میں چلی آئی..... مگر رومی کا خواب ابھی تک بد دستور خواب ہی رہا..... وہ جس کے بغیر زندگی ادھوری ادھوری سی لگا کرتی تھی۔ اب خال خال ہی دکھائی دینے لگا..... بے تابی سے فون کی جستجو کرتی تو اکثر بڑی کر دیتا۔ شہزاد احمد الگ خاموش تھے۔ اب کس منہ سے احسن کی والدہ کی منت سماجت کرتے کہ وہ آئیں اور انگوٹھی سے جڑے اک نازک رشتے کو پائیدار کریں۔ رومی کی ضد نے تو انہیں امیر سے غریب بنا کر رکھ دیا تھا۔ احسن، رومی کی پسند نہ ہوتا تو رشتوں کی لائن لگی تھی۔

انتظار کی اسی اذیت ناک کیفیت سے دوچار وہ ایک دن وہاں جا پہنچی جہاں اپنی مصروفیت کے بارے میں احسن اسے بتا رہا تھا۔ یہ ایک مقامی پرائیوٹ اسپتال تھا۔ گیٹ کراس کر کے وہ مرکزی عمارت کی جانب جانے ہی لگی تھی کہ احسن اپنی کولیگ ڈاکٹر زینیرہ کا ہاتھ تھامے کینٹین سے ہنستے ہوئے آتا نظر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر دھک سے اس کا دل بیٹھنے لگا..... جسے اس نے کمال مہارت سے سنبھالا اور ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائے ان کی جانب بڑھی۔

”ہائے احسن!“ احسن اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔

”اوہائے رومی! کیا حال ہے.....؟ یہ.....“

”ہاں یہ ڈاکٹر زینیرہ ہیں۔ میں جانتی ہوں انہیں۔“ اس نے نہایت خوش اخلاقی سے زینیرہ سے مصافحہ کیا۔ جس کے انداز میں اپنی پرانی کلاس فیلو سے ملنے پہ کوئی گرمجوشی نہیں تھی۔

”اوہ..... تو تم واقف ہو ان سے؟“ خواہ مخواہ ڈھرایا گیا۔

”احسن مجھے کچھ وقت چاہیے..... اگر تم فری ہو تو؟“

”او کے..... زینیرہ! میں تم سے کچھ دیر میں رابطہ کرتا ہوں۔“ مسکرا کر زینیرہ کو رخصت کیا۔ کچھ نہ کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا۔ وہ تذبذب کا شکار ہونے لگی۔

”ہاں رومی! یقیناً تم میرے بہت زیادہ بڑی ہونے کی وجہ سے پریشان ہو.....“ وہ اس کی طرف پلٹا..... مردانہ وجاہت تو اس کی ذات کا طرہ امتیاز تھی ہی..... اور اسے دل اسی کو اپنا سمجھتا تھا۔ لمحے میں گھائل ہونے لگی۔

”احسن! کہیں چل کے بات.....“

”بھئی..... یہیں آ جاؤ ایک طرف، میری نظر میں تو اتنے پیارے لان سے بڑھ کر کوئی اور خاص جگہ نہیں۔“ فوراً اس کی آفر کو رد کر دیا تو اس نے بھی عندیہ پیش کرنے میں دیر نہ کی۔

”احسن! تمہاری ماؤس جاب مکمل ہونے پر امی نے آنا تھا ہمارے گھر؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنی بات کہی۔

”ہاں..... آنا تو تھا رومی..... مگر سچ بات یہ ہے کہ تمہارا رویہ ان کا دل دکھا گیا ہے۔“

”کیوں..... کیوں احسن! میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟“

”بھئی رومی! سمجھنے کی کوشش کرو..... میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں..... میرے مستقبل کو وہ روشن اور محفوظ دیکھنا چاہتی ہیں..... مگر تم ہو کہ اپنے اتنے امیر والد کی جائداد میں سے اتنا بھی حصہ نہیں لینا چاہتی جو ہمیں خوشیوں کی ضمانت ہی دے سکے۔“

بے رخی کی انتہا اس کے خوب صورت چہرے کو ڈھانپنے ہوئے تھی۔

”کیوں احسن! تم اپنے آپ پہ یقین نہیں رکھتے؟ اتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بھی تم بہتر زندگی

کی ضمانت دوسروں سے مانگ رہے ہو، کسی کے مرہون منت کیوں ہو تم؟ اور..... اور پھر ہماری محبت؟“ اسے جانے کہاں سے ڈھیروں غصہ آ گیا۔

”ارے بھاڑ میں گئی یہ خالی خولی محبت.....“

احسن کی آواز اور لہجہ اتنا گرجدار تھا کہ اس کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ کافی فاصلے سے گزرتے ہوئے اکاؤنٹ لوگوں نے بھی چونک کے ادھر ہی دیکھا تھا۔ احسن کا یہ روپ دیکھ کے رومی کے دل میں سجا اس کا عظیم الشان بت یکنخت گرا اور پاش پاش ہو گیا۔ وہ ہونق سی اسے دیکھنے لگی۔

”ارے تم سے بہتر شریک زندگی تو وہ زنیہ ہوگی میرے لیے..... کم از کم سچی محبت ہے اسے مجھ سے..... ارے میرے مستقبل کو سنوارنے کے لیے باپ سے پراپرٹی میں حصہ بھی لے گی وہ۔“

”احسن!“ اس کے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی اتنی زیادہ ہنک کے باعث چکرا کے گر جاتی..... وہ تیزی سے مڑی اور جیسے من من بھر کے قدموں کو اٹھاتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچی۔

☆☆☆

احسن کی شادی کی خبر کچھ ہی دنوں میں ”احمد والا“ کے اہنی گیٹ کو عبور کرتی... اس کے کانوں سے آنکرائی۔ بادل گرے..... حسرت ویاس کا مینہ بھی آنکھوں کے بند توڑتے ہوئے خوب برسا مگر جو بجلی گرتا تھی وہ..... بالکل بھی نہ گری۔ جب کافی سوچ بچار کے بعد اسے احساس ہوا کہ آخری ملاقات ادھوری رہ جانے پر بھی..... احسن نے اسے آواز تک نہ دی تھی۔ والد کے دھی مگر طنزیہ اور مغرور رویے کے باعث اسے غم کا ابلتا آتش فشاں سینے میں ہی دفنانا پڑا پھر سب کچھ آنا فنا اور اس کی مرضی پوچھے بغیر ہی ہونے لگا۔ پاپا نے سیکینہ کو کچھ دن کے لیے بلایا تھا۔ اس کا درد بٹانے کو نہیں بلکہ وہ کینیڈا میں مقیم اپنے فرسٹ کزن کے بڑے بیٹے کے ساتھ اس کا نکاح

کرنے کے معاملات طے کر رہے تھے، وہ بھی میٹ پر..... سیکینہ نے اسے آگاہ کیا تو جواب میں وہ بس خاموش رہی تھی۔ جب احسن ہی نہیں ملا تھا تو کوئی بھی سبکی..... یہ ہی جواب ملا اسے اپنے اندر سے۔

”رومی! ذرا اپنے چہرے کی کیئر کرنا شروع کرو۔ نیٹ پہ ہی سہی مگر تمہاری تصویر تو دیکھے گا ناں تمہارا دو لھا کینیڈا میں.....“ سیکینہ بڑے پیار سے اسے دھیرے دھیرے سمجھاتی مگر وہ سر جھاڑ منہ پھاڑے سارے گھر میں بلاوجہ عجب بولائی سی پھرتی..... جیسے کوئی مقصد حیات ہی نہیں ہو یا پھر بہت قیمتی شے کم ہو گئی ہو۔ اصل میں تو اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اس کے آئیڈیل احسن میں ایسا خاص کیا تھا جسے وہ بھلا نہیں پاری تھی۔ کئی بار تو اس کے دماغ نے بھی عجیب سا سوال داغ دیا کہ وہ اس کا آئیڈیل تھا بھی یا نہیں۔ سلگتے لمحوں نے اس کی یادداشت کو داغدار کیا اور جلد ہوا وقت کچھ آگے سرک گیا۔ خزاں کی ایک اداس سی شام میں جب گھر کے تمام افراد کے درمیان وہ..... دلہن بنی کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی اسکرین پر نظر آتے ملاسم کے دولہا سے ایجاب و قبول کر رہی تھی تو بے وجہ اسے اپنا وہ خواب یاد آ گیا۔ وہی جھوٹا فریبی خواب، جسے وہ چاہ کر بھی کبھی بھلا نہیں پائی تھی۔ نکاح ہوتے ہی ارد گرد سے اور لاکھوں میل دور کینیڈا سے بھی مبارک سلامت کا شور سنائی دیا اور پھر اسے تین ماہ کے اندر رخصت کر کے کینیڈا لے آنے کے وعدے کے بعد تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ سیکینہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

☆☆☆

نکاح تو ہو ہی گیا تھا مگر اس کے کان پہ جول تک نہ رینگئی۔ وہ پوری کی پوری کسی کے نام سے منسوب ہو گئی۔ اسے چنداں پروا نہ تھی۔ عبدالمعین کی ڈھیروں تصاویر کمپیوٹر میں اس کے سامنے کھلی تھیں۔ وہ ہلک پہ ہلک کرتی جا رہی تھی مگر عبدالمعین

کی کوئی بھی تصویر اسے اپنائیت کا احساس نہ دلا سکی۔ in box میں اس کے نام کئی پیغامات تھے اور اپنی پسند و ناپسند کا ذکر بھی..... جس سے اسے ایک خاص بات کا علم ہوا کہ عبدالمعین بے حد مذہبی سوچ رکھتا ہے اور اسے بھی..... جہیز لینے کے بجائے دلہن کو ایک محفوظ اور بہتر زندگی فراہم کرنے کے لیے مالی اور اخلاقی تحفظ دینا پسند ہے۔ یہ پیغام پڑھنے کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی۔

کچھ ہی دنوں میں اس پر پاپا کی ان جلد بازیوں کا راز بھی افشاں ہو گیا۔ جب صبح سے اپنے کمرے میں وہ خود ساختہ قید سے گھبرا کر نیچے لاؤنج کی میزریاں اتری تو اماں زریہ نے اسے بتایا کہ ڈرائنگ روم میں اس کے پاپا سے ملنے کوئی خاتون آئی ہیں اور پاپا وہیں ہیں۔ شہزاد بہت عرصے سے اپنی کسی دوست کو گھر نہیں لائے تھے۔ بھی اسے یقین تھا کہ کوئی رشتے دار خاتون ہوں گی۔ وہ سیدھی ڈرائنگ روم کی جانب چل دی۔ جہاں وہ دونوں بے حد خوشگوار موڈ میں موجود تھے مگر خاتون بالکل انجانہ سی تھیں۔ جو اس سے عمر میں تو گنی تھیں مگر لاش پش میں اسے ہزار گنا مات دے رہی تھیں۔ اسے دیکھ کے مسکرائی رہیں وہ مگر شہزاد قدرے گڑبڑا سے گئے۔

”آؤ..... ان سے ملو رومی بیٹا..... یہ میری فرینڈ..... تمہاری آنٹی مونا ہیں، بڑی دلچسپ..... شخصیت کی مالک ہیں یہ۔“

رومی کو بیزاری میں بھی اس مضحکہ خیز سی اور ماڈ خاتون سے چہرے پر مروت سجا کر ملنا پڑا۔ عادت تو بچپن سے تھی مگر اب اس عمر میں بھی والد کو ایسی سرگرمیوں میں ملوث دیکھ کے اسے حیا سے زیادہ شرم ہی محسوس ہوئی۔

”نائس گرل۔“ مصنوعی سے انگلیں لہجے میں ان خاتون نے کہا۔

”بیٹا! زریہ اور مشتاق سے کافی کا کہو۔“

اسے سمجھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ بھی فوراً وہ ”اوکے پاپا“ کہتی ہوئی واپس مڑی۔

”تمہاری بیٹی تو بہت سادہ اور سنجیدہ سی ہے شہزاد ڈارلنگ!“ وہ تیزی سے ان آوازوں کی حد سے نکل گئی۔

☆☆☆

سیکینہ اور طاہر بھائی نے اسے نکاح کی خوشی میں اپنے خوشیوں بھرے پرسکون گھر میں انوائٹ کیا تھا۔ وجیہ کی جانب سے لان میں رات کو باربی کیو پارٹی بھی ارنج کی گئی تھی اور تو اور اس نے اپنے کچھ خوش مزاج دوستوں کو بھی دعوت پر بلایا تھا جنہوں نے آکر مختلف گانوں پر گروپ ڈانسز کرنے کا پروگرام تک بنا ڈالا، سب کچھ محض رومانیہ احمد کو خوش کرنے کے لیے ترتیب دیا جا رہا تھا۔ احسن کی طرف سے لگائی گئی اس کے دل کی چوٹ کو سب مل کے مندل کرنے میں بہت دنوں سے مصروف عمل تھے۔ انہیں اسے احساس دلانا تھا کہ وہ اب ایک نئی اور پریکٹیکل زندگی شروع کر چکی ہے۔ سیکینہ کی فرمائش پر وہ سی گرین شیفون کی ساڑی پر 70ء کی دہائی کا اونچا اور بڑا سا جوڑا سجائے جب تیز روشنیوں میں چلی آئی تو سب مہمان خصوصی کو جیسے دیکھتے ہی رہ گئے..... وجیہ عثمانی کا دل پہلی مرتبہ بڑے زور سے عجیب انداز میں دھڑکا..... دونوں ہاتھوں سے گونج دار تالی کی آواز جو نکلی تو سبھی حاضرین محفل اس کی آمد پر محبت سے تالیاں بجانے لگے۔ سیکینہ نے دلہن پر پھول نچھاور کیے اور بڑے انداز سے اس کا ہاتھ تھام کر لان میں عین اس بج کے سامنے رکھے صوفے پر لا بٹھایا۔ تقریب شروع ہو گئی۔ شہزاد احمد حسب عادت یہاں آنے کے بجائے اپنی نئی فرینڈ کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے تھے۔ وجیہ کی سرکردگی میں اچھا خاصا انتظام و اہتمام اس کے لیے کیا گیا تھا۔ مشروبات کی پیشکش کے فوراً

اپنے دماغ کو دیجئے طاقت اور توانائی



دفتری، گھریلو کارکردگی بہتر بنائیے

BRAINICA
BRAIN ENERGIZER SYRUP

PC SIR
نوڈ سپلیمنٹ کوئی سائڈ ایفکٹ نہیں
سے تصدیق شدہ

Rs.500/=

برینیکا

سیرپ

توانا اور متحرک دماغ بہتر زندگی!

برینیکا بذریعہ کوریئر/وی پی پی

اپنے گھر منگوانے کیلئے فون کیجئے

0315-3830001, 0315-3830002

0213-4943664
مراد میڈیکو: اسٹریٹ نمبر 17 نزد آغا خان ہسپتال

0213-4010647
786 میل سٹریٹ نزد پاکستان پوسٹ آفس

یاد رکھیے، برینیکا سیرپ کسی اور دوسرے میڈیکل اسٹور یا رابطہ نمبر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا

”یار..... مگر ہاف سیلوز تو اوڑھے ہوئے بڑے سے دوپٹے کے بھی اندر تھیں..... ان کو کیسے نظر آئیں؟“ وہ قدرے چڑی گئی تھی شاید۔
”لو..... اب یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ آرگنزا کے کامدار دوپٹے میں بھلا..... دکھائی نہیں دیتی ہوں گی تمہاری گوری بانہیں.....“ اسے رومی کے غصے کا علم تو تھا ہی۔

”اب خود ہی بتاؤ کیا جواب دوں۔ خفت سے ”سوری“ لکھوں یا ڈھٹائی سے ”میری مرضی؟“
”چھوڑو کچھ بھی نہ لکھو۔ یوں ظاہر کرنا جیسے تم نے میل دیکھی ہی نہیں۔“ ادھر سے رف سا آئیڈیا پیش کیا گیا۔

”او کے مگر ظاہر..... ہی کر سکتی ہوں۔ یقین دلانا مشکل ہو گا۔“ بیزاری سے فون بند کر کے وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کچھ اور بھی میلو تھیں پرانی..... جنہیں اس نے آج مٹا دینے کی ٹھانی تھی۔ مگر اسی اثنا میں کینیڈا سے اس کے شوہر نامدار..... عبدالمعبود کا فون آ گیا..... اس نے فون کو گھورا۔ نکاح کے ایجاب و قبول کے بعد شاید دوسری مرتبہ اس سے بات ہونے والی تھی۔

”ہے..... ہیلو۔“ رشتہ گہرا تھا پر آشنائی نہ تھی۔
”السلام علیکم.....“ خالصتا عربی لہجے میں کہا گیا۔ اس کی ہنسی چھوٹے چھوٹے رہ گئی۔ دھیرے سے اس نے جواب دیا۔

”کس سے..... بات کر رہی تھیں رومانیہ؟“ عجیب سے انداز میں حال چال پوچھے بغیر سوال داغا گیا۔

”مم..... میں..... وہ سیکینہ آپ سے..... بات کر رہی تھی۔“

”ہاں پہلے بڑی تھا فون.....“
”جی جی..... وہ بس..... آپ بھی مجھ سے ایک بات شیئر کریں گے کیا؟“ وہ بھی دو ٹوک ہو گئی جیسے۔

بیچنے کے لائق سمجھ رہی تھی۔
”دیکھو ناں! یہاں کتنی بورنگ لگ رہی ہوں میں..... اور یہ آف..... کسی مائی کی تصویر۔“ بے دلی سے تصاویر دیکھتے ہوئے وہ اپنے زریں خیالات کا اظہار بہن سے کر رہی تھی۔

”میں نے تو اسی روز تمہیں بتا دیا تھا کہ غسل درست کر لو ورنہ رابعہ پھوپھی کی خاندانی ہیلتھ وزیٹر ہی لگو گی۔“ کشن کا بھرپور وار کھا کے بھی سیکینہ ہنسی رہی تھی۔
آج میل باکس میں..... عبدالمعبود کی بڑی بہن نے بھی ای میل میسج بھیجا تھا۔ اس نے کمال شوق سے اسے اوپن کیا مگر پڑھنے کے بعد عجیب سے تاثرات دل میں ابھرنے لگے۔ رومن انگریزی میں لکھا تھا۔

”السلام علیکم، کیا حال ہے بھابی رومانیہ عبدالمعبود جی! آپ کی سلامتی کے لیے ڈھیروں دعائیں، آپ کی پکچرز..... ملی ہیں یوں تو ہمیں ان کا بے صبری سے انتظار تھا اور آپ کو پہلی مرتبہ اتنا کلوز دیکھ کے خوشی بھی ہوئی۔ بس..... برا مت مانے گا..... کہ ہمارے سمیت..... عبدالمعبود بھائی کو آپ کی ہاف سیلوز کچھ غیر مناسب سی لگیں..... معاف کیجیے گا پر بہتر ہو گا اگر آپ مکمل آستین والے موٹے کپڑے زیب تن کیا کیجیے..... دل سے دعائیں، اپنا خیال رکھیے گا۔“

رومانیہ کبھی مانیٹر..... اور کبھی اپنے کپڑوں کو عجیب بے ڈھنگے انداز میں دیکھنے لگی۔ پھر سائنڈ پر رکھا ہوا موبائل اٹھا کے سیکینہ کا نمبر پریس کیا..... اور ایک ہی سانس میں اسے میل سنا ڈالی۔

”ہاں..... تو..... عبدالمعبود تمہارے شوہر ہیں..... تمہیں ان کی پسند و ناپسند کا خیال تو رکھنا ہو گا ناں۔“ یہ جانتے ہوئے کہ رومی بذات خود اپنی اچھی خاصی نقاد ہے سیکینہ کو اسے سمجھانا بھی مشکل سا لگا۔

بعد اس کے دوستوں نے محفل کو جیسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ غضب کا ہلا گلا اور مشہور گانوں پر لڑکوں کے زبردست ڈانسز نے ماحول کو گرمادیا۔ وجیہ پوری طرح ان کے ساتھ شریک رہا بلکہ ننھے طلحہ اور شرارتی سی مومی کو بھی ساتھ لگائے رکھا۔ سیکینہ نے بڑے عرصے بعد رومی کے چہرے پر کچھ حقیقی تاثرات نوٹ کیے۔ وہ طلحہ، مومی اور وجیہ کی آپس کی شرارتوں پر مسکرا رہی تھی یا محفوظ ہو رہی تھی جو بھی تھا بڑے دنوں بعد نظر آیا تھا سیکینہ کو۔ وہ مطمئن سی ہو گئی۔

اتنے سارے ڈانسز اور ہلے گلے کے باعث سب دوستوں کی بھوک چمک اٹھی تو لان میں باربی کیو کرتے بیرے گرم گرم چکن بوٹی، سیخ کباب اور تکے خوب صورت سلاڈ سے سجے تھالوں میں اٹھائے ایک ایک مہمان کو پیش کرنے لگے۔

”رومانیہ جی!“ وجیہ اپنے پروقار چہرے پر تمام تر خلوص سجائے اس کے قریب چلا آیا۔
”آپ کو ہمارے انتظامات میں کوئی کمی تو نہیں لگی؟“

”ارے نہیں، نہیں وجیہ! شکریہ..... بے حد شکریہ..... اس قدر خلوص کا۔“ آج اس کا دل سے شکریہ کرنا تو بنتا ہی تھا۔

”بس رومانیہ جی! ہمارے اس خلوص کو آپ ہمیشہ یاد رکھیے گا اور کبھی جو ہماری ضرورت آن پڑے تو بلا جھجک کہہ ڈالیے گا۔ جتنی آپ ہماری بھابی کو عزیز ہیں۔ آپ کا خیال کرنا تو بنتا ہی ہے ناں.....“ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

”جی ضرور.....“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور وہ طلحہ کی پکار پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

رومانیہ کے نکاح کی تصاویر خود اس کے بجائے سیکینہ آپنی نے عبدالمعبود کو ای میل کی تھیں..... حالانکہ رومی ان میں سے صرف چند کو ہی

”یہ کینیڈا میں رہتے ہوئے بھی آپ کی فیملی..... اس قدر مذہبی عقائد کا خیال کیسے رکھ رہی ہے؟“

”رومانیسہ! فار یور انفارمیشن ایک تو مذہبی عقائد کا تعلق کسی خاص ملک سے نہیں ہوتا اور دوسرے شاید شہزادانگل نے آپ کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتایا..... ہم تین سال سے کینیڈا میں شفٹ ہوئے ہیں پہلے تو تمام عمر سعودی عرب میں رہائش تھی ہماری۔“

”اوہ..... اوکے..... اب پتا چل گیا ہے۔“

اسے اور کچھ نہ سوچا۔

”خیر آپ کی خیریت معلوم کرنا تھی۔ جو اب کرتا رہوں گا..... اور آپ کا بڑی فون بھی مجھے خواہ مخواہ کانشس کرنے لگا کہ جانے کس سے بات ہو رہی ہے ہمارے سوا آپ کی..... اوکے..... اللہ حافظ۔“

فون تو بند ہو گیا اور اس کے کانوں کی سائیں سائیں تو جیسے بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی میں رنگ جیسے غائب ہو گئے تھے۔ سنسان گھر میں صرف عبدالمعین کے فون آنے کی گھنٹی وقفے وقفے سے بجتی رہتی تھی۔ لان میں کھلے رو پہلے پھولوں پر شاید کوئی تازہ شبنم نہیں ٹھہری تھی اور گہرے سبزے میں گہرا ”احمد ولا“ زردی مائل بے رونق سی جگہ بن گیا تھا۔ شہزاد احمد کی لاڈلی امیرزادی یوں تو روپے پیسے کی اسیر نہیں تھی مگر ڈھیروں دولت بھی اس کے دل کی خوشیاں خرید نہیں سکتی تھی اور پھر خریداری تو اسے محبت جیسے انمول رشتے کو استوار کرنے کے لیے کرنی بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

”کیسا بے وقوف رہا میں بھی عمر بھر..... یا شاید خود پر کوئی گمان ہی نہیں رہا کبھی..... بھی تو اسے حاصل کرنا تو دور اس سے اظہار محبت بھی نہ کر سکا۔“ وجیہ عثمانی سادہ سے شلواری قمیص میں ملبوس اپنے کمرے میں

تہا بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس نے شاید تیسرے یا چوتھے سگریٹ کی راکھ سامنے رکھی ایش ٹرے میں بجھائی اور پھر سے خود کو تلاشتے میں مگن ہو گیا۔

جب طاہر بھائی نے رومانیسہ کا رشتہ لے جانے کے بارے میں رائے لی تو اس نے حیرت انگیز طور پر انکار کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ ”سکینہ بھابی بتایا کرتی تھیں کہ وہ سدا کی جھٹی ہے..... خاص کر اپنے آئیڈیلز کے متعلق.....“

بچپن سے وہ ہر کام اور ہر شخص کے بارے میں اپنا الگ ہی ایک تصور بنا لیتی ہے اور پھر اس کی رائے کو بدلنا کبھی آسان نہیں ہوتا تھا۔ رومانیسہ کی ہزاروں خوبیوں میں محض یہ ایک ایسی خامی تھی جو بقول شہزاد انکل کے..... اسے ضائع کر رہی تھی۔ اسے رومی کے لیے اپنے جذبات کی ٹوہ لگاتے ہوئے شہزاد انکل بھی اپنی بہت سی خامیوں کے ساتھ نظر آئے۔

”کیا ہزاروں خوبیوں والے انسان کی کسی ایک خامی پر اسے سزا دینا ضروری ہے جبکہ اس کی یہ خامی کسی اور کے لیے نقصان دہ بھی نہ ہو؟“ رومی کا معاملہ اس کے ذہن میں جانے کیوں زیر بحث تھا۔

”ارے وجیہ! تم یہاں بیٹھے ہو..... اور یہ کیا سگریٹ پینا کب سے شروع کر دی تم نے.....“ آف بہت بری بات ہے..... مجھے تو بالکل پسند نہیں۔“

”سکینہ بھابی کٹے ہوئے سیبوں کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولے چلے جا رہی تھیں۔

”وہ..... میں سوچ رہا تھا آپ بچوں کو لے کر کسی دن رومی کی طرف چلی جائیے گا..... کافی اکیلا پن محسوس کرتی ہے وہ.....“ خواہ مخواہ منہ سے پھسل گیا تو اسے خود کافی خفت محسوس ہوئی۔ اس کا کیا حق تھا بھلا یہ کہنے کا؟ ”سکینہ نے بھی عجیب سے انداز میں اسے دیکھا۔

”ہاں..... ضرور چلی جاؤں گی اصل میں سارا مسئلہ تو طلحہ اور مومی کے اسکول کا ہے ناں.....“ وہ

جس طرح بولتی ہوئی آئی تھیں ویسے ہی چلی گئیں..... وجیہ تو بس سر جھٹک کے رہ گیا۔

☆☆☆

عبدالمعین سے اس کے تعلقات عجیب بے ڈھنگے سے انداز میں چل رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی مگر شاید اس کی قسمت شادی اور محبت کے معاملے میں بڑی بیکار نکلی تھی۔

ہزاروں، لاکھوں میل کی دوری کے باوجود..... عبدالمعین کا کردار کسی شکی، اور حاکمیت پسند شوہر جیسا رہا تھا۔ کئی بار تو وہ پاپا کی عادات پر بھی اچھا خاصا لیکچر دے چکا تھا۔

”میرے ابو نے بتایا ہے کہ شہزاد انکل الکحل کا استعمال کرتے ہیں..... آپ دونوں بیٹیوں پہ بھی انہوں نے کبھی کوئی چیک نہیں رکھا.....“ سکینہ باجی کا دل اتنی آزادی کے باوجود بھی سسرال میں کیسے بکا ہوا ہے؟ میرے ابو نے ہمارا نکاح کر کے شہزاد انکل جیسے بندے پر احسان ہی تو کیا ہے..... برا مت مائیے گا..... سنا ہے انہوں نے پہلے بھی آپ کا کہیں رشتہ کیا ہوا تھا۔ اور آپ کی امی بھی ان کی اسی آزاد عادت کے باعث دکھی دل سے رخصت ہو گئیں اس دنیا سے۔“ وہ باتوں باتوں میں جیسے اسے زچ کرتا رہتا تھا۔ اس طرح کے سوالوں کے جواب تو پھر بھی تراش لیتی وہ۔ مگر مشکوک رہنا بھی اس کی روٹین میں شامل تھا۔

”آج کہاں گئی تھیں؟ اکیلی تھیں یا سکینہ باجی ساتھ تھیں تمہارے؟ اماں زہینہ کس مرض کی دوا ہے؟ اسے کیوں نہیں ساتھ لے جاتیں شاپنگ پہ؟ برقع نہیں پسند تو عبا یا خرید لو..... اور عبا یا طبیعت پہ ناگوار گزرے تو بڑی سی چادر ہی لے لو.....“ اگرچہ اس کی ہدایات درست اور فائدہ مند تھیں مگر انداز میں جو حاکمیت اور سخت گیری تھی روز بروز وہ اس سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں عبدالمعین کو کچھ

بھاتا ہی نہیں تھا یا در پردہ اس کی بڑی بہن اپنی سوچ کا اطلاق کرانے میں سرگرم تھی..... کچھ تو تھا جو دونوں میاں، بیوی..... میں بن کے نہیں دے رہی تھی اور پھر کینیڈا روانگی سے محض تین روز قبل ہی معاملہ جھگڑے تک آن پہنچا..... حسب عادت معین کا دن میں ساتواں فون تھا۔ ہر بار وہ بڑی مستعدی سے اس کے ہر ایک سوال کا جواب دے رہی تھی جو یقیناً اس کی لمحہ بہ لمحہ مصروفیات کے بارے میں ہی تھا مگر پھر سارے کمرے میں بکھرے سامان کی ملازمہ کے ساتھ پیکنگ کرتے ہوئے اسے فون اٹھانے میں دیر ہو گئی۔ عبدالمعین غضبناک سا ہورہا تھا۔

”کہاں تھیں تم؟“ بے حد غیر مہذب انداز میں استفسار ہوا۔

”وہ..... میں وہ سامان کی پیکنگ.....“

”ارے بس کرو..... کیا کچھ لوٹ کے لاؤ گی باپ کے گھر سے..... انسان کو ایک مختصر سا وقت کاٹنا ہے اس دنیا میں اور پھر یہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے رخصت ہو جانا ہے..... کیوں فضول خرچیاں اور لالچ بسالیا ہے تم جیسی لڑکیوں نے اپنے دماغوں میں؟“ آف اتنے مہذب ممالک میں رہ کر اتنی خوب صورت سوچ کا پرچار وہ اتنے غیر اخلاقی انداز میں کر رہا تھا جیسے وہ اس کی منکوحہ نہیں کوئی راہ چلتی غیر مہذب لڑکی ہو۔

ہائے ری قسمت!..... سفر زیست عجب سے رنگ دکھا رہا تھا۔ پہلا ہم سفر مادہ پرستی کی انتہا پہ تھا اور دوسرا..... اسے خواہ مخواہ..... تعیش پسندی کے الزام میں ملوث کرنے پر تلا ہوا تھا..... اس کا سر چکرانے لگا۔

”معین!“ اس کی آواز برداشت کی حدوں کو توڑتے ہوئے حلق سے برآمد ہوئی۔ ”آپ مجھ سے اس طرح بات نہیں کر سکتے..... میں آپ کی بیوی ہوں کوئی زرخیز غلام نہیں..... سمجھے آپ؟“

”اوہو..... تو بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ والد

روزمرہ تھکن کو بدل ڈالنے
چستی اور توانائی میں!
VITALITA SYRUP

Food Supplement for Vitality

Verified by
PCSR

Rs.250/-

ایک انمول خزانہ
ہر دم رکھے تو توانا

★ بدن کو معدنیات کی فراہمی

★ پروٹین کی کمی کا خاتمہ

★ دماغی کارکردگی میں بہتری

★ بدن کے لئے چستی اور توانائی

★ بیماریوں کے خلاف بھرپور مدافعت

★ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں کے لئے

★ سائڈ ایفکٹ سے مکمل محفوظ

★ روزمرہ کاموں کے لئے بھرپور توانائی

وائٹالیٹا سیرپ بذریعہ کوریٹر/ وی پی پی

اپنے گھر منگوانے کیلئے فون کیجئے

0315-3830001, 0315-3830002

کراچی میں وائٹالیٹا سیرپ حاصل کرنے کیلئے

مراد میڈیکو اسٹوریم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال
0213-4943664

786 میڈیکل سٹور بلاک 17، گلستان جوہر نزد جوہر چورنگی
0213-4010647

یاد رکھیے، وائٹالیٹا سیرپ کسی اور دوسرے

میڈیکل اسٹور یا رابطہ نمبر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا

”پاپا اپنی زندگی کا مکمل اختیار اپنے شوہر...
عبدالمصیب کو سونپنے سے پہلے میں اپنے دماغ میں
آئے خدشات کو دور کرنا چاہتی ہوں اور اس معاملے
پر میرے کچھ تحفظات، بحث طلب ہیں۔“
”جانتی ہو کہ کس وقت آ کر تم ایسی باتوں کی
گارٹی مانگ رہی ہو جب بارات سمجھو دروازے پر یہ
کھڑی ہے۔ ہوش، عقل کے ناخن لو۔ جانے کب تم
عقل مند ہوگی؟ تین دن..... صرف تین دن بعد تمہاری
فلائٹ کنفرم ہے۔ بے وقوف.....!“ وہ بھی اس کے
باپ تھے۔ ارد گرد کا لحاظ کیے بغیر اس پر چلا اٹھے۔
”صرف آپ یہ بتائیں کہ آپ میری مدد
کر رہے ہیں یا نہیں؟“

”کیوں..... اور کیسی مدد کرنا ہوگی مجھے
تمہاری؟“ طنز آؤ چھا گیا۔
”آپ کو اپنے کزن اور اس..... عبدالمصیب
سے میرے حقوق کے متعلق نہ صرف بات کرنا ہوگی
بلکہ..... بلکہ ایک reminder پر دستخط کروانا
ہوں گے کہ.....“

”شٹ اپ، نان سینس لڑکی میں کبھی ایسا
نہیں کروں گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے... تم نے مجھے؟ جو
معاملات نکاح سے قبل طے کرنے کے ہوتے ہیں
اب ان کی منت سماجت کر کے حل کرواؤں۔ تمہیں
اب اپنے پر اہلم خود ہی حل کرنا ہوں گی۔“

”پاپا! کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“
”ہاں..... بالکل اور پھر تم جیسی نادان اور خود
پسند لڑکی کے لیے کون وقت ضائع کرے۔“ ان کا لہجہ
نہ جانے کیوں مگر بہت دُشٹ تھا اور پھر اس کا جواب
بھی مل گیا۔ مونا آنٹی بڑے انداز اور استحقاق سے
گاڑی سے نکل کر اس کے عین سامنے کھڑی تھیں۔

”بے بی! ڈونٹ مائنڈ! پر تم جیسی بیٹیوں کے
والدین بھری جوانی میں ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔
پہلے بھی تم نے اپنی شادی کے معاملات کو خراب کیا

نگاہ مونا یہ ڈال کر اب شہزاد احمد سے مخاطب ہوئی۔
اس کے لہجے کی ضد بھی باپ نے فوراً محسوس کر لی۔
”افوہ..... کیا ہے رومی، مجھے تمہاری مونا آنٹی
کو چھوڑنے جانا ہے..... کیا مسئلہ ہے؟ بات واپسی
پر بھی ہو سکتی ہے۔“ انہوں نے اس کے جارحانہ موڈ
کو دبانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی بدکی۔
”نہیں..... آپ ابھی چلیں اندر..... میرے
ساتھ..... مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے
پاپا۔“

انہوں نے کسی محتاج کی طرح مونا کو دیکھا۔
جس کے چہرے اور انداز میں گھر جانے کی بے حد
جلدی صاف ظاہر تھی۔
”جانے تم کیوں سمجھ نہیں پا رہیں..... بالکل
ایک دودھ پیتی بچی کی طرح ضد ہوتی ہے تمہاری.....
میں کچھ نہیں جانتا بس..... جو بتانا ہے بتا دو یہیں.....
کم آن.....“ اس نے بھی موقع محل دیکھے بغیر سب
کہنے کا تہیہ کر لیا۔ جانتی تھی کہ جب ان کی زندگی میں
کوئی عورت آتی ہے وہ یوں ہی غیر اور کٹھور بن
جاتے ہیں۔ اس کے لیے خاص وقت شاید کبھی نہ
نکال سکیں گے۔

”تو سنیں پاپا..... آپ کے کزن کا بیٹا عبد
المصیب نکاح کے دن سے لے کر آج تک نہ صرف
میری انسلٹ کرنے میں لگا ہوا ہے بلکہ..... بلکہ وہ
ایک بے حد شکی اور حاکمیت پسند انسان ہے..... آئی
ایم سوری پاپا..... اتنی دور سے اگر وہ مجھے ذہنی اور
روحانی طور پر یہ تکلیف دے رہا ہے تو آپ خود ہی
بتائیں کیا تمام عمر میرا اور اس کا مزاج مل سکے گا؟“
سرتا پانچھتی وسوسوں کی ٹیمیں اس نے اگل ڈالی
تھیں۔ شہزاد احمد ایک لمحے کو سکتے میں آ گئے۔

”لڑکی! تمہارا دماغ تو درست ہے؟ کیا چاہتی
ہو آخر تم؟“ انہیں رومی کے گمبھیر مسئلے سے زیادہ مونا
سے شرمندگی کی پروا تھی۔

صاحب نے سب کچھ مجھے بعد از نکاح بتایا تو مجھے
تمہارے اس لب و لہجے کی پہلے سے توقع ہو گئی تھی۔“
”آپ کی سوچ انتہائی محدود اور منفی ہے.....
انتہائی مناسب اور قابل عمل باتوں کو بھی آپ کا یہ
انداز مجھ پر اثر انداز نہیں ہونے دے رہا۔“ اس کا
لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

”تم جیسی آزاد خیال گھرانوں کی لڑکیاں بڑی
محنت سے سیدھی ہوتی ہیں اور وہ میں کر کے ہی دم
لوں گا۔ فون بند کرتا ہوں۔ تم سے انشاء اللہ چار روز
بعد ملاقات ہوگی..... اور پھر میری ہر بات من و عن
بجکم شریعت ماننا پڑے گی..... اللہ حافظ۔“
”کیا گزارہ ہو سکے گا تمام عمر؟“ فون بند
ہوتے ہی وہ سر تھام کے بستر پر ڈھسے گئی۔ ایک ہی
سوال دماغ میں زوروں سے گردش کرنے لگا۔

☆☆☆

گیراج میں کھڑی برٹش گرین پراڈو میں بیٹھی
مونا آنٹی ہاتھ میں تھامے آئینے سے اپنی آخری لگ
دیکھ رہی تھیں۔ ڈرائیور باہر کھڑے شہزاد احمد کے حکم
پر گاڑی کو اور بھی چکار رہا تھا۔ صبح کے اجالے میں پورا
دلا ہی دمک رہا تھا۔

”شہزادار لنگ! پلیز جلدی کرو۔ امی دو گھنٹے سے
میرا ویٹ کر رہی ہیں۔“ مونا آنٹی شاید کل رات سے
یہیں قیام پذیر تھیں۔ بھی تو گھر جانے کی جلدی تھی۔
”بس دو منٹ یار! یہ ان کام چوروں کا کام
مجھے کبھی پسند نہیں آتا۔ جب تک خود اپنی نگرانی میں نہ
کراؤں، حرام خور ہیں یہ۔ اتنی خوب صورت گاڑی
کی یہ حالت بنا رکھی ہے انہوں نے؟“ شہزاد احمد کی کھلی
تعریفوں پر ڈرائیور نے بس کان دبانے میں ہی
عافیت سمجھی۔

”پاپا، پاپا! کہاں جا رہے ہیں آپ؟ پلیز اندر
چلیں..... میری بات سنیں.....“ اچانک رومائیسہ
گیراج میں وارد ہوئی۔۔۔ اور ایک عقیلی اور تنقیدی

غزل

بڑا عجیب سا موسم بسا ہے آنکھوں میں
خوشی کی رت میں بھی کچھ شبنمی سی رہتی ہے
بھری محفل میں بھی گم صم، اداس اور تنہا
ہجوم میں بھی مگر اک کی سی رہتی ہے
انا کے خول میں رہ کر صدا نہیں دیتے
نگاہ ناز میں لیکن نمی سی رہتی ہے
وہی سپنا کہ جو تم نے کبھی دکھایا تھا
اسی منظر پہ اب نگاہ جمی سی رہتی ہے
کرن پچھڑتے سے اس نے کہا تھا مجھ سے
تمہی سنبھالو کہ، دھڑکن تھمی سی رہتی ہے

شاعرہ: مہناز کرن، پشاور

اپنے ساتھ لگالیا۔

☆☆☆

کینیڈا رخصتی کی صبح شہزاد احمد بیٹی کو دعائیں
دینے کے لیے اس کے کمرے میں چلے آئے۔ جہاں
گزشتہ رات سے آئی سکیئنہ اور بچے بھی سو رہے تھے۔
”ایک بچے کی فلائٹ ہے، ذرا ٹائم سے نکل جانا۔
اڑ پورٹ پہ کافی مسئلے ہوتے ہیں، آن بورڈ ہوتے
ہوتے.....“ وہ سر جھکائے خفا خفا اور خاموش بیٹھی تھی۔
سکیئنہ بھی جان بوجھ کر آنکھیں موندے لیٹی رہی۔

”جانتا ہوں..... تمہاری ماں کے جانے کے
بعد..... ایک بہترین باپ کا کردار احسن طریقے سے
ادا نہیں کر سکا..... جیسا تجھی ہوں کوشش تو کی ہے تم
لوگوں کو خوشیاں دینے کی۔ ہاں بے پروا ہوں شروع
سے..... سو بہت کچھ برداشت کیا ہوگا تم دونوں
نے..... خاص کر رومی بیٹا تم نے.....“ وہ بدستور
خاموش رہی ہاں البتہ دکھ کے بادل آنکھوں کے
رستے ٹپ ٹپ برسنے لگے۔

”ٹھیک ہے، جانتا ہوں تم بہت خفا ہو.....
معافی تو نہیں مانگوں گا مگر امید کرتا ہوں کہ بہت جلد تم

بھائی بھی وجیہ کے ساتھ ساتھ حیران ہو گئے۔
”جی..... جی وہ میں..... طاہر بھائی! ذرا دل
اداس ہو رہا تھا۔ آپ اور بچوں سے۔“
”مگر پھر بھی..... رومی بیٹا؟“ ان کا انداز ہنوز
سوالیہ تھا۔

”مجھے تو یہ کسی مشکل میں لگتی ہیں۔ از ایوری
تھنگ اوکے ناں؟“ وجیہ اس سے کیسے ناواقف ہوتا
بھلا۔

”سکیئنہ! بے چاری کو یہاں کچن میں کھڑا
رکھوں گی یا..... چلو اندر چل کے بات کرتے
ہیں.....“ اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ سکیئنہ کے جہازی
سائز بیڈ کے کونے پر بیٹھی مستقل روئے چلے جا رہی
تھی اور اس کے ارد گرد بیٹھے سارے نفوس دکھ اور
شک کے عالم میں اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کسی
آن دیکھی قوت سے سوال کر رہے ہوں۔ ”اب اسے
کیا کہنا ہے؟“

”میں..... میں جانتی ہوں..... آپ لوگ بھی
پاپا کی طرح مجھے خود پسند، ضدی اور بے وقوف ہی
نہیں گے..... مگر خدا کی قسم میں.....“ رندھی ہوئی
آواز میں اس نے اپنی بھرپور صفائی پیش کرنے کی
کوشش کی۔

”رک جاؤ رومی بیٹا! پلیز..... کیوں اپنی بے
گناہی ثابت کرنے کے لیے خدائے واحد کی قسمیں
کھا رہی ہو، وہ بھی ہمارے سامنے اپنے دوستوں
کے سامنے ہم دونوں میاں، بیوی نے ہمیشہ تمہیں
اپنے تنہا سے گھر میں اپنے باپ کی ہر عادت پہ قربانی
دیتے دیکھا ہے پھر کیوں بتا رہی ہو، ہمیں اپنے بارے
میں؟“ طاہر بھائی..... باپ جیسی شفیق پر سنیلٹی کے
مالک..... آج اسے وہ پیارا اور اعتماد بخش رہے تھے۔
جسے اس نے برسوں مس کیا تھا۔ بات کرتے ہوئے
ان کی آنکھیں نم تھیں اور جنہیں دیکھ کے دونوں بہنیں
بھی رو دیں۔ طاہر نے ایک ننھی گڑیا کی طرح اسے

اب بھی وہ فیڈر بنا رہی تھی کہ اسے مین گیٹ پہ
رومانیہ کی گاڑی کا ہارن صاف سنائی دیا۔ اس نے
نگاہ اٹھائی کچن میں لگے کلاک پہ سوا گیارہ کا وقت
واضح تھا۔ وہ حیران رہ گئی..... فیڈر وہیں چھوڑ کر وہ
باہر کی طرف بھاگی..... رومی ہی تھی جو گاڑی پورچ
میں لگا کے اسی کی طرف آرہی تھی۔ دونوں بہنیں
شدت سے گلے لگ گئیں۔

”میں نے کل آنا ہی تھا رہنے کے لیے.....
سو چا کہ تمہارے جانے میں دن ہی کتنے باقی ہیں۔
کچھ گھڑی.....“ عجیب سے اندیشوں کے زیر اثر،
ایک بڑی بہن ہونے کے ناتے عجیب سے بے ربط
الفاظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

”میرے ساتھ اندر چلو.....“ سرد لہجے میں
جواب ملا تو سکیئنہ اسے لیے کچن میں آ گئی۔
”خیر ہے ناں رومی؟“

”نہیں..... تم تو اپنے گھر میں اتنی مگن رہتی ہو
کہ اُس گھر کی کوئی خبر ہی نہیں تمہیں.....“ پریشانی میں
اس نے بڑی بہن سے شکوہ بھی کر دیا۔
”اب بتا بھی چکو..... میرا دل دھلا رہی ہو خواہ
مخواہ.....“

”شہزاد احمد..... تمہارے پاپا..... بہت جلد
شادی کر رہے ہیں..... اور.....“

”اور..... دوسری بات کیا ہے..... رومی؟ میں
جانتی ہوں کہ دوسری بات پہلی سے زیادہ اہم ہے۔“
اسے پاپا کے متعلق خبر فزہ برابر بھی نئی نہ لگی۔
”اور یہ کہ میں پرسوں کینیڈا نہیں جا رہی۔“ وہ
بڑے حوصلے اور دکھ بھرے لہجے میں بولی مگر سکیئنہ پہ
گویا کوئی بم گرا۔

”کیا..... فضول بکواس ہے؟ تمہاری رخصتی
ہے پرسوں اور.....“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی.....
طاہر اور وجیہ دونوں اسی طرف آرہے تھے۔
”ارے رومی! یہ تم ہو..... اس وقت؟“ طاہر

اور اب بھی تمہاری اپنے شوہر سے نہیں بن رہی..... تو
پھر اس کی سزا بے چارے باپ کو کیوں دے رہی
ہو؟“

”آئی! ایک عورت کی حیثیت سے آپ ہی
بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے جبکہ عبدالمعین ایک.....“
اس نے مکاری مونا آئی کے طعنوں کو بھی اپنی
پریشانی میں انگور کر کے پوچھا۔

”صاف بات ہے..... تم کوئی اسکول جاتی بچی
نہیں ہو، عاقل و بالغ ہو، جاؤ خوب دیر تک سوچو اور
جو سمجھ میں آئے وہی فیصلہ کرلو..... کیوں شہزاد
ڈارلنگ ایم آئی رائٹ؟“

”ہاں..... ہاں بالکل..... ویسے بھی میں
زبردستی کا قائل نہیں ہوں..... البتہ جو بھی فیصلہ کرو،
یہ سوچ کے کرنا کہ کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں بھی
شادی کر رہے ہیں۔ کم از کم ہمارے معاملات کو
ڈسٹرب مت کرنا، اوکے۔“ وہ اس نئے انکشاف پر
تب تک سُن اور ہونٹ بنی کھڑی رہی جب تک گاڑی کا
انجن ایک زبردست گونج سے اشارٹ نہیں ہو گیا۔ وہ
سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گیراج سے
نکل آئی۔

☆☆☆

سکیئنہ بچوں کو سلا کے کچھ دیر کو کچن کا ایک چکر
ضرور لگایا کرتی تھی۔ سب کچھ نوکروں پہ چھوڑنا اسے
سخت ناپسند رہا تھا۔ رات دس گیارہ بجے جب دونوں
باورچی کچن صاف کر کے سونے کو جاتے تو وہ ضرور
آکر نظر ڈال لیا کرتی تھی کہ کہیں چو لھے جلتے تو نہیں
رہ گئے۔ فریج کا دروازہ اچھی طرح بند ہے۔ سالن
فریزر میں رکھ دیے گئے ہیں، پانی کے ٹکے مکمل بند
ہیں، روٹی کے ٹکڑے زمین پر تو نہیں گرے اور خاص
طور پر وہ مومی اور ننھی حمنہ کے لیے دو گرم فیڈرز
دودھ کے تیار کر لیتی تھی۔ جب وہ وقفے وقفے سے
بھوک کے مارے اٹھتی تھیں تو فوراً دے دیا کرتی تھی

عبدالمنیب کے رنگ میں خود کو رنگ کے ایک خوشگوار زندگی گزارو گی۔ میری تمام تر نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ ایک جھٹکے سے وہ یوں اٹھ کر چلے گئے جیسے کوئی سیاستدان کوئی بھی..... سیاسی بیان داغ کر ڈاکس سے غائب ہو جاتا ہے۔ سکینہ اٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

”تم تیار ہونا رومی؟“ سب کچھ سننے کے بعد اس نے پوچھا۔

”ہاں آپنی! میں نے پکا فیصلہ کر لیا ہے۔“
”تو ٹھیک ہے، گیارہ بجے طاہر اور وجیہ کے ساتھ کورٹ جا کر ہم دونوں خلع کے کاغذات کینیڈا روانہ کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے آپنی! روز روز سے تو ایک ہی دن مرنے بہتر ہے اور ویسے بھی مجھے احساس ہوا کہ بحیثیت عورت ذات کے..... میں تو شاید خود کو بدلنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جاؤں پر عبدالمنیب بہت سخت مزاج کا مالک ہے۔ وہ میرے لیے ایک فی صد بھی چٹنج نہیں ہوگا..... میری ہستی اس کے اور اس کی فیملی کے لیے بھی باعث مصیبت بن جائے گی۔“
”خدا تمہارا حامی و ناصر ہو رومی! اگر امی زندہ ہوتیں تو شاید یہ سب نہ ہوتا..... تم بھی منجھدار میں ڈولتی کشتی کے بجائے کسی کنارے لگی ہوتیں.....“
گہرے دکھ سے اس کی آواز بوجھل ہونے لگی۔

☆☆☆

”رومی! تمہیں طاہر بھائی اور سکینہ بھابی کے ساتھ گھر واپس جانا چاہیے تھا۔ شہزاد انکل کو جب یہ علم ہوگا تو وہ..... شاید تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کریں۔“ کورٹ سے واپسی پر اس نے بہن اور بہنوئی کو زبردستی واپس بھیج دیا تھا۔

”پاپا کو ہمیشہ سے جانتی ہوں اور اب بھی خود ہی فیس کروں گی انہیں..... بس وجیہ! آپ چھوڑ آئیں گیٹ تک مجھے.....“ سکینہ اسے اللہ کے حوالے

کر کے اسی کے اصرار پر طاہر کے ساتھ چلی گئی۔
”وجیہ! وہ میرے پاپا ہیں..... اور جانتی ہوں کس حد تک غصہ آئے گا انہیں۔“
”اوکے..... خدا آپ کی مدد کرے..... ایک بات پوچھوں..... برامت مانتے گا۔“
”یہی کہ اب میں کیا کروں گی؟ تمہا زندگی کیسے کاٹوں گی؟“

”جی جی..... بالکل میم! یہی پوچھنے والا تھا میں۔“ وہ درو بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ ”بولو ناں کیا ہوگا اب تمہارا؟“ لہجے میں لاکھوں فکریں تھیں۔
”وجیہ! یہ وہ سوال ہے جو ماں کی وفات کے بعد میرے لیے کئی بار دہرایا گیا۔ ہر بار..... جواب میں میرے پاس کچھ نہیں تھا مگر پھر بھی زندگی کتنی رہی..... مرنے تو نہیں گئی میں.....“
”تو..... کیا پھر سے خود کو اپنے بے پروا پاپا، مونا آنٹی کے طعنوں اور احمد ولا کی اداسیوں کے حوالے کر دو گی تم؟“

”بتائیں، کوئی حل ہے آپ کے پاس؟“
بہت کچھ چاہ کے آج بھی وہ اسے بس یہ نہ کہہ پایا کہ میں حاضر ہوں۔ تمام مشکلوں..... تمام کم مائیگی کو دور کر دوں گا۔

”جو بھی ہے رومانس! انسان کے لیے تنہا پہاڑ جیسی زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔ خلع ملے ہی تم اپنے لیے کوئی مناسب سا جیون ساتھی تلاش کر لینا..... سکون سے زندگی کٹے گی ورنہ..... تو عورت کے لیے مسائل کا انبار کھڑا ہے۔“ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے مشورہ ہی دیا گیا بس اس سے۔
”آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی وجیہ؟“ بے خیالی میں شاید ٹائم پاس..... کے لیے پوچھا گیا سوال کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح وجیہ کے دماغ میں لگا۔

”میں نے..... شادی.....؟“ ایک بے بس سی

مسکراہٹ ہونٹوں پہ چسپاں ہو گئی۔

”جی ہاں، آپ نے؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں بس..... اب کیا کہوں..... شاید جس کی تلاش تھی وہ ملا ہی نہیں۔“
”اس کا مطلب..... سب کو ہی اپنے آئیڈیل کی تلاش رہتی ہے۔“ تھوڑا بہت خود کو مورد الزام تو وہ ٹھہرا ہی رہی تھی۔

”کہہ سکتے ہیں اور نہیں بھی..... ہر بندہ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔“ اسے جو سمجھ میں آیا وہ کہہ ڈالا اور اسی اثنا میں وہ گھر کے دروازے پہنچی۔

☆☆☆

عبدالمنیب سے خلع لیے اسے ایک سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا..... خلع کے پیپرز کینیڈا بھیجنے کے بعد اس دن جب وہ گھر واپس آئی تو سوائے اماں زرینہ، مشتاق اور چند ایک وفادار ملازموں کے اور کوئی نہیں تھا۔ سارا گھر زوروں کی آندھی طوفان آجانے کے باعث عجیب آسیب زدہ سا لگنے لگا۔ ایک بارول چاہا کہ گاڑی نکالے اور جیسے اڑتی ہوئی سکینہ کے گھر جا چھپے مگر پھر..... اپنے معاملات کو خود ہی حل کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے وہ اپنے بیڈروم کی گلاس ونڈو کے قریب گرم کبل میں دبکی رہی..... اماں زرینہ گرما گرم کافی اور بریڈرولز لے کر آئی تو اس نے وہیں روک لیا۔

”اماں! پاپا کچھ بتا کے نہیں گئے کہ کب آئیں گے؟“

”پہلے کبھی بتایا ہے کیا شہزاد میاں نے جواب بتائیں گے.....“ وہ بھی نا امید سی لگ رہی تھیں۔
”بس کہہ گئے تھے کہ گھر کا خیال رکھنا..... اور بیٹا! ایک بات کی سمجھ ہم کو تو نہیں آئی۔ یہ تم تو خیر سے آج کینیڈا کے لیے رخصت ہو رہی تھیں گھر سے پھر؟“

”پھر..... پھر.....“ مطمئن انداز میں جواب دیا۔ ”پاپا آئیں گے تو خود ہی پتا چل جائے گا۔ میری

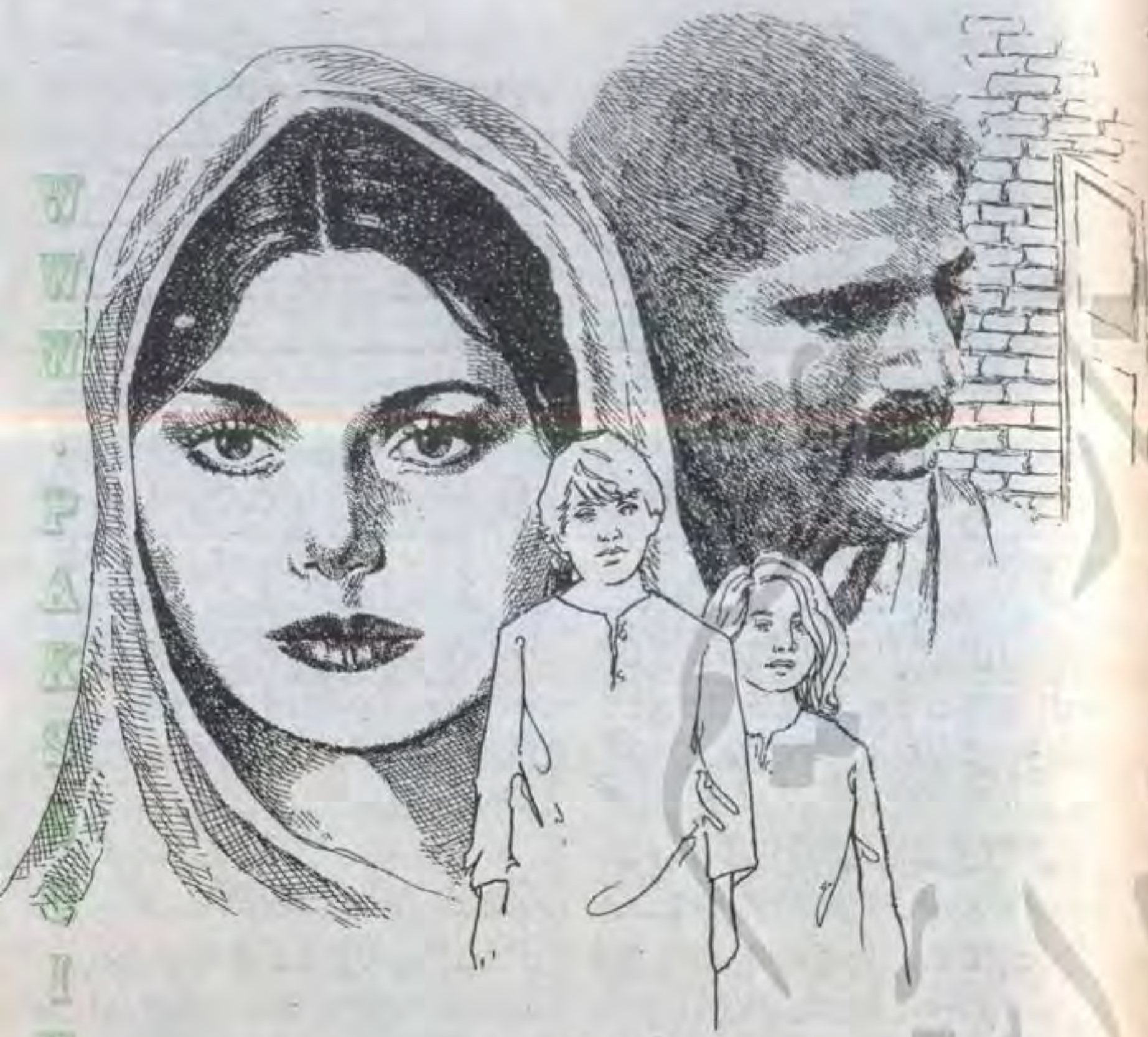
فلائٹ کینسل ہو گئی ہے اماں جی۔“

وہ دونوں اس اندھیری طوفانی رات میں دروازے لاک کیے ایک دوسرے کے ساتھ وقت بتاتی رہی تھیں۔ ڈھیروں مشکلوں کی طرح وہ پانچ دن بھی اکیلے سکتے ٹھہرتے گزر رہی گئے..... پاپا کے فون پر اماں زرینہ کو جو ہدایات ملیں۔ انہیں سن کر رومی نے من و عن بڑی بہن کے گوش گزار کر دیا..... وہ باقاعدہ نکاح کے بعد مونا آنٹی کے ساتھ ہی مومن ٹرپ پہ تھے پھر ان کی واپسی بھی بڑی فلمی انداز میں ہوئی۔ پاپا عمر سے پندرہ سال کم کے لباس میں ملبوس کسی ہیرو کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور مونا آنٹی باقاعدہ سرخ کامدار قیمتی ساڑی میں عجیب بھونڈی سی لگ دے کر بھی خوش اور مطمئن لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر پاپا بہت چلائے تھے۔ سر تھام کے کافی دیر بیٹھے رہے۔ مونا آنٹی نے بہت دیر تک لمبا چوڑا لیکچر دیتے ہوئے خنجر کی آنی سے بھی زیادہ چھیننے والے طعن و تشنیع سے بھی نوازا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور نہ ہی یہ بتاتے ہوئے اسے برا لگا کہ عبدالمنیب کو وہ خلع کے کاغذات بھیج چکی ہے۔

☆☆☆

طلحہ کی دسویں سالگرہ پر خود وہ اور سکینہ دوسری چھوٹے بہن اور بھائی کی بڑی بہنیں بن چکی تھیں..... رومی اور وجیہ کے بالوں میں آئی رد پہلی چاندنی کو طاہر بھائی کی عقابی نگاہوں نے ڈھونڈ لیا۔
”یار! شرم کرو تم دونوں..... کنوارے آنٹی! انکل!“ وہ بالکل برابر میں کھڑے رومی اور وجیہ سے مخاطب تھے۔

”ایسا کرو کہ یا تو اپنے اپنے لیے کوئی مناسب رشتہ قبول کر لو یا پھر..... آپس میں شادی کر لو.....“
خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو.....! انہیں غصہ تھا یا پھر وہ مذاق کی انتہا پہ جا کے وہ جملہ کہہ گئے۔ جس سے وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر



تحفہ لوشیڈنگ کا

رضوانہ پارس

”سنیں ثاقب، آج آفس سے واپسی پر ایک کلو سیب لیتے آئے گا۔ بچوں کے ایگرام شروع ہونے والے ہیں، میں چاہتی ہوں کچھ پھل وغیرہ بھی ان دنوں اگر عاشی اور آزر کھاتے رہیں تو ان کے دماغ کے لیے اچھا رہے گا۔“ عنبر نے آفس کے لیے نکلتے ثاقب سے فرمائش کی تو وہ الجھ سا گیا۔

”یار عنبر تم بھی فضول کی بات کرتی ہو، سیب کھانے سے کیا بچے ایک دم ہی بہت ذہین ہو جائیں

خوش شکل نہ سہی مگر پیار اور خلوص سے بھرا بہت بڑا دل رکھتا ہے..... ایک بھائی کا دیا ہوا تحفہ قبول نہیں کرو گی کیا؟“

رومانیہ نے ایک نظر طاہر بھائی کے گرم ہاتھوں میں قید اپنے کانپتے ہاتھوں پر ڈالی تو دوسری سے وجیہ عثمانی کو اپنے جیون ساتھی کے طور پر جانچا..... اس کی آنکھوں میں ایک امید بھری سوچ اور ہونٹوں پر خوش آمدید کہتا دھیمسا سا تبسم ثبت تھا۔

”طاہر بھائی! سیکینہ آپی! میں آپ لوگوں کی بات کو کبھی رو نہیں کر سکتی.....“ یہ مشکل تمام اس نے کچھ کہنے کی ٹھانی ہی تھی کہ طلحہ، مومی اور ان کے ننھے دوست دروازے کے قریب کھڑے تالیاں بجانے لگے۔

”خالہ مان گئیں..... خالہ مان گئیں.....“ بچوں کے شور سے کان پڑی آواز سنا کی نہیں دے رہی تھی۔ بھی وجیہ عثمانی نے اپنے دھڑکتے دل کو قابو کر کے بڑے حوصلے سے رومانیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کی اس سرعام جرات پر رومی نے گھبرا کر بہن اور بہنوئی کو دیکھا تو وہ بڑی چاہت اور خوشیوں بھری امید لیے مسکرا رہے تھے۔

”رومی.....!“ وجیہ نے اسے پہلی بار استحقاق سے پکارا تو اسے یہ محسوس کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ زندگی میں پہلی بار ہی اسے اپنے سامنے اپنی پسندیدہ خوابوں کا مجسم روپ نظر آیا تھا۔ سچائی اور خلوص، محبت سے بڑھ کر اور کیا صفات ہوتیں جو وجیہ میں نہ تھیں۔

”وجیہ.....!“ آپ کے خلوص کا بے حد شکریہ!“ اس نے بھی بڑی عقیدت اور اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھاما اور پہلے سے منتظر بچوں کے ساتھ مل کر سالگرہ کا کیک کاٹنے چل دی۔ دونوں کو خوشی کے ساتھ چلتے دیکھ کر سیکینہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ جنہیں طاہر عثمانی نے اپنی انگلیوں کی پوروں پہ چن لیا۔

سنائے میں آگئے..... رومی ایک جھٹکے سے اٹھ کر سیکینہ کے بیڈروم میں چلی گئی اور سیکینہ نے طاہر کو ان کی اس بات پہ بہت گھور کے دیکھا۔

”سیکینہ! مجھے یوں مت گھورو..... خدا کی قسم رومانیہ مجھے بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں..... بھی تو برسوں سے چاہتا ہوں کہ وہ میری بیٹی بن جائے..... وجیہ کی زندگی میں آکر..... یقین مانو میں اسے وہ تمام تر تحفظ اور خوشیاں فراہم کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو تمہارے پاپا کو اسے دینی چاہیے تھیں..... وہ بے چاری دو بار زندگی کے اہم امتحان میں ناکام کیا ہوئی..... ہم نے اس کی..... اہم ترین ذات کی طرف دیکھنا اور سوچنا تک چھوڑ دیا۔ نہیں سیکینہ! وہ ہماری بیٹی جیسی بہن ہے اور میں بھائی ہونے کے ناتے اس کا مستقبل ضرور سنوارنے کی جدوجہد کروں گا۔“ طاہر عثمانی تو ہمیشہ سے ہی اس کے خیر خواہ تھے۔ اب طلحہ کی سالگرہ کا کیک کاٹے بغیر ہی سب کو لیے..... اپنے بیڈروم کی طرف لپکے۔ رومانیہ شہزادہ کیلے میں منہ دیے اپنی تمام تر توانائیوں سے رو رہی تھی۔ سیکینہ نے بڑی محبت سے اسے اپنی جانب کھینچ کر گلے لگا لیا..... چہرہ بال اور اس کا دامن تک بھیگا ہوا تھا۔

”رومی! میری جان! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“ سیکینہ کی آواز اس کی ذمے داری کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔ طاہر بھائی بھی آگے بڑھے۔

”رومی بیٹا! اپنے بڑے بھائی کو یوں تنگ کرنا چھوڑ دو۔ تم یوں اپنوں میں بھی غریب الوطنی کی زندگی تو مت گزارو۔ ہمیں یوں سزا مت دو خود سے خلوص رکھنے کی.....“ ان کی آواز کمرے کے سکوت میں گونج رہی تھی۔

”دیکھو! میرے پاس تمہیں دینے کے لیے ایک بہت پیارا اور عزیز از جان تحفہ ہے..... میرا بھائی وجیہ عثمانی..... برسر روزگار، تعلیم یافتہ..... بہت

گے اور ایگزیم میں ٹاپ کر لیں گے۔ ارے ابھی تم نیوز میں نہیں دیکھ رہی تھیں کہ ایک تدور میں روٹیاں لگانے والے بچے نے پورے صوبے میں ٹاپ کیا ہے جس کے پاس ڈھنگ سے کھانے پینے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے اور تم جانتی ہو آج کل سب کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔“ ثاقب کا یہ لیکچر عنبر نے بہت صبر کے ساتھ سنا اور اترے ہوئے چہرے کے ساتھ خاموشی سے مڑ گئی۔

”دیکھو عنبر آفس جاتے وقت میرا موڈ مت خراب کیا کرو۔ تمہیں یوں اداس چھوڑ کر جاؤں گا تو ٹھیک سے موٹر بائیک بھی نہیں چلا پاؤں گا اور اگر کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا تو پھر پچھتانا کہ آخری وقت میرا میاں گھر سے خفا ہو کر گیا تھا۔“ ثاقب نے رُوٹھ کر جاتی ہوئی اپنی بیوی کی ڈکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا کہ یہی آخری حربہ ہوتا تھا اس کے پاس عنبر کو منانے کا اور یہی ہوا عنبر تڑپ کر واپس پلٹی۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھی اُمڈ آئے تھے۔

”گھر سے نکلتے وقت اتنے منحوس جملے بول کر کیوں میری جان نکال رہے ہیں آپ؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ ثاقب نے بہت پیار سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”مجھے غصے سے اور کبھی اپنے اتنے والہانہ انداز سے..... تم مجھے جانے بھی دو گی یا نہیں؟“ ثاقب نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ کچھ کھسیا کر اس کی بانہوں سے نکل آئی۔

”سوری ثاقب، میری وجہ سے آپ کو آفس سے کافی دیر ہو گئی لیکن بس ایک منٹ اور رک جائیں۔“ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ ثاقب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تبھی وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے پاس آگئی اور ثاقب کے ماتھے سے دس روپے کا نوٹ چھلاتے ہوئے فوراً اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ثاقب، یہ راستے میں کسی فقیر کو دے دیجیے گا اور بائیک آہستہ چلائے گا۔“ ثاقب مسکراتا ہوا اپنی بائیک کی طرف چلا گیا اور جب تک بائیک عنبر کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی وہ وہیں دروازے پر کھڑی دعائیں پڑھتی رہی۔

ثاقب اور عنبر کی شادی کو تقریباً دس سال ہو گئے تھے لیکن ان کی محبت آج بھی گلاب کے پھولوں کی طرح تازہ اور مہکتی ہوئی تھی، حالانکہ معاشی حالات انہیں زندگی کو زیادہ انجوائے نہیں کرنے دیتے تھے لیکن پھر بھی عنبر کو اپنے اس چھوٹے سے گھر، اپنے شوہر اور اپنے دونوں بچوں سے والہانہ محبت تھی۔ اپنے گھر کے پرسکون ماحول میں اسے اتنی زیادہ خوشی محسوس ہوتی تھی کہ وہ ہر وقت ان میں اتنی مگن رہتی کہ اسے اور کسی چیز کی کمی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی باقی دو بہنیں اس سے زیادہ خوشحال گھرانوں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا رہن سہن، ان کا پہننا اوڑھنا اور گھریا سب ہی کبھی کبھی عنبر کے دل میں ایک ہلکی سی خلش پیدا کر دیتے لیکن پھر ثاقب کی خوب صورت رفاقت اور اپنے پیارے پیارے بچوں کی بے تحاشا محبت میں گم ہو کر جیسے وہ اپنی زندگی میں ہونے والی ہر کی کو بھلا دیتی۔ ثاقب ایک بڑی کمپنی میں ایک درمیانے درجے کی پوسٹ پر فائز تھا۔ تنخواہ بس اتنی تھی کہ مہنگائی کے اس ہوش رُبا دور میں کھینچ تان کر گزارہ ہو ہی جاتا تھا اور اب جوں جوں بچے بڑے ہو رہے تھے خرچے اور مسائل میں بھی اضافہ ہو رہا تھا لیکن عنبر پھر بھی اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو بغض، حسد اور دوسروں سے بلا وجہ کی ریس میں اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی اجیرن کر دیتی ہیں۔ ایک اچھی اور باصلاحیت بیوی بن کر اس نے اپنے چھوٹے سے گھر کو ایک پرسکون جنت کا روپ دیا ہوا تھا۔ بس ایک ذرا سی خامی جو اس میں تھی وہ یہ کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس تھی۔ بچوں کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی تھی۔ خاص طور پر ان کی

پڑھائی کے سلسلے میں وہ جنون کی حد تک پاگل تھی۔ اچھی دونوں بچے بہت چھوٹی کلاسوں میں تھے لیکن وہ یہ برداشت ہی نہیں کر پاتی تھی کہ آرزو اور عاشی کے کسی ٹیسٹ میں ذرا سے بھی کم نمبر آئیں اور ایگزیم کے دنوں میں تو وہ جیسے پوری دنیا بھول کر بس بچوں کو پڑھانے میں ہی مگن رہتی جس کا شکوہ اس کی امی اور بہنوں کے ساتھ ساتھ ثاقب کو بھی ہوتا کہ ایگزیم کے دنوں میں وہ اپنی بیوی کی نگاہ کرم سے مکمل طور پر محروم ہو جاتا۔ یہاں تک کہ چائے ناشتا اور کھانا بھی ثاقب کے سامنے رکھتے ہوئے اس کا سارا دھیان بچوں کی طرف ہی رہتا۔

”عاشی میں پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔ سارے سوالوں کے جواب لکھ کر رکھو۔“ اور کبھی آزر کو میتھس کے سوال کو جلد از جلد حل کرنے کی تاکید کی جا رہی ہوتی۔ کبھی کبھار ثاقب الجھ ہی جاتا۔

”یار لگتا ہے سی اے کا ایگزیم دے رہے ہیں یہ بچے، ارے اتنی چھوٹی کلاسوں میں ہیں یہ لوگ..... تھوڑا ایزی لو۔“ عنبر اس کی بات کا برا مان کر ہمیشہ کی طرح جواب دیتی۔

”آپ کا مطلب ہے کہ چھوٹی کلاسوں کے بچوں کو ایگزیم کی تیاری کرنے کے بجائے کھیل کود میں لگا دینا چاہیے کہ بیٹا سی اے کا ایگزیم دینا بھی پڑھنا۔“

ان دنوں عاشی اور آزر کے ایگزیم کا سلسلہ چل رہا تھا۔ کل ان کا پہلا پیپر تھا اور بقول ثاقب کے یہ بچوں کے نہیں بلکہ عنبر کے ایگزیم شروع ہو رہے ہیں۔ عنبر کو جو سب سے بڑا مسئلہ لگ رہا تھا وہ لوڈ شیڈنگ کا تھا۔ ان کے علاقے میں دن میں تین بار دو دو گھنٹے کے لیے لائٹ جاتی تھی۔ سب سے زیادہ عنبر کو جو وقت کھلتا تھا وہ رات نو بجے کا تھا جو بچوں کے سونے کا ٹائم ہوتا تھا۔ رات نو بجے سے گیارہ بجے تک لائٹ کا نہ ہونا اس کے لیے شدید اذیت کا سبب بنا ہوا تھا۔ اتنی شدید گرمی میں بھلا بچے پنا پنے کے کیسے سو سکتے تھے۔ عام

دنوں میں تو خیر گزارہ ہو ہی رہا تھا لیکن ایگزیم کے دنوں میں ایسے وقت لائٹ کا جانا بچوں سے زیادہ عنبر کو پریشان کر رہا تھا۔

”کاش ہمارے گھر یو پی ایس ہوتا یہ تو اب عام سے گھروں میں بھی لوگوں نے لگوا لیے ہیں۔“ اس نے کڑھ کر سوچا لیکن ثاقب سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی البتہ ثاقب کے سامنے اس لوڈ شیڈنگ کو صلو اتیں سنا کر دل کی بھڑاس ضرور نکال لی۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ناصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 نمبر ۱۱۱ سٹیشن ڈسٹریکٹ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

ہر روز شنبات کو شہر کے ہر گھر پر

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”ارے شکر کرو کہ اب بجلی ٹائم سے جا کر بالکل ٹائم سے یعنی دو گھنٹے میں ہی واپس آ جاتی ہے۔ ورنہ یاد ہے پہلے بغیر کسی اطلاع بغیر کسی شیڈول کے گھنٹوں، گھنٹوں غائب رہتی تھی۔“ ثاقب نے اسے پچھلے دنوں کی یاد دلا کر جیسے اس لوڈ شیڈنگ کو تعریف کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جو عنبر کو ذرا بھی پسند نہیں آئی۔

”لیکن ثاقب کل بچوں کا پہلا پیپر ہے۔ گیارہ بجے رات تک ان کی نیند ڈسٹرب رہے گی تو صبح سویرے کیسے وہ فریش اٹھیں گے۔“ وہ کافی فکر مند لگ رہی تھی۔

”افوہ عنبر، یہ شکر کرو کہ ہمارے ایریا میں گیارہ بجے لائٹ آ جاتی ہے جہاں میرا دوست جاوید رہتا ہے وہاں رات گیارہ بجے لائٹ جا کر ایک بجے رات کو آتی ہے۔“ ثاقب کی اس اطلاع پر عنبر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے کہ یہاں گیارہ بجے لائٹ آ جاتی ہے۔“ ثاقب اس کے شکر بھیجنے پر بے اختیار ہنس دیا۔

”بس میری پیاری بیگم، تمہاری یہ معصومیت ہی تو ہمیں دیوانہ بنائے ہوئے ہے لیکن آج کل تو تمہاری طرف سے نو لفٹ کا بڑا سا بورڈ ہمارا منہ چڑاتا رہتا ہے۔“ ثاقب کی وارفتہ نگاہوں سے کتراتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”افوہ ثاقب، آٹھ بج رہے ہیں، میں جلدی سے کھانا لگا دوں پھر بچوں کو کل کے پیپر کی تھوڑی سی تیاری بھی کروانی ہے نو بجے لائٹ چلی جائے گی۔“ وہ عجلت میں کہتی کچن کی جانب چلی گئی۔

”کاش میں ایگزام کے دنوں میں بچوں کی کوئی بک بن جایا کروں کم از کم تمہارے ہاتھوں میں رہنا تو نصیب ہوگا۔“ ثاقب نے شرارت سے عنبر کو پکار کر کہا تو کچن سے آتی اس کی کھلکھلاتی ہنسی کو اپنے دل میں اتارتے ہوئے اس نے ٹی وی آن کر دیا۔

نو بجے تک عنبر سب کاموں سے فارغ ہو چکی

تھی۔ بچوں کے یونیفارم بھی استری کر کے لٹکا دیے تھے۔ ٹھیک نو بجے کھٹ سے گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ثاقب نے بچوں کے کمرے میں ایک ایمر جنسی لائٹ لگانی ہوئی تھی سو اس کی روشنی میں عنبر نے بچوں کو بستر پر لٹا دیا۔

”افوہ امی، ہمیں اتنی گرمی میں کیوں سونے کے لیے لٹا رہی ہیں۔ ہمیں باہر جانا ہے۔“ آزر نے منہ بسورا تو عاشی بھی ضد کرنے لگی۔

”ارے بیٹا روز کی بات اور تھی لیکن کل تمہارا پہلا پیپر ہے۔ تم دیر سے سوؤ گے تو صبح جلدی کیسے اٹھو گے؟“ عنبر نے پیار سے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا اور پاس پڑا ہوا ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر ان کو جھلنے لگی۔ ثاقب نے کمرے میں جھانکا تو بچے تقریباً غنودگی میں آچکے تھے اور عنبر بڑی تندہی سے انہیں پنکھا جھل رہی تھی۔

”عنبر جان تم تھک جاؤ گی۔“ ثاقب نے سرگوشی میں اس سے کہا۔

”کوئی بات نہیں ثاقب، دو گھنٹے میں سے پون گھنٹا تو گزر رہی چکا ہے۔“ عنبر نے بہت آہستہ سے جواب دیا کہ بچوں کی نیند ٹوٹنے کا جو خدشہ تھا۔ ثاقب خاموشی سے باہر آ گیا۔

”اسی لیے تو ماؤں کے پیروں کے نیچے جنت رکھی گئی ہے۔“ ثاقب نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”لیکن عنبر تو کچھ زیادہ ہی حساس ماں ہے۔ اپنے ننھے منے بچوں کے امتحان کو اتنی زیادہ اہمیت دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ارے بچے نو بجے کے بجائے گیارہ بجے بھی اگر سونے لیٹتے ہیں تو کون سا فیل ہو جاتے۔“ ثاقب کو اب خواہ مخواہ ہی اُس کے اس طرح پنکھا جھلنے سے الجھن ہونے لگی تو وہ اٹھ کر گھر سے باہر گلی میں چلا گیا جہاں اس کے آس پڑوس کے کچھ مرد حضرات کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ثاقب بھی وقت گزارنے کی خاطر ان کے پاس چلا گیا اور پھر ان لوگوں نے اسے جو خبر سنائی تو جیسے اس کے تو

ہوش ہی اڑ گئے۔

”کیا کہہ رہے ہیں جلال صاحب آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اس نے بہت پریشان ہو کر انہیں دیکھا تو نزدیک کھڑے اعظم صاحب مزید تفصیل بتانے لگے۔

”ارے ثاقب صاحب، آدھے سے زیادہ شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہت ہی بڑا بجلی کا بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ میں نے خود ابھی پتا کیا ہے صبح چار بجے سے پہلے بجلی آنے کا کوئی امکان نہیں۔“ ثاقب نے بہت آپ سیٹ ہو کر ان کی بات سنی اور بہت الجھے دل سے واپس گھر لوٹ آیا۔

”اب کیا ہوگا، صبح بچوں کا پہلا پیپر ہے۔ غبر تو سن کر حواس باختہ ہی ہو جائے گی۔ اتنی گرمی میں تمام رات بچے کیسے سوئیں گے؟“ ثاقب کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ باہر برآمدے میں سرھام کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ بھی غبر دے قدموں بلاہر آئی۔

”ثاقب گیارہ بج چکے ہیں لائٹ نہیں آئی ابھی تک۔ ذرا جا کر پتا تو کریں۔“ اس نے ایک نظر غبر کے پسینے سے تر تھکے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

”غبر بہت بُری خبر ہے، لائٹ صبح تین چار بجے تک آئے گی۔“ اس نے دل کڑا کر کے بیوی کو یہ خبر سنا دی۔

”ہیں.....؟“ اس نے بہت شاکد ہو کر سننے پر ہاتھ مارا۔ ”اب کیا ہوگا ثاقب بچے اس گرمی میں کیسے سوئیں گے۔ اتنی مشکل سے تو آٹھ لگی ہے دونوں کی دیکھنا کچھ ہی دیر میں جاگ جائیں گے۔“ وہ واقعی کچھ زیادہ ہی حواس باختہ ہو رہی تھی۔ ”اگر ان کی نیند پوری نہیں ہوئی تو وہ کیسے پیپر دیں گے؟“ اس نے روہانے لہجے میں ثاقب سے پوچھا تو وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گیا۔

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد غبر نے بہت لجاجت سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے التجا کی۔ ”ثاقب میں اتنی دیر سے ان دونوں کو پنکھا

جھلنے جھلنے تھک چکی ہوں پلیز اب ایک گھنٹا آپ یہ کام کر دیں پھر میں جھل دوں گی اپنی باری یہ۔“

”کیا مطلب اپنی باری.....؟“ ثاقب نے بہت حیران ہو کر غبر کو دیکھا تو وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”ثاقب پلیز بچوں کے ایگزام کی خاطر ہمیں اپنی نیند کی قربانی تو دینا ہوگی ناں۔ ہم لوگ باری باری بچوں کو پنکھا جھلیں گے۔ یوں رات کٹ جائے گی۔“ غبر کی اس تجویز پر ثاقب تو بھڑک ہی اٹھا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے غبر، مجھے صبح آفس جانا ہے، میں کیسے ہر گھنٹے بعد بیٹھ کر پنکھا جھل سکتا ہوں۔“ ثاقب کے اس طرح بھڑک جانے پر غبر کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

”ثاقب میں نے بچوں کو ایگزام کی اتنی تیاری کرائی ہے اتنی محنت کی ہے ان پر اور اگر وہ ساری رات سو نہیں سکے تو میری سب محنت پر پانی پھر جائے گا۔ پلیز آج آپ میری مدد کیجیے میں بھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔“ کس درد سے وہ التجا کر رہی تھی۔

ثاقب کو بے اختیار اس پر ترس کے ساتھ ساتھ پیار بھی آ گیا۔

”ٹھیک ہے جان، تمہاری خاطر یہ قربانی بھی سہی حالانکہ صبح مجھے ایک بہت ضروری فائل جی ایم صاحب کو دینی ہے بہت اہم میٹنگ ہے ان کی۔“

ثاقب کی رضامندی غبر کے دل میں اس کے لیے تشکر کے ہزاروں پھول کھلا گئی۔

کام انجام دیتے رہے۔ بچوں کی اس سکون نیند پر غبر اپنی لاکھوں ایسی نیندیں قربان کر سکتی تھی لیکن ثاقب ہر مرتبہ ہی آنکھیں مسلتے ہوئے بڑبڑاتا ہوا بچوں کے کمرے میں جاتا تھا۔ صبح چار بجے کے قریب چھم سے لائٹ آگئی تو جیسے دونوں کی جان میں جان آگئی۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے، مجھے اس ڈیوٹی سے نجات تو ملی۔“ ثاقب نے سیکھے کی ٹھنڈی ہوا کو جیسے اپنے اندر اتارا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بو جھل ہو رہی تھیں۔ غبر خود بھی نیند اور تھکن سے بے حال ہو رہی تھی۔

”تھینک یو ثاقب، آپ دنیا کے سب سے اچھے شوہر اور بہترین باپ ہیں۔“ اس نے بہت محبت سے ثاقب کو دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

”تمہارا یہ خوب صورت سا اظہار میں کل دوبارہ بھی سنوں گا آج تو نیند نے بے حال کیا ہوا ہے۔“ وہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے بولا تو غبر بھی مسکرائی ہوئی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

وہ بے حد گہری نیند میں تھی جب ثاقب نے اسے بہت جھنجھوڑ کر جگایا۔

”کیا ہوا ثاقب سب خیریت تو ہے؟“ وہ اسے یوں بوکھلایا ہوا دیکھ کر بہت پریشان ہو گئی۔

”غضب ہو گیا غبر، ہم لوگ سوتے ہی رہ گئے یہ گھڑی دیکھو صبح کے دس بج رہے ہیں۔“ ثاقب نے بہت ہی بے چارگی سے وال کلاک کی طرف اشارہ کیا تو غبر کا دل ایک لمحے کو دھڑکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چھلانگ مار کر بستر سے نیچے اتر آئی۔

”ہائے اللہ، بچوں کا پیپر تو رہ گیا۔ اسکول بس بھی آ کر چلی گئی ہوگی۔ ان کا پیپر کس ہو گیا ثاقب اب کیا ہوگا؟“ وہ بے اختیار رو دی اور ثاقب بچوں کے کمرے کی طرف بھاگا۔ جس ایگزام کی تیاری کے لیے اس نے اپنے بچوں کی جان ایک کی ہوئی تھی خود بھی ہر خوشی سے منہ موڑا ہوا تھا، اپنے شوہر کے حقوق بھی نظر انداز کر دیے تھے۔ کل پوری رات اپنے ساتھ ساتھ صبح صبح دفتر جانے والے اپنے شوہر کو بھی جگا کر

بچوں کی نیند کو ڈسٹرب نہیں ہونے دیا تھا آج اسی نیند نے اس کی تمام قربانیوں کو رائیگاں کر دیا تھا۔ غبر کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بچوں کے کمرے میں جا کر انہیں اس ایسے کی خبر دے۔ بھی ثاقب نے آکر اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف موڑا۔

”غبر ذرا یہ خط تو پڑھو۔“ غبر نے حیرت سے ثاقب کے ہاتھوں میں پھڑپھڑاتے کاغذ کو دیکھا اور پھر بے اختیار اسے چھین کر پڑھنے لگی۔

”امی ابو We love you آپ دونوں بہت اچھے ہیں۔ ہم خود سے تیار ہو کر اسکول جا رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو نہیں جگایا کیونکہ آپ لوگ ساری رات ہماری وجہ سے جاگے ہیں۔“

آزر اور عاشی! غبر نے بار بار یہ معصوم سی لکھی ہوئی تحریر پڑھی۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک بہت تکلیف دہ لمحہ اتنی جلدی راحت میں بدل جائے گا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے آٹھ اور نو سال کے بچوں نے اپنے ماں باپ کی محبتوں کو ان کی قربانیوں کو دل سے محسوس کیا تھا اور ان سے اپنے پیار کا بہت معصوم سا اظہار انہیں نہ جگا کر کیا تھا۔ یہ بات جیسے غبر کو دنیا کی امیر ترین عورت بنا گئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت خوب صورت رنگوں میں نہا گئی ہے۔

”ثاقب، کل رات میں سوچ رہی تھی کہ کاش میری بہنوں کی طرح ہمارے گھر میں یو پی ایس یا جنریٹر ہوتا لیکن اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ جس عورت کے پاس آپ جیسا شوہر اور آزر اور عاشی جیسے بچے ہوں اس کی زندگی میں اتنی خوشگوار سی ٹھنڈک بکھر جاتی ہے جس کا مقابلہ کوئی جنریٹر کر ہی نہیں سکتا۔“ اور اس کی اتنی پیاری سی بات پر ثاقب نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔



زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں
... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی
خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ
رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے
لوگ، بہت سے مواقع ایسے

زندگی

ناہید سلطان اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کاغچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

قسط 13

ضرور ملتے ہیں... جب
محبت دستک دیتی ہے
... اور اس کی خوشبو
میں روشنی کی تابناکی
بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ... مکر و فریب
... سفاکی اور تنگ نظری کے
ساتھ... ازل سے محبت کرنے والوں
کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی
کبھی تریپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

انہی روابط میں بنی خوب صورت کہانی جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی



دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری..... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آگئے اور آٹھ نو سال ایک پلیرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکورنگ انجینیئر کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جا رہی تھی۔ تقدیم، تنسیم کے موبائل پر مدثر کے پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتا دیتی ہے، تنسیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جا کر کورٹ میرج کر لیتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تنسیم نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تنسیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا مختصر پاجا ہے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر فائو اسٹار ہوٹل میں ہوئی ہے۔ تقدیم کے گھر میں مدثر کی کال کا انتظار ہوتا ہے۔ مدثر، تنسیم کو بھیجنے کی حامی بھر لیتا ہے اور پھر اپنی والدہ کو اپنی کورٹ میرج کے بارے میں بتاتا ہے۔ زیتون نے تقدیم کے لیے عباد کا رشتہ بتایا تو اماں رضامند ہو گئیں کہ وہ لوگ لڑکی کو دیکھنے آجائیں۔ تنسیم گھر واپس آ کر اپنے کمرے میں رہ رہی ہے لیکن کوئی اس سے بات چیت نہیں کرتا بس اس کو کھانا دے دیتے ہیں، رات میں اسے پیاس لگتی ہے تو وہ دروازہ کھولنا چاہتی ہے لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ حجاب کا فون بند ہونے پر الطاف امی کے فون پر کال کرتا ہے لیکن حجاب بات نہیں کرتی۔ اکیڈمی میں پانگ آؤٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مونس کو آؤٹ پاس نہیں ملتا تو صبور احمد پوری فیملی کے ساتھ کال آگئے۔ زیتون ان کو عباد کے لیے جوڑی دکھاتی ہے وہ انہیں بہت پسند آتی ہے لیکن عباد کو ان کی غربت پر اعتراض ہوتا ہے۔ امی اسے منع کرنے سے انکار کرتی ہیں تو عباد جہیز کی لسٹ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ الطاف، حجاب کے اسکول پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈراتا ہے کہ اسٹاف کے لوگوں کو بلا کر وہ سب کو بتا دے گا۔ تقدیم اور ابا مونس کی پانگ آؤٹ کی تقریب میں جاتے ہیں تو صبور احمد اور ان کی فیملی کا بہت اچھی طرح خیال رکھتے ہیں اور واپسی پر ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ تقدیم سمجھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی عازنہ ہے جس کی وجہ سے مونس انکار کر رہا ہے۔ عباد اچھی جگہ شادی کرنے کے لیے شادی دفتر میں اپنا اندراج کراتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ مونس، مدثر کا ایڈریس پوچھتا ہے تاکہ اس سے طلاق کی وجہ پوچھ سکے لیکن تنسیم اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کر دیتی ہے۔ الطاف امی کو دمکی دیتا ہے اب وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کر دے گا۔ حجاب گواہی کی سپورٹ ملی تو اس نے خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ عازنہ اور اس کے گھروالے خوش تھے کہ انہیں کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تنسیم کے پریکٹس ہونے پر ابا نے مدثر کے والد سے بات کی کہ ایک دن کے لیے اسے رخصت کرا کے اپنے گھر لے جائیں۔ بہت مشکل سے وہ اس بات کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔ الطاف نے وکیل کو فون کیا اور اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ یہ کیس نہ لڑے اور حجاب کو کیس واپس لینے پر آمادہ کر لے تو الطاف اسے منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ تقدیم اپنے این جی او کے وکیل اویس انصاری کو تنسیم کا کیس بتاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ شروع کے مطابق تنسیم عدت اپنے سرال میں گزارے گی اس لیے وہ مدثر کے والدین سے بات کرتا ہے اور تنسیم کو ان کے گھر رہنے اور اس کا خرچ اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ حجاب کے کیس کی پیشی ہوتی ہے اور اگلی پیشی کی تاریخ دو ماہ بعد ملتی ہے۔ تنسیم کے مدثر کے گھر آنے پر مدثر ہاسٹل میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ تنسیم سمجھتی ہے کہ شاید وہ اس سے کچھ بات کرے گا لیکن جب وہ اس سے نہیں ملتا اور اسے پتا چلتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے تو تنسیم جذباتی ہو کر ایک غلط قدم اٹھا لیتی ہے۔ تنسیم کے ایک غلط قدم اٹھانے کے باوجود وہ زندگی اسقاط سے محفوظ رہی لیکن مدثر کے گھروالے اس بات کو بہانہ بنا کر تنسیم کو اپنے گھر رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ حجاب کی وکیل حجاب سے معذرت کر کے کیس واپس کر دیتی ہیں۔ عباد خوش تھا کہ اسے اس کی منزل مل گئی اب بس عباد اپنے بلائے جانے کا منتظر تھا۔ ثریا اپنے چچا زاد بھائی کا رشتہ تمہید کے لیے لے کر آتی ہے۔ عازنہ شادی کے لیے مصر تھی اور مونس پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔ اپنے مقدمے کی بیرونی کے لیے حجاب، تقدیم سے بات کرتی ہے تو وہ اس کی ملاقات اویس انصاری سے کراتی ہے۔ اویس انصاری کیس لینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ پیشی پر الطاف کا وکیل بحری عدالت میں حجاب کی کردار نشی کرتا ہے۔

اگلی صبح جب وہ اسکول گئی تو اسے اپنی ساتھیوں کی نگاہوں میں غیر معمولی کیفیت کا احساس ہوا، وہ سب اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ مارنگ اسمبلی کے لیے اسمبلی گراؤنڈ میں پہنچی تو ٹیڈل اور ہائی کلاسوں کی بعض طالبات نے اسے دیکھ کر آپس میں کھسپھسپھس شروع کر دی۔

”مس عابدہ انہیں (caution) کا شن دیں پلیز۔“ اس نے پی ٹی آئی سے کہا۔

”ایٹین شن..... اسٹینڈ ایزی۔“ پی ٹی آئی نے اپنی پاٹ وار آواز میں کہا۔ بعض طالبات پھر بھی سرگوشیاں کرتی رہیں۔

”آج ہو کیا رہا ہے ان لڑکیوں کو.....“ اس نے پی ٹی آئی سے کہا۔

جواباً پی ٹی آئی نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

”کیا ہوا.....؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں میڈم.....“ پی ٹی آئی نے نظریں جھکی لیں۔

مارنگ اسمبلی کے بعد اس نے حسب معمول پورے اسکول کا راونڈ لیا، اسٹاف روم کے باہر راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے اسٹاف روم کا جائزہ لینے کو دروازے سے اندر جھانکا تو نان کلاس ٹیچرز جن کا پہلا پیریڈ فری تھا اسٹاف روم میں بیٹھی تھیں اور انہی میں سے ایک مسز عنایت اللہ اخبار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کے آگے تانے بہ آواز بلند پڑھ رہی تھیں۔

”مدعیہ نے جو ایک سرکاری اسکول کی پرنسپل بتائی جاتی ہے اپنے شوہر کے خلاف یہ مقدمہ سول جج عادل سلیم کی عدالت میں دائر کر رکھا ہے۔ بحث کے دوران مدعا علیہ کے وکیل نے مدعیہ کے بارے میں انکشاف کیا کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا امیر آدمی اپنے جال میں پھانس لینا اس کا تیرہ ہے..... مدعا علیہ دہی میں مقیم ایک امیر پاکستانی بزنس مین ہے۔“

حجاب کو اسٹاف روم کے دروازے سے اندر جھانکتے دیکھ کر مسز عنایت اللہ کے سوا باقی تمام ٹیچرز چونکی دکھائی دیے لگیں۔ مسز عنایت اللہ اخبار پڑھنے میں اتنی محو تھیں کہ انہیں دروازے پر اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا..... مسز حمید نے کھنکار کر مسز عنایت اللہ کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ انتہائی محو تھیں۔

”مدعا علیہ کے وکیل نے تمام حقائق بیان کرنے کے بعد مدعیہ کی پیشین کو باطل قرار دینے اور مقدمہ خارج کرنے کی درخواست کی۔“

”مسز عنایت اللہ! میڈم آئی ہیں۔“ مس روشن جہاں نے مسز عنایت اللہ کو مخاطب کیا۔

”کدھر.....!“ مسز عنایت نے ہڑبڑا کر اپنے چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹا لیا۔ حجاب دروازے سے ہٹ کر راہداری میں آگے چل دی۔ دفتر میں پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے سائڈ ریک پر رکھاتہ شدہ اخبار اٹھایا ہی تھا کہ کلرک تاج محمد اس کے کمرے کے دروازے پر آکھڑا ہوا۔

”السلام علیکم میڈم جی۔“

”وعلیکم السلام..... کیسے ہیں تاج محمد صاحب؟“ اس نے پوچھا۔

”شکر ہے میڈم جی..... آپ تو خیریت سے ہیں ناں جی؟“

”جی تاج صاحب!“ وہ کلرک سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر پائی۔

”اچھا جی!“ تاج محمد کے لہجے میں حیرت تھی..... پھر اس نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”نوش لینا بھی نہیں چاہیے“

جی..... یہ اخبار والے تو بس مریج مسالا لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔“

”لائسنس اس طرف دیجیے گا تاج صاحب..... مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔“ اس نے تاج محمد کو اس کے کمرے میں بھیجنے کی خاطر بہانہ کیا۔

”اچھا جی!.....“ تاج محمد پلٹ گیا۔

حجاب نے بجلتا اخبار کھولا اور بے تابی سے نظریں دوڑانے لگی، اخبار کے اندرونی صفحہ نمبر دو پر اس کی تصویر چھپی ہوئی تھی..... وہی عدالت میں اس کا روپ..... آنکھیں کھلی ہوئی..... باقی چہرہ چادر سے ڈھانپا ہوا۔ تصویر کے ساتھ چھپی خبر کی سرخی ہی اس کی سانس کی لے کو مدھم کر دینے کو کافی تھی۔

”سرکاری اسکول کی پرنسپل پر مقامی عدالت میں اس کے شوہر کی جانب سے بدکرداری کا الزام!“ خبر کی تفصیل میں الطاف کے وکیل سیف علی خان کی جانب سے عدالت میں کہی گئی باتوں کو اور بھی چٹخا راگیا کر بیان کیا گیا تھا۔

تصویر دیکھ کر، خبر پڑھ کر وہ بہت دیرینہ جان سی بیٹھی رہی..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے..... کہاں جائے..... لوگوں کا سامنا کیسے کرے، ساتھیوں کی نگاہوں میں معنی خیزی، آسبلی میں بعض طالبات کی آپس میں کھسر پھسر، مسز عنایت کی بہ آواز بلند اخبار خوانی اور کلرک تاج محمد کے معنی خیز جملے ایک فلم کے مربوط مناظر کی طرح اس کی سماعت میں لرزائیں بشارت میں متحرک تھے۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح عدالتوں میں بھی جھوٹ سکے رائج الوقت سمجھا جاتا ہے مگر اس سکے کی قیمت اور قوت اتنی زیادہ ہو سکتی ہے کہ کسی کی زندگی ہی تاخت و تاراج کر دے یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا..... سیف علی خان کی عدالت میں شعلہ نوائی نے تو اس کی ساری زندگی ہی جیسے جھٹسم کر کے رکھ دی تھی..... خاک آلودہ ہو گئی تھی وہ، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اتنی ذلت، اس قدر رسوائی کے بعد کیونکر وہ اپنی ساتھیوں سے نظریں ملا کر بات کر سکے گی اور کیسے طالبات سے محبت و احترام کا وہ رشتہ استوار رکھ سکے گی جو اس کے نزدیک اب تک کی زندگی کا حاصل تھا۔ طالبات کی نگاہوں سے جھلکتی محبت اور احترام نے تو اس کی ذات کو وہ اعتماد بخشا تھا جو اپنے حسن و جلال میں اس کے ظاہری حسن کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ الطاف کی سابقہ تمام دھمکیاں اور ہتھکنڈے ایک طرف، اس کی ایما پر بھری عدالت میں اس کے وکیل کی زبانی اس کی کردار کشی ایک طرف..... جیتے جی مار دیا تھا سیف علی خان نے اسے اپنی فیس میں ملنے والے چند سکوں کے عوض!

اس کی میز کے پہلو میں استادہ ریک پر دھیرے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور وہ دل گرفتگی کی انتہائی حدوں سے نکل کر بے خبری کے عالم میں پچھنی ہوئی تھی۔

”میڈم جی فون ہے.....“ نائب قاصدہ نور جہاں اسے مطلع کر رہی تھی۔

”آں..... ہاں.....“ وہ چونکی۔ نور جہاں کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں سے بھی کم و بیش وہی پیغام ملا جو اسے اپنی ساتھیوں اور تاج محمد کی نگاہوں سے مل چکا تھا اور وہ پیغام کیا تھا..... ”تم رسوا ہو چکی ہو..... قابل عزت نہیں رہیں!“

سیف علی خان کی زبان اس کی زندگی ہی نہیں، امی کی تمام زندگی کی اُس ریاضت کو بھی نگل گئی تھی جو انہوں نے اپنی اولاد کو معاشرے میں عزت کا مقام دلوانے کے لیے کی تھی۔

اس نے فون کال ریسیو کی تو امی کی آواز سنائی دی۔ وہ رنج و غم میں ڈوبی آواز میں کہہ رہی

تھیں۔ ”حجاب! آج کا اخبار دیکھا؟“

”جی امی!“ یہ دو الفاظ اسے اپنے حلق میں پھنستے حسوس ہوئے۔ ”کیسی ذلت دکھائی ہے ان لوگوں نے..... اس لیے منع کرتی تھی میں تمہیں الطاف سے ٹکر لینے کو۔“ امی کے لہجے میں اب رنج و غم کے ساتھ غصہ اور ناراضی بھی تھی۔

”امی..... پلیز..... پلیز امی!“ وہ گڑ گڑائی..... ”آپ ساتھ نہ چھوڑیے گا ورنہ میں بالکل ہی اکیلی رہ جاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے آواز بھرا گئی۔

”بہجت کا فون آیا تھا..... بہت ناراض ہو رہا تھا..... اتنا روڈ تو وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا مجھ سے..... کہہ رہا تھا کہ آپ کی بیٹی نے ہمیں کسی کو منہ دکھانے کا نہیں رکھا..... اسے شہ آپ نے دی ہے۔“ امی نے لچلے بھر کو توقف کیا پھر درد میں ڈوبے لہجے میں بولیں۔ ”نایاب کا بھی فون آیا تھا..... خفا ہو رہی تھی کہ قائم خان نے ہاتھ کے وقت اخبار دیکھ کر اس میں حجاب کی تصویر دیکھی اور خبر پڑھی تو ناشتا ہی چھوڑ دیا..... اخبار کو توڑ مروڑ کر، جھٹکا دے دے کر کہہ رہے تھے کہ یہ ہے تمہارا خاندان..... نایاب کہہ رہی تھی کہ قائم خان کی تو خیر ہے ان کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ کر انہیں منا ہی لوں گی..... سسرال میں کیسے منہ دکھاؤں گی لوگوں کو۔“

حجاب سانس روکے سنتی رہی۔

”دونوں کہتے تو ٹھیک ہی ہیں..... ارم کو تو بہجت کو باتیں سنانے اور ہم سب پر ہنسنے کا موقع ملا..... اور نایاب بھی شوہر اور سسرال والوں کے ساتھ کتنی ہی اچھی سہی طعن و تشنیع سے باز تھوڑی رہتے ہیں لوگ..... مجھے تو رباب کی فکر لگ گئی ہے..... کون آئے گا اب اس کے لیے اس گھر میں..... مجھے تو لگتا ہے کہ میری ساری زندگی کی محنت برباد ہو گئی۔“

ضبط کے سارے بندھن یک لخت ٹوٹ گئے..... یہ سوچے بنا کہ وہ اس وقت کہاں تھی..... کس حیثیت میں تھی..... اس کے منہ سے پہلے ایک ہلکی سی سسکاری نکلی اور پھر وہ گھٹی گھٹی آواز میں باقاعدہ رونے لگی..... غنیمت ہوا کہ اس کے اپنی رقت پر قابو پانے تک کوئی اس کے کمرے میں آیا نہیں ورنہ بڑی عجیب صورت حال کا سامنا ہوتا اسے۔

”اخبار تو سبھی پڑھتے ہیں..... ادھر ہماری طرف کے لوگ اور ادھر پشاور میں جب تمہارے بابا کے خاندان کے لوگوں کو پتا چلے گا تو کیا سوچیں گے۔“

”امی..... حجاب دنیا میں صرف میرا ہی نام تو نہیں۔“ اس نے امی کو تسلی دینا چاہی۔

”تصویر جو چھاپ دی ہے بد بختوں نے۔“

”کون پہچانے گا..... چہرہ تو میرا ڈھکا ہوا ہے۔“

”اڑنی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں لوگ..... انسان کی پہچان کے لیے اس کی آنکھیں ہی کافی ہوتی ہیں اور فرض کرو نہ بھی پہچانیں تو ایسی باتیں چھپتی کب ہیں..... پر لگا کر اڑتی ہیں۔ یہاں سے وہاں تک۔“ امی نے توقف کیا پھر گھائل لہجے میں بولیں۔ ”بہت ذلت ہو گئی۔“

حجاب کو احساس جرم مارے دے رہا تھا..... امی اور باقی خاندان کو پہنچنے والے اس دکھ اور ذلت کی ذمے دار وہی تو تھی..... کیا تھا اگر وہ اپنے دل کو مار کر، ذات پر جبر کر کے بسمہ کے حقوق کی علمبرداری کا نام نہاد تمنغہ اپنے سینے پر سجانے کا خیال پس پشت ڈال کر الطاف کے ساتھ گزارہ کر لیتی..... خود بھی عیش و آرام سے رہتی،

”بکواس بند کرو۔“

”اچھا جی! اب بھی..... اب بھی بکواس بند کرو.....“ یکا یک اس نے اپنا لہجہ بدل لیا۔ ”جانتی ہوا اخبار میں چھپنے والی تصویر اور خبر کے بعد تمہاری اوقات کیا رہ گئی ہے۔ اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ کوئی اور گلے لگالے گا نہیں..... بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو دوسرے دن تم اپنی ماں کے گھر ہوگی۔“

حجاب کو لگا برداشت کی انتہا سے اس کا سینہ پھٹنے کو تھا۔

”تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔“

”ابھی دماغ ٹھکانے نہیں آئے تمہارے!“

”میرے دماغ تو ٹھکانے ہیں، تم اپنے دماغ کی خیر منادو..... خدا کے قہر کو دعوت مت دو۔“ وہ جلتے جھٹے لہجے میں بولی۔

”اب تم اپنے دوپٹے کا پلو پھیلا کر یہ بد دعائیں دوگی..... جا الطاف تیرا بیڑا غرق ہو..... تو کہیں چین نہ پائے..... تو خوشیوں کو ترسے..... محتاج ہو..... موت آئے.....“ وہ پھر ہنسا۔

”دوسروں کو بے سبب ستانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ستائیں رہا ہوں یا تم..... بیوی ہو کر آنکھیں دکھاتی ہو..... باتیں سناتی ہو..... عدالت میں کھینچ لیا..... کسی کی مجال تھی کہ الطاف کو عدالت میں گھسیٹ سکے مگر تم نے میری بیوی ہو کر ایسا کیا..... مجھے عدالت میں بلا کر ذلیل کیا..... کیا سمجھتی تھیں تم..... الطاف آسانی سے ہار مان لے گا..... عدالت نے اگر تمہارے حق میں فیصلہ دے بھی دیا تو تم دیکھنا کیا کرتا ہوں میں تمہارے ساتھ۔“

”کیا کرو گے! کیا کرو گے تم..... بولو، کیا کرو گے؟“ وہ غصے سے بولی۔

”وقت بتائے گا۔“

”جو تم نے کر لیا ہے..... جو تم کر چکے ہو اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تم۔“ اس نے تحقیر سے کہا۔

”دننگی تصویریں دیواروں پر لگواؤں گا تمہاری۔ چہرہ تمہارا جسم کسی اور کا۔“ اس نے کہا۔

”شرم کرو..... شرم کرو۔ افسوس تمہاری ماں زندہ نہیں..... ہوتی تو میں ان سے پوچھتی ایسا بیٹا کیوں جنم دیا جسے دوسروں کی بہنوں، بیٹیوں کا کوئی احترام کوئی پاس نہیں۔ یاد رکھنا تم نے اپنے وکیل سے مجھ پر جو جھوٹے الزامات لگوائے ہیں ان کا حساب دینا پڑے گا تمہیں۔“

”حساب تو تمہیں بھی دینا پڑے گا۔ ایک شریف آدمی سے زوجیت کا رشتہ قائم کر کے وظیفہ زوجیت ادا نہ کرنے کا۔“ وہ بے شرمی پر اتر آیا۔

”آئی ہیٹ یو۔“

”لیکن کیوں.....؟“ وہ تڑپ کر بولا۔ ”آج بتا ہی دو، کیوں ہے تمہیں مجھ سے نفرت؟“

”کیونکہ تم جھوٹے ہو، مکار ہو، غلیظ ہو اور ناقابل برداشت ہو۔ گھن آتی ہے مجھے تم سے..... میں تم جیسے آدمی کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کو ترجیح دوں گی۔ آئی ہیٹ یو..... ہیٹ یو.....“

”وہنا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ حد آگئی تھی جہاں برداشت کی تمام پرتیں جھج جاتی ہیں۔ دوسری طرف الطاف دم بخود تھا۔ اس سے پہلے زندگی میں کبھی کسی نے اس سے اس قدر نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ نہ اتنی تضحیک کی تھی اس کی۔ وہ تو پیسہ پھینک کر تماشا دیکھنے اور اپنی جیب میں پڑے کرنسی نوٹوں کے

خاندان کی بھی جگہ ہنسائی نہ ہوتی مگر اب کیا ہو سکتا تھا اور جو ہو چکا تھا اس سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا..... اب تو ادھر کی دنیا ادھر بھی ہو جاتی..... الطاف انسان سے فرشتہ ہی کیوں نہ بن جاتا، دنیا کی کوئی طاقت اسے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی..... عزت تو جا ہی چکی تھی..... جان باقی تھی..... جانی ہے جائے..... پروا نہیں، مقدمہ عدالت سے خارج کیا جاتا ہے..... کر دیا جائے..... پروا نہیں..... اوکھلی میں سر دے کر موصولوں سے کیا ڈر..... رہا ساتھیوں، رشتے داروں اور دنیا کا سامنا کرنے کا مسئلہ وہ تو کرنا پڑے گا..... نوکری پہلے اگر شوق، تحصیل کردہ علم کا استعمال اور خود کفالتی کا بہانہ تھی تو اب ضرورت بن گئی تھی..... بہر صورت جاری رہنی تھی، نہ تو نوکری ترک کی جاسکتی تھی نہ دنیا اپنی مرضی سے چھوڑی جاسکتی تھی سو ساتھیوں کا سامنا کرنا بھی مجبوری تھی رشتے داروں اور دنیا کا سامنا کرنا بھی ضروری۔

دن بھر اسکول میں ساتھی اساتذہ سے سامنا ہوتا رہا..... نہ ان میں سے کسی نے کوئی سوال کیا نہ اس نے از خود کوئی وضاحت ضروری سمجھی۔ پبلک ڈیلنگ سے بھی مفر نہ ہو سکا..... چھٹی کے بعد گھر واپس لوٹی تو امی کو غیر معمولی اداس دیکھا، اتنی اداس تو وہ اس سے قبل صرف ایک موقع پر نظر آئی تھیں اور وہ تھی بابا کی موت۔ رباب بھی گھر پر تھی، مانند دیوار چپ! اسی نے کھانا گرم کیا اور نکالا مگر کھانے کو کس کا دل تھا۔ دو چار نوالے زہر مار کر کے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

☆☆☆

سہ پہر کو اس کے موبائل فون کی مخصوص ٹون کے ساتھ ایک ناشنا سا نمبر اسکرین پر وارد ہوا، اسے اپنی منہی مجبوری کے پیش نظر کال ریسیو کرنا پڑی۔

”السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“ الطاف کی آواز اس کے کان میں پڑی وہ دم بخود رہ گئی۔ فشار خون جیسے بلندی کو چھونے لگا۔ ڈھٹائی کی انتہا تھی یا پھر خباثت کی۔

وہ خاموش رہی۔

”مزاج گرامی بخیر!“

اس نے جڑے بھینچ لیے۔

”سرکار! مزاج اب بھی ٹھکانے پر آئے کہ نہیں۔“ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ حجاب کا دم پھولنے لگا۔

”کسی اور کے لائق نہیں رہیں تم اب۔“ وہ ہنس دیا۔

”شٹ اپ.....“ اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

”اور ڈانٹ لو..... اور ڈانٹ لو میری جان..... اب تو یہ تمہارا حق بنتا ہے..... ویسے..... تصویر خوب

صورت آئی۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

حجاب کا خون کھولنے لگا۔

”اس دنیا میں اب صرف ایک ہی شخص ہے جس کی بانہوں میں تم پناہ لے سکتی ہو..... اور وہ ہے تمہارا شوہر.....“

”ہیل ٹو یو.....“

”یار! کیوں جہنم میں جانے کی بددعا دیتی ہو..... جنت سجا رکھی ہے الطاف نے تمہارے لیے..... یہاں

بھی اور دینی میں بھی..... غصہ تھوک دو، آؤ جنت کے مزے لوٹتے ہیں۔“

عوض اپنی پسند کی چیزیں خریدنے اور اپنی مرضی کے بندوں کے دام چکانے کا عادی تھا۔ حجاب بھی اسے پہلی نظر میں پسند ہی تو آگئی تھی جو اس نے اسے اپنی دولت کے بل بوتے پر خریدنے اور اپنے کراچی اور دیہی کے محل سراؤں کی زینت بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھنے والی حجاب اس کے خلاف سیدہ پلائی دیوار ثابت ہوگی۔ اس کی دولت، اس کی دھمکیاں، اس کے ڈراوے، سارے حربے دھرمے زہ جائیں گے اور وہ اسے ایسی بے نقط سنائے گی کہ وہ دم بخود رہ جائے گا۔ ایسی عورت کے تن کو اگر زبردستی زیر بھی کر لو تو کیا من تو اس کا یہی چلتا رہتا ہے۔ تم جھوٹے ہو..... مکار ہو..... غلیظ ہو..... ناقابل برداشت ہو..... کھن آتی ہے مجھے تم سے۔ میں تم جیسے آدمی کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کو ترجیح دوں گی۔ آئی ہیٹ یو..... ہیٹ یو!..... ہیٹ یو!

اور ایک بسمہ بھی جس نے اس کے تمام عیوب، خامیوں، کمزوریوں اور شہوریوں سے مفاہمت کر لی تھی۔ اس کی تمام غلاظتوں کو قبول کر لیا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ شراب پیتا ہے، دل پھینک ہے، خوب صورت عورت ہی نہیں نوجوان اور خوب صورت لڑکے بھی اس کی کمزوری ہیں مگر ان عیوب کے باوجود اس نے اسی کے ساتھ جینے مرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

مسئلہ حجاب کا بسمہ سے تقابل نہیں اس کی اپنی بد صورتی کے کھل جانے کا تھا۔ زندگی کے آئینے میں پہلی بار کسی نے اس کی بد صورتی پر انگشت نمائی کی تھی۔ اس کی سفید، اجلی، بے داغ پوشاک بھی اس بد صورتی کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی وہ لمحہ ضرور آتا ہے جب اسے اپنی اصل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی خود احتسابی کی منزل سے گزر کر کبھی کسی اور کے انگلی اٹھانے پر۔ اس کی زندگی میں بھی وہ لمحہ آ گیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کی اصلیت اس کے برتنے پر کھلتی ہے مگر عجیب بات تھی کہ حجاب برتنے بنا ہی اس کی اصل سے واقف ہو گئی تھی۔ اس کے الفاظ کی بازگشت ہتھوڑے کی ضرب کی طرح اس کے ذہن پر دھمک دے رہی تھی۔

”غلیظ ہو، ناقابل برداشت ہو..... کھن آتی ہے مجھے تم سے۔ میں تم جیسے آدمی کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کو ترجیح دوں گی۔ آئی ہیٹ یو..... ہیٹ یو!..... ہیٹ یو۔“

وہ شاکڈ تھا کہ اس نے تو حجاب کو دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے زیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود ہی رنگا ہو گیا تھا اور وہ بھی ایک بے دست و پا، کمزور عورت کے ہاتھوں۔

بہت بڑی ذلت تھی، ناقابل بیان رسوائی اور کبھی نہ بھلائی جاسکنے والی شکست۔ وہ ہار گیا تھا۔ گھاؤ بہت گہرا تھا مگر اس زخم کو اسے آپ ہی چاٹنا تھا۔

فون کال کا حجاب کی جانب سے منقطع کیا جانا اسے مزید تذلیل محسوس ہوئی۔ کتنی دیر وہ صدمے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

تمہید کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ لڑکے والوں کو شادی کی جلدی تھی۔ صرف ایک ماہ کا وقفہ رکھا انہوں نے شادی کے لیے۔ دونوں گھرانوں نے ضروری معاملات و باہم گفت و شنید... ثریا کو پیش پیش رکھ کر کی..... ثریا اور نادر کے مشورے سے مہر سوالا کھروپے قرار پایا۔ جہیز کے لیے ثریا کے چچا نے ابا سے کہا۔

”براہ کرم آپ لوگ کسی غیر ضروری تکلف میں نہ پڑیں۔ الحمد للہ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ ٹی وی، فریج، واشنگ مشین، گھریلو استعمال کے چھوٹے موٹے برقی آلات کچھ بھی نہ خریدیں آپ..... سب

زندگی

کچھ موجود ہے۔ کپڑا، زیور کی ممانعت اس لیے نہیں کروں گا کہ آپ مجھے مطلق العنان نہ سمجھنے لگیں۔ ویسے بھی کپڑا اور زیور بچیوں کا شوق ہوتے ہیں۔ مائیں ان کے لیے سینت سینت کر رکھتی ہیں۔ انہیں پہنے اوڑھے دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ ویسے تو ضرورت ان کی بھی نہیں..... جو بچی کا نصیب ہوگا اس کے شوہر کی طرف سے مل جائے گا اسے۔“

”باقی نقد دے دیا جائے۔“ اماں دبی زبان سے بولیں۔

”ایک پائی نہیں بہن۔“ لڑکے کے والد نے برجستہ کہا۔ ”ہمیں کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔“

”رسم تو ہے ناں بھائی صاحب۔ ماں باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت حسبِ حیثیت کچھ تو دیتے ہی

ہیں۔“ ابا بولے۔

”آپ اپنی بیٹی ہمیں دے رہے ہیں۔ اپنے جگر کا ٹکڑا اس گھر کی سب سے قیمتی متاع۔“

”بے شک۔“ ثریا کی چچی نے شوہر کی تائید کی پھر بولیں۔ ”ہم کسی تکلف، کسی فضول رسم میں پڑ کر نہ

آپ کو کوئی تکلیف دینا چاہیں گے نہ خود زیر بار ہونا پسند کریں گے۔“

”چچی جان مانجھا، مہندی تو ہم ضرور کریں گے۔“ ثریا بولی۔

”بھئی تم بہو، بیٹیاں اپنی خوشی کو جو چاہو کر لینا مگر اس طرح کہ کوئی بد مزگی، کوئی پریشانی، زیر باری نہ ہو۔“

”ارے چچی جان بس تھوڑا سا ہلا گلا کریں گے اور کیا۔“

”اجازت ہے۔“ چچا بولے۔

”چچا جان، زندہ باد۔“ ثریا نے کہا۔

”بلال میاں! آپ کب وقت دیں گے ہمیں اپنی شاپنگ کے لیے؟“ ابا نے تمہید کے ہونے والے دولہا

سے پوچھا۔

بلال بے ساختہ چونکا۔ ”دولہا کا جوڑا اسراں سے جاتا ہے۔“ ثریا ہنسی اور بولی۔

”میں سمجھتا ہوں اس تکلف میں پڑنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ بلال اپنی تیاری اپنی مرضی سے آپ

کر لیں گے، کیوں بیٹے؟“ چچا نے کہا۔

”جی ابا..... بالکل۔“ بلال نے تائید کی۔

ابا نے اماں کو دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ تبادلہ خیال کیا پھر ابا اپنی جگہ سے اٹھے اماں

کے نزدیک جا کر آہستہ سے ان سے کچھ بات چیت کی پھر ہونے والے سہمی کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے

کہا۔ ”اس معاملے میں آپ کو ہماری خوشی کی خاطر ہماری درخواست ماننا ہوگی بھائی صاحب۔“

”آپ کی خوشی سر آنکھوں پر۔“

”میری اور اہلیہ کی خواہش ہے کہ بلال میاں اپنی پسند سے خریداری کریں مگر اپنی جیب سے نہیں..... یہ

ہماری خوشی ہے۔“

”چلیں جیسے آپ کی مرضی۔“

تمام معاملات باہمی احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طے کیے گئے۔

دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ تمہید خوش تھی مگر متفکر بھی کہ اس کے اس گھر

سے جانے کے بعد گھر واری کون سنبھالے گا۔ اماں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ان کے کھانے پینے، کپڑوں کی

”ابا میں واپس کر دوں گا آہستہ آہستہ۔“

”تم ابھی واپس کرو گے..... یکمشت۔ جیسے لیا ہے ویسے ہی لوٹا دو۔ یہ میرا حکم ہے۔“

”ضرورت پڑ گئی تو؟“

”اپنے باپ کو اتنا فقیر سمجھتے ہو۔ ضرورت پڑی تو تقدیم سے لے لیں گے۔ اپنی تنخواہ سے تمہاری ماں کو وہ ہر ماہ جو پیسے دیتی ہے اس سے تمہاری ماں نے کمپیاں ڈال ڈال کر کوئی ساڑھے چار لاکھ روپے جمع کر رکھے ہیں۔ تمہاری بہنوں کی شادیوں کے لیے اس میں سے لے لیں گے۔ تقدیم کا وقت آئے گا تو اتار دیں گے۔“

”ابا میں تو کہتا تھا.....“

”آپ کچھ نہ کہیں۔“ ابا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنیں۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر اور بینک کا نام میرے موبائل پر ایس ایم ایس کر دو۔ آن لائن کی سہولت ہے تمہارے بینک میں؟“

”جی ہے۔“

”میں یہ رقم واپس بھجوا رہا ہوں تمہیں۔“ ابا نے بلاتا خیر وہ رقم منس کو واپس بھجوا دی تھی۔

تقدیم کی مصروفیت کافی بڑھ گئی تھی۔ صبح سے شام تک دفتر پھر شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں روزانہ ہی بازار آنا جانا۔ چھٹی کے دو دنوں میں تو اسے سر کھانے کی فرصت نہ ملتی۔ غنیمت تھا کہ ہفتے وار دو چھٹیاں ملتی تھیں اسے ورنہ اور مشکل ہو جاتی۔ لڑکے والوں نے اگرچہ جہیز کے سلسلے میں خاطر خواہ ممانعت کر دی تھی مگر پھر بھی سو کام تھے۔ تمہید ہی نہیں باقی اہل خانہ کے کپڑوں کی خریداری اور درزی کے ہاں سے سلائی اپنی جگہ ایک بڑا کام تھا..... اور ڈھیروں کام تھے۔ شادی کے لیے میرج ہال کی بکنگ، مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی سمجھ بوجھ، مایوں اور مہندی کی تیاری کہ یہ تو ثریا کی خصوصی فرمائش تھی۔ تقدیم ہر معاملے میں اماں اور ابا کی دست راست بنی ہوئی تھی تو ثریا کا صلاح مشورہ انتہائی مدد و معاون ثابت ہو رہا تھا۔

”ثریا کو جتنی اہمیت ملتی وہ خوش ہو کر اتنا ہی آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرتی۔“

”ثریا تم تو اس گھر کے لیے فرشتہ بن گئیں۔“ ایک روز اماں نے اس سے کہا۔

”آئی، اللہ راستے بناتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ زندگی میں جن باتوں کو ہم اپنے لیے مصیبت سمجھتے ہیں اللہ میاں انہی سے ہمارے لیے آسانیوں کا راستہ کھول دیتے ہیں۔ اب دیکھیں ناں کہاں مگر کہاں تسنیم..... نہ تسنیم کا مگر سے مقدر لڑتا نہ وہ ہمارے ہاں آتی نہ ہم آپ جیسے اچھے لوگوں سے ملتے اور نہ تمہید کا چچا کے گھر میں رشتہ طے ہوتا۔ یہ سب اس نیلی چھتری والے کے بندوبست ہیں۔ تسنیم کے مقدر کی خرابی تمہید کے لیے خیر کا سبب بن گئی۔ انشاء اللہ بہت خوش رہے گی تمہید چچا کے گھر میں اور آئی اللہ نے چاہا تو آگے پیچھے آپ کی ساری بچیاں غنیمت چلی جائیں گی، میں تو تسنیم کے لیے بھی دعا کرتی ہوں کہ فارغ ہو جائے تو اللہ اس کا نصیب بھی کسی بھلے مانس سے کھول دے۔“ اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”اللہ کے ہاں کسی چیز کی کمی تھوڑی ہے آئی۔ وہ کہتا ہے کن اور جو وہ چاہتا ہے پلک جھپکتے میں ہو جاتا ہے۔“

”بے شک۔“ اماں تائید کیے بنا نہ رہ سکیں۔

☆☆☆

”مونس! اب تو تمہاری ایک اور بہن کی شادی ہو جائے گی۔ گھر جاؤ گے تو بات کرو گے ناں اپنے پیرئیں سے۔“

”ماں! بہت دیر سے اس سے فون پر راز و نیاز میں مصروف تھی۔“

”وہلائی، بستر کی صفائی اور وقت پر دوا دینے کا خیال کون رکھے گا۔ وہی کام جو برسوں تک انجام دیتے دیتے اسے کھلنے لگے تھے۔ بوجھ محسوس ہوتے تھے انہی کے چھوٹ جانے کا خیال اس کے دل کو دکھائے جاتا۔ گھر چھوٹے، ماں باپ کے گھر سے دوسرے گھر جانے اور بھائی بہنوں سے الگ ہونے کا خیال اسے اداس کیے جاتا۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ کسی حال میں مطمئن نہیں رہتا۔“

”تسینم گھر میں شادی کی چہل پہل دیکھتی تو اس کے دل میں کسک سی اٹھتی۔ تھوڑا صبر کر لیتی، انتظار کر لیتی، بے تابی نہ دکھاتی تو وہ بھی ایسی ہی تکریم اور خوشی کے ساتھ اپنے گھر جاتی۔ اپنے پرانے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ شوہر کے بیرون ملک جانے کے بعد وہ اپنی آسانی کی خاطر میکے میں رہ رہی تھی، یہ تو اسی کو یا گھر والوں کو ہی معلوم تھا کہ وہ کس طوفان بلاخیز سے گزری تھی اور اپنی ہی نہیں بلکہ اب تو اپنے بطن میں نمو پاتے ایک نئے وجود کی بقا کے لیے بھی ہنوز ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔“

”مونس کو تمہید کا رشتہ آنے سے شادی کی تیاریوں تک جملہ احوال سے باخبر رکھا جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا چھٹی پر گھر آئے گا مگر تمہید کا رشتہ پھر شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے کی خبر سن کر اس نے اپنا کراچی آنا شادی تک موقوف کر دیا تھا۔ وہ شادی سے دو چار دن قبل گھر پہنچ کر بہن کی شادی کی خوشیوں میں گھر والوں کے ساتھ شریک رہنا چاہتا تھا۔ شادی کے اخراجات میں ابا کا ہاتھ بٹانے کو اس نے اپنے ایک ساتھی سے کچھ رقم ادھار لے کر گھر بھجوا دی تھی۔“

”پیسے کہاں سے آئے؟“ ابا نے اس سے پوچھا۔

”پیسوں کی فکر نہ کریں ابا۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”کیسے فکر نہ کروں بیٹے۔ کیا مجھے تمہارے وسائل کا علم نہیں؟“

”ٹھیک ہے ابا، ٹھیک ہے۔ ایسے موقع زندگی میں بار بار تو نہیں آتے ناں!“

”کسی سے فرض لیا ہے؟“

”چھوڑیں ابا۔“

”کیسے چھوڑوں..... نہیں بیٹا نہیں۔ میں تمہیں یہ رقم واپس بھجوا رہا ہوں۔ جس سے لی ہے واپس کر دو ورنہ یہ سمجھ لینا تمہید کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی جو خوشی تمہاری ماں کو اور مجھے ہے ادھوری رہ جائے گی۔“

”اوہو ابا کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ بھائی ہوں میں۔ کیا میرا اتنا بھی فرض نہیں بنتا کہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہی حصہ ڈال دوں؟“

”بیٹا! سو مواقع آئیں گے بہن کو دینے دلانے کے پھر دے دینا۔“ ابا نے سمجھایا۔

”ابا۔“

”بیٹا!“

”پلیز ابا۔“

”دیکھو میں آج کل بہت خوش ہوں۔ تمہاری پیدائش کے موقع کے علاوہ شاید اور کبھی اتنا خوش نہیں رہا میں۔ تمہید کی بہت فکر تھی مجھے۔ بڑی خدمت کی ہے اس نے ہم سب کی۔ بہت اچھے لوگ مل گئے ہیں اس کے لیے۔ کسی چیز کی تمنا نہیں رکھتے۔ جہیز میں کپڑوں اور زیور کے سوا کچھ بھی دینے سے منع کر دیا ہے۔ اللہ کی مہربانی ہے جو اتنے اچھے لوگ مل گئے۔ اگر اب بھی ہم اپنے اوپر قرض کا بار چڑھائیں تو یہ اللہ کی ناشکری ہوگی بیٹے۔“

”نہیں یار ابھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”کم سے کم دو بہنوں کی تو ہو جائے۔“

”تو دو کی تو ہو جائے گی ناں..... ایک تمہید باجی دوسری تسنیم۔“

”اوہ یس!“ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عازرہ اور اس کے گھر والوں کو یہ بتانے کے باوجود کے لڑکے کی بیرون ملک روانگی کے باعث اس کی ایک بہن کی ہنگامی بنیادوں پر شادی کرنا پڑی تھی وہ نہ جانے کیوں تسنیم کا شادی شدہ ہونا اپنے ذہن سے محو کر دیتا تھا۔

”ایک مرتبہ پہلے بھی آپ یہ غلطی کر چکے ہیں لفظین صاحب۔“ عازرہ کی آواز سے اس کی مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ اسے لفظین ہی کہتی تھی۔

”کون سی غلطی؟“ وہ چونکا۔

”دو بہنوں کی شادی ہو جانے کی شرط میں کتنی کی غلطی۔ تم نے کہا تھا کم از کم دو بہنوں کی شادی تو ہو جائے ابھی تو ایک کی بھی نہیں ہوئی..... یاد ہے ناں؟ میں نے تمہیں یاد دلایا تھا کہ ایک کی تو ہو چکی ہے۔ ڈنڈی مارتے ہو لفظین صاحب۔“

”اوہ نو یار..... اصل میں وہ کیا ہے کہ تسنیم کا نمبر نہیں تھا ناں ابھی پہلے تو تمہید باجی اور تقدیم آپ کی باری تھی۔ رشتے والوں کو تسنیم پسند آگئی اور وہ لوگ اماں ابا کے اتنا پیچھے پڑے کہ تسنیم کی پہلے کرنا پڑی۔ آدمی اپنی باری سے پہلے باری لے بیٹھے یا پیچھے چلا جائے تو کتنی میں یونہی گڑبڑ ہو جاتی ہے یار..... اسی لیے اسی لیے میں اپنی باری کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہاری باری میں تو پھر بہت دیر ہے لفظین۔ تین بہنوں سے چھوٹے ہونا؟“

”نہیں..... چار سے۔“

”اومائی گاڈ! اگر تم نے سچ سچ اپنی باری کا انتظار کیا تو میں تو شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو جاؤں گی..... نو مائی ڈیر لفظین میں اتنا لمبا انتظار نہیں کر سکتی۔“

”یار! دو کے بعد اماں اور ابا سے بات کر کے مگنی کر لیں گے ناں۔ تمہیں پتا ہے مگنی میں بھی بڑا رو مینس ہوتا ہے۔ اتر اتر کر اپنی انگلی والی انگلی دوستوں کو دکھانا۔ رات کو دیر تک فون پر مستقبل کے منصوبے اور صبح.....“

”ٹائیں ٹائیں فٹ!“ وہ اس کی بات اچک کر بولی۔

”اونہیں یار، صبح آنکھ کھلتے ہی موبائل اٹھانا اور ہیلو ہائے، گڈ مارننگ کرنا۔“

”پائی داوے کتنا تجربہ ہے؟“

”تجربہ..... کس بات کا؟“

”مگنیوں کا۔“

”ایک کو ترس رہے ہیں یار..... تم مگنیوں کی بات کرتی ہو۔“ وہ زور سے ہنسا۔

”دل جلانے کی بات نہ کیا کرو۔“

”کس کا دل؟“

”میرا اور کس کا۔“

زندگی

”او یار! ایک ہی تو دل بھایا ہے آج تک..... اسے بھلا کیوں جلاؤں گا۔“

”مجھے کیا پتا..... یہ تو تم خود سے پوچھو..... دیکھو میں کچھ نہیں جانتی..... تمہیں اپنے پیرنٹس سے اس دفعہ بات کرنی ہوگی۔“

”مگر شادی..... تقدیم آپ کی شادی کے بعد..... یار! بڑی اچھی بہن ہے میری..... فیملی کے ساتھ بہت محض..... ان کے لیے رشتے بھی بہت آتے ہیں..... بس ذرا تمہید باجی کی وجہ سے گوٹ پھنسی ہوئی تھی..... انشا اللہ جلدی ہوگی تقدیم آپ کی شادی۔“

”اور اگر نہ ہوئی.....؟“

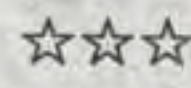
”کیوں نہیں ہوگی اور کیسے نہیں ہوگی..... تقدیم آپ جیسی لڑکیاں تو مقدر والوں کو ملتی ہیں۔“

”اور عازرہ صبور احمد جیسی؟“

”مقدر کے سکندروں کو!“

”جاؤ معاف کیا..... کیا یاد کرو گے لفظین کہ کس سخی سے پالا پڑا تھا لیکن دیکھو مگنی والی بات اسی بار کر لینا۔“

”او کے..... او کے میم۔“



لوگ بڑے بڑے جرم کر کے بھی نہ جانے کیونکر دنیا کا سامنا کر لیتے ہیں، حجاب کو تو ایک ناکردہ جرم کا احساس ہی مارے ڈالتا تھا۔ بھجوت بھائی اور نایاب باجی نے تو گھر آنا جانا ترک کر کے گویا معاشرتی مقاطعہ کر دیا تھا..... (سوشل بائیکاٹ) حجاب کو امی اور باب سے بھی شرم محسوس ہوتی۔ اس کی وجہ سے ان کے بھی روابط ٹوٹ گئے تھے..... انتہائی قریبی رشتوں سے..... دیگر رشتے دار پہلے ہی کچھ کم باتیں بناتے تھے جو رہی سہی کسر پوری ہو گئی تھی..... کراچی سے پشاور تک ایک ہی خبر کا تڑکا لگا ہوا تھا..... ”حجاب کے کروت پڑھے اخبار میں..... ہم تو پہلے ہی کہتے تھے یہ ماں بیٹیاں ٹھیک نہیں ہیں، ساری غلطی ماں کی ہے، شوہر ساری زندگی باہر رہا..... یہ اکیلی..... جو مرضی میں آئی کیا، دن دیکھانہ رات..... نوکری کا بہانہ گھر سے باہر..... کیا ضرورت تھی بیٹیوں کو اتنا پڑھانے لکھانے کی..... اور پھر نوکری کرانے کی..... خاندان کی اور لڑکیاں بھی تو ہیں..... پڑھی لکھی نہیں تو کیا عزت سے گھروں میں تو بیٹھی ہیں..... یوں اخباروں میں تصویریں چھپوا کر کسی نے نام نہیں اچھالا خاندان کا..... حجاب نے تو بے غیرتی کی انتہا ہی کر دی..... پیسے کو اپنا ایمان بنالیا..... لعنت ہے ایسے پیسے پر..... کوئی تعلق رکھنے کے لائق نہیں ہیں یہ ماں بیٹیاں..... کوئی پوچھے بھی تو کہہ دو ہماری کچھ نہیں لگتیں..... تو بہ تو بہ! اللہ معاف کرے..... عورت کی خوب صورتی اس لیے تھوڑی ہوتی ہے کہ اس کے دام کھرے کیے جائیں..... آدمی شریف ہے جو حجاب کو اب بھی اپنے گھر میں ڈالنا چاہتا ہے، ہوتا کوئی بد معاش تو ٹکڑے کر کے کسی جنگل میں پھینک آتا یا نالے میں بہا دیتا۔“

غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں اور ہر شخص اپنی اپنی بساط، اپنے اپنے ظرف کے مطابق بولی بولتا۔

حجاب اسکول جاتی تو اسے اپنی ساتھیوں سے نظریں ملاتے شرم آتی۔ طالبات سے حجاب آتا..... بچیوں کے والدین اور سرپرستوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک احساس شرمندگی غالب رہتا..... ہم عصر اداروں کی سربراہان سے ملنا ہوتا تو ان کی نظروں میں اسے اپنے لیے استہزاء کی کیفیت کا احساس ہوتا..... افسران اعلیٰ اور ان کے ماتحت عملے کی نظروں میں اب بھی پہلے جیسا احترام نہیں رہا تھا..... حقارت جھلکتی تھی..... نوکری مجبوری

نسبت بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی تو انہیں یوں لگتا جیسے مدثر ان سے ہزاروں میل دور جا کر بھی ان کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ تسنیم اور اس کے لطن میں پلتے ننھے وجود کی صورت! مدثر کی یاد می کی آنکھوں کو دن بھر میں نہ جانے کتنی مرتبہ دلاتی۔

☆☆☆

تمہید کی شادی کے کارڈ چھپ کر آ گئے تھے۔ مہمانوں کی فہرست مرتب کی جا رہی تھی۔ اماں اور بابا نام لکھوا رہے تھے، تقدیم کا غد قلم لیے نمبردار نکلتی جا رہی تھی۔
”اپنے وکیل صاحب کا نام ضرور لکھنا۔“ ابا جو ذہن پر زور دے دے کر اعزاد اقربا کے نام نمبر وار لکھوا رہے تھے بولے۔

”وکیل صاحب!“ تقدیم نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

”ارے ہاں بھئی..... وہی اولیس انصاری صاحب۔ بہت کام آئے وہ ہمارے..... عزت بندھی رہ گئی۔“ اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”فکر نہ کرو تقدیم کی ماں، اللہ بہتر کرے گا۔“ ابا نے اماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”کبھی سوچا تھا کہ یہ دکھ بھی سہنا پڑے گا۔ سات نسلوں میں نہ ہوئی ہوگی ایسی بات۔“

”ہونی کو کون روک سکا ہے تقدیم کی ماں۔“

”لڑکیوں کو ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”اچھا بیٹی لکھ لیا تم نے وکیل صاحب کا نام؟“

”جی ابا!“

”اپنی میڈم کا نام بھی لکھ لو۔“

”نہیں ابا۔“

”کیوں؟“ ابا چونکے۔

”وہ ذرا دوسرے انداز کی خاتون ہیں۔ آدھی یورپین آدھی پاکستانی۔ سرعام سگریٹ پیتی ہیں..... تمہید کے سسرال والے دین دار لوگ ہیں۔ میڈم اگر آگئیں اور ان کے سامنے سگریٹ بھی پینے بیٹھ گئیں تو بہت عجیب لگے گا ابا اور مجھے بھی میڈم کو خاص توجہ دینا پڑے گی۔ تمہید کی سسرال والوں کو گلہ ہوگا کہ ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف لگی رہیں۔“

”نہ بلائے پر تمہاری میڈم کو جو گلہ ہوگا کہ بہن کی شادی میں پوچھا تک نہیں۔“

”اسی لیے آفس سے کسی کو بھی نہیں بلا رہی ہوں بعد میں سب کو ایک ساتھ آفس میں ہی ٹریٹ دے دوں گی۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“

”حجاب کو مت بھول جانا۔“ اماں نے یاد دلایا۔

”اے بھولی تو وہ مجھے قتل نہیں کر دے گی۔“ تقدیم مسکرائی۔

”بلکہ حجاب مع اہل خانہ۔“

”لڑکی کی قسمت کا کچھ بتا ہوتا ہے۔“ اماں کے لہجے میں رنج تھا۔ ”ایسی خوب صورت لڑکی اور نصیب ایسا کھوٹا۔“

نہ بن گئی ہوتی تو وہ چھوڑ چھاڑ گھر بیٹھ جاتی..... لمحہ لمحہ عذاب تھا جو وہ سہہ رہی تھی۔

اتنی بڑی اور بھری پُری دنیا میں تقدیم اور اس کے گھر والے اس کے لیے جذباتی سہارا بن گئے تھے۔ تقدیم کی نگاہوں میں اب بھی اس کے لیے پہلے جیسا پیار تھا..... باتوں میں اخلاص تھا..... روتے میں دل بستگی تھی..... اسی لیے وہ پہلے کی نسبت جلد جلد اس سے ملنے لگی تھی..... کبھی اس کے دفتر میں..... کبھی گھر جا کر..... گھر کے سب لوگ حجاب کو اس وقت سے جانتے تھے جب وہ تقدیم کے ساتھ پڑھا کرتی تھی..... پہلے وہ کبھی بکھار گھر آیا کرتی تھی اب گاہے گاہے آنے لگی تھی..... تقدیم نے حجاب کے بارے میں اپنے دلی جذبات گھر والوں کو بھی منتقل کر دیے تھے، حجاب وہاں آتی تو اس گھٹن سے خود کو قدرے آزاد محسوس کرنے لگتی جس کا اسے ان دنوں باہر کی دنیا ہی نہیں خود اپنے گھر میں بھی سامنا تھا..... امی کا سپاٹ چہرہ اور رباب کی خاموشی اس کے لیے زندگی کی سب سے کٹھن آزمائش بن گئی تھی..... تقدیم کے گھر آ کر وہ کچھ ریلیکسڈ ہو جاتی۔ وہاں اماں انھیں جو اسے بیٹیوں کی طرح پیار کرتیں اپنے پاس بٹھا کر اسے تسلی دیتیں..... اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتیں..... تقدیم تھی جو اسے صلاح مشورہ دینے کے ساتھ بہتری کی امید بھی بندھاتی..... تمہید بھی جو ان دنوں اتنی مسرور تھی کہ لپک لپک کر پہلے سے زیادہ اس کی خاطر مدارات کرتی..... تسنیم بھی جو اپنے بھاری وجود کو چادر میں لپیٹے کبھی اس کے پاس آ بیٹھتی تو اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی اداسی اسے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی بسمہ کی یاد دلاتی۔ اس کی آنکھوں میں بھی تو ایسی ہی اداسی تھی۔ تعظیم اور تقدیس اسے بڑی بہن کا سا احترام دیتیں..... تقدیم سے اس کی برسوں پرانی دوستی ان دنوں ویسے ہی اس کے کام آ رہی تھی۔ جیسے دو چھٹی میں دھری کوئی زائد از ضرورت تو شک کسی مہمان کے قیام پذیر ہونے پر یاد آتی ہے اور اپنی تمام تر حدت و ملائمت کے ساتھ کام آنے لگتی ہے۔

تمہید کی شادی کی تیاریوں میں تقدیم اور اس کے گھر والوں کا انہماک اور مسرت دیکھ کر حجاب کو الطاف سے اپنے نکاح کا موقع یاد آتا..... سب کتنے خوش تھے..... مگر کسے معلوم تھا کہ وہ خوشی نہ صرف نایاب سدا ر ثابت ہوگی بلکہ ایسے دردناک انجام سے دوچار ہوگی جو کسی اور کے لیے نہ سہی خود اس کے دل کو اک کرب مسلسل سے دست و گریباں کر دے گا..... دل کو اس کرب سے مفر کی کوئی راہ نہیں مل پا رہی تھی۔

☆☆☆

مدثر اسکاٹ لینڈ چلا گیا تھا..... بہن کے پاس وہ پہلے بھی گیا تھا مگر عارضی قیام کے لیے لیکن اس بار تو وہ وہاں مستقل قیام کی نیت سے گیا تھا۔ مئی کو وہ اٹھتے بیٹھتے یاد آتا اور اس کی یاد آتے ہی غیر شعوری طور پر انہیں تسنیم کا خیال آتا..... ڈیڈی کی مطلق العنانی اور سفاکیت پر انہیں دل ہی دل میں غصہ آنے لگتا۔ کیا تھا اگر وہ تسنیم کو اس گھر میں قبول کر لیتے۔ آخر منعم کی بیوی کو بھی تو کیا ہی تھا۔ بجا کہ مدثر اور تسنیم دونوں نے غلطی کی تھی۔ والدین اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اس لیے تھوڑی بھیجتے ہیں کہ وہ وہاں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے محبت کی پیچگیں بڑھائیں اور ماں باپ کی عزت اور ارمانوں کا خیال کیے بنا زندگی کے اتنے بڑے بڑے فیصلے خود کر ڈالیں۔ جنہیں کرنے سے پہلے ان کے بڑے ہر پہلو سے سو سو بار سوچتے ہیں..... لیکن ڈیڈی نے تسنیم کو طلاق دلو کر مدثر سے بھی بڑی غلطی کی تھی۔ اس لیے کو اب وہ بے پاؤں ساری زندگی مدثر اور تسنیم ہی نہیں دونوں خاندانوں کے مستقبل کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔ اک کمتر دکھ سے نجات کی کوشش میں کبھی مندل نہ ہونے والے زخم کو دو خاندانوں کا نصیب بنا دیا گیا تھا۔

عجیب بات تھی مدثر کے جانے کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ ہی کے دل میں تسنیم سے ہمدردی ہی نہیں

”قسمت کا تو نہ لڑکی کی پتا ہوتا ہے نہ لڑکے کی“ ابا بولے۔

”سچ کہتے ہیں۔“ اماں نے گھائل لہجے میں کہا پھر قدرے توقف سے بولیں۔ ”ابھی تو خیر موقع نہیں ہے ایسی بات کرنے کا لیکن تمہید کی شادی سے نمٹ کر آپ اپنی بہن اور بہنوئی سے ضرور بات کر لیں..... بتا دیں انہیں کھل کر کہ ہماری تو دلی آرزو تھی کہ خوش بخت ہمارے گھر آئے مگر..... کوؤں پر خدا کی مارجود کھجھیے والوں کے انڈے کھا بیٹھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے کر لوں گا میں بات، سمجھا دوں گا بہن کو۔ نیاز مانہ ہے تقدیم کی ماں ان باتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

تقدیم اگلا نام لکھنے کے لیے اماں اور ابا سے ڈکٹیشن لینے کی منتظر تھی۔ تمہید گرم پکوڑوں کی پلیٹ اٹھائے آ پہنچی۔ اسے دیکھ کر اماں کا جی بھر آیا۔ تسنیم کے قصے سے پہلے تمہید کتنی مایوس ہو چلی تھی اپنے مستقبل سے..... اکثر بھڑک جاتی گھر والوں سے الجھنے لگتی۔ تسنیم کے قصے نے اسے یوں خاموش کر دیا تھا جیسے اس نے اپنے مقدر کی مایوسی سے مفاہمت کر لی ہو مگر اس مفاہمت سے یک بیک کیسی امید پھولی تھی۔ ثریا نے ٹھیک کہا تھا کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے زندگی میں کہ جن باتوں کو ہم اپنے لیے مصیبت سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ انہی سے ہمارے لیے آسانیوں کا راستہ کھول دیتا ہے۔

☆☆☆

عباد کو ویزے کے انتظار میں ایک، ایک دن پہاڑ لگ رہا تھا۔ نورین سے اس کی بلاناغہ فون پر بات ہوتی۔ ساس اور سر سے بھی رابطہ رہتا۔ اس کا بس چلتا تو ویزے کے بغیر ہی اڑ کر وہاں جا پہنچتا۔ نورین سے زیادہ وہ ملکہ کا دل پس دیکھنے کی تمنا میں مراجار ہا تھا۔ اب وہ اور بات تھی کی نورین اس کے لیے وہاں پہنچنے کا زینہ بن رہی تھی اور اسی لیے اسے نورین سے یہ کہنا پڑتا۔ ”آئی ایم ڈانگ ٹوسی یوہنی۔“

”بٹ آئی ایم ناٹ۔“ کئی مرتبہ عباد سے ایک ہی بات سننے کے بعد ایک روز نورین نے بیزار سے کہا۔

”کیا..... کیا کہا تم نے؟“ وہ چونکا۔

”میں نے کہا تم مجھے دیکھنے کو مر رہے ہو تو شوق سے مرو میں اتنی فضول بات کے لیے نہیں مر سکتی۔“

”محاورہ ہے سوئٹ ہارٹ..... لیکن کیا تم مجھے دیکھنے، مجھ سے ملنے کو فضول بات سمجھتی ہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ہم دونوں پھر سے اکٹھے ہوں۔ ہمارے درمیان دوری نہ ہوں، فاصلے نہ ہوں۔“

”آدمی کو پریکٹیکل ہونا چاہیے۔“ نورین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ اس نے اپنی بات کی تائید چاہی۔

”نو..... ناٹ ایٹ آل ڈارلنگ..... ناٹ ایٹ آل۔“ عباد کو اختلاف رائے کی اجازت تھی نہ حوصلہ۔

نورین کا امیر وکیر باپ اس کے ساتھ اپنی پہلی ہی نشست میں اسے بتا چکا تھا کہ اسے اس کی بیٹی سے شادی کی صورت میں بیوی کا بندہ بے دام بن کر رہنا تھا..... اس میں حرج بھی کیا تھا، عباد کو تو بیوی کی طرف سے بہت کچھ ملنے کی امید تھی۔ اکثر مرد تو بیوی کو بہت کچھ دے دلا کر بھی اس کے زرخیز بنے رہتے ہیں۔

☆☆☆

مونس کی آمد نے تمہید کی شادی کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔ تسنیم کو اس نے دوسرے ہی حال میں دیکھا۔ اماں نے اپنے پاس بٹھا کر وہ ساری کتھا اسے سنائی جو اس کی عدم موجودگی میں گزری تھی۔

”شوٹ کر دینا چاہیے تھا اس بد معاش کو۔“ مونس دانت پیس کر مدثر کی بابت بولا۔

”بیٹا! غلطی تو ہماری اپنی لڑکی کی بھی تھی۔“ اماں نے خدا لگتی کہی۔
 ”مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غلطی دو افراد کریں اور سزا صرف ایک کو بھگتنی پڑے۔“
 ”دستور ہے بیٹا۔ مرد اور عورت مل کر غلطی کریں تو سزا عورت ہی کے حصے میں آتی ہے۔“

”کس دستور کی بات کر رہی ہیں اماں؟“

”معاشرے کے دستور کی اور کس دستور کی۔“

”میں سمجھا آپ دین کے دستور کی بات کر رہی ہیں۔“

”کہتے ہیں دین سے دنیا تھا منی مشکل..... اللہ اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے مگر بندے، بندوں کو معاف نہیں کرتے۔“

”ظرف ہونا چاہیے اماں۔“

”وہ دور چلا گیا ہے بیٹے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اتنا کچھ ہوا اس نے کبھی ہم سے بدتمیزی یا بدکلامی نہیں کی بلکہ جانے سے پہلے تسنیم سے معافی بھی مانگی۔ طلاق دینے پر پچھتاوا ہے اسے۔“ اماں نے اپنا ہاتھ مولس کے کندھے پر رکھ دیا۔

”پچھتاوا!“ مولس نے جبرے بھینچ لیے اور وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”ایک لڑکی کی زندگی برباد کر دی اس نے.....“

اسے تو ڈوب کر مر جانا چاہیے تھا۔

”برامت ماننا بیٹے، ایک بات کہوں۔ ایک لڑکی کی زندگی تو تم نے بھی برباد کی ہے۔“

”آپ بھی برامت مایے گا اماں..... اگر میں آپ کی اس بات کا جواب دوں تو۔“

”ہاں، ہاں دو، ضرور دو..... دیکھوں تو کیا جواب ہے تمہارے پاس۔“ اماں نے مولس کو تیکھی نظروں

موٹاپا

موٹاپا سے مراد موٹا ہونا نہیں کیونکہ اس کا تعلق پاؤں کے وزن سے ہوتا تو پھر یہ محاورتا خالص زنانہ صفت ہوتی حالانکہ یہ تو وہ صفت ہے جو مرد و عورت سے علیحدہ نہیں کرتی، پاس پاس کرتی ہے۔ اسی لیے دو موٹے مرد عورت اتنے ہی فاصلے پر بیٹھے ہوں جتنے فاصلے پر پتلے مرد عورت بیٹھے ہوں تو موٹے ایک دوسرے کے زیادہ پاس پاس ہوتے ہیں۔

پتلے بہت سخت ہوتے ہیں جبکہ موٹے افسر اور خاوند ہی نہیں، موٹی بیوی تک بہت نرم ہوتی ہے۔ یقین نہ آئے تو چھو کر دیکھ لیں۔ اپنی کہاوت ہے عورت، تربوز اور پیپر کو وزن سے منتخب کرنا چاہیے۔ وزن تو مصرعوں میں نہ ہو تو وہ شعر نہیں بنتے۔ پتلا اور نحیف تو اردو ادب میں صرف عاشق ہی ملتا ہے۔ اس کی حالت اس قدر پتلی ہوتی ہے کہ اس کی تو بات تک میں وزن نہیں ہوتا پھر عاشق کا یہ کہنا کہ مجھے ہر طرف محبوب ہی محبوب نظر آتا ہے دراصل محبوب کے موٹے ہونے کی تعریف کرنا ہی ہے۔ اسی لیے تو عاشق کہتا ہے محبوب آجائے تو لگتا ہے کل کائنات آگئی اور وہ منہ موڑ جائے تو اسے لگتا ہے پوری دنیا منہ موڑ گئی ہے۔ کمزور اور پتلے محبوب کا عارض بھی عارضہ بلکہ عارضی لگتا ہے۔

از: مزاحیات، ڈاکٹر یونس بٹ
مرسلہ: غزالہ طارق، سرگودھا

”سمسٹر نکل گیا ہے۔“

”تو کیا ہوا، اپنے ساتھیوں سے ایک سمسٹر جو نیز ہی ہو جاؤ گی ناں..... وقت کو جب، جہاں اور جیسے بھی پکڑ سکتی ہو پکڑنے کی کوشش کرو۔ اینڈ آف دی ڈے نقصان میں نہیں رہو گی لیکن اگر وقت کو نہ پکڑا تو وہ آگے نکل جائے گا اور تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔ تم سمجھ رہی ہونا میری بات؟“

”جی میڈم!“

”Go ahead..... بسم اللہ کرو۔“

”لیکن میڈم ایک مسئلہ ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”کیا؟“ میڈم بھٹی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”آئی ایم پریگنٹ۔“ میڈم بھی مسکرا دیں۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ یہ فقرہ میڈم بھٹی کا گویا تکیہ کلام تھا اور بقول ڈیپارٹمنٹ کے طلبہ میڈم بھٹی کا یہ کہنا کہ ”کوئی مسئلہ نہیں“ بڑے سے بڑے مسئلے کو آسان کر دیا کرتا تھا، ریلیف دیتا تھا۔

”میڈم! ٹیچرز کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”کیوں ہوگا بھٹی؟ جس لڑکی کی شادی ہو گئی ہو اس کا پریگنٹ ہونا بھی نیچرل ہے۔ یہاں یونیورسٹی میں پریگنٹ اسٹاف کام نہیں کرتا ہے کیا۔ اگر یونیورسٹی کے ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ اسٹاف میں پریگنٹ ہو جانے والی شادی شدہ خواتین اپنے فرائض منصبی ادا کر سکتی ہیں تو ایک شادی شدہ طالبہ کے تعلیم جاری رکھنے پر کیوں اعتراض ہوگا کسی کو۔“

سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوری اماں!“ مونس نے پہلے اپنی جسارت رندانہ پر معذرت کی پھر بولا۔ ”آپ والدین کو چاہیے کہ ہمیں اپنی خواہشوں کی زنجیروں میں باندھنے کی کوشش نہ کریں۔ ہماری اپنی بھی تو کوئی خواہش ہو سکتی ہے۔ میں چاہتا تو آپ کو بتائے بغیر بھی کوئی فیصلہ کر سکتا تھا مگر میں نے آپ کو اعتماد میں لیا اور دوسری طرف بھی بتا دیا ہے کہ جب تک تقدیم آپ کی شادی نہیں ہو جاتی انہیں انتظار کرنا ہوگا۔ کیا آپ کے اطمینان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ نہ میں نے آپ کے اعتماد کو نہیں پہنچائی ہے نہ اپنی ذمہ داری سے نظر چرائی ہے۔“

اماں نے ایک سرد آہ کھینچی اور مونس کو بڑی حسرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور اماں کے نحیف شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟“

”دیکھ رہی ہوں کہ وقت نہیں کیا کچھ دکھاتا ہے۔“ اماں نے پھر ایک سرد آہ بھری اور مونس کو پھر ویسی ہی نظروں سے دیکھتے ہوئے دل گرفتگی سے کہا۔

☆☆☆

وقت قاتل بھی ہے مسیحا بھی۔ زخم بھی لگاتا ہے اور خود ہی زخم کی نکور بھی کرتا ہے۔ وقت نشتر بھی ہے مرہم بھی۔ تسنیم دھیرے دھیرے زندگی کے اس روپ کی طرف پلٹ رہی تھی جو خرابی قسمت سے قبل اس کا معمول تھی۔ اس نے اپنا منقطع تعلیمی سلسلہ مکمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پریگنٹنسی میں آخر زندگی کے دیگر معاملات بھی تو چل ہی رہے تھے۔ ہمت کر کے وہ ایک روز یونیورسٹی جا پہنچی۔

”اے لڑکی! تم اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“ ڈیپارٹمنٹ کی سب سے زیادہ مقبول اور محترم استاد میڈم بھٹی نے پوچھا۔

”میڈم، شادی ہو گئی تھی میری۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا..... اچھا، یہ اچھی خبر ہے لیکن یہاں تو جس سے بھی پوچھا گیا تمہارے بارے میں اس نے لاعلمی ظاہر کی۔“

”میڈم! یہاں سے کسی کا میرے گھر آنا جانا نہیں تھا ناں اس لیے۔“

”اسی لیے کہتے ہیں انسانوں کا انسانوں سے رابطہ رکھنا ضروری ہے۔“

”انسانوں کا!“ اس نے میڈم بھٹی کے دو الفاظ معنی خیز لہجے میں دہراتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”تمہارے اس تبصرے پر میں اپنے کمٹنس محفوظ رکھتی ہوں۔“ میڈم بھٹی بھی خوش دلی سے مسکرائیں۔ ”بیٹھو تو تمہارا اسٹینڈ بڑھ گیا ہے۔ اپنے شاگردوں کو میں عام طور پر اپنے کمرے میں بیٹھنے کی دعوت نہیں دیتی ہوں لیکن بھی تم تو اب محترم ہو گئی ہو۔“ میڈم بھٹی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”تھینک یو میڈم۔“ وہ اپنے وجود کے گرد لپٹی چادر کو سنبھالتے ہوئے ان کے روبرو بیٹھ گئی۔

”آج کیسے آنا ہوا؟“

”میڈم! میں اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“

”گڈ! نیک ارادہ ہے..... تو کرو کس نے منع کیا ہے؟“

”لیکن میڈم گیپ آ گیا ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

تمہید کی شادی کا دعوت نامہ دیتے ہوئے تقدیم نے امی سے حجاب اور رباب کے ساتھ مایوں اور مہندی کی تقاریب میں بھی شرکت کرنے کا اصرار کیا تھا۔ امی نے اس سے شرکت کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن مایوں والے دن جب حجاب نے انہیں یاد دلایا کہ آج شام کو تقریب میں شرکت کرنی ہے تو امی نے قدرے ناگواری اور بیزاری سے کہا۔ ”مجھے کہیں آنے جانے کو مت کہا کرو۔“

”لیکن آپ نے تو تقدیم سے وعدہ کیا تھا امی۔“

”شرما حضوری۔“ امی نے توقف کیا پھر گھائل لہجے میں بولیں۔ ”کسی کو منہ دکھانے کے رہے ہیں ہم لوگ.....؟ کسی نے پہچان کر انگلی اٹھا دی تم پر تو تقدیم کے گھر والے بھی مشکل میں پڑ جائیں گے کہ دلہن کی بہن کی سہیلی ایسی!“

حجاب صدمے کی کیفیت میں رہ گئی۔ اخبار میں تصویر اور عدالتی کارروائی کی تفصیلی خبر شائع ہونے کے بعد سے امی ایک درد آمیز خاموشی میں تو تھیں لیکن یہ کرب ایک دن اس کے لیے ملامت بن کر امی کی زبان سے ٹپک پڑے گا یہ حجاب کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ چند ٹامے دم بخود رہی پھر امی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں؟“ اس کا لہجہ درد اور شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”مجھے کیا حق ہے کسی سے ناراض ہونے کا۔“ انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شاید امی نے یہ کہا ہوتا کہ ہاں وہ اس سے ناراض تھیں تو اسے اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا امی کی اس بے رخی سے ہوا۔

”آپ سے بہتر مجھے اور کون جان سکتا ہے امی۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ”کیا میں ایسی ہو سکتی ہوں..... اتنی گر سکتی ہوں کہ میسے کی خاطر..... نہیں امی نہیں... میں اتنی ذلیل، ایسی بچ اور بے کردار نہیں ہو سکتی۔ اس وکیل نے مجھے صرف اپنی فیس کی لالچ میں ذلیل کیا ہے۔ بے بنیاد الزامات لگائے ہیں اس نے مجھ پر۔“ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

”میں تو اس رشتے سے خوش ہی نہیں تھی۔ کتنی دفعہ میں نے کہا کہ میرا دل ڈرتا ہے..... جب آپ لوگ اس کا گھر دیکھ کر آئے اور رباب بہت اکیسائٹ ہوئی تو میں نے کہا تھا ناں مجھے بڑے گھروں سے ڈر لگتا ہے۔ میری اپنی مرضی ہوتی تو میں ایسا کیوں کہتی۔“

”نایاب ناراض ہو کر اپنے گھر بیٹھ گئی بہجت کو دیکھے مجھے کتنے دن ہو گئے۔ اب اور کیا چاہتی ہو تم مجھ سے۔“ امی نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

”پلیز!“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے امی کو اپنی آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ امی اسے بہت دور دوسرے کنارے پر کھڑی دکھائی دیں۔

”پلیز امی، آپ..... آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہوں مگر آپ کی ناراضی نہیں سہہ سکتی میں۔“ اس نے باہم جوڑے ہوئے ہاتھ علیحدہ کر کے امی کے گھٹنے پکڑ لیے۔

”چھوڑو میرے گھٹنے۔“ امی نے بیزاری کا اظہار کیا۔ ”جانا ہے..... اکیلی جاؤ۔ نہ میں جاؤں گی نہ رباب کو جانے دوں گی تماشا بننے کے لیے۔“

اس کا جی بری طرح بھرا آیا۔ اپنی پیشانی دونوں گھٹنوں پر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امی کا ہاتھ اسے دلا سہ دینے کو نہیں آیا اور ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ الطاف کے لیے اس کے رویں رویں سے بددعا

”اور اگر ہوا میڈم؟“

”نہیں ہوگا..... اگر ہوا تو ہم ڈیفینڈ کریں گے..... ہاں البتہ ایک بات ہے، تمہیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ یونیورسٹی ایک مخلوط تعلیمی ادارہ ہے اس طرح سے اپنے آپ کو لپیٹ سمیٹ کر آؤ کہ لوگوں کی نظریں خواہ مخواہ تمہاری طرف نہ اٹھیں۔ جانتی ہوناں بعض لڑکے کتنے چھپھورے ہوتے ہیں کسی کو یہ موقع دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ تم پر کوئی آواز کسے یا کوئی الٹی سیدھی بات کہے۔ دیکھو اس وقت بھی تو تم نے خود کو کتنی اچھی طرح چادر سے ڈھانپ رکھا ہے۔ کون سامنتھ ہے؟“

اس نے مجھوب ہو کر میڈم بھٹی کے سوال کا جواب دیا۔

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ میڈم بھٹی اپنے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں بولیں۔ ”ڈیوری سے پہلے تم اپنے سمسٹر سے فارغ ہو جاؤ گی۔“

”تھینک یو ویری مچ میڈم۔“

”کس بات کا؟“

”آپ نے میری ہمت بڑھائی۔“

”تعلیم کے لیے میرا اپنا منشور یہ ہے کہ تعلیم ہر قسم کے حالات میں سب کے لیے..... نہ عمر کی قید ہوئی چاہیے نہ وقت کی۔ میں تو کہتی ہوں ساٹھ سال کا ایک بوڑھا بھی ڈاکٹر، انجینئر بننے کی خواہش رکھتا ہو تو اسے موقع ملنا چاہیے۔“

”تھینکس اے لاث۔“

”پھر وہی بات۔“

”میڈم! آپ ہی نے تو ایک دفعہ کلاس کے دوران کہا تھا انگریزی زبان میں تین میجک ورڈز ہیں پلیز، سوری اور تھینک یو۔ ان الفاظ کو کام میں لا کر بہت سی مشکلات کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔“

”کوئی شک نہیں۔“ میڈم بھٹی نے اپنی کبھی بات کی تائید کی۔

”اجازت ہے میڈم؟“

”اوکے..... ہسپیڈ کیا کرتے ہیں تمہارے؟“ اس کے زخمی دل کے بند چیسے کھل گئے۔

”باہر ہوتے ہیں میڈم۔“

”کہاں؟“

”اسکاٹ لینڈ۔“

”کرتے کیا ہیں؟“

”اپنا بزنس ہے۔“

”تم بھی وہیں چلی جاؤ گی؟“

”جی میڈم۔“ اس نے میڈم بھٹی سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

زندگی میں انسان کو بسا اوقات کتنی فاش غلط بیانی کرنا پڑتی ہے۔ کاش..... یہ سب کچھ سچ ہوتا، حقیقت

ہوتی۔ مدثر سے اس کا رشتہ قائم ہوتا۔ وہ بے شک چلا جاتا اسکاٹ لینڈ..... اس کا تو ہوتا اسے ایک نہ ایک دن اس کے پاس جانے کی امید تو ہوتی۔ اب تو ہر امید، ہر آس گویا ٹوٹ چکی تھی۔

ناشائیں نمبر نظر آ رہا تھا۔

”ہیلو!“ تنسیم نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو!“ جواب دینے والی آواز کو وہ کروڑہا آوازوں کے بیچ بھی پہچان سکتی تھی۔ اس آواز کو سنتے ہی وہ دم بخود رہ گئی۔

”مڈر!“ اس نے کہا اور تنسیم کا دل دکھا کہ وقت نے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں اسے اپنی شناخت کے لیے نام بتانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

”کیسی ہو؟“ اس نے پوچھا۔ وہ گنگ تھی۔

”ناراض ہو؟“ اس نے کہا۔ تنسیم نے بٹن دبا کر کال منقطع کر دی۔ اسکرین پر اسی نمبر کے ساتھ دوبارہ رنگ ٹون بجی۔ دوبارہ..... سہ بارہ..... چوبارہ۔ اس نے پھر وہی بٹن دبا دیا۔ رنگ ٹون پھر بھی اسی نمبر کے ساتھ، اسی بے تابی سے۔

”کیا ہے؟“ اس نے کال ریسیو کر کے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟“

”ڈونٹ ڈسٹرب می۔“ اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اتنی دور آ کر بھی تمہارا خیال میرے ساتھ ہے۔“

”I feel guilty, I feel ashamed“

”آئندہ فون مت کرنا مجھے۔“

”پلیز..... پلیز فون بند مت کرنا۔“ وہ بے تابانہ گڑ گڑایا۔ ”میری بات سنو، میری بات سنو پلیز..... میں

تمہارے لیے اور اپنے بچے کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”زہر بھجوادو میرے لیے بھی اس کے لیے بھی۔“

”کچھ بتا رہا ہوں، شرمندہ ہوں..... معافی چاہتا ہوں تنسیم۔“

”مجھے زندہ رہنے دو، سمجھے۔“ اس نے نجی سے کہا۔

”کبھی کبھی فون تو کر سکتا ہوں؟“ وہ لجاجت سے بولا۔

”کیوں، کس لیے اور کس ناتے سے؟“

”میں اس کا باپ ہوں۔“

”مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ اس نے دُشٹی سے کہا اور بٹن دبا کر کال منقطع کر دی۔ رنگ ٹون پھر بھی، بجتی رہی

تنسیم نے فون سوچ آف کر دیا۔

شام کو تمہید کی مہندی کی تیاریاں تھیں۔ باہر برآمدے میں تعظیم اور تقدیس محلے کی لڑکیوں بالیوں کے ساتھ ڈھونکی بج رہی تھیں اور اونچی تان میں گارہی تھیں۔

میرے نیر سے آج مجھے آیا

پہلا جوڑا یہ ہری ہری چوڑیاں

اندر کمرے میں تنسیم کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ماں باپ کی عزت کا خیال رکھا ہوتا تو بہنیں اور سکھیاں اس کی باری پر بھی اس کے لیے یہ لاپیں ضرور لگاتیں۔ اسے تو نہ پہلا جوڑا نصیب ہوا تھا نہ ہری

نکل رہی تھی۔

”یہاں عزتیں اچھلتی ہیں، انصاف بکتا ہے۔“ سیف علی خان جیسے وکیلوں کے چیمبرز کی پیشانی پر چسپاں کرنے کے لیے یہ سلوگن بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے لڑنا بھی مشکل تھا اس معاشرے میں۔

تمہید کے مایوں میں امی اور باب کے بنا وہ کیسے جاسکتی تھی بھلا۔ تقدیم فون پر سخت برہم ہوئی۔ ”مجھے پتا ہے ساری شرارت تمہاری ہے، آنٹی نے تو مجھ سے پکا وعدہ کیا تھا۔“

”یقین کرو گی کہ میری شرارت نہیں، حالات کی بے رحمی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کون سے حالات کی، کس کے حالات کی؟“

”امی اس ڈر سے نہیں آئیں کہ شرفا کی محفل میں کسی نے اگر مجھے میرے رسوا چہرے کے حوالے سے پہچان لیا تو؟“

”اوہ نو! تقدیم نے بے ساختہ کہا اور ساتھ ہی نہایت برا بھلا بھی کہا۔“

”کسے گالی دے رہی ہو؟“

”کسے دینی چاہیے؟“

”ظاہر ہے..... مجھی کو۔“ وہ ہنسی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں اس شخص کو گالی دے رہی ہوں جس نے تمہیں اپنے سونے کے پنجرے میں قید کرنے میں ناکامی پر تمہارے خوب صورت پرکڑنے کی کوشش کی اور اس کے وکیل کو گالی دے رہی ہوں جس نے تم پر کچڑا اچھال کر اپنی زبان بدبودار کی۔“

”میں خود اس تجربے سے گزرنے کے بعد سوچتی ہوں ہمارے ہاں عورت کا کتنا استحصال کیا جاتا ہے۔“

جس کے جو منہ میں آتا ہے کہہ گزرتا ہے، لکھ دیتا ہے، چھاپ دیتا ہے بغیر کسی ثبوت، پنا تصدیق کیے۔“ حجاب دکھ سے بولی۔

”عورت کا ہر معاشرے میں استحصال کیا جاتا ہے ڈیرے مغرب کے معاشرے کو ہم کتنا تہذیب یافتہ اور وہاں کی عورت کو کتنا آزاد، خود مختار اور مضبوط سمجھتے ہیں..... کبھی اس معاشرے میں عورت کے استحصال کی کہانیاں سننی ہوں تو وقت لے کر ہماری باس سے ملنے آ جاؤ۔ ایسی ایسی لرزہ خیز داستانیں سناتی ہیں کہ خدا کی پناہ! میڈم کے کمرے میں ایک فریم شدہ تصویر بھی ہے۔ ایک دیہاتی عورت اپنے گھر کے آنگن میں مٹی کے چولھے کے پاس بیٹھی ہانڈی سے سالن نکالتے ہوئے چولھے کے سامنے بیٹھے اپنے شوہر اور بچوں کو دیکھ کر کسی بات پر مسکرا رہی ہے۔ ایک بچہ اس کی گود میں بھی دُکا ہوا ہے۔ میڈم کہتی ہیں یورپ اور امریکا میں انہوں نے کسی عورت کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ نہیں دیکھی..... اچھا دیکھو آج تو تمہاری غیر حاضری معاف ہے۔ مہندی میں نہ آئیں تو قتل کر دوں گی تمہیں۔“

”امی سے بات کرو، ان کے اور باب کے بغیر میں نہیں آ سکتی چاہے تم مجھے ایک نہیں سات مرتبہ قتل کر دو۔“

”اوکے، میں آنٹی کے پاس آؤں گی۔“

☆☆☆

تنسیم کے موبائل کی رنگ ٹون بج رہی تھی اور اسکرین پر مقامی نمبروں سے زائد ہندسوں پر مشتمل ایک

”نہ..... نہ ایسی غلطی مت کرنا۔ بہنوں کے انتظار میں بیٹھے رہنے والے بھائی زیادتی کرتے ہیں اپنے ساتھ، اپنے گھر والوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ بھی جن کی لڑکی سے شادی کر کے وہ کسی ایک گھر کی ایک لڑکی کے سلسلے میں اس کے گھر والوں کی فکر کم کر سکتے ہیں۔ اپنے گھر ہی کی مثال لے لو اماں، ابا کتنے پریشان اور فکر مند رہا کرتے تھے خدا خدا کر کے کسی ایک بہن کا مسئلہ تو حل ہوا۔“

”اصولاً اب آپ کا نمبر ہونا چاہیے۔“

”میری فکر نہ کرو، میں ان لڑکیوں میں سے نہیں جو شادی کو زندگی کا حرف آخر سمجھتی ہیں۔“

”جیسے تمہید باجی۔“

”ایسا مت کہو..... تمہید کا مسئلہ شادی سے زیادہ زندگی کی یکسانیت سے بیزاری تھی۔ صبح اٹھنا اور رات تک کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہنا اور ہم میں سے کوئی نہ اس کی پیٹھ تھپکتا تھا، نہ حوصلہ افزائی کے دو بول بولتا تھا۔ کیا تھا اس کی زندگی میں۔ کوئی مقصد ہونا ضروری ہوتا ہے مونس۔ میرے پاس اچھی جاب ہے، زندگی میں واضح مقاصد ہیں، ٹارگٹس جن تک پہنچنے کے لیے مجھ پر کسی کا جبر نہیں۔ میری اپنی چوائس، میرا اپنا انتخاب ہے۔ جب آپ اپنی چوائس کی زندگی گزارتے ہیں مونس تو پھر آخری نتیجہ کچھ بھی ہو آپ اپنے ٹارگٹ تک پہنچ پائیں یا نہ پہنچ پائیں آپ کسی اور کو الزام نہیں دیتے۔ آپ کہتے ہیں یہ میرا اپنا فیصلہ تھا کسی اور کا کیا دوش۔“ اس نے توقف کیا پھر کہا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”آپ کے ٹارگٹس کسی اور کے ٹارگٹس کی راہ کی رکاوٹ بھی تو بن سکتے ہیں؟“ وہ بہن کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بات حوصلے کی ہے۔ دوسرا اگر اپنے ٹارگٹس تک پہنچنے کے لیے اس رکاوٹ کو عبور کر سکتا ہے، گرانے کی ہمت رکھتا تو بھد شوق۔“ وہ مسکرائی۔

”چیلنج منظور۔“ مونس نے انتہائی قطعیت سے کہا۔

”اوہ نو۔“ وہ بے ساختہ چونکی۔ ”تم..... اس گھر کی سب سے بڑی امید اور خوشی ہو مونس۔ دور رہو یا پاس اس گھر کے لیے قوت ہو۔ اماں اور ابا نے تمہارے حوالے سے نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھ رکھے ہیں، کتنی خواہشیں، کتنے ہی ارمان ہیں ان کے جن کا مرکز تم ہو۔ اماں بیمار رہتی ہیں۔ تسنیم کی وجہ سے بہت پریشان رہی ہیں خدا کی مہربانی سے تمہید کی شادی کا مسئلہ حل ہوا تو ان کی مایوسی کچھ دور ہوئی ہے۔ تم انہیں انتظار میں مت رکھنا۔ بہنوں کے سلسلے میں تو مجبوری تھی تمہارا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لڑکی موجود ہے، میں یہ نہیں کہتی کہ کل ہی کرڈا ولیکن خواہ مخواہ دیر مت کرنا۔ ہم سب..... خاص طور پر اماں ابا تمہیں سہیلڈ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اماں کی یہ فکر بھی دور ہو جائے گی کہ تم گھر سے اور ہم سب سے دور اکیلے ہو۔“

”اکیلے کا کیا ہے..... ہم فوجی بندوں کی کسی بھی وقت کسی ایسی جگہ پوسٹنگ ہو سکتی ہے جہاں میریڈ آفسیر بھی نیلی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔“

”ماں کو یہ احساس تو رہتا ہے کہ اس کے افسر بیٹے کے لیے دعا کو اٹھنے والے ہاتھ اور بھی ہیں۔“

”ایمان سے آپ عورتوں کے پاس ہر بات کی جیسی فلیکشن ہوتی ہے۔ کیا کیا اور کیسے کیسے پوائنٹس نکال کر لاتی ہیں آپ لوگ۔“

”مان گئے ناں؟“

ہری چوڑیاں اس کی کلائیوں کی زینت بنی تھیں۔ معمولی تک سب کی تمہید پر بھی پیلا جوڑا اور سبز چوڑیاں پہننے کے بعد کیسا روپ آیا ہوا تھا۔

سچ ہے میکیے اور سسرال میں وہی لڑکیاں عزت پاتی ہیں جو ماں باپ کی عزت کا خیال رکھتی ہیں۔ تسنیم خسارے میں رہی تھی۔ تصویر عبرت بن گئی تھی۔ اپنے آپ سے بھی شرم آتی تھی اسے۔

☆☆☆

مہندی کی رات جب لڑکیاں بالیاں گاجا کر تھک چکیں۔ مہمان واپس جا چکے، گھر والے تھکے ہارے سونے کی تیاریاں کرنے لگے تو مونس، تقدیم کے پاس آ بیٹھا۔

”آپی، نیند آنے لگی ہے؟“

”تمہیں نہیں آرہی؟“

”آ تو رہی ہے۔“

”سو جاؤ، صبح جلدی اٹھنا ہے۔ ڈھیروں کام ہیں۔“

”ایک ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔“ تقدیم کا ماتھا ٹھنکا۔ اب تو وہ مونس کی ضروری بات سنے بغیر سو ہی نہیں سکتی تھی۔

”ہاں، بولو۔“

”وہ.....“

”چپ کیوں ہو گئے؟“

”یار کیسے بات کروں؟“ اس نے اپنی بائیں ہتھیلی کھول کر اس پر دائیں ہاتھ سے مٹکا مارا۔

”سمجھ گئی..... عازنہ کی کوئی بات کرنا چاہتے ہو۔“ تقدیم مسکرائی۔

”ہاں ناں۔“ وہ سرک کر اس کے نزدیک ہو گیا اور رازداری سے بولا۔ ”کچھ منگنی شگنی کا سین بن سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں، تم کہو تو شادی کا بھی۔“ تقدیم نے اپنے دل میں خوش بخت کے لیے ایک کک ہونے کے باوجود مونس کو خواہر انہ محبت سے دیکھا۔

”نہیں، نہیں شادی ابھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”جب تک آپ کی نہیں ہو جاتی۔“

”میرے انتظار میں نہ رہنا برادر ورنہ انتظار لمبا ہو جائے گا۔“ تقدیم نے خوش دلی سے کہا۔

”کیوں..... کیوں؟“ وہ چونک کر بولا۔

”جب تک تمام بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی میں اپنے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“

”ہیں..... ہیں۔“

”جی، جی۔“

”یہ زیادتی ہوگی ہم سب کے ساتھ..... اور اپنے ساتھ بھی۔“

”یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر میرا بھی یہ فیصلہ ہے کہ میں آپ کی شادی ہونے کا انتظار کروں گا۔“

”اجی مانے ہوئے تو ہم پیدا نشی ہیں۔“

”ملاؤ ہاتھ۔“ تقدیم نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا پھر بولی۔ ”ابھی نہیں ذرا تمہید کی شادی ہو لینے دو اور ابا ذرا وقت دیکھ کر چھوٹی پھوپھو اور پھوپا سے بات کر لیں تاکہ وہ خوش بخت کے لیے تمہاری آس میں نہ بیٹھے رہیں پھر اماں ابا سے بات کرتے ہیں ہم تمہاری منگنی کے لیے۔“ تقدیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

”ہم سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“ مونس نے کہا۔

”بھی تمہید اور اس کے دولہا کو بھی ملاؤں گی اپنے ساتھ۔ اکیلا چنا کیا خاک بھاڑ بھونکے گا۔“

”سرکار! اس اکیلے چنے کی اہمیت ہم سے پوچھیں۔ اماں، ابا جتنی آپ کی سنتے ہیں کسی کی نہیں۔“

”محبت ہے ان کی لیکن ایک بات بتا دوں تمہیں..... ہم پانچوں بیٹیاں بھی اگر اماں، ابا کے ارد گرد ان کی دل جوئی کو بیٹھ جائیں تو ان کے چہروں پر وہ خوشی اور وہ اطمینان دور دور تک نہیں دکھائی دیتا جو تمہیں دیکھ کر ان کے چہروں پر نظر آنے لگتا ہے۔ تمہید کی شادی کی تیاری تو مہینہ بھر سے چل رہی ہے لیکن جو خوشی اماں، ابا کے چہروں پر تمہارے آنے کے بعد دکھائی دی ہے پہلے نہ تھی۔“

”ہو امیں اڑنے لگوں گا۔“

”وہ تو آپ پہلے ہی اڑ رہے ہیں، مزید اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بونے بنے زمین پر پھدکتے رہ جائیں اور تم.....“

مونس مسکرا دیا اور اسی مسکراہٹ میں اسے جمائی آئی۔ ”میرا خیال ہے اب سویا جائے۔“

مونس اماں کے کمرے میں بچھے اپنے بستر پر جا پڑنے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ تمہید کی شادی کا دن کتنے انتظار کے بعد آ رہا تھا۔

☆☆☆

شام کو تمہید کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے امی کے کپڑے استری کرنے کے بعد حجاب اپنے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔ امی غسل خانے میں غسل لے رہی تھیں۔ رباب یونیورسٹی سے آنے کے بعد کھانا کھا کر قیلولہ کرنے لیٹی تھی اور سو گئی تھی۔ تقدیم کے اصرار نے امی کو شادی ہی نہیں مہندی میں بھی شریک ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مہندی والے دن امی تمام وقت تقدیم کی والدہ کے پاس ہی بیٹھی رہی تھیں۔ تقریب کے اختتام پر جب امی، رباب اور حجاب اپنے گھر واپس ہونے لگیں تو تقدیم کی والدہ نے امی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے اصرار سے کہا تھا۔

”شادی میں ضرور آنا بہن۔“ امی نے وعدہ کر لیا تھا۔

دروازے پر لگا اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبائے جانے پر اسے استری کو عموداً کھڑا کر کے خود ہی دروازے پر جانا پڑا۔

”کون؟“ اس نے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے پوچھا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔

اس نے چٹنی گرائی اور بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر کھڑے الطاف پر نظر پڑتے ہی اس کی سانس اوپر کی اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں سرتاپا سرایت کر گئی۔ اس کی دھمکیوں کے پیش نظر حجاب کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ وہ کسی نیک نیتی سے وہاں آیا ہوگا۔ اس پر نظر پڑتے ہی حجاب نے خوف کی کیفیت میں دروازہ بند کرنا چاہا مگر اس نے دروازے کے ایک پٹ پر اپنا ہاتھ دھر کر سمبٹ معکوس میں

زندگی

بھر پور دباؤ دے کر اس کی دروازہ بند کرنے کی کوشش کو نا کام بنا دیا۔ وہ متوحش ہو کر پلٹی اور اندر بھاگی۔ کون جانے کہ وہ کس ارادے سے آیا تھا۔ تیزاب کی بوتل جو اس نے اپنے کلف دار کمرے کی جیب میں چھپا رکھی ہو..... یا پھر کوئی مہلک ہتھیار جس سے وہ اس کا کام ہی تمام کرنے آیا ہو۔

”امی..... امی..... امی.....“ وہ چلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی آواز جیسے حلق میں گھٹی چلی جا رہی تھی۔

”کیا ہے..... کیا ہوا ہے؟“ غسل خانے سے امی کی تشویش میں ڈوبی آواز آئی۔

اس نے کمرے کے دروازے کی چٹنی چڑھائی اور غسل خانے کا بند دروازہ بے تابانہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

”آ رہی ہوں..... آ رہی ہوں۔ ارے کرنٹ لگ گیا کیا، کتنے دن سے سوچ رہی تھی استری کا تار بدلوانے کو۔“ غسل خانے میں امی بلند آہنگی سے بول رہی تھیں۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خوفزدہ سی وہ کمرے کے دروازے اور کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ امی غسل خانے سے اس طرح باہر نکلیں کہ ان کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور گیلے بدن پر پہنے جانے کے باعث کپڑے جا بجا نم تھے۔

”کیا ہوا؟“

”وہ..... امی..... وہ آیا ہے..... الطاف.....“ اس نے وحشت کے عالم میں بتایا۔

”الطاف! امی چونکیں۔“ کہاں؟“

”باہر..... دروازے پر..... ہو سکتا ہے اب اندر آ گیا ہو۔“ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”کو..... کون؟“ امی بھی خوفزدہ نظر آنے لگی تھیں۔

”میں ہوں، رباب۔ دروازہ کھولیں۔“ امی دروازے کی طرف بڑھیں۔

”امی ذرا دیکھ کر۔“ حجاب نے غسل خانے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

امی نے دروازہ کھول دیا۔ حجاب غسل خانے میں گھس کر دروازے کو کسی ہنگامی صورت حال میں بند کر لینے کو چوکس ہو گئی۔ جان سے مار دیے جانے سے زیادہ اسے یہ خوف تھا کہ الطاف تیزاب پھینک کر کہیں اس کا چہرہ نہ بگاڑ دے۔ اسے امی اور رباب کی سلامتی کی فکر بھی تھی مگر الطاف کا اصل نشانہ تو وہی تھی۔

”الطاف..... بھائی آئے ہیں۔“ دروازہ کھولے جانے پر اس نے رباب کو امی سے کہتے سنا۔ رباب کتنی بے وقوف تھی۔ اب بھی اسے بھائی کہہ رہی تھی۔

”کیوں؟“ امی نے پوچھا۔

”وہ..... وہ کہہ رہے ہیں بیٹھ کر کچھ بات کرنی ہے۔“

”دروازہ تو نہیں کھلا چھوڑ آئیں تم؟“

”جی..... کھلا ہے..... وہ دروازے پر جو کھڑے ہیں۔“

”کیا بات کرنے آیا ہے؟“

”مجھے کیا پتا، آپ خود پوچھ لیں۔“

”میری چادر کہاں ہے؟“

”امی..... دیکھ کر۔“ حجاب نے غسل خانے کے دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے ہدایت کی۔

”ارے..... چپ کرو تم! امی نے اسے ڈانٹا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ ”یہ ساری مصیبت

تمہاری ہی وجہ سے تو ہے۔“ حجاب کو خوف کے ساتھ ایک دکھ نے بھی آیا۔
 ملامت..... ملامت..... ملامت! اس کے نصیب میں بس ملامت ہی رہ گئی تھی۔ اس کا جی بھر آیا۔
 ”چادر دو مجھے..... کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہوں۔“ امی نے یقیناً رباب ہی کو گھر کا تھا۔ قدموں کی چاپ
 بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔

اس کی ٹانگوں میں اب مزید کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ خوف، وحشت، دکھ، امی، رباب اور خود
 اپنی بھی سلامتی کی فکر اسے نیم جاں کیے دے رہی تھی۔ یکا یک اسے اپنی خود غرضی اور بزدلی کا احساس ہوا۔ امی
 اور رباب باہر نہیں خطرے کی زد پر اور وہ..... وہ اپنا چہرہ بگاڑ دیے جانے کے خوف سے اپنی جان بچانے کی
 خاطر غسل خانے میں چھپی بیٹھی تھی..... ناگہاں الطاف کے اندر جانے کی صورت میں غسل خانے کا دروازہ اندر
 سے بند کر لینے کو چوکس! اسے..... اس کیفیت میں دیکھ کر کوئی یقین کر سکتا تھا کہ وہ ایک تعلیمی ادارے کی
 ایوارڈ یافتہ سربراہ تھی۔ بزدلی اور خود غرضی انسان کو کس قدر کمزور کر دیتی ہے اسے اپنی بزدلی پر غصہ آیا۔ خود
 غرضی پر ندامت ہوئی۔ غسل خانے سے باہر نکلی اور امی اور رباب کے پیچھے پیچھے جا پہنچی جو ہوسو ہو۔

رباب اسے بیٹھک کے دروازے کی آڑ میں کھڑی ملی۔ دروازے سے کان لگائے۔ اس کے قدموں کی
 چاپ سن کر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ حجاب نے امی کی بابت پوچھنا چاہا لیکن رباب نے اپنے ہونٹوں پر انگلی
 رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا اور ساتھ ہی آگے بڑھ کر دروازے سے کان لگا دینے کا بھی۔
 دروازے کی جھری سے اس نے الطاف کو بیٹھک میں امی کے روبرو بیٹھے دیکھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں
 آن لگا..... ”اگر وہ امی کو کوئی نقصان پہنچا کر بھاگ گیا تو؟“

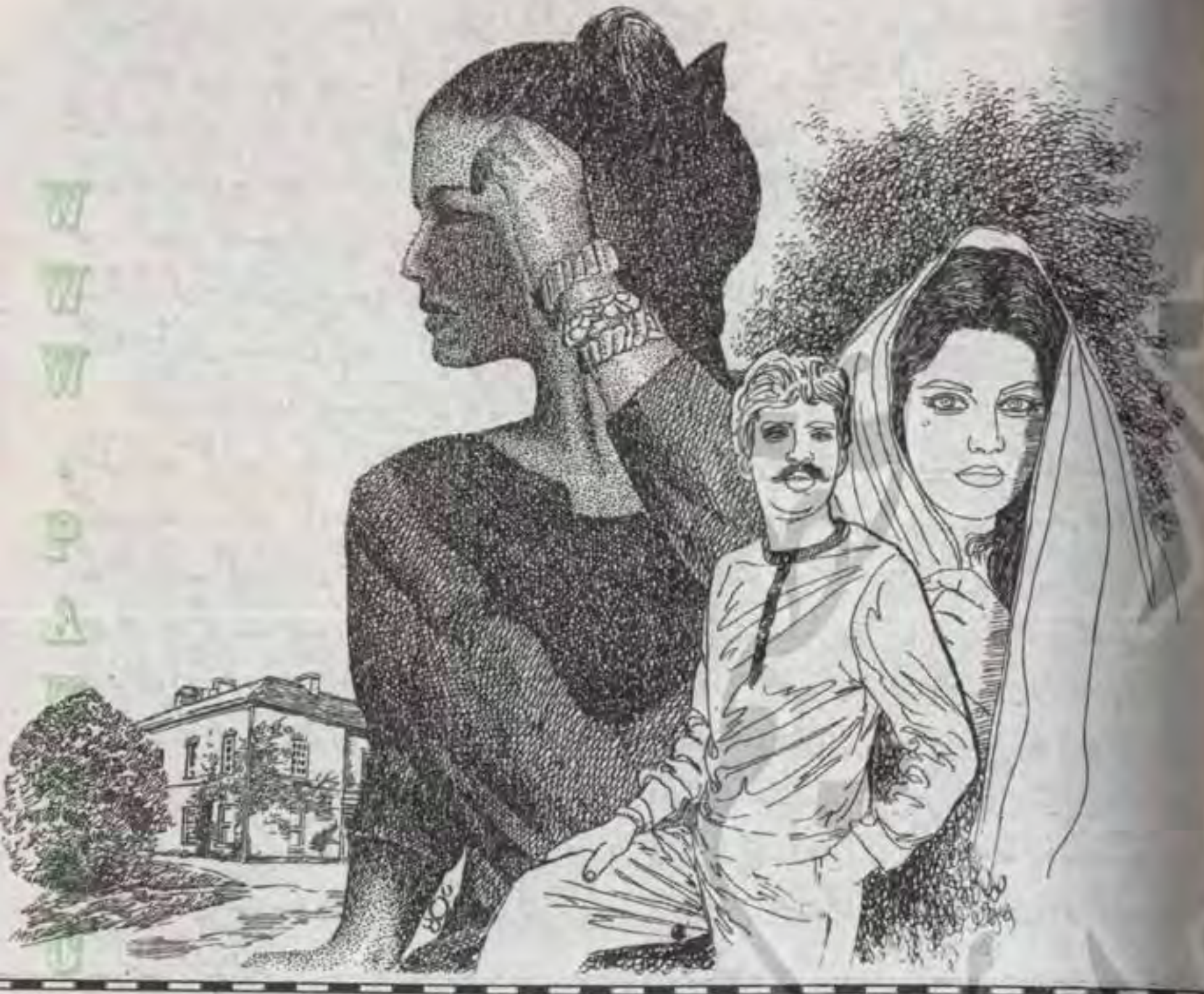
”آپ کی بیٹی سے اب میرا کوئی رشتہ نہیں رہا۔“ الطاف کہہ رہا تھا۔ ”اس لفافے میں طلاق نامہ ہے اور
 مہر کا چیک۔ شریعت کی رو سے نصف مہر دینا واجب تھا اور اس سے زائد مستحب۔ میں نے نکاح کے موقع پر جو
 کچھ چڑھایا کچھ واپس نہیں لینا چاہتا۔ عدالت میں جو کچھ ہوا میرے وکیل نے جو بے بنیاد باتیں کیں مجھے اس کا
 افسوس ہے۔ مقدمہ جیتنے کے لیے عدالتوں میں اکثر یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال مجھے افسوس ہے اور اخبار
 میں جو کچھ چھپا اس سے حجاب کو، آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو جو تکلیف پہنچی اس کی بھی معذرت
 چاہتا ہوں۔“ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

امی اس کا دیا ہوا لفافہ ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھیں۔
 ”خدا حافظ۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ حجاب اور رباب الٹے قدموں انتہائی سرعت سے دروازے
 کی اوٹ سے ہٹ کر اندر لپکیں اور حجاب برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے سینے
 پر تھا اور دل کی دھڑکنیں بے قابو!

گھر کے باہر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز سنائی دی اور گاڑی تیزی سے گلی میں آگے نکل گئی۔ امی اندر
 آئیں ان کے ایک ہاتھ میں لفافہ تھا دوسرے میں ایک پکا کاغذ جس کے کونے پر ایک چیک بھی دھکی دے رہا تھا۔
 ”حجاب! یہ تو معجزہ ہو گیا۔ وہ خود طلاق نامہ پہنچا گیا ہے۔“ امی کہہ رہی تھیں۔

حجاب پورے ہوش و حواس میں امی کو دیکھ رہی تھی مگر ان کی آواز اسے خواب و خیال کی دنیا سے سنائی دیتی
 لگ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)



ٹوٹا لاسٹ

سکینس

اس بار اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ
 بھی ہو جائے وہ سائرہ کے پاس اسلام آباد ضرور
 جائے گی۔

corporate sector میں نو سے
 پانچ کی تھکا دینے والی جاب..... اوپر سے باس کی
 مہربانی کہ کبھی وقت پہ اٹھنا نصیب نہیں ہوتا تھا، باس
 کو ہمیشہ اشد ضروری کام ٹھیک پونے پانچ بجے ہی یاد
 آتا تھا اور وہ دل ہی دل میں کس کے رہ جاتی.....

”دراصل میرے ہسپتال اور بچے بھی ان دنوں گھر پر نہیں ہوں گے، صرف ایک ہفتے کی تو بات ہے، کلوزنگ میں تو ابھی ٹائم ہے میں واپس آ کر سب دیکھ لوں گی، ابھی میرے لیے یہ بہتر ہے کہ.....“ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اچک لیا گیا۔ ”مجھے آپ کی بہتری دیکھنے سے زیادہ ادارے کی بہتری دیکھنی ہے۔“ لہجہ اب خونخوار ہو گیا تھا۔ وہ کسی گری پڑی پوسٹ پر کھیاں نہیں مار رہی تھی سینئر منیجر تھی، باس کی بات سے زیادہ اس کا لہجہ اسے تپا گیا..... اس نے خود پر بہ مشکل کنٹرول کیا۔ ”یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں سر، میں اس ادارے میں پچھلے پندرہ سالوں سے ہوں اور میں نے بھی ہمیشہ یہاں کی بہتری چاہی ہے.....“ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”ہا..... کرتے کیا ہیں آپ لوگ..... میں اگر ہر چیز پر نظر نہ رکھوں تو یہ ادارہ تو کب کا زمین بوس ہو چکا ہوتا، جب کام کا وقت آتا ہے سارے بہانے بنا بنا کر ادھر ادھر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جائیں بی بی میرا وقت برباد نہ کریں اپنا کام کریں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ انہوں نے کچھ اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں جاؤ بابا معاف کرو..... اور دفع ہو جاؤ۔

کئی برسوں کا جما جمایا صبر کا پیمانہ ایک دم چھلک اٹھا۔ قسمت کی خرابی ہو تو چیزیں خود بخود بگڑنے لگتی ہیں، ہوا ایک دم مخالف سمت چلنا شروع ہو جاتی ہے، باس جو پہلے ہی کر رہا تھا شاید بیوی سے لڑ کے آیا تھا جو فی الوقت نیم چڑھا بھی ہو رہا تھا اور عازرہ اپنی روٹین بھگتاتے ہوئے زندگی سے بیزار ہوئی بیٹھی تھی۔

”میں کوئی ناجائز مطالبہ نہیں کر رہی ہوں..... میری چھٹیاں ڈیو ہیں اور مجھے ابھی ان کی ضرورت ہے۔“ غصے میں وہ دلیر ہو گئی اور دو ٹوک انداز میں بولی۔

جاتے..... رات گئے واپسی ہوتی اور اس کا تھکن سے برا حال ہوتا۔

اگلے دن سے پھر وہی امتحان شروع..... اسے چھٹی کی واقعی ضرورت تھی اور باس چھٹی دینے کے معاملے میں تو مہا کنجوس..... اس نے فقط ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دی جو نا منظور ہو گئی۔ پورے چار مہینوں تک لگاتار بغیر کسی چھٹی کے مسلسل گدھوں کی طرح کام کرنے کے بعد اس نے یہ جسارت کی تھی۔ اس سے پہلے بھی کسی اشد ضرورت کی وجہ سے فقط ایک دو دن کی چھٹیاں ہی لی تھیں۔ ایک ہفتے کی عیاشی کا سوچنا تو اس کے اپنے خواب و خیال میں بھی نہ ہوتا اگر صورت حال اپنی موافق نہ بن جاتی۔

عاشراپنی کمپنی کی طرف سے کسی آرڈر کی بٹنگ کے لیے جاپان جا رہا تھا پورے پندرہ دنوں کے لیے اور سعد اور فہد اپنے اسکول کی طرف سے چھٹیوں میں نادرین ایریا کے ٹرپ پر جا رہے تھے، ان کا پروگرام دس دنوں کا تھا۔ اتنا اچھا موقع اسے کب ملتا کہ وہ بھی اپنی تھکن اتار لیتی، اس کا سائرہ کے سوا اور تھا بھی کون جسے وہ میکے کا نام دیتی۔ سائرہ سے ملے دو سال ہو رہے تھے اتنا لمبا وقفہ دونوں بہنوں کی ملاقات میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی جاب سے مجبور تھی تو سائرہ اپنی گھریلو ذمے داریوں میں ابھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی تھی اس لیے اس کی ذمے داری زیادہ تھی۔

”میں ضرور جاؤں گی.....“ اس نے پکا ارادہ کر لیا۔

”دیکھیں سر میرا جانا بے حد ضروری ہے.....“ اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجا کے کہا۔

”کیا ضروری ہے مسز عاشرا یہ فیصلہ مجھے کرنے دیں، کلوزنگ کا ٹائم قریب ہے اس لیے آپ کا آفس میں ہونا ضروری ہے۔“ باس کا لہجہ حسب معمول سخت تھا۔

مخصوص تھا۔ وہ گھر کو میڈیہ چھوڑ کے جانے کی قائل نہیں تھی اس لیے ممتاز بی بی روز صبح ساٹھ بجے اس کے گھر آتی اور اس کے آفس کے لیے نکلتے ہوئے ضروری کام نبٹا کے اس کے ساتھ ہی نکل جاتی۔

اتوار کے دن اسے الگ سے پیسے دے کر بلوایا پڑتا تھا اور وہ آ کے بہت سے کام کر جاتی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا ورنہ اس کے پاگل ہو جانے میں کوئی کمی نہ رہ جاتی۔

عاشرا کو روپیہ اس کی لیے مزید جھنجھلاہٹ کا سبب تھا۔ وہ مردوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جنہیں اپنی ذات کے سوا دوسری چیزیں مشکل ہی سے نظر آتی ہیں۔ وہ عجیب شخص سا آدمی تھا۔ جسے کسی چیز سے کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ کچھ بے پروا، کچھ بے حس اور تھوڑا سا کاہل بھی..... اس کے آگے بڑھ کر ڈٹے داریاں اٹھانے پر عاشرا غیر محسوس طریقے پر ریلیکس ہوتا چلا گیا۔ وہ نوکری کر رہا تھا، عازرہ کے لیے یہ احسان ہی بہت تھا..... دوسرا احسان وہ اتوار کے اتوار اس پر کرتا.....

خوب دیر تک سونے کے بعد، اپنا پسندیدہ برنج کر کے اخبارات کی سرخیاں ملاحظہ کرنے کے بعد ایک کام وہ بڑی دلجمعی سے کرتا تھا اور وہ تھا اپنی گاڑی کی دھلائی۔

اپنی ”سٹی“ چکانے کے بعد وہ اس کی ”کورے“ پہ بھی نظر کرم کرتا اور اسے بھی دھو ڈالتا..... پورے ہفتے میں اسے عاشرا پر اس لمحے جی پیار آتا۔

”غنیمت ہے اگر نہ کرتا تو کیا اس سے کوئی یہ کام کروا سکتا تھا؟“ وہ سوچتی اور اس کی مشکور ہو جاتی۔

اتوار کی شام بچوں کے لیے مخصوص تھی..... گروسری کی خریداری کے بعد وہ لوگ بچوں کی فرمائش پہ کہیں آؤٹنگ یا کھانے پینے کے لیے نکل

آفس سے نجات ملنے کے بعد بھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوتی تھی۔ کراچی کی دل دہلا دینے والی ٹریفک میں خود ڈرائیو کر کے گھر واپس آنا بھی اتنا آسان نہیں تھا مگر وہ یہ سب کر رہی تھی اور اسے کرنا ہی تھا..... خود کو منوانے اور اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے شوق میں شروع کی جانے والی ملازمت اس کے گلے کا طوق بن کے رہ گئی تھی۔

زندگی کچھ اس ڈھب پہ رواں ہو گئی تھی کہ لگی بندھی ایک معقول رقم سے ہاتھ دھونا اس کے بس میں نہیں رہا تھا..... گو عاشرا کی جاب کافی اچھی تھی لیکن گھر کے اخراجات بھی آسان کی طرف گامزن تھے..... سعد اور فہد شہر کے ایک مہنگے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ان کی تعلیم، پرورش اور سب سے بڑھ کر اس دور کے دیگر بچوں کی طرح ان کی بے لگام ہوتی خواہشات کے لیے یقیناً رقم کی ضرورت تھی۔ اب قدم پیچھے ہٹانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکنے کے باوجود وہ کسی مشین کی طرح مسلسل مصروف عمل تھی۔

آفس میں سب سے زیادہ زہرا سے اپنا باس اور اس کا روپیہ لگتا تھا۔ انتہائی سخت گیر اور ماتحتوں کی عزت نہ کرنے والا شخص اس کے لیے ناقابل قبول تھا مگر وہ اس کی عزت کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا حکم ماننے کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی کی معمولی سی غلطی کو بھی اگتور کرنے کا عادی نہیں تھا اور عازرہ کو انتہائی محتاط رہ کر کام کرنے کے باوجود کڑوی کیسی سنے کو مل جاتی جس پر اس کے تمام بدن میں آگ لگ جاتی لیکن اسے مسکرا کے ضبط کرنا پڑتا تھا۔

ہر ورکنگ وومن کی طرح اس کے لیے بھی اتوار یوم نجات تھا..... مگر ہفتے کے چھ دنوں کی تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود اسے اتوار کے دن بھی سکون نصیب نہیں تھا۔ یہ دن ہفتے بھر کی لاٹری، کوکنگ اور گروسری کی خریداری کے لیے

شاک کی سی کیفیت میں چلا گیا۔ سائرہ نے اس وقت اپنا ایف ایس سی کلیئر کر لیا تھا اور وہ ڈاکٹر بننے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن بابا کے بعد ممانے ایک دم ہمت ہار دی۔ عافیہ خالہ نے اپنے لاڈلے بیٹے عرفان کے لیے جھولی پھیلائی اور ممانے کھٹ سائرہ کو اس جھولی میں ڈال دیا۔ سائرہ کی شادی تک سب کے دل بابا کی جدائی کے آفریں شاخس کے زیر اثر رہے پھر رفتہ رفتہ سکون آ گیا اور ممانے کو تو ایسا آیا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ عافیہ خالہ خود بیاہ کے اسلام آباد گئی تھیں سالوں سے وہیں مقیم تھیں۔ ان کے شوہر کی وہاں کے نواحی علاقے میں زمینیں اور فارم ہاؤسز تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ اب

آف ہو گیا تھا۔ بچے اپنے ٹرپ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اس خبر سے تھوڑے سے چونکے مگر پھر ہارل ہو گئے تھے۔ یہ مسئلہ ان کی سوچوں سے بڑا تھا۔ بچوں کے ساتھ اس کا وقت بھی بہتر گزر رہا تھا۔ لیکن چند دنوں ہی میں وہ بوریت محسوس کرنے لگی۔ عاشر کا رویہ بھی قدرے کھنچاؤ لیے ہوئے تھا اس کا دل انجانے اندیشوں اور واہموں کا شکار ہونے لگا۔ عاشر کی روانگی سے پہلے اس کا موڈ تدریجاً بہتر ہو گیا تھا۔ جاب کرنے والی خواتین کے شوہر عموماً سمجھدار ہوتے ہیں۔ انہیں طبیعتاً ضرورتاً یا مجبوراً انڈر اسٹینڈنگ کا مظاہرہ کرنا ہی پڑتا ہے ورنہ۔۔۔۔۔ خیر جاتے ہوئے وہ اسے اپنے ڈیوڑھی کلیئر کروانے اور کسی دوسری جگہ اپلائی کرنے کا مشورہ دے گیا۔۔۔۔۔ بچے بھی اپنے ٹرپ پہ اگلے دن روانہ ہو گئے۔ اب وہ بھی اور خالی گھر۔۔۔۔۔ سب کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پہلی فلائٹ سے اپنی اسلام آباد کے لیے بکنگ کروائی۔

جس مقصد کے لیے اتنا کچھ جھیل لیا اب کم از کم وہ تو پورا ہو جاتا۔۔۔۔۔ جانے سے پہلے اس نے اپنے اور سائرہ کے لیے شاپنگ کی، خوب اچھا سا فیشن کروایا اور فریش ہو کر جانے کو تیار ہو گئی۔ پہلے تو صرف ہفتے کا سوچا تھا اب دس دنوں کا پروگرام بن گیا۔ سعد، فہد بارہ دنوں کے بعد آنے والے تھے۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ اس نے ذہن کو ساری الجھنوں سے آزاد کرنے کے لیے اپنی سوچوں کا رخ اپنی بہن کی طرف موڑ لیا۔

سائرہ اس سے چھ برس چھوٹی تھی۔ اس کی شادی ماسٹر مکمل ہونے کے بعد ہوئی تھی اور اگلے ہی سال سعد اور فہد دونوں اس کی زندگی میں ہلچل مچانے لگے چلے آئے۔۔۔۔۔ اور اس کے اگلے برس بابا اچانک اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ سارا خاندان ایک

پچھلے پندرہ سالوں سے محنت کر رہی ہوں اور عزت چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اتنی بے عزتی میں برداشت نہیں کر سکتی، بہت ہو گیا۔۔۔۔۔ اس شخص کی بکواس اور نہیں سن سکتی، میں کوئی اس کی زرخیز نہیں ہوں۔ جاری ہوں، خود ہی استغنی دے دوں گی۔۔۔۔۔ نہ رہے نوکری، مجھے اس کی پروا نہیں۔ وہ بکیتی جھکتی اپنا بیک اٹھا کر۔۔۔۔۔ آفس سے باہر آ گئی۔۔۔۔۔ غصے کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو ایک تو اترے ابلے چلے آ رہے تھے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر رو رہی تھی۔ اس نے کئی بار اپنا چہرہ صاف کیا مگر آنسو بہے چلے جا رہے تھے، وہ جھنجھلا گئی۔

نہ جانے اسے اپنی ذلت کا دکھ تھا یا اتنی پرانی نوکری چلے جانے کا صدمہ۔۔۔۔۔ لاشعوری طور پر نہ چاہنے کے باوجود وہ روئے جا رہی تھی۔ مجبوری کا مطلب ٹوٹل لاس نہیں ہونا چاہیے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے عاشر کو میج کیا۔

”میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔“
”کیوں۔۔۔۔۔ کیا تم پاگل ہو؟“ عاشر کا فوراً جواب آیا۔ وہ ابھی اس میج سے ”لطف اندوز“ ہی ہو رہی تھی کہ اس کا دوسرا میج بھی آ گیا۔
”ابھی میٹنگ میں ہوں، تھوڑی دیر تک کال کرتا ہوں۔“ اسے عاشر کے میج ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کال کر کے کیا کہنے والا ہے۔ وہ اسٹیمپنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس بار وہ اپنی خواہش سے رو رہی تھی۔

☆☆☆

جہاز میں بیٹھنے کے بعد سیٹ بیلٹ باندھ کے اس نے سیٹ کی پشت سے سرٹکا کے آنکھیں موند کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے ایسے ہی سکون کی ضرورت تھی۔ پچھلا پورا ہفتہ اس کی زندگی کا بے سکون ترین ہفتہ تھا۔ اس نے واقعی جاب چھوڑ دی تھی۔ عاشر کو اس پر اعتراض تھا اور اس کا موڈ

”چھٹی نہیں ملے گی۔“ باس کا استحقاق مجروح ہونے لگا۔۔۔۔۔ دونوں طرف آگ برابر کی تھی۔
”میں ضرور جاؤں گی۔۔۔۔۔“ اس نے نتیجے سے بے پروا ہو کے باس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
”گیٹ لاسٹ۔۔۔۔۔“ باس جواب دہاڑے۔
”مائی فٹ۔“ اس کے جواب میں عاشر نے چیخ کر کہا۔

”میں تمہیں سپینڈ کروادوں گا۔۔۔۔۔“ باس کی آنکھیں ابل پڑیں۔
”میں خود تم پہ اور تمہارے ادارے پر تھوکتی ہوں۔۔۔۔۔ میں نے اپنی زندگی کے پندرہ سال یہاں برباد کیے میری غلطی تھی۔۔۔۔۔“ وہ حلق کے بل دہاڑی۔۔۔۔۔ دونوں آپ سے تم پر آ گئے۔
”اوہ یو۔۔۔۔۔“ باس آدھا جملہ کہہ کر کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

یہی وقت تھا جب اس کے کولیگز گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

”سیم ٹو یو۔۔۔۔۔“ اس نے انگلی سے باس کی طرف اشارہ کیا گویا انگلی نہ ہو بلکہ بھالا ہو جو سیدھا باس کی آنکھوں میں گھس کے اسے پھوڑنے والا ہو۔
”مسز عاشر پلیز۔۔۔۔۔ کام ڈاؤن۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو، خود کو سنبھالیں۔“ وقار صاحب گھبرا کے اس کی طرف بڑھے۔

”سر پلیز، پانی پیئیں۔۔۔۔۔“ ساجد نے پانی کا گلاس باس کی طرف بڑھایا جسے باس نے پوری قوت سے جھٹکتے ہوئے زور سے کہا۔

”گیٹ لاسٹ آل آف یو۔“
”بھاڑ میں جاؤ۔“ عاشر تن فن کرتی ہوئی وہاں سے باہر آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے سارے کولیگز بھی۔۔۔۔۔ سب کی زبان یہ ایک ہی سوال تھا، کیا ہوا۔۔۔۔۔ کوئی پوچھ رہا تھا کوئی سمجھا رہا تھا۔
”میں مجبور ہوں مگر اتنی زیادہ بھی نہیں۔۔۔۔۔“

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR of U. A. E
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O. Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Web site: www.welbooks.com

تسلی

اُداسی تیری آنکھوں کی
بہت سے راز کہتی ہے
ہنسی ہوتی ہے ہونٹوں پر
نظر اس پار ہوتی ہے
نہیں ہوتا وہاں کچھ بھی
فقط اک آس ہوتی ہے
پچھڑ کر جو گئے ہم سے
وہ ہوں شاید وہاں پر ہی
شبیبہ ان کی نظر آئے

ذرا یہ دھند جو ہٹ جائے
زمین و آسمان کے بیچ
کہیں تو وہ بھی دنیا ہے
پچھڑ کر لوگ جاتے ہیں
کبھی نہ لوٹ آنے کو
بتادیں کاش وہ اتنا
نہیں ہم یاد اب ان کو
تسلی خود کو دے لیں گے
سکوں سے ہم بھی جی لیں گے

شاعرہ: خالدہ نسیم، یو کے

ہے تو سو جاتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”پہلے باتیں کریں گے اور پھر باتیں کرتے
کرتے سو جائیں گے۔“ وہ ہنسی۔۔۔۔۔ بہن سے مل کر
بہت خوشگوار احساس ہو رہا تھا، اسے اپنی ساری
پریشانیاں ہوا میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

دودن تو آرام اور خوش گپیوں میں ایسے گہم گئے
کہ پتا ہی نہیں چلا۔ وہ سارہ، اس کے بچوں اور خالہ،

اسے تین سالوں کے بعد دیکھ رہی تھی۔
”افوہ۔۔۔۔۔“ وہ دل ہی دل میں خائف ہو گئی۔
”یہ تو بالکل وڈیرا لگنے لگا ہے۔“ سب اسے اصرار کر
رہے تھے اور وہ کھانے سے زیادہ لوازمات
دیکھ دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی۔
کھانے کے بعد تھوڑی دیر سب کے ساتھ بیٹھ
کر وہ گیٹ روم میں چلی آئی۔ کشادہ بیڈ روم، میں
جہاز سی سائز کا قیمتی بیڈ موجود تھا۔ کمرے کا انٹیریئر
لا جواب تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ پریوں کے دیس
میں چلی آئی ہو۔ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی اور
سارہ اندر چلی آئی۔

”کچھ چاہیے تو نہیں۔“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔
”اگر تم بوتل کا جن ہو تیں اور یہ سوال پوچھتیں
تو میں کہتی میرے میاں اور بچوں کو بھی اس جنت میں
بلواد صرف انہی کی کمی ہے یہاں۔“ وہ ہنسی۔
”ان کو تو بلوانا میرے بس میں نہیں البتہ میں
خود آگئی ہوں، تمہارے ساتھ سوؤں گی آج۔“ وہ
بیڈ پر بیٹھتے ہوئے مسکرائی۔

”شوق سے سوؤ مگر تمہارے میاں۔۔۔۔۔“ وہ
قدرے حیرانی سے بولی۔

”وہ جا چکے ہیں۔“ وہ پھر مسکرائی۔
”ہائیں۔۔۔۔۔ ابھی آئے تھے اور چلے بھی
گئے۔۔۔۔۔“ وہ حیرت زدہ سی بولی۔

”ان کی روٹین ایسی ہی رہتی ہے۔۔۔۔۔ آج صبح ہی
جہلم گئے تھے، شام میں آئے اور اب زمینوں پر چلے
گئے ہیں، ایک آدھ دن میں آجائیں گے۔“ وہ
طمینان سے نیم دراز ہو کے بولی۔

”چلو اچھا ہے۔۔۔۔۔ ہمیں موقع مل گیا۔۔۔۔۔ اب
ہم دونوں خوب باتیں کریں گے۔“ سارہ نے
خوش ہو کر کہا۔

”لیکن اگر تم تھکی ہوئی ہو اور تمہیں نیند آرہی

سے سچی ہوئی، خوشیوں میں نہائی ہوئی، جسم پر مہکا
برانڈ ڈسوت، سارہ کی مسکراہٹ اس کی آسودگی کا پتہ
دے رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔
سارہ کی ہمراہی میں اس کی لینڈ کروزر میں
بیٹھے ہوئے ایک لمحے کو اس کے ذہن میں خیال
آیا۔۔۔۔۔ زندگی یہی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ نہیں کہ ذرا ذرا
سی بات پر نکلے نکلے کے لوگوں کی بکواس سنی جائے
اور اپنی مرضی سے انسان جی بھی نہ سکے۔۔۔۔۔ سارہ
کے باادب ڈرائیور نے گاڑی اشارٹ کی اور وہ ہوا
کے دوش پر گامزن ہو گئی۔

اسلام آباد کے نکھرے نکھرے پُر فضا ماحول اور
دلکش نظاروں نے کراچی کی دھول اڑاتی ہوئی
سڑکوں کو چند لمحوں کے لیے بھلا دیا۔

سارہ کا گھر شہر کے پوش علاقے میں تھا۔۔۔۔۔
یہاں عموماً غیر ملکی سفرا کی رہائش گاہیں تھیں۔
وہ ہنسی خوشی بہن کے عالیشان گھر میں داخل ہوئی
تو اسے ایک لمحے کو اپنے لگژری فلیٹ کی یاد آئی۔۔۔۔۔
اچھے خاصے علاقے میں واقع ٹھیک ٹھاک کشادہ اور
آسانٹوں سے مزین۔۔۔۔۔ سجا سنورا فلیٹ اس گھر کے
سامنے ڈول ہاؤس لگ رہا تھا۔ وہ یہاں پہلے بھی آچکی
تھی لیکن جب بھی آتی ایسے ہی مسمرائز ہو جاتی۔

خالہ خالو بہت محبت سے ملے کہ عازنہ کے
ذہن میں ماں باپ کی یاد تازہ ہو گئی اور اس کی
آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔

رات میں اس کے اعزاز میں شاندار عشاء دیا
گیا۔ عرفان بھی واپس آچکا تھا اس سے اچھی طرح
ملا۔۔۔۔۔ عرفان کی شخصیت سے وہ خواہ مخواہ مرعوب
ہو گئی۔۔۔۔۔ لمبا تو وہ پہلے سے تھا اب چوڑا بھی ہو چکا
تھا۔ اس کا لیا دیا انداز اب شاہانہ کردار میں تبدیل
ہو چکا تھا۔ چہرے پر نوکیلی مونچھوں کا اضافہ ہو چکا
تھا جو اس کے رعب میں اضافہ کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ

سارہ کو بھی وہیں رہنا تھا۔ سو دونوں بہنیں شمالی اور
جنوبی سمتوں میں بکھر کے رہ گئیں۔

ان دوریوں کے باوجود عازنہ، سارہ کی
طرف سے بے فکر تھی۔ اسے بچپن اور نوجوانی کا
عرفان اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اس کا ہم عمر تھا مگر کافی
لیے دیے رہتا تھا۔۔۔۔۔ اسے وہ سیدھا سادہ اور کم گو لگتا
تھا۔ سارہ بھی تو بہت سادہ تھی۔ شادی کے تیرہ
برسوں میں وہ پانچ بچوں کی ماں بن گئی۔ اسے سارہ
کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ زندگی کے سارے رنگ
اس کے لیے خوشنما تھے اور کیا چاہیے تھا! سارہ اس
کے آنے کی خبر سن کے بہت خوش تھی۔ اس کی شدت
سے منتظر تھی۔ دونوں بہنوں نے فون پر ہی بہت
سارے پلان بنا لیے تھے۔ مری، نتھیا گلی، بھور بن
تک جانے کا پروگرام بن گیا۔۔۔۔۔ عازنہ ان دنوں کو
اچھی طرح انجوائے کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ پھر دوبارہ
موقع ملے نہ ملے۔۔۔۔۔ زندگی پر اس کا بھی تو حق
تھا۔۔۔۔۔ حالات سے لڑ کر اپنے حصے کی خوشی حاصل
کرنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔۔۔۔۔ اس کے ذہن میں
جب بھی باس کی حیرت زدہ سڑیل سی صورت گھومتی
اسے بے اختیار ہنسی آ جاتی۔۔۔۔۔ کم از کم عازنہ سے اس
بد تمیزی کی توقع ہر گز نہیں رہی ہوگی۔۔۔۔۔ جیسی کرنی
وہی بھرنی۔۔۔۔۔ وہ خود کو تسلی دیتی۔

انٹرویوٹ پہ سارہ اور بچے اس کے منتظر
تھے۔۔۔۔۔ اس نے بہن اور بھانجے بھانجیوں کو خوب
لپٹا کے پیار کیا۔

”عرفان۔۔۔۔۔؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے
ادھر ادھر دیکھا۔

”جہلم گئے ہیں کسی کام سے، رات تک
آجائیں گے۔“ سارہ مسکرائی۔

خوب صورت تو وہ ہمیشہ کی تھی۔۔۔۔۔ اب اور
زیادہ ہو گئی تھی۔ البتہ وزن کچھ بڑھا لیا تھا۔ سونے



نئے سال 2013 کے
پہلے شمارے کی دل آویزیاں

اولین صفحات کی رونق

ایک بیوی کی گمشدگی کا پراسرار معاملہ
احمد اقبال کے شراب قلم کی تابانیاں

سرورق کی کہانیاں

نئے سال کا پہلا اچھوتا سرورق..... آپ کی پسندیدہ
مصنف **مریم کے خان** کی تحریر

اور

پر خارا ہوں پر چلنے والوں کا عبرت انگیز ناچرا.....
نواب صاحب کے قلم کی نشر انگیزیاں

سحر

انگریز سلسلے

لکار..... بدلتے ماحول اور گرجتے دشمنوں کی لاکڑیاں
طاہر جاوید مغل کا معرکہ..... ایک نئی ذکر
پکا مزہ اسما قادری کا سلسلہ گرداب

نیو اثر فول

جلیل اور راجا کی ہمراہی میں ایک اور ہنگامہ
شکو کی شوخیاں..... اماں کی دھمکیاں

مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ

مغربی دنیا کے رسم و اطوار..... معاشرت و تغیرات
کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد ترجمہ کہانیاں

جنوری 2013ء

تھا..... وہ اندر ہی اندر بہت پُر جوش ہو رہی تھی۔
رات کے کھانے کے بعد سائرہ اس کے ساتھ بیڈ
روم میں چلی آئی تو عائرہ کو خواہ مخواہ ہنسی آگئی۔
”بھئی کچھلی کئی راتوں سے تم میرے ساتھ
سو رہی ہو مگر آج تمہارے میاں صاحب تشریف
لائے ہیں اس لیے تم اپنے قیام و طعام کا بندوبست
اپنے کمرے ہی میں رکھو۔“
”نہیں، میں تمہارے پاس ہی ٹھیک ہوں۔“
وہ مسکرائی۔

”کیا لڑ کر آئی ہو.....؟“ عائرہ ہنسی
”نہیں..... نہیں تو۔“ وہ ایک دم گھبرا
گئی۔ عائرہ کو اس کا گھبرانا عجیب سا لگا۔
”تو پھر جاؤ..... عرفان بھائی تمہارے منتظر
ہوں گے۔“ سائرہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر کمرے
سے باہر نکل گئی۔ سائرہ کے جانے کے بعد اس کی نظر
بیڈ کے سائڈ ٹیبل پر گئی..... وہاں سائرہ کا موبائل
فون رکھا ہوا تھا۔

”لو..... محترمہ یہ بھول کے چلی گئیں۔“ اس
نے موبائل ہاتھ میں اٹھا کے بغور دیکھا۔ ستراتی ہزار
ایلیٹ کے اس فون کو اس نے نیٹ پر سرچنگ کے
دوران کئی بار دیکھا تھا اور ہر بار یہی سوچا تھا کہ وہ
کون لوگ ہوتے ہوں گے جو اتنا مہنگا موبائل فون
استعمال کرتے ہوں گے۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کی
اپنی بہن ان خوش نصیب لوگوں کی فہرست میں شامل
تھی۔ وہ مسکرا کے اٹھی اور موبائل لے کر کمرے سے
باہر نکلتے ہوئے ایک بار سوچا..... ”یہ وہ خوش نصیب
گھر ہے جہاں زندگی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ
گر ہے۔“ یہاں گزرا رہے ہوئے دنوں میں اسے
نہ تو اپنے کھڑوس باس سے ہونے والی جھڑپ یاد آئی
نہ اپنا ٹھس شوہر..... نہ بیوی ٹریفک میں ٹینشن کی
حالت میں گاڑی ڈرائیو کرنے کا خیال آیا، نہ گھر کی
فکریں سر پر سوار ہوئیں..... وہ زندگی کی ہر الجھن

ہوئے گود میں اٹھا کے کہا۔
اس کے بعد اگلے تین چار دن اسلام آباد کا چٹا
چٹا گھومنے اور شاپنگ کرنے میں یوں گزرے کہ بچہ
بھی نہیں چلا۔
”آف وقت اتنی تیزی سے گزر رہا ہے اور
تمہارے میاں صاحب کا کچھ پتا نہیں..... کہاں
غائب ہو گئے ہیں وہ..... لگتا ہے مری کا پروگرام
جانے گا۔“ وہ خریدے ہوئے سامان کو بیگ میں
ٹھونستے ہوئے بولی۔

”تمہارے لیے خوشخبری ہے۔ وہ آج شام
واپس آرہے ہیں۔“ سائرہ نے اسی اطمینان سے
جواب دیا۔
”پھر تو اس خوشخبری کے ساتھ مٹھائی کھلاؤ۔“
اس نے بہ مشکل بیگ کی زپ بند کی۔ سائرہ جواباً
مسکراتی رہی۔
عائرہ نے نوٹ کیا تھا کہ سائرہ نے بولنا کم اور
مسکراتا زیادہ شروع کر دیا تھا۔
”یہ سب بیگانہ انداز ہیں بھئی! اس نے خود کو
تسلی دی۔

☆☆☆

عرفان سر شام ہی واپس آ گیا تھا۔ اس نے
نپے تیلے انداز میں اپنی غیر حاضری کی معذرت
چاہی..... عائرہ چاہنے کے باوجود اس سے کوئی ہنسی
مذاق اور جملے بازی نہیں کر سکی..... فقط مسکراتی
رہی..... ہو سکتا ہے واقعی کوئی مسئلہ ہو گیا ہو، اس نے
عرفان کے چہرے کو بغور دیکھا جس پر اطمینان اور
آسودگی موجود تھی۔

عائرہ نے نوٹ کیا کہ ملازمین کی موجودگی کے
باوجود سائرہ عرفان کے چھوٹے موٹے کام اپنے
ہاتھوں سے کر رہی تھی۔
وہیں بیٹھے بیٹھے مری اور گلیات کا پروگرام بھی
فائل ہو گیا..... صبح دس بجے نکلنے کا پروگرام بنا

خالو کی کمپنی میں بہت خوش تھی۔ سعد اور فہد سے بھی
روزانہ بات چیت ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں بھی اپنے
ٹرپ کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ اطمینان اور خوشی
نے اس کی بھوک بڑھا دی تھی یا اسلام آباد کے پانی
میں کوئی ایسی تاثیر تھی کہ وہ خوب کھانے لگی تھی۔

”ارے باپ رے..... اگر یہی حالات رہے
تو میں تو یہاں سے خوب موٹی ہو کے واپس جاؤں
گی۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔
”بیٹھی بیٹھی کھاؤ گی تو یقیناً ایسا ہی ہوگا..... چلو
آؤ ٹنک کا پروگرام رکھتے ہیں۔“ سائرہ نے تجویز
پیش کی۔

”سوچا تو تھا مگر پھر خیال آیا کہ عرفان تو
آجائیں..... بھئی کہاں رہے گئے تمہارے میاں۔“
وہ فوراً بولی۔
جواب سائرہ کے بجائے خالہ کی طرف سے آیا۔
”تمہارے خالو نے تو زمینوں کے معاملات
سے اب کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، دل کی بیماری نے
ان کو زیادہ بھاگ دوڑ کے قابل ہی نہیں رکھا.....
اب سارے کام عرفان ہی سنبھالتا ہے، بے چارہ
اسی چکر میں یہاں وہاں ہوتا رہتا ہے۔“

”اوہ.....“ اس نے سر ہلایا۔
”زمینوں کے سو بکھیرے ہوتے ہیں، پھنس گیا
ہوگا کہیں..... آجائے گا ایک آدھ دن میں.....
تمہارے آنے کا سن کر تو بہت خوش ہوا تھا۔“ خالہ
نے صفائی پیش کی۔

”جی بالکل.....“ اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔
”چلو دامن کوہ کا پروگرام بنالیتے ہیں۔“
سائرہ جلدی سے بولی۔

”نہیں خالہ پہلے زد (zoo)“ سائرہ کا سب
سے چھوٹا بیٹا اذ لان اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
”سب سے پہلے زد جائیں گے اور اس کے
بعد کہیں اور.....“ اس نے بھانجے کو محبت سے دیکھتے

ماہنامہ پاکسوسائٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM

چیمبر لیڈر

عنبرہ سید



”مجھے تو بس یہی ڈرتا تھا کہ تو بہت ناراض ہوگی جب میں تجھے یہ خبر سناؤں گا مگر اماں سچ ہے کہ تیری بہو بڑی نیک دل ہے، شکل کی بھی اچھی ہے، ناک نقشہ ٹھیک ہے، رنگ گورا ہے بالکل میموں جیسا۔ اب تو خود سوچ اماں، ادھر پاکستان میں تو میرے لیے لڑکی ڈھونڈتی تو وہ میموں جیسی گوری نہ ہوتی، نہ ہی اتنی پڑھی لکھی ہوتی، نہ اتنی کمائیاں کرنے والی ہوتی لیکن یہاں یہ مجھے مل گئی ہے تو سمجھ..... میں اس

”میں اپنی مرضی سے بول نہیں سکتی، سن نہیں سکتی، دیکھ نہیں سکتی، کیوں.....؟“ سائرہ ہسٹریائی انداز میں بولی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے!“ عرفان ایک دم دھاڑا۔

”کاش یہاں سے دفع ہو سکتی..... میرا دل یہی چاہتا ہے۔“ سائرہ کی آواز کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔

”اوہ..... یہاں سے دفع ہونا چاہتی ہو..... ہو کے دکھاؤ، تمہاری دونوں ٹانگیں توڑ کے تمہیں کوٹے میں پھینک دوں گا..... تم میری حیثیت اور طاقت سے اچھی طرح واقف ہو..... تم میرے پیروں کی بیڑی بنو گی تو توڑ کے پھینک دوں گا، راستے کا پتھر بنو گی تو لات مار کے دور کر دوں گا..... اپنی اوقات سے بھی باہر مت نکلتا..... اتنا بڑا گھر ہے، رہو، کھاؤ، پیو جو چاہے بناؤ مگر تم کو سوال کرنے کا حق ہے نہ فیصلہ کرنے کا..... بات آئی سمجھ میں۔“ اس نے ٹھہر، ٹھہر کے سخت لہجے میں کہا۔

سائرہ کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

”لائٹ بجھاؤ اور میرے پیر دباؤ..... مجھے نیند آرہی ہے۔“ عرفان کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر میں دروازے کے نیچے سے آنے والی روشنی کی پتلی سی لکیر غائب ہو گئی، ہر دروازے کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی سائرہ کے دروازے تک نہیں آئی تھی اس لیے اس کہانی سے ناواقف تھی۔

ہر پیر میں کچھ دیکھی اور کچھ ان دیکھی بیڑیاں ہوتی ہیں۔ دیکھنے والی بیڑیاں توڑی جاسکتی ہیں مگر ان دیکھی بیڑیوں سے آزادی ناممکن ہے.....

وہ باس کے منہ پر استغنی مار کے آگئی تھی۔

سائرہ عرفان کے منہ پر کیا مارتی.....؟ عازرہ نے ایسی ہزار کے مو بائل کو نفرت سے دیکھا اور لٹے پٹے انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

بھول گئی تھی..... اسے امید تھی جو سکون اور خوشی کا خزانہ وہ اپنی چند دنوں میں یہاں سے کما کے واپس جانے والی تھی وہ اس کے اگلے کئی مہینوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے سائرہ کے بیڈروم کے باہر پہنچ کر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ تڑاخ کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں معلق ہو گیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم مجھ سے یہ سوال پوچھو کہ میں دو کی جگہ چار دنوں میں کیوں واپس آیا ہوں۔“ ”کپا میں آپ کی بیوی نہیں ہوں..... آپ سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکتی؟“ سائرہ کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”بیوی..... ہا..... بیوی ہو تو بیوی بن کے رہو..... اپنی حد کے اندر.....“ اس کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ عازرہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ عرفان نشتے میں تھا۔

”مرد، عورت سے برتر ہے اور عورت اس کے پیروں کی جوتی..... میرا کھاتی ہو..... میرے گھر میں رہتی ہو..... یہ مت بھولنا.....“ وہ غصے سے بولا۔

”یہ کب بھولتی ہوں..... ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ یہ آپ کا گھر ہے.....“ سائرہ کی آواز ابھری۔

”یاد رہتا ہے تو زبان کیوں چلتی ہے تمہاری؟ میرے سامنے جب بھی آؤ تمہارا منہ بند ہونا چاہیے اور تمہارے ہونٹوں پر یہ سرخ لپ اسٹک ہونی چاہیے۔ بس یہی تمہاری اوقات ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”مجھ میں اور ان عورتوں میں کیا فرق ہے جو سرخ لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو رنگ کے آپ کے سامنے آتی ہیں اور آپ کو رجھاتی ہیں؟“ سائرہ کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

”وہ عورتیں.....“ عرفان ہنسا۔ ”وہ تم سے بہت بہتر ہیں..... تم بولتی بہت ہو۔“

پردیس میں پردیسی نہیں رہا۔ مجھے کام کرنے کی اجازت اور رہائش مل گئی ہے، میرے دن آسان ہو گئے ہیں، اب جب میں اور تیری بہو کمائیاں کر کے تجھے بھجوائیں گے تو تیرے بھی دن آسان ہو جائیں گے۔ نیپو اور بلی دونوں ہی انگریزی اسکول میں پڑھ سکیں گے اور تو بھی لوگوں کے گھر میں کام کرنے کی مشقت سے بچ جائے گی۔“ اشرف، زبیدہ کو وہ خواب دکھا رہا تھا جو سب کے سب بڑے سہانے تھے۔ وہ سنہرے خواب آنے والے دنوں سے متعلق تھے، ان دنوں کے متعلق جن کے لیے اشرف پردیس کاٹنے گیا تھا۔ اشرف کمائیاں کر کے زبیدہ کو وہ رقم بھجوانے والا تھا جس کے ہاتھ میں آتے ہی زبیدہ کی اگلی پچھلی ساری دھن، ساری تکلیفیں ختم ہو جاتی تھیں۔ نہ جانے کس کس سے قرضہ لینا پڑا تھا، نہ جانے کب کب کی سینت سینت کر رکھی تھیں بڑے بڑے قرضوں میں ملائی گئی تھیں جب جا کر اشرف کے پردیس جانے کا بندوبست ہوا تھا، ممبر افضل کی ماں کا بھلا ہو جس نے اپنے داماد سے کہہ سن کر اشرف کو باہر بھجوانے کا بندوبست کیا تھا۔ ممبر افضل کا بہنوئی ٹریولنگ ایجنسی کا مالک تھا۔ اسے سب خبر تھی کس دیس میں چانا قانونی ہے کس میں نہیں، کہاں کمائیاں زیادہ ہوتی ہیں کہاں کم..... پہلے پہل زبیدہ کو اس ملک کے نام سے اختلاف ہوا جہاں ممبر افضل کا بہنوئی، اشرف کو بھجوانے کی پیشکش لے کر آیا تھا۔

”لوگ کویت جاتے ہیں، دبئی جاتے ہیں..... (الظہبی، سعودی عرب جاتے ہیں، وہاں نہ جائیں تو امریکا جاتے ہیں، یورپ جاتے ہیں افریقا کون جاتا ہے ماسی..... وہاں تو جیسی ہوتے ہیں اور وہاں کے جنگلوں میں تو اللہ معاف کرے، آدم خوروں کی بستیاں بھی آباد ہیں۔“ زبیدہ کی بھانجی سلیمہ نے اشرف کے ملک سے باہر جانے کی خبر سن کر زبیدہ کو

ہراساں کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اوہ اماں، وہ افریقا نہیں ساؤتھ افریقا ہے۔“ اشرف نے یہ اعتراض سن کر جھنجھلا کر کہا تھا۔ ”آپا سلیمہ تو اپنی ساری معلومات ایک گھرے میں ڈال کر زور زور سے گھڑا ہلاتی ہے اور جب اس میں سے کسی چیز کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے خبر باہر نکالتی ہے تو اس کی وہی شکل ہوتی ہے جو اس نے تجھے ساؤتھ افریقا کے بارے میں دی ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے ساؤتھ ہے کہ کوئی اور..... افریقا تو افریقا ہوتا ہے ناں..... حبشیوں کا ملک ہے وہ، وہاں جا کر تو کمائیاں کم کرے گا کہ آدم خوروں سے بچنے کی ترکیبیں زیادہ سوچے گا۔“ زبیدہ کا دل ہول گیا، اتنی بڑی رقم ادا کر کے وہ اشرف کو آدم خوروں کے حوالے کیسے کر سکتی تھی۔

”اوائے ہوئے اماں وہ تو گوروں کا ملک ہے، وہاں ہیرے جواہرات ہوتے ہیں اور سونا ہی سونا..... جو وہاں جاتا ہے لاکھوں پتی بن کر واپس آتا ہے۔“ اشرف نے سر پٹیتے ہوئے کہا اور ثبوت کے طور پر نمبرداروں کا بڑا بیٹا پیش کیا جو کئی سال سے اسی ملک میں رہ رہا تھا جہاں اشرف جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

”اوجانے دو اماں جی، لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو، اشرف کو گولڈن چانس مل رہا ہے اللہ کی قسم گولڈن چانس۔“ نمبرداروں کے بیٹے نے زبیدہ کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے دیکھ۔ گلیوں اور سڑکوں پر روڈ ماسٹری کرتے اتنے سال گزار دے میں نے..... جب سے ساؤتھ افریقا گیا ہوں بھاگ لگ گئے ہیں مجھے بھی اور میرے سارے گھر والوں کو بھی۔“

”یہ تو ہے ان کے پیسوں کو تو جیسے جاگ لگتی ہے پانچ روپے کے سو بن جاتے ہیں شام تک۔“ زبیدہ نے نمبردار کے بیٹے ارمان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”لے پھر پڑھ بسم اللہ ماسی اور اشرف کے جانے کی تیاری پکڑ۔“ ممبر افضل کے بہنوئی نے اشرف کا پاسپورٹ بنوا کر جب اسے پکڑایا تو زبیدہ نے دل ہی دل میں نہ جانے کون کون سی دعائیں پڑھتے ہوئے ادھر ادھر سے قرضہ زکوٰۃ اور مدد مانگ کر کتنے ہی ڈھیر پیسوں کے جمع کر لیے پھر اپنے گھر کے مرتبان، پیٹی کے کونے اور گلڈان جھاڑ جھاڑ کر ان میں سے کب کب کے جمع کیے پیسے نکالے۔

”کب کے پیسے جوڑ رہی ہے اماں تو۔“ اشرف نے پانچ پانچ سو کے وہ نوٹ دیکھ کر کہا جو زبیدہ نے پتا نہیں کب کب مرتبانوں اور گلڈانوں میں چھپا رکھے تھے۔

”گھر میں دال پکانے کو پیسے نہیں ہوتے تھے، ہم اچار کی پڑیاں لالا کر روٹی کھاتے رہے اور تو یہ پیسے سیتی رہی۔“ اشرف کو غصہ آنے لگا۔

”نہ سینتی تو آج جو کی بیشی ہے تیرے پیسوں میں وہ کہاں سے پوری ہوتی۔“ زبیدہ نے بھی چمک کر جواب دیا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔“ اشرف اس ڈر سے بیٹی آواز میں بولا کہ ماں کا موڈ خراب ہو گیا تو سب چوپٹ ہو سکتا تھا۔

”تو جانتی ہے حکومت نے پانچ سو کے یہ نوٹ ختم کر دیے ہیں، شکر کر کچھ لوگوں کے رونے دھونے سے ان کے ختم ہونے کی ڈیٹ کچھ آگے بڑھ گئی، نہیں تو پکے ضائع ہو جاتے تھے یہ نوٹ۔“ اشرف نے کہا۔

”میں کیا جانوں ایسی باتیں۔“ دل ہی دل میں نوٹ بچ جانے پر شکر ادا کرتی زبیدہ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”صبح کی ٹنگی سارا دن لوگوں کے جھوٹے برتن باٹھے مانتھتی ہوں، جھاڑو پونچھا کرتی ہوں تب جا کر تم تینوں کے پیٹ بھرنے اور کپڑے لٹے کا بندوبست ہوتا ہے۔ مجھ کوڑی کو کون ایسی خبریں سناتا کہ حکومت کیا کر رہی ہے کیا نہیں۔“

جینا لیدر

”چل شکر کر پھر بھی بچ گئے۔“ اشرف پیسے گنتا ہوا بولا، وہ خوش تھا کہ اماں کے پاس سے نکلنے والے پیسوں نے اسے ساؤتھ افریقا کے اور بھی قریب کر دیا تھا۔

جس دن اشرف کا ویزا ملا، زبیدہ اشرف کی لائی برنی کی ٹکڑیاں آس پڑوس میں بانٹی تو پھری مگر اس کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوبے جا رہا تھا۔ دو سال پہلے اشرف نے اسکول چھوڑ کر اس کی اس آرزو پر مبنی لات ماری تھی کہ اس کے بچے پڑھ لکھ کر افسر بنیں اور اس کے بعد سے وہ ہر دوسرے ہفتے کام بدلنے میں مشغول رہا تھا۔ نان بائی کے تنور سے لے کر درزی کی دکان پر کام سیکھنے تک نہ جانے کتنے ہنر تھے جو اشرف نے سیکھنا شروع کر کے چھوڑے تھے۔ نہ کہیں ٹک کر کام کیا نہ جم کر کمائی کی۔ زبیدہ کو اشرف کی بیکاری اور آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑ جانے کے خوف سے پوری پوری رات نیند نہیں آتی تھی۔ بھلا ہو ممبر افضل کی ماں کا جو اسے زبیدہ کی پریشانی پر ترس آ گیا اور اس نے اپنے داماد سے کہہ کر اشرف کو ساؤتھ افریقا بھجوانے کا انتظام کروا دیا۔

☆☆☆

ساؤتھ افریقا اجنبی مگر خوب صورت ملک تھا۔ یہاں کالے اور سفید دونوں طرح کے لوگ رہتے تھے۔ کما تے کھاتے اور خوش باش بھی تھے مگر جو بات اشرف کو پاکستان میں نہیں بتائی گئی تھی وہ ساؤتھ افریقا پہنچ کر پتا چلی تھی اور وہ بات یہ تھی کہ اسے عارضی رہائشی ویزے پر ساؤتھ افریقا بھجوا دیا گیا تھا۔ ممبر افضل کا بہنوئی لاکھوں لے کر اشرف اور اس کی اماں کے ساتھ ہاتھ کر گیا تھا۔ اجنبی ملک، اجنبی لوگوں میں اجنبی زبان سمجھنے اور بولنے کی دقتیں اشرف کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے کافی تھیں اور قریب تھا کہ وہ لاکھوں پر فاتحہ پڑھ کر پاکستان واپس جانے کی کرتا کہ اسے اپنے ہی علاقے کا ایک لڑکا

حبیب مل گیا تھا۔ حبیب پانچ سال پہلے ان مشکلوں سے گزر چکا تھا جن سے اشرف گزر رہا تھا۔ حبیب نیک دل اور پیاسا لڑکا تھا۔

”شکر کرتے تھے میں مل گیا اشرف نہیں تو تیری یہاں مٹی رل جانی تھی اور جب رل کر ہار جاتا تو تجھے انہوں نے جہاز پر بٹھا کر واپس بھیج دینا تھا ہمیشہ کے لیے۔“ حبیب نے اشرف کی پریشان شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں کوئی کسی کا کچھ نہیں لگتا، سب کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے۔“ اشرف سے ایجنٹ کی کہانیاں سنتے ہوئے اس نے کہا۔

”تو پھر تو مجھ پر کیوں ترس کھا رہا ہے لالہ حبیب.....؟“ اشرف نے حبیب کا منہ تکتے ہوئے کہا۔

”بس یار..... میں نے تجھے دیکھا تو مجھے اپنا وہ وقت یاد آ گیا جب میں تیری طرح رل رہا تھا.....“

مجھے ترس آ گیا، میں نے سوچا بھی اللہ میاں تو نے مجھے سنبھالا، میں تیرے ایک بندے کو سنبھالتا ہوں اور تو پھر میرا گرامیں بھی تو ہے ناں۔“ حبیب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”پر لالہ حبیب تیرے پاس جادو کی چھڑی تو ہے نہیں جو تو نے اپنے عارضی ویزے کو مستقل بنالیا اور یہاں ہی رہے جا رہا ہے، ٹھانڈے بھی تیرے خوب ہیں۔“ اشرف نے حبیب کے گروہری اسٹور کو آنکھیں پھاڑتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”چل، تجھے بھی عارضی سے مستقل کرانے کا بندوبست کرتے ہیں، کام بھی مل جائے گا اور گھر بھی۔“ حبیب نے ہستے ہوئے کہا۔ ”اتنے دن تو بے فکر ہو کر میرے ساتھ رہ۔“

اشرف کے نصیب اچھے تھے، پیچھے اماں زبیدہ کی دعائیں بھی تھیں جو بہت کم عرصے میں حبیب نے اسے جادو کی وہ چھڑی لادی جو اس کے بہت سے مسئلے حل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اشرف حبیب کے

ساتھ ہی اسٹور پر کام کرنے لگا اور اسی کے گھر کے خانے میں بنے کمرے میں رہنے لگا۔ اب اشرف کو ساؤتھ افریقا اچھا لگنے لگا اور وہ ویک اینڈز پر حبیب اور اس کی فیملی کے ساتھ خوب گھومتا پھرتا اور مزے کرتا تھا۔ اس کی اماں کو اشرف کے پیچھے باقاعدگی سے جانے لگے، نہ آگے کی فکر رہی نہ پیچھے کا غم..... لیکن اشرف بہت دیر تک اماں کو یہ نہیں بتا رہا کہ جادو کی اس چھڑی کا نام کیا تھا جس نے اسے مسائل کے عفریت سے بچالیا تھا۔

☆☆☆

زبیدہ کے پاس پیسے آنے لگے، جنہیں اب اس نے گلدانوں اور مرتبانوں کے بجائے ٹین کے کنستریں میں رکھنا شروع کر دیا، ٹین کے اس کنستریں میں پیسے رکھنے سے پہلے اس نے کنستریں کو ڈھکن اور کنڈی لگوائی اور ایک چھوٹا سا تالا بھی خرید..... چند ہی مہینوں میں ٹین کا کنستریں روپوں سے بھر گیا۔

”اماں تو جوڑتی ہی جائے گی، ہمیں سوکھا ساہ (آسان زندگی) کبھی نہیں لینے دے گی۔“ ٹیپو زبیدہ کی اس عادت پر بولتا، اس کا بھائی باہر چلا گیا تھا اور وہاں سے کمائیاں کر کے بھیج رہا تھا۔ ٹیپو کی نظروں کے سامنے نت نئے ڈیزائنوں اور خوبیوں والے موبائل فون تاجتے، ڈیجیٹل کیمرے گھومتے، کپڑے اور گھڑیاں رقص کرتیں، اسے اپنا ذاتی طرز زندگی بہتر کرنا تھا۔

”تو سوکھے ساہ کی بات کرتا ہے۔“ زبیدہ نے ایک دن ٹیپو کے مطالبے پر چولہے کے قریب رکھا چمنا اٹھا کر اسے مارنے کو اٹھالیا۔ ”کم بختا۔“ مجھے وہ قرضہ رات کو سونے نہیں دیتا جو اشرف کو بھیجنے کے لیے لوگوں سے اٹھایا تھا۔“ زبیدہ کے چہرے کی کڑھکی مزید نمایاں ہو گئی۔ ”قرضہ اترے گا تو آگے کی سوچیں گے۔“ ٹیپو زبیدہ کی اس کڑوی بات کے جواب میں ہونٹ بچھینچ کر رہ گیا۔

”بھائی وہاں کی رنگین دنیا میں مزے کر رہا ہوگا، اچھا کھاتا، اچھا پیتا ہوگا، ادھر ہم اب بھی ان کالی پیلی اینٹوں کی دیواروں والے کمرے میں رہے جارہے ہیں، کھانے کو پنے تلے شوربے والی دال اور ہوا میں اڑنے والی چپائی کھانے کو ملتی ہے، ٹین کا دروازہ جس میں جا بجا سوراخ ہو رہے ہیں، ساری رات ہوا سے کھڑکتا ہے اور نیند خراب کرنے کا باعث بنتا ہے، اماں اب کبھی صبح کام پر نکلتی ہے اور شام پڑے گھر آتی ہے، نہ کوئی دن بدلا نہ رات.....“

جبکہ بھائی سے چاچے رحمت کے موبائل پر جب بھی بات ہوتی ہے کہتا ہے ٹیپو رچ کے کھایا کر اور چاچے رحمت کے سامنے کیا بتاؤں کہ اماں کھانے اور خرچے کو کچھ دے تو تجھے بھی بتاؤں کیا کھایا کتنا خرچ کیا۔“ وہ اپنی جھلنگا چارپائی پر لیٹا سوچتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ”کتنی بار اماں سے کہا ہے کہ ایک اچھا موبائل فون ہی لے لے، جس پر انٹرنیٹ کی سہولت ہو، بھائی سے کھل کر بات کر سکیں گے اور کیا بتا اسکا پپر شکل بھی دیکھ لیں پر اماں کو یہ باتیں سمجھ آئیں تو بات ہے ناں.....“

☆☆☆

”یہ تو سمجھو معجزہ ہی ہو گیا ماسی تیرے ساتھ، اشرف افریقا میں بس گیا اور کمائیاں بھی کرنے لگا۔“ سلیمہ نے زبیدہ سے اشرف کا احوال سن کر کہا۔ ”مگر تو بے بڑی بھولی، اشرف سے کرید کر پوچھا بھی ہے وہ وہاں کرتا کیا ہے، چاہے تو جنگلوں سے ہاتھی پکڑنے اور انہیں نہلانے کا کام کرتا ہو۔“

”مزدوری ہی کرنی ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔“ زبیدہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”فارغ نہیں بیٹھا یہ ہی بہت ہے، اب چاہے ہاتھی نہلاتا ہو چاہے کسے کام کرنا ضروری ہے اور پھر پیسے بھی بھجواتا ہے ہر مہینے باقاعدگی سے، اب تو مجھے کہتا ہے اماں اپنا کھانا کھلو الے بینک میں، ہنڈی والوں کا اعتبار نہیں ہوتا۔“

جینر لیڈر

”بڑا سیانا ہو گیا اشرف۔“ سلیمہ جو اشرف کے خوار ہونے کے بعد واپس آ جانے یا پھر افریقا میں کسی آدم خور کے ہاتھ لگ جانے کی خبر کی منتظر تھی مایوس ہوتے ہوئے بولی۔

”چل پھر اب پیسہ بھیجتا ہے نا اشرف تو گھر کو سچا سنوار اور برادری والوں کی روٹی (دعوت) کر، انہیں بھی تو پتا چلے زبیدہ اب پہلے والی زبیدہ نہیں رہی۔“ سلیمہ نے اندر کی جلن کو ایک نئے مشورے کے ساتھ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”واہ، میں کیوں دعوت کروں برادری کی؟“ زبیدہ نے حسب معمول چمک کر کہا۔ ”جب میں فاتے مرتی تھی برادری نے کتنا مجھے پوچھا، جو دکھ کے ساتھی نہ بن سکے انہیں سکھ کا ساتھی کیسے بنالوں۔“

”اچھا نہ کر دعوت.....“ سلیمہ، زبیدہ کے دو ٹوک جواب پر کھسیا کر بولی۔ ”پر تو اپنا اور اپنے گھر کا حلیہ تو درست کر لے، تو نے اب بھی وہی چادر اوڑھ رکھی ہے جو اپنے بچوں کے بچپن سے اوڑھ رہی ہے۔“

”کر لیں گے حلیہ بھی درست، پہلے لوگوں کا قرضہ تو اتار لوں۔“ زبیدہ نے وہی جواب سلیمہ کو دیا جو ٹیپو کو دیتی تھی۔ ”میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی آنکھیں پیسہ دیکھ کر پھٹ جاتی ہیں، کتنے سال سہی ہوں تو ہاتھ آیا ہے، پاگل ہوں جو بہانے لگ جاؤں، میرا بیٹا پردیس کاٹ کر کمار رہا ہے، اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی شمارنے میں ضائع کر دوں۔“

”سچ ہے غریب عادتاً خسیس ہو جاتا ہے۔“ سلیمہ نے زبیدہ کے گھر سے واپس آتے ہوئے سوچا۔ ”ماسی کے پاس پیسہ آ رہا ہے پھر بھی لوگوں کے جھوٹے برتن مانجی ہے اور میلے کپڑے دھوئی ہے، خسیس ہو چکی ہے ماسی بھی۔ پیسہ، پیسہ جوڑتی رہے گی، پیوند لگے کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی عادت نہ چھوڑے گی۔“

☆☆☆

”یونس خان آیا ہے؟“ اشرف نے لمحے بھر کے لیے اپنی فکریں واقعی اتارتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں آیا ہے۔“

”اور عمر گل..... وہ اگلوں کی وکٹیں اکھاڑنے والا؟“ اشرف عمر گل کا تصور کر کے جھومتے ہوئے بولا۔

”اوئے اس کے بغیر تو ٹیم ہی نہیں بنتی۔“

”اور اپنا لالہ..... یوم یوم؟“ اشرف پوری جون میں آتے ہوئے بولا۔

”وہ بھی ہے۔“ حبیب ہنستے ہوئے بولا۔
 ”اوتیری خیر لالہ حبیب، چل فیر سب کچھ
 چھوڑ..... میچ دیکھتے ہیں، اپنے پاکستان میں تو میچ ہی
 بند ہو گئے ہیں۔“ اشرف بچوں کی طرح خوش ہو کر
 تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔

”میں نے ٹکٹ لے لیے ہیں۔“ حبیب نے جیکٹ کی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”تیری بھر جانی بھی چائے گی ناں..... تو میچ کے ٹکٹ اس کی وجہ سے آسانی سے مل گئے ہیں۔“

”ستے خیراں بھر جائی دیاں۔“ اشرف مزید خوش ہوا۔ ”لالہ حبیب تو بڑی قسمت والا ہے۔۔۔۔“

”یہی تو بات ہے اشرف یار.....“ حبیب نے

آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”وہ صرف بیوی نہیں لاٹری ہے لاٹری جو میرے نام نکل آئی ہے، کماتی ہے، کھلاتی

س کی برکتیں ہیں جو حبیب مغل ساؤتھ افریقا میں

”ہاں لالہ، تو میرا یہ کام کروے تو کیا ہی بات سیٹ ہو گیا ہے اور تجھے بھی سیٹ کرنے والا ہے۔“

”اوہ اماں کے لال، اسی لیے تو میچ دکھانے لے چلا ہوں، کیا پتا اُدھر عمر گل جیک کیلے کی وکٹیں اکھاڑے، اُدھر تو اپنے لیے کوئی لاٹری نکلاوے۔“

”میری لاٹری آفریدی کے چھکے کے ساتھ ملتی ہے لالہ حبیب، وہ نہ چلا تو میری قسمت بھی نہیں چلتی۔“ اشرف نے ترنگ میں آتے ہوئے پیش گوئی کی۔ (اشرف نہیں جانتا تھا کہ اس کی پیش گوئی کے عکس آفریدی کو نہ بیننگ میں چلنا تھا نہ ہی باؤننگ میں، البتہ اس کے نام کی لاٹری گراؤنڈ کے قریب وٹڈری لائن سے باہر رقصاں ہونے والی تھی)

☆☆☆

”یہ تو نے کیا، کیا اشرف، شادی کر لی کسی کافر نے؟“ مہینوں بعد جب اشرف نے زبیدہ کو یہ بات بتائی جس کے بتانے سے اسے اب تک سخت رگڑتا رہا تھا تو زبیدہ ہکا بکا رہ گئی پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔

”اشرف مجھے شادی پر کوئی اعتراض نہیں، اس
کے کافر فی ہونے پر اعتراض ہے، کافر فی لاکھ چھوڑ

روڑ بھی کمائے وہ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں
 سکتے۔“ زبیدہ نے دکھ سے لرزتی آواز میں کہا۔

جب ہی تو میں کہوں سب کے اکسانے پر بھی
رے ہاتھ اس پیسے کی طرف کیوں نہیں بڑھتے،

”اماں وہ کافر فی نہیں ہے، ایک اللہ کو ماننے والی

بھی لے، میں چاہتا ہوں وہ اپنی من مرضی سے کلمہ پڑھے اور امید ہے کہ وہ ضرور پڑھ لے گی، اس کی بہن لے حبیب کی بیوی ہے، دونوں بہنیں بڑی پیار محبت والی بیبیاں ہیں۔ دونوں کو پاکستانی مرد اچھے لگتے ہیں، اس لیے تو ہم پاکستانیوں سے نکاح کر کے ہمیں ادھر راسنی خوشی سیٹ کیا انہوں نے۔“ اشرف نے ماں کو اس جوڈی سی تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اور نوکری بھی ان کی بڑی اعلیٰ ہے اماں۔“
 اس کی خاموشی پر وہ ایک اور دلیل دینے لگا۔
 ”پاکستان کی ٹیم ادھر آئی تھی ناں تو جس بھی ہمارے
 شیر نے کوئی کارنامہ کیا انہوں نے دل کھول کر اسے
 دیا، ہمارا ملک، تمہارا ملک نہیں کرتیں بالکل
 ہی.....“ اشرف کے لہجے سے شکتی مسرت نے
 بیدہ کو باور کروادیا وہ خوش اور مطمئن تھا سو اس نے
 اس بات پر خاموشی اختیار کر لی مگر دل ہی دل میں
 اللہ کا شکر بجالائی کہ اس نے اشرف کا بھیجا پیسہ خود پر
 استعمال نہیں کیا تھا۔

”اللہ جانے کس کام سے یہ پیسہ کمایا جاتا ہے،
ملکوں میں تو نہ جانے لڑکیاں کیا، کیا کرتی ہیں پیسہ
کمانے کے لیے جس کمائی میں محنت شامل نہ ہو وہ
حلال ہو ہی نہیں سکتا۔“ زبیدہ نے خود کو سمجھایا اور
بے باتھوں سے مزید محنت کر کے کمانے کے لیے کمر
ستہ ہو گئی۔

اور جس دن ٹیپو کو چاچے رحمت کے موبائل
 پر اکیلے میں اشرف سے بات کرنے کا موقع ملا،
 نے گھر کا اور ماں کے مزاج کا سب احوال بھائی
 کو کہہ سنایا۔ اشرف ماں کے تیوروں کا حال سن کر
 رنج ہو گیا۔

”چل تو دل برا نہ کیا کر، تجھے میں الگ پیسے
 گویا کروں گا، تیرا شناختی کارڈ بن گیا ہے ناں تو بس
 تیرے اور بلی کے لیے میں الگ پیسے بھیجتا ہوں،
 کسے دے اماں کو من مانیاں، حرام مال ہے تو

نظم

چلو چھوڑ و محبت کو
چلو ایک کام کرتے ہیں
آزاد بکبل کی طرح
افق پہ لمبی اڑان بھرتے ہیں
خوشی کے گیت گاتے ہیں
چلو تنہی کی طرح
خوشبو سے مہکے گل کو چھوتے ہیں
چلو چھوڑ و محبت کو
کوئی پسنا نچوتے ہیں
مگر
پسنے پہ ہوا لازم
وہ پسنا ہو محبت کا
وہ پسنا ہو محبت کا

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

قرضہ کیسے اتار لیا اس نے اس حرام مال سے۔“
اشرف کو ماں پر تاؤ اور چھوٹے بھائی بہن پر پیار
آنے لگا۔

ویسٹرن یونین کے ذریعے اشرف کی طرف سے پہلی بار پیسے ملنے پر ٹیپو نے سب سے پہلے نئے ماڈل کا دلکش موبائل فون خریدا..... دونوں بہن بھائیوں نے اپنے دوستوں کے نمبرز اس فون میں محفوظ کیے اور انٹرنیٹ چلا کر خوب گانے ڈاؤن لوڈ کیے۔ ٹیپو دکان سے میموری کارڈ میں بھی فلمیں اور گانے ڈلوا لیا یہ وہ موج تھی جس کا دونوں نے زندگی میں پہلی بار مزہ چکھا تھا۔ اس کے بعد اشرف کے پیسوں سے گھر میں سہولتیں آنا شروع ہوئیں۔ گھر کا حلیہ بہتر ہوا ٹی وی اور فریج آئے، پھر واشنگ مشین بھی آگئی، ٹیپو اور بلی کے حلیے بہتر ہوئے اور کھانا پینا بھی..... زبردہ گھر میں آنے والی ان تبدیلیوں کو دیکھ

کر کچھ نہیں بولی۔ نہ اس نے ٹیپو سے جرح کی نہ اشرف سے پوچھا بلکہ کان مزید لپیٹ کر پہلے جہاں چار گھروں کا کام کرتی تھی اب دو مزید گھروں کا کام لے لیا، اس کی کوشش رہنے لگی وہ کم سے کم گھر میں رہے، ٹیپو اور بلی بھی خوش رہتے، انہیں ماں کا ڈر تھا، جس نے اب زیادہ بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسکول کالج سے گھر آنے کے بعد فی وی دیکھتے، کمپیوٹر پر من پسند فلمیں دیکھتے اور اپنی مرضی کا کھانا کھاتے پیتے۔ زبیدہ اکثر جن گھروں میں کام کرتی تھی وہیں سے کھانا کھا آتی اور اگر وہاں کھانے کا ٹائم نہیں ملتا تو ساتھ گھر لے آتی۔ پیسے نے گھر میں طرز زندگی کے دو معیار بنا دیے تھے مگر دونوں فریق اپنے اپنے معیار زندگی پر راضی اور خوش تھے۔ زبیدہ گھر آنے کے بعد ٹیپو اور بلی کے معمولات دیکھتی، وہ فی وی پر ڈرامے اور فلمیں دیکھ رہے ہوتے، برگر اور پیپسی سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے اور کبھی کمپیوٹر پر بھابی سے باتیں کر رہے ہوتے۔ زبیدہ دیکھتی اور سستی مگر بولتی نہیں تھی۔ دونوں بچے ہر دم بھابی کا کلمہ پڑھتے رہتے جو دور بیٹھی ہی ان سے اتنی کھل مل گئی تھی کہ ان کی پسندنا پسند، عادات و اطوار سب کے بارے میں جان چکی تھی۔

”بھابی نے کل دروازے پر پڑا پردہ دیکھا تو بولی اسے بدل دو۔“

”بھابی بتاتی ہے برگر گھر پر کیسے بناتے ہیں۔“

”بھابی کہتی ہے مائیکرو ویو۔۔۔ اوون لے آؤ، سہولت ہو جائے گی۔“

”بھابی کہتی ہے اگلی بار پیسے بھیجے گی تو بلی کے لیے الگ فون لے لیا جائے۔“

”بھابی کہتی ہے کہیں اچھی جگہ دیکھ کر پلاٹ لے لیا جائے۔“

”بھابی کہتی ہے ہم نیا گھر بنائیں گے۔“ زبیدہ یہ بھابی نامہ سستی اور یوں ظاہر کرتی جیسے نہ سنا ہو۔

”ہونہ نیا گھر۔“ زبیدہ اکیلے میں خود سے ہم کلام ہوتی۔ ”اشرف کا باپ تر کے میں یہ چار مرے کا گھر ہی تو چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اس گھر کی پچھتوں اور گرتی دیواروں کو اپنے ہی دم پر تھاما اور جھیلایا تھا۔ وہ تانگے کے نیچے آکھ نہ مر جاتا بھئی تو ہم دونوں مل کر کب کے اس اینٹ گارے کے ڈھانچے کو گھر بنا چکے ہوتے پر ادھر وہ مرا ادھر فٹے داریوں کی پوٹلیاں میرے سر پر آن پڑیں۔ اشرف بارہ سال کا تھا جب اس کا ابا مرا اور آج اشرف خیر سے پچیس سال کا ہو چکا۔ یہ تیرہ سال کہاں گزرے کیسے گزرے، دنوں کے سکے وقت کے تھال میں گرنے سے پہلے کہاں کہاں زخم لگا کر گئے، کون کون سے زخم ادھیر کر گئے کچھ سمجھ نہیں لگی۔“ زبیدہ کو ایک ایک کر کے گزرے دنوں کی تمام تلخیاں یاد آنے لگتیں۔

”چلو بناؤ نئے گھر کم بختو۔“ پھر وہ اپنے خیالوں کے بوجھ سے آزاد ہونے کی خاطر چیختی اور بڑبڑاتی۔ ”نکلو یہاں سے خالی کرو میرا گھر، حرام کمائی سے بنی یہ چیزیں مجھے رات بھر سونے نہیں دیتیں۔“ وہ اپنا غصہ ٹیپو اور بلی پر نکالتی۔

”حرام کا پیسہ کیسے ہو گیا اماں؟“ ٹیپو نے بالآخر ایک دن دل کڑا کر کہا۔ ”مجھے پتا ہے بھابی اور بھابی کتنی محنت کرتے ہیں تو جا کر یہ پیسہ ہاتھ آتا ہے۔“

”کیا محنت کرتی ہے بھابی؟“ زبیدہ نے تنک کر کہا۔ جواب میں جو ٹیپو نے اسے بتایا اور جتنا اسے سمجھ میں آیا اس سے اشرف کی بیوی کے بارے میں اس کے ذہن کا الجھاؤ قدرے کم ہوا، پہلی بار اس نے گلی محلے کی اکا دکا عورتوں کو یہ بتایا کہ اشرف نے ساؤتھ افریقا میں شادی کر لی تھی۔

”مبارک ہو بھئی زبیدہ، تم تو میم کی ساس بن گئیں۔“ بیگم حق، جن کے زبیدہ کپڑے دھونی تھی نے سن کر اسے کہا اور ہنسنے لگیں۔

”بس بیگم صاحبہ جی سمجھ میں نہیں آتا یہ اچھا

ہوا کہ برا ہوا۔“ زبیدہ نے واشنگ پاؤڈر کے جھاگ میں ڈوبے کپڑے ملتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہی ہوا ناں، اشرف کو وہاں ٹکنا تھا تو پوری یا کاغذی شادی تو کرنی ہی پڑتی، اس ملک میں خارجی رہائش کا ویزا ہی ملتا ہے، مستقل رہنا ہو تو کوئی نہ کوئی چکر چلانا ہی پڑتا ہے۔“ بیگم حق نے زبیدہ کے ذہن کی ایک اور گرہ کھولی۔

”اچھا بیگم صاحبہ جی!“ زبیدہ نے کپڑے چھوڑ کر بیگم حق کی طرف دیکھا۔

”تو اور کیا.....!“ بیگم حق مسکرائیں۔ ”یہ بتاؤ تمہاری بہو کوئی کام وام بھی کرتی ہے کہ اس نے اشرف سے شادی اس لیے کی کہ پردیس سے آیا غریب کمائے اور وہ عیش کرے۔“

”کرتی ہے بیگم صاحبہ جی۔“ زبیدہ نے قدرے فخر سے کہا۔ ”لیڈری کرتی ہے وہاں، لیڈر ہے لیڈر۔“

”ہیں.....!“ بیگم حق نے آنکھوں سے عینک اتار کر اچھپے سے کہا۔ ”کس کی لیڈر ہے۔“

”پتا نہیں جی۔“ زبیدہ نے سر ہلایا۔ ”ووتوں والی لیڈر ہے شاید۔“

”نیلسن منڈیلا کی بیوی فارغ ہے آج کل، کہیں اشرف نے اس سے شادی تو نہیں کر لی۔“

بیگم حق کے بیٹے زین نے ہنستے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں جی۔“ زبیدہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے بیگم صاحبہ جی، لیڈری اچھا کم (کام) ہوتا ہے ناں..... لیڈر تو ملک کی خدمت کرتا ہے ناں۔“

”ہاں، لیڈر کا مطلب تو رہنما ہی ہوتا ہے زبیدہ۔“ بیگم حق نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں سوچ رہی ہوں اگر تمہاری بہو سیاسی شخصیت ہے تو پھر اس نے ایک بیکار سے پاکستانی لڑکے سے شادی کیسے کر لی؟“

”یہ تو وہ ہی جانے، مجھے تو صرف اتنا پتا میں کہ وہ جو کمائی کی کمائی ہی ہوتی۔۔۔ ہوگی ناں۔“

”ہاں، ان ملکوں کے سیاسی لیڈر تو اپنے اپنے ملک سے اور قوم سے بہت مخلص ہوتے ہیں، حق حلال کی ہی کمائی ہوتی ہے ان کی۔“ بیگم حق نے فتویٰ دیا۔ زبیدہ کو محسوس ہوا اشرف کی بیوی کے بارے میں یہ سن کر کہ وہ ساؤتھ افریقا میں سیاسی لیڈر تھی بیگم حق خاصی متاثر نظر آرہی تھیں، اس کا سراپا اپنی نارمل سطح سے ذرا سا بلند ہو گیا۔

☆☆☆

”شکر ہے بھائی اشرف، اماں کا کفر ٹوٹا، اب وہ ہمارے ساتھ ہی کھاتی پکاتی ہے اور تمہارے بھیجے ہوئے پیسوں کو خرچ بھی کرنے لگی ہے۔“ کچھ دنوں بعد ٹیپو نے اشرف کو فون پر اطلاع دی۔ اشرف کے سینے سے نہ جانے کب سے رکی ایک سانس خارج ہوئی اس نے اپنی بیوی کیٹی اور اپنے بیٹے عبد اللہ کی تصویریں ٹیپو کو ای میل کیں۔ زبیدہ نے پہلی بار اپنی بہو اور پوتا دیکھے۔ بہو کے نین نقش حبشیوں والے مکررنگ گورا تھا۔

”ان کے ابا کا لے ساؤتھ افر۔ سن اور اماں گوری ساؤتھ افر۔ سن تھی۔“ بلی نے زبیدہ کو سمجھایا۔

”اور اشرف کا کوئی بچہ اگر اپنے نانا پر چلا گیا تو کیا ہوگا؟“ زبیدہ نے اپنے پوتے عبد اللہ کی تصویر دیکھتے ہوئے سوچا۔ عبد اللہ شکل میں اشرف پر اور رنگت میں اپنی ماں پر گیا تھا۔

”اسے سمجھا کلمہ پڑھ لے، جو صفتوں کی اچھی ہے تو مذہب بھی اللہ رسول کا اپنا لے، کلمہ پڑھنے سے اس کی روح بھی صاف ہو جائے گی۔“ اگلی بار اشرف کا فون آنے پر زبیدہ نے اسے سمجھایا۔

”ہاں اماں بس تو دیکھنا جب تجھ سے ملے گی تو پوری مسلمان بنی ہوگی۔“ اشرف نے زبیدہ کو یقین دلاتے ہوئے مطمئن کر دیا۔

”آج سے ساؤتھ افریقا میں ٹوئٹی ٹوئٹی کپ شروع ہونا ہے اماں۔“ ایک روز ٹیپو نے بتایا۔ ”بھابی نے بھی شرکت کرنی ہے۔“

”اچھا اچھا وہ بھی آئے گی۔“ زبیدہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ دن پہلے ہی اس کو بلی نے بتایا تھا کہ لاہور میں ٹوئٹی ٹیچ ہوا تھا اس میں وزیر اعلیٰ مہمان خصوصی تھے۔ وزیر اعلیٰ لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر مسکرا رہے تھے۔

”ان ملکوں کے لیڈر بھی اپنے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میچ دیکھنے آتے ہوں گے۔“ زبیدہ نے کہا اور بستر جھاڑ کر اس پر لیٹ گئی۔ کچھ عرصے سے اس نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اشرف کے بھیجے پیسے اس کی سارے گھروں میں کام کی کمائی سے دگنے ہوتے تھے۔ ہاں، اب اسے اپنی کمزور پڑتی ہڈیاں رونے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو اسے اشرف اور اس کی بیوی کی کمائی کے حلال ہونے پر بھی کوئی شک نہیں رہا تھا۔ اشرف نے بیوی کی اب جو تصویر بھیجی تھی اس میں وہ شلوار قمیص اور دو پٹا پہن کر بیٹھی تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”میں نے اس کا نام ہاجرہ بتول رکھا ہے اماں، نانی کے نام پر۔“ اشرف نے اسے بتایا۔ ”میں اسے ہاجرہ کہہ کر ہی بلاتا ہوں، بہت خوش ہوتی ہے یہ نام سن کر۔“

”کلمہ پڑھا اس نے کہ نہیں؟“ زبیدہ نے دل کی خلش کا رونا رویا۔

”سمجھ پڑھ ہی لیا۔“ اشرف نے گول مول جواب دیا۔ ”یہاں مشکل ہو جاتی ہے اماں اگر کھلے عام بتا دو کہ جی اب وہ مسلمان ہو گئی ہے سو طرح کے مسئلے مسائل ہو جاتے ہیں، بس جب پاکستان آئے گی تیرے پاس تو پھر تو بہت خوش ہوگی اس کے اطوار دیکھ کر۔“

”اللہ تیرا شکر ہے تو جس حال میں بھی رکھے۔“ زبیدہ نے طمانیت بھری انگڑائی لیتے ہوئے کروٹ بدلی۔ اس کے نیچے نرم بستر تھا۔ اس نے ایک عمرنگی کھاٹ اور پیوند لگے تھیں کے ساتھ گزارا تھی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ آرام کرنا کسے کہتے تھے۔ اس کی بہو نے حبیب کے ہاتھ اسے کپڑوں اور سونے کے بُندوں کے علاوہ لوشن اور کریمیں بھی بھجوائی تھیں، عمر بھر لوگوں کے برتن مانگنے والے ہاتھ اب لوشن اور کریموں سے نرم پڑنے لگے تھے۔

”کل کو ہاجرہ بتول اپنے ملک میں کوئی وزیر شریک لگ گئی تو کتنے فخر کی بات ہوگی۔ وہاں تو صدر بھی عورتیں بن سکتی ہیں۔“ وہ مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگی۔

”بیگم حق کے نمبر پر فون کر کے بتا دینا کہ تیری بھابی نے آج میچ میں آنا ہے۔“ زبیدہ نے بلی سے کہا۔ ”وہ ہی تو ایک دل سے خوش ہونے والی بی بی ہے۔۔۔۔۔ بڑی راضی ہوں گی۔“

”ہاں، ہاں اماں کیوں نہیں۔“ بلی نے ناخنوں پر کیونکس سجاتے ہوئے کہا۔

”آپا سلیمہ نے بھی آنا ہے شام کو ہمارے گھر، ہمارے ساتھ میچ دیکھے گی۔۔۔۔۔ اسے بھابی دکھانی ہے۔“ بلی نے اسے اطلاع دی۔

”کیچا سلیمہ کا سڑ کے سواہ ہو جانا ہے۔“ زبیدہ نے کہا۔ ”نظر ہی نہ لگا دے ہاجرہ بتول کو۔“

”اوہ کچھ نہیں ہوتا اماں، آپا سلیمہ بے چاری نے کیا کر لینا ہے ادھر بیٹھے، سوائے سڑنے کے۔“ بلی ہنس کے بولی۔

☆☆☆

ٹی وی کی اسکرین پر سب حاضرین کی نظریں جمی ہوئی تھیں، کیمرہ ہری ہری گھاس کو دکھائے جا رہا تھا۔ دو ہندے ہاتھوں میں مائیک پکڑے گھاس کے درمیان جکی جگہ کو ہاتھ سے دبا دبا کر انگریزی میں

کچھ بول رہے تھے۔

”میچ کا بتا رہے ہیں کیسی ہوگی۔“ ٹیپو نے وضاحت کی۔

”تو بہ کتنی دنیا میچ دیکھنے آئی ہے۔“ زبیدہ نے چادر کی بکلی مارتے ہوئے کہا۔

اب کیمرہ میچ دیکھنے کے لیے آنے والوں کو دکھا رہا تھا۔ رنگ برنگے لوگ آدھے ننگے، آدھے ڈھکے لوگ ہاتھوں میں غبارے، جھنڈیاں اور کاغذ پکڑے لوگ، کسی کے بال ہنر رنگ کے کسی کے نیلے رنگ کے تھے۔

”ہائے ہائے کلموئیاں، ساری خلقت میں ننگی بیٹھ جاتی ہیں۔“ زبیدہ نے ایک تماشاخی لڑکی پر تبصرہ کیا جو نہ ہونے کے برابر لباس میں ملبوس تھی۔

”ساؤتھ افریقا جو ہوا ماسی۔“ سلیمہ نے چادر کان کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا۔

”آج تو سلیمہ بڑی تیار شیر ہو کر آئی ہے۔“ زبیدہ نے سلیمہ کے کانٹے اور آنکھوں کا سرمہ دیکھتے ہوئے کہا اور دل میں ہنس دی۔ ”لو بھلا ہاجرہ بتول نے کون سا اسے دیکھ لینا ہے اسکرین میں سے جو یہ اپنی طرف سے سونپی بن کے آئی ہے۔“

”او پاکستان ناس جیت گیا۔“ چار پانچ لوگوں نے مسکے اچھالا اور ایک ہندے نے کچھ بتایا تو ٹیپو کے ساتھ سلیمہ کے بچے لڑیاں ڈالنے لگے۔

”بیٹھ جاؤ، یہ کون سا شریفوں کے کرنے والا کام ہے۔“ زبیدہ نے گھر کا۔ ”ماں بہنوں کے سامنے لڑیاں ڈال رہے ہو جیا کرو۔“

ٹیپو کن آنکھوں سے بلی کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ پھر میچ شروع ہوا۔۔۔۔۔ پاکستان نے بلی بازی شروع کی۔ زبیدہ نے نظریں اسکرین پر جمادیں۔ کب آئے گی اس کی لیڈر بہو۔۔۔۔۔ اس کے تصور میں پینٹ کوٹ پہنے لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے ہاجرہ بتول کا تصور آیا اور وہ جھوم اٹھی۔

”اوئے چھکا۔۔۔۔۔ اوئے اکمل کی بلی بلی۔۔۔۔۔“ ٹیپو نے ایک دم اٹھ کر پھر سے شور مچا دیا۔ ”وہ دیکھو وہ بھابی۔۔۔۔۔“ بلی مسرت سے چیخی۔ ”کدھر کدھر۔۔۔۔۔“ زبیدہ کو جس لمحے کا انتظار تھا وہ بالآخر آ گیا تھا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ بلی نے اشارہ کیا۔ ”سرخ بالوں والی، جس کے ہاتھ میں مچھنے سے ہیں۔“ زبیدہ نے غور سے دیکھا۔ بغیر بازوؤں کی چھوٹی سی فراک اور جاگے میں ملبوس سرخ بالوں والی ہاجرہ بتول نیلے رنگ کے مچھنے ہلاتی چھلائیں لگا رہی تھی، وہ ہنس رہی تھی، کبھی ہجوم کی طرف منہ کرتی کبھی گھوم کر گراؤنڈ کی طرف دیکھنے لگتی۔

”ہائے بیڑا تر جائے، وہاں کے لیڈر ایسے ہوتے ہیں۔“ سلیمہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ننگ پٹنگے چھالاں (چھلائیں) مارتے۔“

”بھابی صرف لیڈر نہیں چیئر لیڈر ہے۔“ بلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چیئر (cheer) لیڈر کیا ہوتا ہے؟“ سلیمہ منہ پر انگلی رکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی چیئر لیڈر، باہر کے ملکوں میں ان کی ٹریننگ اسکول ہی میں شروع ہو جاتی ہے، چیئر لیڈرز کی ٹیمیں بنتی ہیں، ان کے مقابلے ہوتے ہیں، ان میں زیادہ تر لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ بڑا مقام ہوتا ہے ان کا، بڑے پیسے کمائی ہیں یہ، آخر چالیس اووروں تک چھلائیں مار مار کر ٹپ ٹپ کر کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا ناں، باہر کے ملکوں میں سارے کھیلوں میں یہ چیئر لیڈر ضرور شامل ہوتے ہیں، بڑی محنت کا کام ہے چیئر لیڈری۔۔۔۔۔ آپا سلیمہ تو یہاں گھر میں بیٹھی اُپلے تھا پتی عورت کیا جانے ان کا اسٹیشن۔“ ٹیپو آپا سلیمہ کے جملے کے جواب میں جوش میں آ کر تقریر کر رہا تھا اور زبیدہ کی آنکھوں کے



اَجالوں کا سفر

نسیرین خالد

وہ پچھلے دو گھنٹے سے دور بین ہاتھ میں پکڑے کھڑکی میں کھڑا تھا۔ تیرے۔۔۔ وہ دور بین آنکھوں پر لگا لیتا۔ ہیری کمرے میں آیا اور اسے یوں کھڑا دیکھ کر خاموشی سے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر بولا۔

”یہ شغل کب سے شروع کر دیا؟“ ہیری کے اچانک بولنے پر مائیکل کے ہاتھ سے دور بین چھوٹ گئی۔ اس نے مڑ کر ناگواری سے ہیری کو دیکھا۔

”کیا دیکھ رہے تھے؟ مجھے بھی دکھاؤ۔“ ہیری

کوٹھے والیوں سے بھی گئی گزری ہے۔ ہائے لوگوں میں لٹ گئی۔“ زبیدہ ٹوٹی کھول کر پانی کی دھار کے نیچے اپنے ہاتھ دھوئے جا رہی تھی۔

”اماں محنت کر کے.....“ ٹیپو نے کہنا چاہا۔

”دفع ہو جا منحوس۔“ ٹیپو کو گھورا۔ ”جسم کی نمائش کر کے تھرکنا اور کمانا..... یہ محنت ہے اور اس محنت کی کمائی حلال ہے..... یہ لیڈری ہے جس کی شوق سب مارتے تھے۔ ٹائلیں توڑ دوں گی جو آج کے بعد کسی نے اس گھر میں اس کلموہی کا نام لیا..... کر تو ت دیکھو اور نام دیکھو لیڈر اس نے ٹیپو کی طرف دیکھا۔

”بے حیائی کی لیڈر ہے وہ۔“ ٹیپو، بلی اور سلیمہ دانتوں میں انگلیاں دبائے زبیدہ کا جنون دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح ان پانچ گھروں کی بیگم صاحبائوں نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ برسوں سے دکھ اٹھاتی زبیدہ دیانتداری اور محنت سے ان کے گھروں کے کام کر کے انہیں سکھ پہنچاتی رہی تھی۔ بس درمیان میں اپنی چیئر لیڈر بہو کی لیڈری کے زعم میں وہ کام چھوڑ کر آرام کرنے چلی گئی تھی۔

”بندہ سوکھی روٹی کھالے لیڈری نہ کرے۔“ زبیدہ نے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر سب بیگم صاحبائوں کو بتایا تھا۔

”میرا اشرف پھنس گیا بیگم صاحب جی، اسے بھی لیڈر ہونے کی جھلک دکھائی ہوگی بعد میں نکلی ہوگی تنگ پتنگی، میراٹن، ڈھول کی آواز پر چھالیں (چھلانگیں) مارتی میراٹن، پر اس کا کیا گیا، پھنس تو میرا اشرف گیاناں۔“

پانچوں بیگم صاحبائوں نے اوپر سے زبیدہ کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے زبیدہ کی بہو کے سیاسی لیڈر ہونے کے بجانے (cheer) چیئر لیڈر نکلنے پر دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔



سامنے اسکرین کا منظر گھوم رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد کمرے میں شور سا مچتا اسکرین پر لوگ جھنڈیاں لہراتے اور ہاجرہ بتول اور اس کی ساتھی لڑکیاں اپنے تقریباً عریاں جسم تھرکاتی کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی میں مصروف ہو جاتیں۔

یکدم زبیدہ کے جسم کی دردیں جیسے واپس آنے لگیں۔ اس نے اپنے نیچے بچھے نرم بچھونے کو دیکھا، اپنے قدرے ملائم ہوتے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کے سامنے بیگم صاحبائوں کے برتن پکڑے اور فرش گھوم گئے جنہیں مانجھتے، دھوتے اور سوتے اس کی عمر گزر گئی تھی۔ اسے اچانک لگا اس کے جسم پر موجود پکڑے اور نیچے بچھا بستر اسے کاٹ کھانے لگا تھا، جیسے اس میں کہیں کانٹے آگئے تھے، وہ وحشت زدہ انداز میں اٹھی اور کمرے سے متصل چھوٹی سی کوٹھری میں جا کر کپڑے بدلنے لگی۔ چند منٹوں بعد وہ اپنے بچھے پرانے کپڑوں اور سوراخوں سے بچی چادر میں ملبوس تھی۔ اس نے کوٹھری میں رکھا پیسوں سے بھرا کنسٹرکٹھا کر صحن میں لاپھینکا۔

”حرام، حرام، حرام.....“ وہ چلانے لگی۔

”حرام چھو گیا مجھے، میری ساری عمر کی ریاضت، مشقت حرام ہوگئی۔“ اس نے دیوانوں کی طرح چلاتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا ماسی؟“ سلیمہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھامے۔

”کوڑے مار مجھے، ڈنڈوں سے سبق چکھا سلیمہ، میری ساری محنت لٹ گئی۔“ اب زبیدہ کسی ایسی ماں کی طرح بین کر رہی تھی جس کا جوان بیٹا مر گیا ہو۔ ”توبہ توبہ استغفار۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی بول رہی تھی۔

”ہائے میں اس تنگی بچی کی کمائی کھاتی رہی، جو خلقت کے سامنے جسم کی نمائش کرتی ناچتی، کودتی ہے اور پیسہ کماتی ہے میں اسے لیڈر سمجھتی رہی جو ادھر کی

چڑھتے ہوئے کہا۔

”ساڑھے بارہ بجے!“ ہیری نے منہ بناتے

ہوئے کہا۔

”اوہ! تھینک یو ڈفر.....“ مائیکل نے مسکراتے

ہوئے کہا اور فون بند کر کے بایک اشارت کی۔ گھر

واپس پہنچ کر بارہ بجے کا الارم لگا کر وہ دوبارہ سو گیا۔

☆☆☆

ہادیہ نے غصے سے اس لڑکے کو گھورا جو پچھلے چار

دن سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ مائیکل نے بایک بالکل

اس کے سامنے روک دی۔

”ہائے..... آئی ایم مائیکل جوزف، میں کوئی

ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں، میں اتنے دنوں سے آپ

سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔“ مائیکل نے

اسے غصے سے گھورتا دیکھ کر فوراً کہا۔ اس کے نام پر

ہادیہ کے چہرے پر اک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”جی فرمائیں!“ ہادیہ نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

”کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“ ہادیہ کو

اس کی جرات پر شدید حیرت اور ساتھ ساتھ اس کی

دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

”آ..... پ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ ہادیہ نے

اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔ ”مسٹر جوزف میں

مسلمان ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے آپ مسلم ہیں۔ میرے کزن

نے ایک مسلم لڑکی سے شادی کی ہے۔ میری نالچ کے

مطابق آپ لوگ کرچتر میں شادی کر لیتے ہیں۔“

”ہمارے ہاں صرف مردوں کو اجازت ہے

اہل کتاب عورت سے شادی کرنے کی اور مسٹر جوزف

ضروری نہیں ہے کہ میں بھی اس جیسی لڑکی ہوں جس

نے آپ کے کزن سے شادی کی ہے اور آئندہ مہربانی

فرما کر میرے راستے میں مت آئیے گا ورنہ انجام کے

ذمے دار آپ خود ہوں گے۔“ ہادیہ اسے دھمکاتے

اوڑھے کندھے پر بیگ لٹکائے کہیں جانے کے لیے

تیار کھڑی تھی۔

”اچھا یہ پڑھتی ہے۔“ ان دو ہفتوں میں پہلی

دفہ مائیکل اسے اس وقت کہیں جاتا دیکھ رہا تھا۔

مائیکل نے اپنی دور بین بیڈ کی طرف اچھالی.....

ٹھیل سے اپنی بایک کی چابی اٹھائی اور تیزی سے

کمرے سے نکل کر جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا۔

”کیا ہوا مائیکل؟“ کچن میں کھڑی ماریہ نے

اسے بیرونی گیٹ کی طرف تیز تیز قدموں سے جاتے

دیکھ کر پوچھا۔

”ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔“ وہ بغیر

رکے بولا اور اپنی بایک نکالی اور اس لڑکی کے گھر کی

طرف موڑ لی۔ جلد ہی مائیکل کو وہ لڑکی نظر آ گئی۔ اسے

دیکھ کر مائیکل نے بایک کی اسپید کم کر دی تھی۔

کافی دیر چلنے کے بعد وہ مین روڈ پر مڑی۔ کچھ

دور جا کر گر لڑکا لچ کا کھلا گیٹ نظر آیا۔ کالج کے ارد گرد

گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن سے اتر کر لڑکیاں کالج کے

گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

مائیکل نے کچھ فاصلے پر بایک روک لی تھی

جب تک وہ لڑکی گیٹ تک نہ پہنچی وہ وہیں کھڑا رہا۔

اس نے جیب سے موبائل نکال کر ہیری کا نمبر ملایا۔ وہ

لوگ اس شہر میں کچھ دن پہلے شفٹ ہوئے تھے جبکہ

ہیری کی فیملی سالوں سے یہیں آباد تھی۔

ہیری کی آواز سن کر اس نے اپنا مدعا بیان کیا تو

وہ چیخ پڑا۔

”مطلب..... تم نے صبح صبح یہ پوچھنے کے لیے

فون کیا ہے کہ کالج کی چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟ مسٹر

مائیکل جوزف تم پر یہ وقت بھی آتا تھا۔“ ہیری نے

ہنسٹ سے کہا۔

”دیکھو ہیری، میں فضول باتیں سننے کے موڈ

میں نہیں ہوں، تمہیں اگر بتانا ہے تو بتاؤ۔“ مائیکل نے

اس میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔“ مائیکل نے

اپنے خیالات کا اظہار کیا اور پھر کچھ یاد آنے پر

استہزائیہ نظروں سے ہیری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے اپنے بھائی کی شادی بھی تو نہیں چلی

حالانکہ اس کی تو کرپشن لڑکی سے ہوئی تھی۔“ ہیری

اس کے طنز پر دانت پیس کر رہ گیا۔

☆☆☆

”ہاں یہی گھر ہوگا۔“ مائیکل نے براؤن گیٹ کو

دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا وہ کون سا گھر

ہے جس میں وہ لڑکی رہتی ہے۔ جب اسے یہ یقین

ہو گیا کہ یہی گھر ہے تو اس نے آگے بڑھ کر ٹیل

بجائی۔

دروازہ کھولنے والا ایک لڑکا تھا۔ اس لڑکے کو

مائیکل اکثر اس گھر میں دیکھتا رہتا تھا۔ لڑکے کو دیکھ کر

مائیکل کو شدید مایوسی ہوئی۔

”جی فرمائیں؟“ مائیکل کو خاموش دیکھ کر اس

لڑکے نے پوچھا۔

”وہ..... وہ احمد کاظمی صاحب کا گھر یہی ہے؟“

مائیکل کے ذہن میں فوری اپنے پڑوسی کا نام آیا تو اس

نے وہی نام لے لیا۔

”جی نہیں! یہ عبدالعزیز صاحب کا گھر ہے۔“

”اوہ سوری آپ کو ڈسٹر ب کیا۔“ مائیکل نے

معذرت کی

”کوئی بات نہیں، اٹس اوکے۔“ لڑکے نے

کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

مائیکل کی جیسے ہی آنکھ کھلی اس نے گھڑی کی

طرف دیکھا جس میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ ”اوہ

ٹو!“ کہہ کر اس نے کمبل دور پھینکا بیڈ سے چھلانگ لگا

کر کھڑکی تک پہنچا۔ سامنے ٹھیل سے دور بین اٹھائی

اور اس لڑکی کے گھر پر فوکس کر دی۔ وہ لڑکی کالی چادر

نے اس کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

مائیکل نے دور بین اس کی طرف بڑھادی۔ ہیری نے

اسی اینگل پر دور بین رکھی جہاں مائیکل دیکھ رہا تھا۔

”اچھا تو تم اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے!“ ہیری

نے دور بین سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... اچھی ہے ناں؟“ مائیکل نے پوچھا۔

”پتا نہیں..... وہ تو اپنی عبادت میں مصروف

ہے، ویسے یہ سب کب سے ہو رہا ہے؟“ ہیری نے

دور بین واپس کرتے ہوئے پوچھا۔

”پچھلے دو ہفتے سے..... ہر روز اٹھارہ گھنٹے۔“

”کیا..... اٹھارہ گھنٹے؟ بھی میں کہوں میرے

میجر کا کوئی جواب نہ ہی کوئی ای میلز کا..... تم..... تم

پاگل تو نہیں ہو گئے؟“ ہیری نے حیرت سے اسے

دیکھا۔

”ہاں! شاید پاگل ہو گیا ہوں۔ جانتے ہو میں

ہر روز صبح چھ بجے اٹھتا ہوں کیونکہ اس ٹائم یہ لڑکی اپنی

عبادت کے لیے اٹھتی ہے۔“ ہیری آنکھیں پھاڑے

اسے دیکھ رہا تھا۔

”ت..... تم کہیں سیریس تو نہیں ہو گئے ہو اس

معاملے میں؟“ ہیری نے تشویش سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے..... ہو گیا ہوں۔“ مائیکل نے

بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”تم ایسا سوچ بھی مت لینا مائیکل، اس میں اور

ہم میں بہت فرق ہے، وہ لڑکی جس طرح عبادت

کر رہی ہے اس کا مطلب ہے شی از مسلم۔“

”سو واٹ.....؟ رو بن نے بھی تو ایک مسلم

لڑکی سے شادی کی تھی۔“ مائیکل نے اپنی اور ہیری کی

پچھو کے بیٹے کا نام لیا۔

”ہاں کی تھی مگر وہ شادی چلی صرف دو مہینے

تھی۔“ ہیری نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”شادی چلنا نہ چلنا بعد کی بات ہوتی ہے اور

حادث نے غصے سے سرخ جوزف کا چہرہ دیکھا اور بولا۔ ”ڈیڈ اسلام سچا دین ہے میں نے اسے پڑھا ہے جو باتیں آج ہمارے سائنسٹ ثابت کر رہے ہیں وہ باتیں آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن پاک نے بتادی تھیں اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو آپ بھی پڑھ کر.....“

”شٹ اپ ناؤ..... شٹ اپ۔“ جوزف چیخے۔ ”تمہارے پاس اب بھی وقت ہے مائیکل سدھر جاؤ نہیں تو میں تمہیں اپنی جائداد سے عاق کر دوں گا، بھوکے مر جاؤ گے تم۔“ جوزف کی دھمکی سن کر حادث کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ ”ڈیڈ اس دنیا میں کوئی کسی کو رزق نہیں دیتا۔ سب کا رازق اللہ ہے وہ سب ضرور بناتا ہے مگر رازق وہ خود ہے۔“

”یکو اس بند کرو اور دفع ہو جاؤ میرے گھر سے ابھی اور اسی وقت۔“ جوزف غصے سے چلائے۔ حادث اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ ماریہ نے آگے بڑھ کر غصے سے ہانپتے جوزف کو سنبھالا۔

”کام ڈاؤن جوزف، جوان بیٹے کے ساتھ ایسا رویہ مت رکھو وہ مزید گمراہ ہو جائے گا۔ نرمی اور پیار سے اس کے گمراہ کن خیالات کو کنٹرول کرو۔“ ”یہ لوگ کبھی واپس نہیں پلٹتے ماریہ۔“ جوزف نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ انہیں اپنا کزن فریدوں یاد تھا جو آج سے بیس سال پہلے مسلمان ہوا تھا۔ اپنے باپ کی کروڑوں کی جائداد ٹھکرا کر ایک مسجد کا پیش امام بن گیا تھا اور پھر پلٹ کر نہیں آیا۔

حادث جب اپنے کمرے سے نکلا تو اس کے ایک ہاتھ میں بیگ اور دوسرے میں اپنی بایک چابی تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا۔ ”مام..... ڈیڈ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں آپ کے لیے دعا کروں گا کہ اللہ آپ دونوں کو

”سب سے پہلے تو یہ جان لو مائی ڈیر ہیری کہ اب میرا نام محمد حادث ہے اور ڈیڈ بھلے سے مجھے شوٹ کر دیں۔ آئی ڈونٹ کیئر۔“ مائیکل کے بے فکری سے کہنے پر ہیری حیران رہ گیا۔ ”تمہیں پتا ہے اسلام Terrorism پھیلا رہا ہے پوری دنیا میں.....“ ہیری نے کہنا چاہا مگر مائیکل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اسلام Terrorism نہیں پھیلا رہا نہ ہی اس کا پیروکار Terrorist ہو سکتا ہے تم قرآن پاک پڑھ کر دیکھو اس میں ہے ”اگر کسی انسان نے ناحق کسی دوسرے انسان کا قتل کیا تو سمجھو اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔“ اور تم اسلام ہی کو کیوں ٹارگٹ کیے ہوئے ہو۔ پہلے اپنے گریبان میں تو جھانکو امریکا کتنا امن پسند ہے اس کا اندازہ تو عراق اور افغانستان کو دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے۔“ مائیکل کے طنز کرنے پر ہیری کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

☆☆☆

ہیری اتنی جلدی اس کے ڈیڈ کو سب کچھ بتا دے گا اسے ہیری سے ایسی امید نہیں تھی۔ مسٹر جوزف خوشخوار نظروں سے گھورتے ہوئے اس سے پوچھ رہے تھے۔

”بتاؤ ہیری نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے؟“ وہ خاموش کھڑا تھا۔

”کچھ پوچھ رہا ہوں میں تم سے مائیکل۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”لیس ڈیڈ، میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب میرا نام مائیکل نہیں محمد حادث ہے۔“ ماریہ اور جوزف کے چہرے کا رنگ یک دم اڑ گیا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم ایسا سوچنا بھی مت نہیں تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

چین ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھے تسبیح و تہلیل میں مصروف تھے۔

مائیکل نے ان کے پاس جا کر انہیں سلام کیا۔ مولوی احمد علی نے سلام کا فوری جواب دیا۔

”میرا نام مائیکل جوزف ہے، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔“

مولوی احمد علی نے... آسمان کی طرف ایک نگاہ کی پھر جوزف کو دیکھ کر سوچا۔ ”اس کے گھر کی کس خبر جب جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔“

☆☆☆ دو ہفتے گزر گئے وہ لڑکا پھر نظر نہیں آیا۔ اسے لگا وہ ڈراما کر رہا تھا صرف اسے متاثر کرنے کے لیے۔

دوسری طرف مائیکل، مولوی احمد علی کی دی ہوئی کتابیں پڑھتا رہا اور ہر روز ان سے ملنے جاتا رہا، جو کچھ کتاب پڑھ کر سمجھ نہیں آتا وہ ان سے ڈسکس کرتا تھا۔ ان کے سمجھانے پر وہ بہت مطمئن ہو جاتا۔ وہ اب بھی مولوی احمد علی کی دی ہوئی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔

”ہائے کزن!“ ہیری کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ مائیکل نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا تو ہیری حیران رہ گیا مائیکل کب اسے اتنی لفٹ کراتا تھا۔

”یہ کیا پڑھ رہے ہو؟“ ہیری نے کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ..... یہ تو مسلمانوں کی کوئی

کتاب ہے یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“ ہیری نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میری کتاب ہے۔“

”واٹ..... تمہاری؟ مگر تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی تھی اس کی؟“ ہیری کے ماتھے پر بل تھے۔

”میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“

”کیا..... تم..... تم..... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ انکل تمہیں شوٹ کر دیں گے مائیکل۔“

ہوئے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے جانے کے بعد مائیکل نے بایک کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ لیا۔ سارا دن وہ بے چین رہا اور ساری رات جاگتا رہا۔ ”وہ مجھے مذہب کی بیس پر ریجیکٹ کر کے گئی ہے..... مجھے..... مائیکل جوزف کو۔“ وہ غصے میں چیخ رہا تھا۔

☆☆☆

آج پھر اسے وہاں کھڑا دیکھ کر ہادیہ کے چہرے پر ناگواری چھا گئی۔

”سنو! اگر تم مجھے صرف مذہب کی وجہ سے ریجیکٹ کر رہی ہو تو میں تمہارا مذہب اپنانے کے لیے تیار ہوں۔“ ہادیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔

”کیا یہ شخص پاگل ہے؟“ ”تم..... تم اسے مذاق مت سمجھو، آئی ایم سیریس! ہینڈرڈ پرسنٹ سیریس، میں مسلم ہونا چاہتا ہوں۔“ مائیکل نے اسے یقین دلانا چاہا۔

”اگر مسلم ہونا چاہتے ہو تو وہاں جاؤ یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ہادیہ نے دور بنی اپنے علاقے کی مسجد کی جانب اشارہ کیا اور گھر کی طرف چل دی۔ ڈرامے باز کہیں کا، مجھے پاگل سمجھتا ہے جو اس کی باتوں میں آ جاؤں گی۔“ گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے ہادیہ بڑبڑا رہی تھی۔

مائیکل دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی گیٹ سے اندر گئی تو وہ بھی وہاں سے چل دیا۔ اس کا رخ مسجد کی طرف تھا۔

مولوی احمد علی اس مسجد کے پیش امام تھے۔ ان کے چہرے پر ہمہ وقت مسکراہٹ رہتی، بہت نرم و سادہ طبیعت کے مالک مولوی صاحب تمام اہل محلہ کے کام آتے۔ آج وہ ظہر سے کافی پہلے مسجد میں آ گئے تھے۔ جلدی آنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا دل بہت بے

جہاں اس کے بے چین دل کو قرار آتا تھا۔

☆☆☆

وہ فجر پڑھ کر مولوی احمد علی سے باتیں کر رہا تھا مگر اس کا دھیان کہیں اور تھا یہ بات مولوی صاحب بھی محسوس کر رہے تھے۔

”حارث بیٹا کیا بات ہے؟“

”وہ جارہے ہیں..... وہ ہمیشہ کے لیے امریکا جارہے ہیں۔ آج ان کی فلائٹ ہے۔“

”تو جاؤ ان سے مل آؤ بیٹا وہ تمہارے ماں باپ ہیں جتنا ہو سکے ان کی خدمت کرو۔ ان کا تم پر بہت حق ہے۔“ مولوی صاحب کے کہنے پر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے اپنے گھر گیا پتا چلا وہ انٹرپورٹ کے لیے جا چکے ہیں۔ وہ فوراً انٹرپورٹ کی جانب روانہ ہو گیا جہاں اسے جلد ہی اپنے مام، ڈیڈ نظر آ گئے۔

”مام۔“ اس نے انہیں دور سے ہی آواز دی۔ ماریہ نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ حارث کو دیکھتے ہی انہوں نے بے تابی سے بازو پھیلا دیے۔ حارث نے بڑھ کر ان سے ملنا چاہا مگر اگلے ہی لمحے جوزف بیچ میں آ گئے۔

”مائیکل بن کر آئے ہو تو ٹھیک ہے لیکن اگر حارث بن کر آئے ہو تو واپس لوٹ جاؤ۔ تم ہمارے کچھ نہیں لگتے۔“ ڈیڈ کے اتنے بے رحمانہ رویے پر حارث کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جوزف نے ماریہ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئے۔

”جوزف وہ ہمارا بیٹا ہے..... اس سے آخری بار مل تو لو۔“ ماریہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی مگر وہ بغیر رکے آگے چلے جارہے تھے۔ حارث وہیں کھڑا انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہاں ہر دوسرا بندہ اپنے پیاروں کے جانے پر اٹک رہا تھا مگر کوئی اس لڑکے کا اصل دکھ نہیں جانتا تھا جو مائیکل جوزف سے محمد حارث بننا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک بچہ اس کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور ایک بڑا سا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بھائی جان یہ وہ گاڑی والی آنتی دے کر گئی ہیں۔“ بچے نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ گاڑی جا چکی تھی۔ اس نے وہ لفافہ بچے کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس لفافے کو چوم لے کیونکہ اس پر اس کی ماں کے ہاتھوں کا لمس تھا۔

اس نے لفافہ کھولا۔ لفافے میں اس کے ایجوکیشنل ڈاکومنٹس کے ساتھ ایک خط تھا۔ حارث نے بے چینی سے خط کھولا۔

”مائی سن مائیکل!“

میری جان واپس آ جاؤ۔ تمہاری ماں تمہارے لیے بہت تڑپتی ہے۔ جوزف کہتا ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔ سمجھ لوں کہ میرا کوئی بیٹا ہی نہیں تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں کیسے وہ وقت بھول سکتی ہوں جب تم میری گود میں آئے میں نے تمہیں چلنا سکھایا، بولنا سکھایا، تم..... تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔ تم دنیا میں کہیں بھی رہو کوئی بھی مذہب اپنا لو میرے بیٹے ہی رہو گے۔ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ ہم اگلے ہفتے ہمیشہ کے لیے امریکا جارہے ہیں۔ تم لوٹ آؤ مائیکل ابھی کچھ نہیں بدلا۔ جوزف بھی تمہیں معاف کر دے گا اور خداوند بھی۔ میں تمہارا انتظار کروں گی، گاڈ بلیس یو۔ یاد رکھنا پیر صبح 9 بجے کی فلائٹ ہے۔

فقط

تمہاری بوڑھی ماں جو تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

وہ بے چین ہو گیا۔ اس کے مام ڈیڈ اسے چھوڑ کر جارہے ہیں۔ وہ عبدالحجیب صاحب سے ضروری کام کا کہہ کر مسجد کی طرف چل پڑا کیونکہ وہی وہ جگہ تھی

رہا تھا۔

مولوی احمد علی اسے دلا سا دے رہے تھے۔ ”بس بیٹا بس کرو بے شک تم حق پر ہو تم اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے ماں باپ کو ہدایت دے اور اپنے کھانے پینے کی فکر ہرگز مت کرنا وہ ہے ناں۔“ مولوی احمد علی نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”وہ تو جانوروں کو، پرندوں کو اور پتھروں میں رہنے والے کیڑوں کو بھوکا نہیں سلاتا تو تمہیں بھی تنہا نہیں چھوڑے گا..... تمہیں تو اس نے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔“ وہ کئی دن مسجد میں رہا پھر مولوی صاحب نے اسے ایک شخص سے ملوایا۔

”یہ عبدالحجیب ہیں۔ ایک اسٹور چلا رہے ہیں۔ انہیں اپنی دکان کے لیے ایک ایماندار آدمی کی ضرورت ہے۔ میں نے انہیں تمہارا بتایا۔ یہ تمہیں اپنی دکان پر رکھنا چاہتے ہیں۔“ مولوی احمد علی کے بتانے پر حارث نے عبدالحجیب صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کی گارنٹی نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں قابل اعتبار شخص ہوں۔“ حارث کے کہنے پر مولوی احمد علی اور عبدالحجیب مسکرائے۔

”میں آپ کی پوری کہانی سن چکا ہوں بیٹا۔ آپ کے لیے مجھے کسی کی گارنٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر حارث عبدالحجیب کی دکان پر ملازم ہو گیا۔ اس روز وہ کسی بچے کو اس کی مطلوبہ اشیاء دے رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سڑک پر کھڑی ہوئی کار پر پڑی۔ گاڑی میں بیٹھی ماریہ جوزف نہایت دکھ سے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ حارث کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماریہ نے فوراً آنکھوں پر چشمہ لگایا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

بھی ہدایت دے۔“

”یہ..... یہ بایک میں نے مائیکل کو دلائی تھی۔ یہ حارث کے لیے نہیں ہے۔“ جوزف نے بایک کی چابی دیکھتے ہوئے کہا۔ حارث کو ڈیڈ کے روتے سے بہت تکلیف ہوئی۔ اس نے فوراً مٹھی کھول دی۔ بایک کی چابی زمین پر گر گئی۔

”اس بیک میں کیا ہے؟“ جوزف نے بیک کی طرف اشارہ کیا۔

”اس میں میرے کچھ کپڑے اور میرے ایجوکیشنل ڈاکومنٹس ہیں۔“ حارث نے بہت مشکل سے بتایا۔ وہ بدقت اپنے آنسو روک رہا تھا۔ اسے ڈیڈ سے ایسے روتے کی امید نہیں تھی۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، لاڈلا اور بہت پیارا۔

”یہ سب بھی میرے پیسوں کا ہے۔“ حارث نے فوراً بایک چھوڑ دیا۔ اس نے ایک شکایتی نظران پر ڈالی اور بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ماریہ اسے جاتا دیکھ کر ایک دم گویا ہوش میں آئیں اور اس کے پیچھے جانا چاہا۔

”رک جاؤ ماریہ، جانے دو اسے۔ اگر اسے ہم سے ذرا سی بھی محبت ہوگی تو لوٹ آئے گا، نہیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں تھا۔“ مسٹر جوزف کی بات سن کر ماریہ نے مڑ کر دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بھلا کیسے سوچ سکتی تھیں کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے وہ ماں تھیں..... ماں اولاد کو کیسے بھول سکتی ہے۔

☆☆☆

وہ رویا کب تھا..... اسے تو رونے کی عادت نہیں تھی۔ اس کے اپنوں نے کبھی اس کے ساتھ ایسا رویہ بھی تو نہیں رکھا تھا۔ مام، ڈیڈ اس کی ہر خواہش اس کے منہ سے نکلتے ہی پوری کر دیتے تھے مگر اب..... اب جو کچھ ہوا تھا وہ اس پر بچوں کی طرح رو

اس کی آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔
”تم کتنے احسان فراموش ہو۔ تمہارے میڈیکل میں ایڈمیشن کے لیے میں نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر بننا تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے اور تم..... تم میرے لیے اتنا بھی.....“ وہ رو پڑی۔

”ارے، ارے..... نہیں پلیز روؤ مت۔ میں نے ابا سے بات کی تھی مگر وہ نہیں مانے۔ وہ سب تو میں نے تمہیں تنگ کرنے کے لیے کہا تھا۔“ معیز نے اسے چپ کرواتے ہوئے وضاحت دی۔

”ہادیہ پلیز چپ ہو جاؤ نہیں تو..... نہیں تو میری ہنسی چھوٹ جائے گی۔“ اس کے رونے میں شدت دیکھ کر وہ ایک دم بول پڑا۔ ہادیہ کے چہرے پر ایک دم مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سامنے رکھی کاپی معیز کے سر پر دے ماری۔ ”سچ کہہ رہا ہوں ایسی عجیب لگتی ہو روتے ہوئے کہ بس۔“ معیز پھر شرارت سے ہنسا۔ ”اوہ نو عصر کی جماعت نکل جائے گی۔“ معیز کی نظر جیسے ہی گھڑی پر پڑی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہاں یاد آیا۔ معیز کچھ یاد کرتے ہوئے ہادیہ کی طرف مڑا۔ ”آج ظہر کے وقت حارث بھائی سے ملاقات ہوئی تھی بہت اچھے انسان ہیں۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔“ بڑے مدبرانہ انداز میں دعا دی گئی تھی۔ ہادیہ نے حیرت سے خود سے دو سال چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

☆☆☆

”آ..... آپ۔“ سامنے بیٹھے حارث کو دیکھ کر ہادیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”آپ تو وہ.....“ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ ”مائیکل.....؟“ بہت کوشش کے بعد بالآخر وہ نام یاد کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ حارث اس کی حیرت زدہ صورت دیکھ کر مسکرایا۔

”ہاں میں پہلے مائیکل جوزف تھا مگر اب محمد

حارث کو یہ خبر سنائی تو ایک بل کو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گیا۔
”ہاں بیٹا عبدالمعین نے ہادیہ کے لیے ہاں کر دی ہے۔“

”ہادیہ، اس کا نام ہادیہ ہے؟“
”ہاں، ہادیہ نام ہے اس کا۔ بہت پیاری بچی ہے ماشا اللہ۔“

”ہاں اس کا نام ہادیہ ہی ہونا چاہیے تھا وہ میری ہدایت کا سبب بنی۔ اس نے میری زندگی ہی بدل دی۔ مجھے مائیکل جوزف سے محمد حارث بنا دیا۔“

☆☆☆

”اماں میرا بی ایس سی تو کمپلیٹ ہو جانے دیں۔“ شادی کی ڈیٹ رکھنے کا سن کر ہادیہ نے التجائیہ انداز میں ذکیہ بیگم کو دیکھا۔

”ہو جائے گا بی ایس سی بھی۔ تمہارے ابا نے بات کی تھی مولوی صاحب سے..... وہ کہہ رہے تھے کہ بھلے شادی کے بعد پڑھ لے حارث کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”مگر اماں۔“ ہادیہ نے رونی صورت بناتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”اگر مگر اپنے ابا کے سامنے کرنا۔ میرے تو اپنے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ تھوڑے سے دن رہ گئے اتنا کام ہے۔“ ذکیہ بیگم پریشانی سے بولیں۔ ہادیہ نے سامنے بیٹھے کتاب کے مطالعے میں غرق معیز کو پر امید نظروں سے دیکھا۔

”معیز میرے بھائی تم ابا سے بات کرو ناں۔“ ہادیہ معیز کے بالکل سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری سسٹر۔ تم خود ہی کہتی ہو کہ میں چھوٹا ہوں اور چھوٹے ایسے معاملات میں نہیں بولتے۔“ معیز نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے شرارت سے کہا تو ہادیہ نے بے بسی سے اسے دیکھا

”وہ مسجد کے سامنے والے محلے میں رہتی ہے۔ براؤن کلر کا گیٹ ہے اس کا۔“ حارث انہیں ایڈریس سمجھانے لگا۔

”ارے وہ تو عبدالمعین کا گھر ہے۔“ سیکنہ بیگم ایڈریس سمجھتے ہی بولیں۔

”اس کی تو ایک ہی بیٹی ہے ماشا اللہ بہت نیک اور نماز روزے کی پابند بچی ہے۔“ سیکنہ بیگم کے چہرے پر خوشی جھلک رہی تھی۔ انہیں بھی ہادیہ بہت پسند تھی ان کے دل میں اکثر یہ انہونی خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش خدا انہیں ایک بیٹا دے دیتا تو وہ ہادیہ کو اپنی بہو بنا لیتیں۔

”بس مولوی صاحب کل ہی رشتہ لے کر چلیں گے عبدالمعین کے ہاں۔“ سیکنہ بیگم پر جوش ہو کر بولیں تو حارث مسکرا دیا۔

”ہاں ضرور۔۔۔ بلکہ کہو تو آج چلتے ہیں۔“ مولوی احمد علی کی بات سن کر حارث کا قبہ قبہ بلند ہوا۔

☆☆☆

عبدالمعین صاحب مولوی احمد علی کی بات پر خاصے حیران ہوئے تھے وہ حارث کی ساری کہانی سے واقف تھے۔ جو کچھ عرصہ پہلے ان کے بڑے بھائی عبدالحجیب کے اسٹور پر بھی کام کر چکا تھا۔ انہیں حارث بے حد پسند تھا۔ وہ اس کی جرات اور راست بازی و بہادری کو بے حد سراہتے تھے جس نے سچے مذہب کی خاطر روپیہ، پیسہ، اسٹیٹس سب ٹھکرا دیا تھا۔ بات اپنی لڑکی کی تھی سو مولوی احمد علی کی بے پناہ تسلی کے بعد انہوں نے ہاں کر دی تھی۔

اس رشتے کے لیے ہاں کرتے ہوئے وہ اب بہت خوش تھے۔ سیکنہ بیگم کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ان کی دلی تمنا پوری ہو رہی تھی۔ حارث انہیں اپنے بیٹے کی طرح ہی عزیز تھا۔ وہ حارث کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے بے تاب تھیں۔ جب انہوں نے

☆☆☆

آج وہ بہت عرصے بعد مولوی صاحب کے ہاں آیا تھا اور انہیں ماں، باپ کے جانے کی روداد سنار ہاتھا۔

”میری بس ایک ہی خواہش تھی کہ آخری دفعہ مام سے مل لوں مگر.....“ وہ رو رہا تھا۔

”بس حارث بیٹا صبر کرو۔ صبر کرنے والوں کو رب العزت بہت پسند کرتا ہے۔“ مولوی صاحب نے اسے سمجھایا۔

”بیٹا آزمائش پر ہی بندے کو تولا جاتا ہے۔ جو آزمائش پر پورا اترتے ہیں ان کے لیے میرے رب کے ہاں بڑے رتبے ہیں۔“ حارث نے آنسو صاف کر لیے تھے۔ وہ مولوی صاحب کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ جب سیکنہ بیگم چائے کا کپ لیے اندر آئیں۔

”کیسے ہو بیٹا؟ اتنے دنوں بعد چکر لگایا۔“ خیریت دریافت کر کے انہوں نے شکوہ بھی کر ڈالا۔

”بالکل ٹھیک ہوں آنٹی! بس نئی جاب ڈھونڈنے میں مصروف ہوں تو ٹائم نہیں ملتا تھا۔“ حارث نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”بس اب جاب مل گئی ہے تو جلدی جلدی آیا کروں گا۔“

”جیتے رہو۔“ سیکنہ بیگم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سامنے کچھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

”شادی کے کیا ارادے ہیں بیٹا۔ اب تو خیر تمہیں اتنی اچھی نوکری بھی مل گئی ہے۔“

”شادی.....“ حارث کو وہ لڑکی یاد آئی۔

”بیٹا تم نے اس لڑکی کا نہیں بتایا جس کے لیے تم نے اسلام قبول کیا تھا۔“ مولوی احمد علی بھی کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔

”کہاں رہتی وہ؟ مجھے بتاؤ میں خود رشتہ لے کر ان کے گھر جاؤں گا۔“ مولوی احمد علی کو حارث کی صورت میں بیٹا مل گیا تھا وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔

امتحان

نگہت سیما

”ادی تم نے بھلا زندگی کو دیکھا ہی کب ہے۔ ایک محل سے نکل کر دوسرے محل میں آگئیں۔ پھولوں میں تلئیں، سونے کے پینگوڑے میں جھولیں، تمہارے ساتھ بھلا زندگی نے کیا برا کیا.....؟ یہی نا کہ مراد سائیں نے دوسری شادی کر لی..... پر تمہارا تو کوئی حق نہیں مارا نا..... اولاد تو ضرور چاہیے ہوتی ہے مرد کو۔ سات سال تمہیں بھی تو اس نے پھولوں کی تیج پر بٹھایا، ہاتھوں کا چھالا



”آج میں بہت خوش ہوں آج میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے تمہیں مانگا تھا۔ میرے پروردگار نے مجھے ہدایت بھی دے دی اور ہادیہ بھی۔“ حارث اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

”جانتی ہو میں نے تمہیں پہلی دفعہ کہاں دیکھا تھا؟“ ہادیہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ اسے ساری بات بتانے لگا کہ وہ کس طرح دور بین کے ذریعے اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ ہادیہ آنکھوں میں حیرت سموئے اس کی باتیں سن رہی تھی کہ فجر کی اذان پر حارث نے وال کلاک کو حیرت سے دیکھا۔

”ہم پورے چھ گھنٹوں سے باتوں میں مصروف ہیں اور پتا ہی نہیں چلا اتنی جلدی وقت گزر گیا۔“ ہادیہ نے اثبات میں گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔

”اب بھی بہت سی باتیں رہتی ہیں اور تم سے ایک بات بھی پوچھنا تھی اس لڑکے کے بارے میں۔“ حارث شرارت سے بولا۔

”کس لڑکے کے بارے میں؟“ ہادیہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”وہی..... وہ جو ایک لڑکا تمہیں بہت تنگ کرتا تھا، کیا نام تھا اس کا.....“ حارث نے خود کلامی کی اور ذہن پر زور ڈالنے کی ایکٹنگ کی۔ ”ہاں، مائیکل نام تھا شاید۔“ حارث کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔ اس کی بات سن کر ہادیہ بھی ہنس پڑی۔

حارث اٹھا اور تیار ہو کر مسجد کی طرف چل پڑا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہادیہ کے سنگ اس کی زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ وہ اس کی ہدایت کا سبب بنی تھی وہ اس کی ہادیہ تھی اس کے توسط سے اس نے اپنے رب کو پہچانا تھا اور ہدایت پا گیا تھا۔

حارث ہوں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔“ کچھ دیر اس کی حیرت سے لطف اندوز ہونے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

”اور تم ہی میری ہدایت کا سبب بنی ہو۔ تم نے اس دن میری رہنمائی کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اس دن میں بہت جذباتی ہو رہا تھا کہ کیسے ایک مڈل کلاس لڑکی مجھے رب کی عبادت کر سکتی ہے صرف مذہب کو بنیاد بنا کر..... بس پھر میں تمہاری بتائی مسجد میں چلا گیا۔ وہاں مجھے مولوی احمد علی مل گئے انہوں نے مجھے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرنے کو کہا۔ مجھے قرآن پاک کی تفسیر پڑھنے کی ہدایت کی۔ میں جیسے جیسے پڑھتا گیا میری ذات میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ مجھے اپنے اندر سکون اترتا محسوس ہونے لگا۔ میں نے اپنے رب کو پہچانا کہ وہ وحدہ لا شریک ہے، وہ اکیلا ہے نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔“ وہ بڑے جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ”اور پھر مجھے اپنی پچھلی پچیس سالہ زندگی پر بہت شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے اتنا عرصہ شرک کی زندگی گزاری ہے۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میں نے اتنا عرصہ اتنا بڑا گناہ کیا اس کی وحدہ لا شریک ذات کو ماننے سے انکار کیا۔“ ہادیہ بہت سنجیدگی اور انتہاک سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”مگر پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو بہت غفور الرحیم ہے۔ اگر بندہ سچے دل سے توبہ کر لے، وہ اپنی جبین نیاز اس کے حضور جھکا دے تو وہ رب کائنات اسے معاف فرما دیتا ہے۔ بس پھر میرے دل نے گواہی دے دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لا شریک ہے اور حضرت محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔“ ہادیہ کو اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا کہ اس رحمن ذات نے اس پر اتنا بڑا احسان کیا وہ اس شخص کی ہدایت کا سبب بن گئی..... اور یہ کہ اتنا بہترین شخص اس کی زندگی کا ساتھی بن گیا۔

پھرے صرف اس وجہ سے کہ سیکہ اسے نہیں سمجھتی، وہ کوئی بات اس کے ساتھ شیر نہیں کر سکتا۔“

بابا سائیں کو لا جواب کرنا آتا تھا اور تایا سائیں لا جواب ہو جاتے تھے اور وہ ادا مہروز اور بھابی کے پاس لاہور پڑھنے آگئی تھی۔

بابا سائیں کی تین ہی اولادیں تھیں۔ فیروز، مہروز اور پھر آمنہ شاہ..... مہروز نے بابا سائیں کی مرضی سے سیرینا سے شادی کی تھی..... جو ان کی یونیورسٹی فیلو تھی۔ اور وہ لاہور میں ہی سیٹلڈ تھا۔ مراد بھی بہانے بہانے ان کے گھر آ جاتا۔

”بھابی ہاشل کا کھانا کھا کر دل اوب گیا ہے۔“
”پہلے تو ہاشل کا کھانا اتنا برا نہیں تھا مراد بھابی ہاں بس اب ہو گیا ہے ناں۔“ اور بھابی سیرینا مسکرا دیتیں۔

اور پھر موقع ملتے ہی وہ اس کے گرد چکرانے لگتا، کتنے خوب صورت دن تھے وہ۔ محبت نے اس کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔

”تم پڑھی لکھی ہو، مراد تمہیں اتنا چاہتا ہے۔“
سیرینا کہتی.....

”کیا ادا مہروز آپ کو نہیں چاہتے؟“ وہ فوراً سوال کرتی۔

”چاہتے تو ہیں لیکن بڑا روکھا اور خشک بندہ ہے تمہارا بھرا۔“

سیرینا کا تعلق لاہور سے تھا۔
”پر بھوجائی مول تو کہتی ہیں کہ.....“ وہ جھجک جاتی۔

”بولوناں کہ عشق لڑایا ہے دونوں نے یہی کہتی ہے ناں مول۔“

”ہاں۔“ وہ نظریں جھکا لیتی۔
”تمہارا بھائی صرف میری ذہانت سے متاثر ہوا

تھا اور یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران ایک بار بھی اس نے کچھ نہیں کہا..... بس جس روز آخری پیپر تھا مجھ

”ہمارے ساتھ تو سائیں فیروز نے اتنا وقت کبھی نہیں گزارا، نہ ایسے چوتھلے کیسے جیسے تو کرتا ہے مراد.....“

”یہ تو ادا فیروز سے پوچھو بھوجائی وہ تمہارے باز کیوں نہیں اٹھاتا میں تو اپنی بیوی کے ناز اٹھاؤں گا۔“ مراد ہنس کر شرارت سے اسے دیکھتا۔ اور وہ

کیسے فخر سے گردن اکڑا کے بھوجائی مول کو دیکھتی تھی مراد مول دو سالہ عمر کو گود میں بھرے جب ادا فیروز

گود میں تھی تو اس کی گردن بھی ایسے ہی فخر سے اکڑی ہوتی۔ مراد نے اسے چاہا بھی تو بہت تھا۔

وہ اس کے بچپن کی منگ تھی اور سگے چاچا کی بیٹی..... مراد تو بچپن سے ہی چکور کی طرح اس کے

گرد چکراتا تھا۔ اللہ نے اسے بے تحاشا حسن سے نوازا تھا اور پھر وہ واحد لڑکی تھی جو پڑھ رہی تھی۔ تعلیم

نے بھی اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا، پہننا سب مختلف تھا..... جو یلی کی

دوسری لڑکیوں سے الگ ہی دکھتی تھی وہ۔ اس کے اللہ نے اسے بھر بھر کے دیا تھا سب کچھ..... پیار،

محبت، دولت۔ سارے ریت رواج ایک طرف رکھ کر بابا سائیں نے اسے شہر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔

”ادا کیا کرے گا اسے اتنا پڑھا کر..... کام کاج سارا جانتی ہے، چار حرف لکھ کر پڑھ لیتی ہے،

بس کافی ہے۔“ بڑے بابا نے منع بھی کیا تھا۔
”مراد جو اتنا پڑھ رہا ہے تو کیا میری بیٹی ان

پڑھ رہ جائے..... قدر نہیں کرے گا وہ میری بیٹی کی..... وہ مراد جتنا نہ پڑھے پر اتنا تو پڑھ لے کہ

مراد کے قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔“
”نہ تو پہلے کون سا ہماری بیٹیاں بہویں

شوہروں کے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہیں جواب آمنہ نے چلنا ہے؟“

”چلو دو قدم پیچھے سہی بابا پر جب دونوں مل کر بیٹھیں تو ایک دوسرے کی بات سمجھ تو سکیں ناں، ایسا

نہ ہو کہ سکندر کی طرح مراد شہر میں دوستیاں بناتا

نہیں کرتا ناں..... پھر ہمیں کیا پتا پیدا کرنے والے کو کیا آزمائش مقصود ہو جو اس نے تمہارے اندر یہ کی رکھ دی۔“ آج پھر ماروی اسے سمجھا رہی تھی۔

”آزمائش.....؟“ آمنہ شاہ حیرت سے ماروی کو دیکھنے لگی۔

”ہاں تمہارے صبر اور شکر کی آزمائش ادی! کیا پتا تمہارا یہ صبر اور شکر مراد سائیں کو کبھی تم سے دور نہ

جانے دے۔“ وہ اسے امید دلاتی۔
”بھلا کبھی کسی نے ساری عمر بے ثمر درختوں کی

بھی آبیاری کی ہے ماروی؟“ آمنہ شاہ کا دکھ اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگتا۔

”جن درختوں پر پھل نہیں لگتا ادی وہ چھاؤں تو دیتے ہیں ناں..... ان کی لکڑی تو کام آتی ہے پھر

وہ بے ثمر کیسے رہے؟“ ماروی نے بڑی سمجھ کی بات کی تھی۔

”یہ تجھے اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا کہاں سے آگئی ہیں ماروی؟“

”بس زندگی نے سکھایا ہے ادی۔“ وہ اداسی سے بولی۔

”تم نے نہ تو بڑی بڑی کتابیں پڑھیں، نہ اسکول، کالج کی شکل دیکھی اور کوئی باتیں سنے تمہاری

تو فلسفیوں جیسی۔“ آمنہ شاہ حیرت سے کہہ رہی تھی۔
”ادی زمانے کی کتاب تو بچپن سے پڑھ رہی

ہوں، تب سے..... جب شاید الفاظ بھی بولنا نہیں آتے۔ ہاں، آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں اور دل پر

نقش ہو جاتا تھا۔“
کسی نے ماروی کو آواز دے کر بلا لیا اور آمنہ اپنے

کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ وہ تھی اور اس کی سوچ.....
☆☆☆

کوئی اتنی پرانی بات تو نہیں تھی جب سب اسے رشک سے دیکھتے تھے۔ سائیں مراد تو اسے لیے لیے

پھرتا..... بھوجائی مول تو جل کر رہ جاتی.....

بنائے رکھا اور اب بھی تجھے بھولا تو نہیں ہے۔ اب بھی چکر تو لگا رہتا ہے دو تین مہینے بعد۔“ وہ کچھ دیر سانس لینے کو رکھی۔

”ہمیں دیکھو زندگی نے تو ہمیں ٹھوکروں پر رکھا ہوا ہے ادی! پیدا ہوتے ہی فٹ بال کی طرح اچھالنا

شروع کر دیتی ہے، کبھی ہماری طرف آؤ تو تمہیں پتا چلے زندگی کیسے ٹھوکروں پر رکھتی ہے۔“ ماروی کسی

دانشمند کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔
”تم کیا جانو ماروی..... زندگی نے ہم سے کتنا

بڑا امتحان لیا ہے..... دیکھو ناں ایک مرد کے شادی کر لینے سے کیسے سب نے آنکھیں پھیر لیں، کوئی

پوچھتا نہیں، بلاتا نہیں..... تائی حاجراں..... نہ ادی سیکہ..... نہ ادا سکندر اور نہ ہی اس کی بیوی.....“

آمنہ شاہ اسے کسی سہیلی کی طرح اینا دکھ بتانے لگی۔
وہ اب اکثر سوچنے لگی تھی زندگی کبھی کبھی

انسان سے بڑا سخت امتحان لیتی ہے۔ جیسے زندگی نے اس سے لیا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کیا زندگی ہر ایک سے

ایسا ہی سلوک کرتی ہے، جیسا اس نے میرے ساتھ کیا۔ تب وہ اپنے ارد گرد موجود ہر چہرے کو کھوجنے

لگتی..... اور اس کے ارد گرد بسنے والے ہر چہرے پر نظر اسے جو سکون، طمانیت اور خوشحالی کے رنگ

بکھرے نظر آتے، وہ اسے بتاتے کہ نہیں زندگی ہر ایک کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتی..... کم از کم اس

کے ارد گرد بسنے والے لوگوں کے ساتھ زندگی نے بہت اچھا سلوک کیا تھا..... شاید صرف وہ ہی ہے تنہا

جسے زندگی نے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا ہے۔
”اولاد کا نہ ہونا کوئی ایسا عیب تو نہیں ادی

جس پر تمہیں شرمندگی ہو، یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ نے اگر تمہارے اندر کوئی کمی رکھ دی ہے تو

اس کی مرضی..... یہ تو بنانے والے پر ہے ناں وہ جیسا چاہے ڈھال دے، جیسا چاہے بنادے۔

چاک پر گھومتا برتن اپنی مرضی سے تو کوئی شکل اختیار

سے آکر کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، جلد ہی رشتہ بھیجے گا..... اور میں ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔“

”اور مراد.....“ آمنہ سوچتی..... اس کے پاس تو الفاظ کا نہ جانے کتنا بڑا ذخیرہ تھا جو وہ ہر روز اسے دانتا تھا۔

”آمنہ کبھی کبھی تو لفظ کم پڑ جاتے ہیں تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ تم میرے لیے کیا ہو۔“

وہ ایسا ہی تو تھا اس کی محبت میں دیوانہ اور پھر نہ جدائی کا خوف تھا، نہ محبت کی ناکامی کا ڈر۔ سکینہ کی شادی بردونوں کا نکاح بھی ہو چکا تھا اور آمنہ شاہ جتنا بھی خوش ہوتی، فخر کرتی کم تھا اور پھر اس کے گریجویشن کرتے ہی مراد نے رخصتی کا شور مچا دیا۔

”مجھے ایم اے تو کرنے دو مراد۔“

”بس اور صبر نہیں ہوتا آمنہ..... بہت انتظار کر لیا۔“ اور پھر گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور وہ مراد کی دلہن بن کر اس کے آنگن میں اتر آئی۔ زندگی پہلے بھی کم خوب صورت نہ تھی اب مراد کی سنگت میں اور بھی خوب صورت ہو گئی تھی..... ادی سکینہ، تائی حاجراں سب ہی اس سے محبت کرتے تھے..... پھر کون سا وہ کسی غیر کے گھر گئی تھی جو اسے کوئی پریشانی ہوتی، وہ پیا کے من کو بھائی ہوئی تھی تو سب ہی اس کی قدر کرتے تھے۔ سات سال پورے سات سال وہ مراد کی محبتوں کے ہنڈولے میں جھولتی رہی..... اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ گھر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں..... وہ باتیں جو پہلے دبی دبی زبان میں ہوتی تھیں انہی باتوں کے نیچے بلند ہو گئے اور شاید بدل بھی گئے تو وہ چونکی۔

”مراد یہ کیا ہے؟“

”کیا؟“ مراد نے نظریں چرائیں۔

”یہی ادی سکینہ اور تائی حاجراں جو تمہاری دوسری شادی کی باتیں کر رہی ہیں۔“

”ہاں..... اماں چاہتی ہیں میں شادی کر لوں

اولاد کی خاطر.....“

”اور تم کر لو گے مراد دوسری شادی؟“

اس نے بڑے مان سے اسے دیکھا اور پھر اس کا مان ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

”میں تمہارا پہلے کی طرح ہی خیال رکھوں گا آمنہ..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں آج بھی..... میں ساری زندگی انتظار کر سکتا تھا لیکن تم جانتی ہونا ڈاکٹر نے تو کوئی آس ہی نہیں دلائی..... صاف کہہ دیا زندگی بھر تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی..... پھر تم ہی بتاؤ بابا سائیں اور اماں کی بات کیسے ٹالوں؟“

”کیا زندگی اولاد کے بغیر صرف محبت کے سہارے نہیں گزر سکتی مراد؟“ اس نے بڑی آس سے اسے دیکھا۔

”ہم ایڈمی سینٹر سے کوئی بچہ لے لیں گے۔“ وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔

”وہ بچہ ہمارا تو نہیں ہو گا نا آمنہ، اس سے بابا کی نسل تو نہیں چلے گی..... اور پھر میں کہہ رہا ہوں آمنہ تمہارا جو مقام ہے وہ بھلا رائیل کا کیسے ہو سکتا ہے۔“

رائیل سومر و تائی حاجراں کی بیٹی تھی اور مراد کی ماموں زاد تھی۔ تائی تو پہلے دن سے ہی چاہتی تھیں مگر شوہر اور دیور کے آگے کچھ نہ کر سکیں مگر اب انہیں جواز مل گیا تھا۔ وہ اسے تسلیاں اور دلا سے دیتا رہا۔

”دیکھو، میرا پہلا بچہ تمہاری ہی گود میں پلے گا آمنہ۔“ اس نے شاید آمنہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کیا اب آمنہ کبھی خوش ہو سکتی تھی۔ کوئی بھی بھلا و کوئی بھی لفظ اسے خوشی دے سکتا تھا؟ پھر مراد، رائیل سومر کو بیاہ کر کرچی لے گیا..... اس گھر میں جو اس نے آمنہ کے لیے خریدا تھا۔

شروع کے دنوں میں تو وہ مہینے میں دو چکر لگاتا..... آمنہ کو اپنی محبتوں کا یقین دلاتا..... پھر دو مہینے بعد..... پھر وقفہ بڑھنے لگا اور اب تو چھ ماہ

ہو گئے تھے اسے گھر کا چکر لگائے۔ رائیل جو ان پڑھ تھی اور معمولی شکل صورت کی تھی..... اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی تھی لیکن اب اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس نے مراد کے دل سے آمنہ کا نام کھرچ ڈالا تھا۔ وہ جو کہتا تھا تمہارے بنا ایک، ایک لمحہ صدی بن جاتا ہے..... وہ چھ ماہ سے اسے بھولا ہوا تھا اور ماروی کو کیا پتا کہ یہ کتنا بڑا امتحان تھا جو زندگی آمنہ شاہ سے لے رہی تھی کہ مراد سائیں، رائیل میں کھو کر اسے بھلا چکا تھا۔

ادی سکینہ اور بھوجائی مول عجیب نظروں سے اسے دیکھتی تھیں اور اسے ان کی نظریں اپنے اوپر ہنستی محسوس ہوتیں۔ اسے بھابی سیرینا کی یہ بات بہت یاد آتی تھی کہ ”جو بھائے پیامن وہی سہاگن۔“ اور اس نے سارے لٹے، گوٹے، ستاروں اور موتیوں والے کپڑے سنبھال کر بکسوں میں رکھ دیے تھے کہ ایسے کپڑے تو من چاہی سہاگنیں پہنتی ہیں ناں.....

”نہ، نہ، ادی ایسا نہ سوچا کریں۔“ ماروی اسے ٹوک دیتی۔ ”اللہ سائیں مراد کو سلامت رکھے.....“

ماروی کے ساتھ اس کا بڑا دل لگتا تھا..... ماروی پندرہ سولہ سال کی تھی لیکن باتیں ایسی کرتی جیسے ایک دنیا دیکھ رکھی ہو۔ ماروی کو ادا جہر روز لایا تھا اس کے پاس۔

”اسے رکھ لو آمنہ..... بڑی اچھی لڑکی ہے، تیری خدمت کرے گی، اسے بس پناہ چاہیے اور گھر کا تحفظ.....“

ادا کو وہ کہاں سے ملی تھی..... اور اس کا خاندان کیا تھا اس نے کوئی کرید نہیں کی۔ وہ تو مراد کے جانے کا غم مناتی تھی۔ سارا دن ماروی پاس بیٹھی ہوتی تب بھی وہ کھوئی رہتی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ اب ماروی نے اس کے چھوٹے چھوٹے کام اپنے ذمے لے لیے۔ اس کے کپڑے استری کرنا..... کمرے کی صفائی کروانا..... چیزیں ترتیب سے رکھنا..... ڈانگ ہال میں جانے کا موڈ نہ ہو تو ناشتا کھانا سب ٹرے میں سجا کر لے آتی اور اسے تو یہ بھی

امتحان

پتا نہیں چلا کہ کب ادی سکینہ اور تائی حاجراں نے بھی ماروی کو اپنے کاموں کے لیے بلانا شروع کر دیا تھا۔ ہو لے ہو لے وہ ماروی کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ اس سے اپنی باتیں اور دل کے بھید کہنے لگی..... اسے لگنے لگا تھا کہ ماروی اس کی سہیلی ہے جو اس سے زیادہ سیانی ہے۔

”ماروی تو روتی کیوں ہے؟“ اس روز اپنے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے اسے روتے دیکھ کر آمنہ نے پوچھا۔

”بس یونہی ادی۔“

”یونہی تو کوئی نہیں روتا ماروی، اتنی چھوٹی سی عمر میں کیا دکھ پال لیے ہیں تو نے؟“ وہ بڑی ہمدردی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”دکھ تو ہمیں ورثے میں ملتے ہیں ادی۔ میراث ہوتے ہیں ہماری۔“

”پھر بھی کیا دکھ ہے کچھ تو کہو کیوں روتی ہو؟“

”کہاناں ادی یونہی روتی ہوں..... ابابا یاد آتا ہے..... اپنی ادی یاد آتی ہے..... اپنا گوٹھ یاد آتا ہے..... اپنے سے چھوٹا بھائی شہباز قلندر یاد آتا ہے۔“ اور آمنہ شاہ کو ہنسی آ گئی۔

”بھئی کیا بات ہے، تمہارا نام ماروی، باپ کا نام وتا یو فقیر، بھائی کا شہباز قلندر، شاہ لطیف کسی کا نام نہیں ہے کیا؟“ وہ مذاقاً کہنے لگی۔

”میرے چاچا کا نام ہے، شاہ لطیف اور یہ سارے نام میری دادی نے رکھے تھے۔ شاید وہ سمجھتی تھی ایسے نام رکھنے سے ابا دتا یو فقیر اور چاچا شاہ لطیف جیسے بن جائیں گے۔“ وہ سر جھکائے ناخنوں سے کارپٹ کے ریشوں کو ادھر ادھر کر رہی تھی۔

”تجھے سب یاد آتے ہیں ماروی تو، تو ان سے ملنے کیوں نہیں چلی جاتی..... کہاں ہے تیرا گوٹھ، چل میں تجھے ملانے لے چلتی ہوں۔“

”میں گوٹھ جا سکتی ادی، ان سب سے مل سکتی تو

سارنگ کو دے دیا تھا..... سارنگ کی نوایاں بھی شاید عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ میری عمر بارہ سال تھی ادی اور سارنگ کی ستر کے قریب تو ضرور ہوگی۔“ آمنہ شاہ نے دانتوں میں انگلی داب لی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”پھر کیا تیری شادی ہوگئی اس بڑھے سے؟“ ماروی کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

”نہ ادی میری شادی نہیں ہوئی..... میں تو.....“ لمحے بھر کے لیے وہ چپ کر گئی..... پھر اس نے سر اٹھا کر آمنہ شاہ کی طرف دیکھا جو اب بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں تو نئے نئے کپڑے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ کپڑے اور چوڑیاں جو سائیں سارنگ نے بھجوائی تھیں لیکن وہ جو میری ادی تھی وہ مجھے گلے لگا لگا کر روتی تھی اور بابا کے سامنے ہاتھ جوڑتی تھی اور مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ادی اتنا رونی کیوں ہے اور بابا سے کیا کہتی ہے۔“

”تو جا اپنے گھر۔ بابا نے ایک دن ادی سے کہہ دیا۔ میرے معاملے میں نہ بول۔ ادی رونی ہوئی جانے لگی تو میں ان سے لپٹ گئی اور رو کر کہا۔

ادی نہ جاؤ۔ ادی کی شادی اماں کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی اور وہ دوسرے گوتھ میں رہتی تھی۔ وہ بابا کی طرف دیکھنے لگی۔ بابا کچھ کہے بنا باہر نکل گیا..... ادی ایک بار پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی..... اس رات ادی نے مجھے بتایا تھا ”دو دن بعد سائیں سارنگ سے تیرا بیاہ ہے اور وہ جو سارنگ کی بیٹی ہے ناں پتل وہ بدلے میں ہماری ماں بن کر اس گھر میں آئے گی۔“ میں آنکھیں پھاڑے ادی کو دیکھتی رہی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس رات ہم دونوں بہنیں جاگتی رہیں۔ دوسری کوٹھڑی میں بابا اور شہباز قلندر سوتے تھے۔ صبح ادی نے جب بابا کو

”میرا اتنی مشکل بھی تو نہیں ہے نا ادی رت سائیں کبھی آپ کی زندگی مشکل نہ کرے۔“

”ماروی تو بھی ناں..... تو نہیں سمجھتی میرا دیکھ..... تیرے ساتھ ایسا ہوتا ناں تو.....“

”میرے ساتھ جو ہوا ہے ادی اللہ سائیں کسی کے ساتھ ایسا نہ کرے۔“ ماروی ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”تیرے ساتھ.....؟ تو نے بتایا نہیں کہ تیرے ساتھ کیا ہوا..... تو کیوں نہیں اپنے گوتھ جاسکتی؟“

”میرے ساتھ ادی.....“ ماروی کی آنکھیں جلنے لگیں تو اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”میری ماں جب مری تو میری عمر دس سال تھی دو سال بعد میرے باپ نے مجھے ”پیٹ دے دیا۔ جانتی ہوناں ادی.....“ پیٹ دینا“ کی رسم کیا ہوتی ہے؟“

”نہیں۔“ آمنہ شاہ حیرت سے اسے تکنے لگی۔

”ہاں تمہیں بھی کیا خبر ہوگی ادی، تم شہروں میں رہیں، شہروں میں بلی بڑھیں جو وقت تم نے ادھر گزارا بھی تو اپنے گھر میں حویلی میں بند..... تم کیا جانو ادی ہمارے رسم و رواج، کیسے ہمیں مل جل مارتے ہیں، پتا نہیں یہ رواج کس نے ڈالے تھے، ادی تجھے کچھ خبر ہے؟ اس نے سر اٹھا کر آمنہ شاہ کو دیکھا اور اپنی طرف اسے دیکھتا یا کر ماروی کو کچھ یاد آیا کہ وہ تو اسے ”پیٹ دینا“ کے متعلق بتانے لگی تھی۔

”ادی اس رسم کا مطلب ہے بیٹی کے بدلے بیٹی دینا، میرے بابا نے بھی سائیں سارنگ کی بیٹی سے شادی رچالی اور بدلے میں مجھے سائیں سارنگ کو دے دیا..... سارنگ کی چار بیٹیاں تھیں بیٹا کوئی نہیں تھا اس لیے بابا نے مجھے سارنگ کو ہی دے دیا..... سارنگ عمر میں میرے بابا سے بھی دس سال بڑا تھا۔ اس کی تین بیٹیاں بیاہی تھیں اور ایک کنواری جس کا رشتہ بابا نے لے کر بدلے میں میرا رشتہ

اس حویلی میں صرف آمنہ کی ہو کر رہی تو جلد ہی اس پناہ گاہ سے نکال دی جائے گی پھر وہی آبلہ پانی کا سفر جس کی مسافت کے نشان اب بھی روح اور جسم پر موجود تھے۔ اسے لگتا تھا جیسے پاؤں اب بھی دھوپ کی شدت سے جلتے ہوں اور چھالوں سے لہو بہتا ہو سو اس نے ادی سیکنہ کو بھی خوش رکھا ہوا تھا اور تائی حاجراں کو بھی..... اور آمنہ شاہ تو تھی ہی اپنی محبت کے پکھڑ جانے کے غم میں ڈوبی اسے اپنے ارد گرد ماروی کی موجودگی کا کم ہی احساس ہوتا تھا۔

اب بھی ماروی چلی گئی تو وہ ماضی میں کھو گئی تھی..... سات سالوں پر محیط ماضی..... جب شادی کے بعد پہلی بار وہ مراد کے ساتھ نار دن ایریا گئی تھی۔ مراد کی بانہوں میں بانہیں ڈالے لالہ زار اور سیف الملوک پر گھومتی رہی تھی۔ وہ ایک ایک بات یاد کرتی..... اور یادوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا.....

”کیا سوچتی ہیں ادی؟“ ماروی ان کے کام انجام دے کر واپس آ جاتی۔

”سوچتی ہوں ماروی میرے جیسا بھی کوئی بد نصیب ہوگا؟“

”نہ ادی، ایسا تو نہ کہیں..... اللہ نہ کرے آپ بد نصیب ہوں۔“

”اور بد نصیبی کیا ہوتی ہے ماروی؟“ آمنہ شاہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ”مراد مجھے بھول ہی گیا ہے۔ کتنے مہینے ہو گئے ہیں۔“

”کیا پتا کسی کام میں اب مجھے ہوں؟“

”ایسے بہلاؤؤں سے کیا میں بہل جاؤں گی ماروی؟“

”بہلانا تو پڑتا ہے ناں ادی..... ورنہ زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔“ ماروی کسی ناصح کی طرح اسے سمجھاتی۔

”زندگی اب کون سی آسان ہے؟“

یہاں کیوں آتی..... انہیں یاد کر کے کیوں روتی..... وہ بڑے دکھ سے کہہ رہی تھی۔

”تو کیا زندگی ماروی سے بھی امتحان لے رہی ہے۔“ اس نے یہ آواز بلند سوچا تھا یا ماروی نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

”ہمیں تو پیدا ہوتے ہی ایسا امتحانی پرچہ تھا دیا جاتا ہے جسے ہم ساری زندگی حل نہیں کر پاتے۔ بس پرچہ تھا امتحانی ہال میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ ہماری تو پوری زندگی ہی امتحان ہوتی ہے ادی۔ آپ کس امتحان کی بات کرتی ہیں۔“ اس نے بڑی گہری بات کی تھی۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں..... ماروی تو بھلا کیوں نہیں جاسکتی ان سے ملنے؟“

”کیا سائیں ہر روز نے آپ کو نہیں بتایا ادی؟“

”نہیں.....“ آمنہ شاہ نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں تو ادی.....“ وہ بتانے ہی لگی تھی کہ تائی حاجراں نے اسے بلالیا۔

”ماروی ذرا آکر میرے پاؤں داب دے۔“ ماروی معذرت طلب نظروں سے آمنہ شاہ کو دیکھتے ہوئے کارپٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے یہاں رہنا تھا اور وہ یہاں رہ کر تائی حاجراں اور ادی سیکنہ کی مخالفت مول نہیں لے سکتی تھی۔ بلاشبہ سائیں ہر روز نے اسے آمنہ شاہ کے پاس چھوڑا تھا..... وہ اس کی دوسرا ہٹ کے لیے اسے اس کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ حالانکہ اپنے بابا سائیں کی حویلی میں وہ اپنی ماں کے پاس بھی چھوڑ سکتے تھے لیکن انہیں آمنہ شاہ کے دکھ کا احساس تھا اس کی تنہائی کا خیال تھا..... اماں نے انہیں بتایا تھا کہ سارا دن بیٹھی دیواروں سے باتیں کرتی ہے اور انہوں نے یہ بات ماروی کو بھی سمجھا دی تھی لیکن ماروی کو زمانے نے جو سکھایا تھا اس نے اسے بتا دیا تھا کہ یہاں شاہوں کی

غزل

کیوں ہو گئی؟

ٹکست و ریخت کا یہ سلسلہ کہاں تک ہے
الچستی سانسوں کا یہ سلسلہ کہاں تک ہے
دعا میں مانگی تھیں خوشیوں کی، کیا ملا ہم کو
غم و آلام کا یہ سلسلہ کہاں تک ہے
محبوتوں کا یہ کشکول ہو گیا خالی
نہ جانے نفرتوں کا سلسلہ کہاں تک ہے
بتائے زندگی، اب کس طرح گزاریں تجھے
میری کہانی کا یہ سلسلہ کہاں تک ہے
خواب بُنتے ہی بنتے، جھپک گئی آنکھیں
خواب ٹوٹنے کا سلسلہ کہاں تک ہے

شاعرہ: رضیہ ناز، کراچی

”میرا بابا گورنمنٹ کے افسروں کی بات مان
جائے گا ناں..... میری شادی سارنگ نانا سے تو
نہیں کرے گا؟“

”ہاں.....“ اس نے مجھے یقین دلایا تھا اور
میں نے نہ سوچا نہ سمجھا نہ ادی سے ہی پوچھا اور ایک
آگ سے دوسری آگ میں کود گئی۔

”کیوں وہ عورت..... میرا مطلب ہے وہ
سارہ بی بی اچھی عورت نہیں تھی کیا؟“ آمنہ شاہ بے
تاب ہوئی۔

”پتا نہیں ادی۔“ ماروی نے انگلی کی پوروں
سے پلکوں کے کنارے پرانے آنسو کو پونچھا۔ ”اچھی
عورت تھی یا بری پر اس نے صرف اپنے فیدے

(فائدے) کا سوچا میرا نہیں ادی..... وہ مجھے
سارنگ سے بچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے لے
کر گئی تھی۔“

”اس نے تجھے اپنی نوکرانی بنالیا تھا کیا؟“
آمنہ شاہ نے پھر اسی بے چینی سے پوچھا۔
”نہیں۔“ ماروی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”ادی تم تو اتنی پڑھی لکھی ہواتی عقل والی ہو، تمہیں

”یونہی ادی..... اور کیا بتاؤں..... میں تو خیر
تھی ہی جھلی..... بے عقل..... ادی تو بابا کو ایک بار
پھر سمجھا کر بلکہ لڑکراپنے گوٹھ چلی گئی..... اور میں دل
ہلانے کو اپنی سہیلی سے ملنے چل دی..... میری سہیلی
سارنگ کی نواسی تھی۔ ادھر میں نے سارنگ سائیں کو
دیکھا..... وہ چار پائی پر بیٹھا کھجوریں کھا رہا تھا اور
مجھے گھور گھور کر دیکھتا جاتا تھا۔ میں ڈر کر کوٹھری میں
گھس گئی جہاں میری سہیلی تھی، وہ ہنس رہی تھی۔

”تو میری نانی بن جائے گی، تیرا بیاہ میرے
نانا سے ہوگا، مجھے اماں نے بتایا ہے۔“ میں گھبرا کر
باہر نکلی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے گھر سے نکل
آئی۔ میرے پیچھے سارنگ کا اونچا قہقہہ گونجتا تھا جس
کی آواز میرے کانوں میں دوڑتی ہوئی آئی۔ پھر مجھے
راستے میں سارہ بی بی نظر آئیں۔ میں بھاگتے
بھاگتے رک گئی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

”تیری ادی کیسی ہے؟“

”ادی تو چلی گئی واپس اپنے گھر۔“

”تو چلے گی میرے ساتھ کراچی؟“

”مجھے سارنگ کا دیکھنا یاد آریا، مجھے مول کی
ہنسی یاد آئی..... تو میری نانی بنے گی۔“ سارنگ کی وہ
لال، لال آنکھیں یاد کر کے میرے جسم پر چبوتیاں
سی رنگنے لگی تھیں۔ اس کا قہقہہ مجھے اپنے اندر چبھتا
محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سر اثبات میں ہلادیا۔ وہ
یکدم خوش ہو گئی۔“

”ٹھیک ہے، مغرب کے بعد ادھر سرکنڈوں
کے پیچھے آ جانا۔“

”پھر مجھے واپس چھوڑ دو گی ناں ادی؟“ میں

نے اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”کب.....؟“

”دو تین دن بعد۔“

چچ، چچ کرتی اور پھر ادی سے کچھ کہنے لگتی.....
بات تھی مجھے تو اس کی باتیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھیں۔
اس لیے میں اس کے جوتوں کو اس کے کپڑوں کو دیکھ
رہی تھی۔ پھر وہ چلی گئی تو ادی نے مجھے بتایا۔
”سارہ بی بی کہہ رہی تھیں تم اس کے ساتھ کراچی
چلی جاؤ تو تم اس ظلم سے بچ سکتی ہو جو بابا ستر سال
بڑھے سے تمہاری شادی کر کے کرنے والا ہے۔“
”کراچی؟ اس کے ساتھ اور تم لوگ.....؟“
حیرت سے میری آواز گنگ ہو گئی۔

”ہم.....“ ادی نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ وہ
کہہ رہی تھی کہ وہاں وہ بڑے لوگوں سے گورنمنٹ
کے بندوں سے بات کرے گی اور وہ بابا کو منع کریں
گے کہ وہ یہ ظلم نہ کرے۔“

”تو؟“ میں نے ادی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”وہ جا
کر خود ہی بات کر لے ناں گورنمنٹ کے بندوں
سے۔ میں کیوں جاؤں اس کے ساتھ؟“

”وہ کہتی ہے تمہارے جائے بنا بات نہیں بن
سکتی ماروی۔“

”تم میرے ساتھ چلو گی ادی؟“ مجھے سمجھ نہیں

آ رہا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔

”نہیں، میں بھلا کیسے.....؟“ ادی پریشان ہو گئی

تھی۔ ”تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا ماروی۔“

”تو پھر میں نہیں جاؤں گی ادی۔“ میں نے

اس کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔ ادی رونے لگی۔

روتے روتے چپ ہو کر اس نے مجھ سے کہا۔

”سن ماروی، بابا میری بات نہیں سنتا میں تھی

سے بات کرتی ہوں وہ بابا کو سمجھائے۔ تھی میرا بہنوئی

تھا۔“ ماروی نے آمنہ کو بتایا۔

وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گئی تو آمنہ شاہ جو

بہت انہماک سے اس کی کہانی سن رہی تھی چونک کر

اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں بول ناں ماروی..... پھر کیا ہوا تو چپ

چائے پانی دیا تو وہ ادی سے کہہ رہا تھا۔
”تو تو پاگل ہو گئی ہے۔ میں کوئی انوکھا کام تو
نہیں کرنے جا رہا؟“ اور پھر بابا روٹی کھا کر کام پر
چلا گیا اور ہم دونوں بہنیں چائے اور روٹی سامنے
رکھے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں اور روٹی رہیں۔
اسی وقت ہمارے گھر میں وہ آگئیں، سارہ بی بی.....
سارہ بی بی بڑی حویلی میں مہمان بن کر آئی تھیں۔
ہماری تو آنکھیں ہی پھٹ گئیں انہیں دیکھ کر، میں
نے چپکے سے ادی کو بتایا۔ ”یہ بڑی حویلی کی مہمان
ہیں۔ شہر سے آئی ہیں۔“

”پر ہمارے گھر کیسے آگئیں؟“ ادی کی حیران
آنکھوں میں صاف لکھا تھا۔

”مجھے پتا ہوتا تو میں پوچھتی کیوں۔“ میں نے
آنکھوں ہی آنکھوں میں لاعلمی ظاہر کی تب سارہ بی بی
نے خود ہی عقدہ کھول دیا۔

”میں نے سنا ہے اس بچی کی شادی ایک ستر
سالہ بوڑھے سے ہو رہی ہے؟“ وہ میری طرف
اشارہ کر کے ادی سے کہہ رہی تھیں۔ ادی بوکھلائی سی
کھڑی تھی۔

”بیٹھیں..... بیٹھیں ناں بی بی۔“ اس نے
موڑھا اٹھا کر اپنے دوپٹے سے صاف کیا تھا حالانکہ
وہ صاف ہی تھا اور سارہ بی بی کو اس نے بیٹھنے کے
لیے کہا..... سارہ بی بی بیٹھ گئیں..... بیٹھنے کے بعد
انہوں نے نظروں ہی نظروں میں پورے گھر کا جائزہ
لیا اور اپنا تعارف کروانے کے بعد ہم سب کے
متعلق پوچھا۔

ادی اسے اپنے، میرے، بابا اور شہباز کے
متعلق بتا رہی تھی اور میں اس کے گورے گورے
ہاتھوں اور پیروں کو دیکھتی رہی اور اس کے خوب
صورت لباس سے اٹھنے والی خوشبو کو گہری سانس کھینچ
کر محسوس کرتی رہی۔ میرا دھیان اس کی باتوں کی
طرف تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار تاسف سے مجھے دیکھتی

تو پتا ہوگا کہ اس نے کس فیدے کے لیے مجھے.....
 ”نہیں.....“ آمنہ شاہ کچھ سوچ کر کانپ گئی۔
 ”کیا وہ تم سے غلط کام کروانا چاہتی تھی؟“
 ”نہیں.....“ ماروی نے پھر نفی میں سر ہلایا تھا۔
 آمنہ شاہ اب حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”اچھا یہ بتاؤ تجھے یہاں سے سیدھے کراچی
 لے گئی تھی یا کہیں اور؟“

”ادی اس شام اذانوں کے بعد جب بابا گھر
 پر نہیں تھا اور شہباز کہیں دوستوں کے ساتھ تھا، میں
 چپکے سے دروازہ بھیڑ کر باہر نکل کر سرکنڈوں کے
 پیچھے آ گئی۔ میں جو امتحان دینے جا رہی تھی مجھے اس
 کے بارے میں کچھ علم تھا، نہ پتا تھا اس پر پے میں کیا
 لکھنا ہوگا۔ میں خالی ہاتھ خالی دماغ کے ساتھ امتحان
 گاہ میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ سائرہ بی بی سرکنڈوں کے
 پیچھے اپنی گاڑی کے پاس کھڑی میری راہ دیکھ رہی
 تھی۔ انہوں نے مجھے ایک بڑی سی چادر اوڑھا کر
 پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا تھا اور وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ
 گئیں۔ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی تھی۔ راستے
 میں کوئی ملا ہی نہیں ادی..... ملتا بھی تو اسے کیا خبر
 ہوتی کہ گاڑی میں ماروی بیٹھی ہے جو بوڑھے
 سارنگ کی مکروہ ہنسی سے ڈر کر بھاگ رہی ہے اور جو
 آج کے بعد پھر کبھی اپنے گوتھ نہ آ سکے گی۔“
 آمنہ سانس روکے اس کی داستان سن رہی تھی۔
 ”رات کو ہم حیدر آباد میں ٹھہرے تھے۔ وہاں
 سائرہ بی بی کے کوئی جاننے والے تھے۔“

”میری ملازمہ ہے۔“ سائرہ بی بی نے وہاں
 بتایا تھا۔ اور مجھے چپ رہنے کو کہا تھا پھر کراچی آ کر
 اس نے مجھے اپنے خوب صورت گھر کے ایک کمرے
 میں ٹھہرایا۔ اس روز میری اس سے کوئی بات نہیں
 ہوئی۔ میں سارا دن اپنی ادی کو شہباز کو اور بابا کو یاد
 کر کے روتی رہی..... ادی کو پتا چلا ہوگا تو وہ روتی
 بیٹتی بین ڈالتی گھر آئی ہوگی۔ وہ ضرور بڑی حویلی بھی

گئی ہوگی اس نے بابا کو ضرور بتا دیا ہوگا کہ حویلی
 والوں کی مہمان بی بی مجھے اپنے ساتھ لے جاتا چاہتی
 تھی..... اور چاچا لطیف تو غصے سے پاگل ہو گیا
 ہوگا..... ایک عورت ٹرے میں کھانا رکھ کر مجھے دے
 گئی تھی۔ پر وہ تو پہلا قلم ہی میرے حلق میں پھنس گیا
 اور میں نے ٹرے پرے کر دی۔“

”تم نے اپنی طرف سے تو صحیح ہی کیا تھا
 ناں ماروی، آخر تمہیں یہ حق تو تھا کہ تم اس غلط فیصلے
 کے خلاف احتجاج کرتیں۔“ اسے خاموش دیکھ کر
 آمنہ شاہ نے کہا۔

”پتا نہیں غلط تھا یا صحیح۔ پر وہاں اس اکیلے
 کمرے میں میرا دم گھٹتا تھا اور دل گھبراتا تھا۔ پتا نہیں
 میں نے دن سے رات کیسے کی تھی رورو کر تڑپ تڑپ
 کر میرے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ کمرے
 میں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تب وہی ملازمہ آئی کہ مجھے
 بی بی بلاتی ہیں۔ باہر تو جیسے دن اتر آیا تھا۔ پوری کوٹھی
 جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ملازمہ مجھے ایک بڑے
 سارے کمرے میں لے گئی جہاں بہت سارے لوگ
 تھے۔ وہ پورا کمرہ لوگوں سے بھرا تھا۔ میں خوفزدہ
 ہو گئی تو سائرہ بی بی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ ہے وہ مظلوم لڑکی جو غلط رسم و رواج کی
 بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ ایک ستر سالہ بڑھے
 کے ساتھ اس کا باپ اس کی شادی کر رہا تھا۔“ سائرہ
 بی بی نے بڑی ساری تقریر کی وہ سب میری تصویریں
 بنارہے تھے۔ مجھ سے سوال کر رہے تھے اور میں
 حیران آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی مجھے ان کی
 باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ آمنہ شاہ کو یاد آیا۔ کوئی
 چار سال پہلے اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ سائرہ بی بی
 حقوق نسواں کی علمبردار کسی این جی او کی کرتا
 دھرتا..... اور بارہ سالہ ماروی پر ہونے والے ظلم کی
 داستان بیان کرتی..... مختاراں مائی کے واقعے کی

امتحان

والوں کو اور ٹی وی والوں کو بلا کر حقیقت بتا دیتی ہوں
 کہ سائرہ تمہیں اغوا کر کے لائی تھی لیکن جب میں
 نے ساری بات بتائی کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں
 تو وہ بہت مایوس ہوئی۔ ادی اس نے مجھ سے کہا کہ
 سائرہ نے بہت پیسہ بنایا ہے۔ تمہیں کیش کروایا ہے
 اس نے اور ابھی اور پیسہ بنائے گی یہ جو ہماری قوم
 ہے ناں ماروی یہ ذرا سی جذباتی بلیک میلنگ پر اپنے
 خزانوں کے منہ کھول دیتی ہے۔ مجھے اس کی باتیں
 سمجھ نہیں آئی تھیں۔ لیکن مجھے لگا تھا کہ جیسے وہ سائرہ
 بی بی سے جلتی تھی۔“

لیکن آمنہ شاہ ساری بات سمجھ گئی تھی۔ اور
 تاسف سے ماروی کو دیکھ رہی تھی اس کے ساتھ تو
 وہی ہوا تھا آسمان سے گرا ٹھوڑ میں اٹکا۔
 ”پھر تم ادا ہروز کے پاس کیسے پہنچیں؟“ آمنہ
 شاہ کا تجسس بڑھ گیا تھا۔

”ادی۔“ اس کی آنکھیں..... برسنے لگیں۔
 ”میں ایک امتحان گاہ سے نکل کر دوسری امتحان
 گاہ میں آ بیٹھی تھی۔ سائرہ بی بی کی سہیلی تو اچھی تھی.....
 میرے حالات پر دکھی ہوئی تھی لیکن جو اس کا خاوند تھا
 ناں وہ ٹھیک نہیں تھا۔ بڑی غلیظ نظریں تھیں تو میں بڑی
 مشکل سے اس کے خاوند سے خود کو چھڑا کر بھاگ
 آئی۔ گیٹ تک تو اس نے میرا پیچھا کیا۔ چھوٹا گیٹ
 کھلا ہوا تھا باہر کوڑے والا کھڑا تھا۔ چوکیدار اندر کوڑا
 لینے گیا تھا۔ میں باہر نکل کر ایک سمت تیز تیز چلتے لگی
 اور چلتے چلتے ہر روز سائیں کے گیٹ پر آ کر گر گئی۔“
 اس نے باقی کی داستان چند جملوں میں سمیٹ دی۔
 تائی حاجراں اسے آواز دے رہی تھیں۔ وہ پلو سے
 چہرہ پونچھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”تو، تو نے ادا ہروز سے کیوں نہیں کہا کہ وہ
 تجھے تیرے گوتھ چھوڑ آئے۔“
 ”سائیں نے کہا تھا یہ مشکل ہے پھر بھی وہ میری
 ادی سے ملے تھے۔ ادی نے کہا وہ بھی ادھر آنے کا نام

بول ابھی اڑ رہی تھی کہ یہ قصہ منظر عام پر
 آ گیا..... اور پھر حقوق نسواں کے لیے آواز بلند
 کرنے والوں کے بیانات، تبصرے..... پھر کسی
 اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی تھی۔

”ماروی کے قتل کی کوشش، باپ اور چاچا کی
 طرف سے۔“

”تو کیا پھر تمہیں سائرہ واپس گوتھ لے گئی تھی؟“
 ”نہ ادی۔“ ماروی کی آنکھیں آنسوؤں سے
 لبریز تھیں۔

”وہ تو مجھے پتا نہیں کہاں کہاں لیے پھری لیکن
 گوتھ لے کر نہ گئی۔ میں جب بھی کہتی تو وہ کہتی.....
 ”ایسا سوچو بھی مت..... وہ تو اب تیرے خون
 کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ جو واپس جاؤ گی تو کاری
 کر دیں گے۔“

”اور ایک دن دو بندے کوٹھی میں گھس آئے۔
 انہوں نے ڈھالے باندھے ہوئے تھے۔ میں سائرہ بی بی
 کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگ
 کر اندر آ گئیں۔ انہوں نے پھر اخبار والوں کو بلایا اور
 کہا مجھے قتل کر دیا جائے گا مجھے تحفظ ملنا چاہیے۔“
 ”وہ یقیناً تمہارے بابا اور چاچا ہوں گے۔“
 ”نہیں ادی۔“ ماروی نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ میرے کوئی نہیں تھے..... انہوں نے چہرہ
 چھپا رکھا تھا لیکن ان کی آنکھیں، ہاتھ پاؤں..... قد
 کاٹھ..... میں قسم کھا سکتی ہوں کہ نہ وہ بابا تھے نہ چاچا لیکن
 سائرہ بی بی نے اخبار والوں سے یہی کہا کہ وہ
 میرے بابا اور چاچا تھے جو مجھے قتل کرنے آئے
 تھے۔ سائرہ بی بی نے میرے تحفظ کی اپیل کی تھی.....
 پھر ایک روز مجھے وہ اپنی سہیلی کے گھر چھوڑ کر خود
 اسلام آباد کسی کام سے چلی گئیں..... اس کی سہیلی نے
 مجھ سے پوچھا کہ کیا سچ سچ میرا باپ میری شادی کسی
 لڑکے سے کر رہا تھا..... اگر یہ جھوٹ ہے تو مجھے
 قاتلوں نے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ابھی اخبار

کے حوالے نہیں کرتی رائیل..... بچہ تمہاری گود میں پلے یا میری..... ہے تو مراد کا بیٹا ناں..... جو نہیں ہم سب کے پاس رہے گا۔“ وہ رائیل کی بانہوں میں سکون سے پڑے بچے کو ایک بار پھر چوم کر بڑے وقار سے واپس مڑ آئی..... اور واپس مڑتے ہوئے اس نے دیکھا مراد شاہ کی آنکھوں میں چمک تھی..... وہی چمک جو کبھی اسے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آ جاتی تھی۔

رائیل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور آمنہ سوچ رہی تھی کہ اس نے رائیل کو ایک مشکل اور مسلسل امتحان سے بچالیا۔

”ادی از زندگی نے تم سے جو امتحان لیا تم اس میں کامیاب ہو گئی ہو۔“ اسی دوپہر اس کے پاؤں دباتے ہوئے ماروی اس سے کہہ رہی تھی۔ اور وہ چپ چاپ ماروی کو دیکھتی رہی۔ پتا نہیں وہ کامیاب ہوئی تھی یا ناکام لیکن وہ رائیل کو امتحان میں ڈال دینے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

اور کئی سال گزرنے کے بعد آج جب مراد تین بچوں کا باپ ہے اور پوری ایمانداری سے پندرہ دن اس کے پاس حویلی میں اور پندرہ دن کراچی رائیل کے ساتھ گزارتا ہے کیونکہ باوجود بہت کوشش کے وہ اپنا دل اتنا بڑا نہیں کر سکی تھی کہ رائیل کے ساتھ ایک جگہ رہ پائی۔ آج جب وہ سپرینا بھابی کے ساتھ مل کر ایک تحریک چلا رہی تھی لوگوں میں شعور جاگر کرنے کی تحریک، غلط اور بیسج رسم و رواج کے خلاف صحیح اسلامی شعور کی آگاہی..... بظاہر وہ بڑی مطمئن اور خوش تھی لیکن آج بھی آمنہ شاہ جب بستر پر لیٹی تو یہی سوچتی۔

زندگی کبھی کبھی آدمی سے بہت بڑا امتحان لیتی ہے..... جیسے اس سے لیا..... رائیل سے لیا اور جیسے ماروی سے لیا.....

رو پڑی۔ میں اکیلا اسے چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ پر اب جلدی آؤں گا۔“ آمنہ شاہ کا دل مراد سے بٹ کر کے خوش تو نہ ہوا لہذا اس پر اور بوجھ آن گرا۔

”مرد کے پاس تو ہزاروں بہانے ہوتے ہیں، ماروی۔ وہ یونہی گفتگوں سے بہلائے رکھتا ہے مجھے یقین کہ وہ آئے گا۔ وہ وہاں رائیل کے ساتھ خوش ہے ماروی۔“

لیکن اس کی توقع کے برعکس وہ آ گیا..... اور رائیل ہاتھ نہیں آیا..... اس کی گود میں ایک ماہ کا بیٹا تھا جو اس نے آتے ہی آمنہ کی گود میں ڈال دیا۔

”یہ تمہارا ہے آمنہ..... میں نے رائیل سے کہہ دیا تھا..... پہلا بچہ آمنہ کا ہوگا۔“ اس نے گود میں پڑے بچے کو دیکھا جو انگلیاں منہ میں ڈالے ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہا تھا۔ ماما کے سوتے اندر کہیں پھوٹ پڑے تھے اور آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ اس نے بچے کو بے اختیار بانہوں میں بھینچتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر مراد کے ساتھ کھڑی رائیل کی طرف دیکھا..... معمولی شکل کی رائیل کے چہرے پر ماما کا نور تھا اور ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ..... اپنی طرف اسے دیکھتے پا کر وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”ہاں..... ادی..... اب یہ آپ کا ہی ہے۔“ اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے کرب کو پتا نہیں کیسے آمنہ شاہ نے محسوس کر لیا۔ کیسے اس نے رائیل کی ماما کی توب جان لی۔ اسے لگا جیسے اس مسکراہٹ کے پیچھے زخمی ماما توب رہی ہے اور زندگی بھی کبھی کبھی آدمی سے کیسا امتحان لیتی ہے۔ ایسے ہی ایک امتحان کا اس وقت رائیل کو سامنا تھا۔ بچے کو گود میں لیے وہ اٹھی اور بچے کو رائیل کے حوالے کرتے ہوئے مراد کی طرف دیکھا۔

”میں ایک ماں سے اس کا بچہ نہیں چھین سکتی۔“ لیکن ادی میں اپنی خوشی سے آپ کو..... رائیل نے کہنا چاہا۔

”کوئی ماں اپنی خوشی سے اپنی اولاد اپنی سوکن

رو پڑی۔

”تم میرے لیے دعا کیا کرو، تم تو معصوم ہو۔ اللہ تمہاری دعا ضرور سنے گا۔“

”کیا دعا کروں ادی؟“

”تو دعا کر ماروی، اللہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے۔“

”نہ ادی نہ ایسی باتیں نہیں کرتے، اللہ سائیں ناراض ہوگا۔ اللہ سے صبر اور حوصلہ مانگو ادی، یہ امتحان تو حوصلے کے طفیل ہی پاس ہوتا ہے۔ موت مانگنا تو بد دعا ہے ادی۔ تم نے دیکھا ہے ادھر نیلے پیچھے پچھلے سال سے گھر بار چھوڑ کر بیٹھے لوگ..... بے چارے سیلاب کے ہاتھوں ستائے ہوئے..... ہر روز ادھر کمپ میں کوئی نہ کوئی مرتا ہے یا کوئی بیمار پڑ جاتا ہے، کبھی زندگی کو وہاں جا کر روتا کر لاتا دیکھو..... کس امتحان میں پڑے ہیں وہ لوگ.....“

”پڑے ہوں گے ماروی۔“ آمنہ شاہ کا دل بہت دکھی تھا۔ ”پر مجھے تو اپنا دکھ سب سے بڑا لگتا ہے۔“

”ادی تم مراد سائیں کو خود ہی فون کیوں نہیں کر لیتیں۔“

”میں.....؟“ اس نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں تم ادی اور کون..... مراد سائیں بھی تو کہتے ہوں گے ناں کہ آپ نے انہیں یاد ہی نہیں کیا..... آپ کو ان کی ضرورت ہی نہیں۔“

”ماروی وہ جانتا ہے کہ میں اس کے بغیر کیسے پل پل مری ہوں گی۔“

”ضرور پتا ہوگا ادی پر کبھی کبھی احساس جگانے کے لیے کنڈی تو کھٹکھٹانی پڑتی ہے ناں.....“ اس نے بڑے گڑ کی بات کی تھی اور اس نے کنڈی کھٹکھٹا دی تھی اور مراد بے چین ہو گیا۔

”میں تمہیں بھولا نہیں ہوں آمنہ، تم میری پہلی محبت ہو..... میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا بس مجبوری تھی..... رابی بیمار تھی ناں..... کئی مہینے سے

نہ لے۔ ورنہ چاچا اور بابا اس کے ٹوٹے کر دیں گے یا پھر کسی غریب کے ساتھ کاری کر دیں گے وہ ناحق مارا جائے گا۔“ وہ آمنہ کو بات بتا کر تیزی سے باہر نکل گئی کہ تائی حاجراں اسے پھر ریکارڈ ہی تھی۔

آمنہ شاہ سوچتی رہ گئی کہ زندگی کبھی کبھی انسان سے کیسا امتحان لیتی ہے جیسے زندگی نے اس سے لیا اور زندگی نے ماروی سے لیا اور ماروی کے لیے اس کا امتحان بہت بڑا اور میرے لیے میرا۔ ماروی بے چاری تو مفت میں ماری گئی..... باپ، بھائی، بہن سبھی چھوٹے اور حاصل حصول کچھ نہ ہوا اور کمانے والوں نے اس کے طفیل بہت کچھ کما لیا۔ یہ کیسی منافق دنیا ہے۔ کئی دنوں تک آمنہ شاہ کو ماروی کے غم نے افسردہ رکھا۔ وہ تاسف سے ماروی کو دیکھتی رہی..... اور اپنا غم بھولے رہی..... لیکن پھر ہولے ہولے اسے لگا کہ ماروی تو ایک ہی بار گزر گئی سارے دکھوں پر سے مجھے تو ہر لمحہ کانٹوں کی مسافت طے کرنی ہے۔ مراد کو رائیل کے سنگ دیکھنا آسان تو نہیں، ہر قدم..... امتحان..... ہر لمحہ مشکل.....

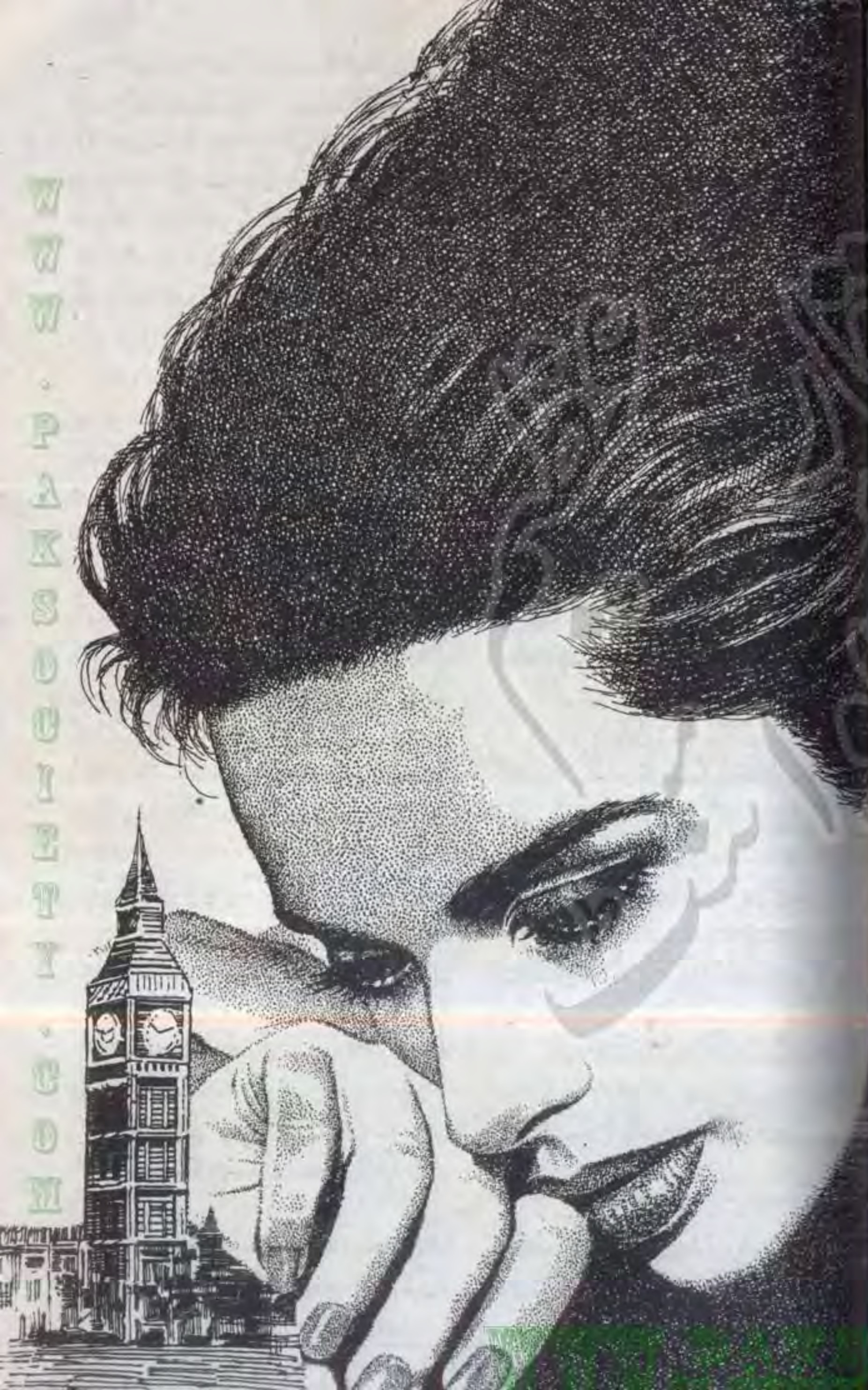
”زندگی تو ہر ایک سے ہی امتحان لیتی ہے ادی کوئی اس امتحان کو پاس کر لیتا ہے اور کوئی فیل ہو جاتا ہے۔“

”اور میں..... کیا میں اس امتحان میں پاس ہو گئی ہوں ماروی؟“ اور ماروی چپ کر جاتی اس کے پاس آمنہ کے سوال کا جواب تھا ہی نہیں یا پھر وہ دینا ہی نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

بہت سارے دن گزر گئے۔ آمنہ شاہ یونہی بے چین روح کی طرح گھر کے دالانوں اور غلام گردشوں میں پھرتی رہی..... ادا مراد کو کراچی اور رائیل کا ساتھ ایسا بھایا کہ وہ مڑ کر حویلی آیا ہی نہیں۔

”ماروی کسی روز میرا دل غم سے پھٹ جائے گا۔“ ایک روز آمنہ شاہ ماروی کا ہاتھ تھام کر



مکمل ناول



جانِ جاوید

عقیدہ محمدیگ

خود اپنے سے ملنے کا تو یارا نہ تھا مجھ میں
میں بھیڑ میں گم ہو گئی تنہائی کے ڈر سے
بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیا غم
منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے
لکے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہو گی
سورج بھی مگر آئے گا اس راہ گزر سے

ہجر و فراق کے بحر میں غوطہ زن معصوم دلوں کی دلگداز داستان

اس نے پوسٹ آفس کی راہ پکڑی۔ آج پھر وہ لیٹ ہو گیا۔ اماں کی تیز آواز نے اسے آخر کار واپس تلخ زندگی میں لا پھینکا جبکہ اس کا خواب تو صرف یورپ تھا۔ اس کے وہاں جانے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا مگر خدا کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا..... اس کی بہن فاطمہ کی موت اور اس کے والد قیوم صاحب کے ہارٹ اٹیک نے اس کی دنیا پلٹ دی۔

ابا کی بیماری کے بعد گھر کا سارا بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑا۔ اپنے تاریک گھر میں وہ داغ چراغ تھا..... جو اپنے والدین کو اپنی بہن فاطمہ کے دکھ سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اپنوں کی موت کا دکھ کیسے کم ہو سکتا تھا۔ قیوم صاحب جو محکمہ پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ ان کی جگہ اکرم نے سنبھالی اور بیرون ملک کی ٹکٹوں کو دیکھ دیکھ کر دن گزارنے لگا..... آدھے گھنٹے میں وہ پوسٹ آفس پہنچا تو لوگوں کی لمبی قطار سے اسے یاد آیا کہ آج بجلی کے بل جمع کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ اس نے تیزی سے اپنا کام نمٹایا اپنے کام سے فارغ ہوا تو سر میں درد سا اٹھنے لگا۔ اس کی وجہ بلوں پر پڑنے والی بار بار مہروں کی کھٹ کھٹ تھی۔ اس نے ایک بھر پور جمانی لی اور چپے ای سرزین بویکارا۔

”چاچا۔ چاچا ایک کپ چائے ملے گی۔“
”بیٹا سر میں درد ہے کیا؟“ خیر دین جو برسوں سے پوسٹ آفس میں صفائی کا کام دیکھ رہا تھا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ وہ جو ایک گھنٹے پہلے چائے کا کپ اسے دے چکا تھا اس کے دوبارہ طلب کرنے پر فکر مند سا ہوا۔

”ہاں، ہاں، چاچا۔ پچھلے کئی دنوں سے سر میں عجیب سا درد رہتا ہے۔“ اس نے اپنے سر کو دبا کر اکتاہٹ ظاہر کی۔

”صبح جلد اٹھ جاتے ہو، نئی ملازمت میں ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی تو

سر درد دور ہو جائے گا۔ میں ابھی اپنے بیٹے کے لیے بڑھیا سی چائے لاتا ہوں۔“ خیر دین نے صفائی والا کپڑا ایک طرف رکھا اور شفقت سے بولا اور ساتھ ہی اس کے کندھے پر ہتھکی دے کر تسلی دی، جس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ پوسٹ آفس کی ملازمت سے ناخوش ہے۔

خیر دین چائے لینے چلا گیا۔ اکرم نے آنکھیں موند لیں اور پھر اس نے اپنے جسم کو کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک چکا تھا۔ ابھی اور اسے مزید تین گھنٹے وہاں بیٹھنا تھا۔ وہ نیند کی آغوش میں جانے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

”سنئے، سنئے۔“ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک سیاہ چادر میں لپیٹی لڑکی کو پایا۔ اس نے آنکھیں مسلیں اور پھر قلم ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔

”جی کہیے!“ وہ شائستگی سے بولا۔
”یہ خط پوسٹ کرنا ہے۔“ لڑکی نے اپنے پرس کی زپ کھول کر اس میں سے ایک خط نکالتے ہوئے بتایا۔

”رجسٹری یا پھر نارمل پوسٹ؟“ اکرم نے اس سے خط پکڑ کر لندن کا ایڈریس پڑھ کر پوچھا۔

”رجسٹری کروانے کے کتنے پیسے ہوں گے؟“ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر نظریں جھکا کر پوچھا۔

”ایک سو اسی روپے!“ اکرم نے خط کا وزن کیا اور پھر خوشگوار موڈ میں بولا۔ وہ ایک دم مرجھا سی گئی۔ اس کے پرس میں صرف ایک سو پچاس روپے تھے۔

”کتنے دنوں میں پہنچ جائے گا؟“ اس نے چادر سنبھال کر پوچھا۔ جیسے کوئی دوسرا اسے پوسٹ آفس میں نہ دیکھ لے۔

”میرے خیال میں دس دن یا پھر پندرہ۔“ اکرم نے قلم اپنے کان میں اڑس کر جواب دیا۔ وہ پرس میں کچھ ٹٹولتی رہی۔

”رجسٹری کروں کیا؟“ اکرم نے خود سے اسے بے پروا دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”جی، جی..... مگر میرے پاس اس وقت ڈیڑھ سو روپے ہیں اگر آپ تمیں روپے کا ادھار کر لیں؟“ اس نے نظریں چرا کر ادھار کا سودا طے کیا۔

اکرم اس کے چہرے کو غور سے تنکے لگا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ اکرم نے اس معصوم سے چہرے کو نفی نہ کی اور خاموشی سے ٹکٹیں چسپاں کرنے لگا۔

”رجسٹری کر رہے ہیں؟ میں کل تمیں روپے دے جاؤں گی۔“ اس کی آواز میں کمی سی آگئی اکرم نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ کچھ سنبھلی۔

”جی ہاں، رجسٹری ہی کر رہا ہوں مگر یہ کیا؟“ اس نے خط کے دوسری جانب پر ایڈریس نہ دیکھا تو وہ چونکا۔

”کیا ہوا؟“ وہ گھبرا سی گئی۔ اکرم کے خط کو ٹھونسنے پر وہ فکر مند ہو گئی۔

”میڈم اپنے گھر کا ایڈریس تو لکھ دیں۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔

”میرے گھر کا..... کیوں؟“ وہ شک بھری نظروں سے اکرم کو تنکے لگی۔

”رجسٹری کے لیے آپ کو اپنا مکمل ایڈریس دینا ہوگا۔“ اکرم نے اسے پاس پڑے خطوط اٹھا کر دکھائے۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا کہ ایسا پوسٹ آفس کا اصول ہے۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا..... کہ آپ کسی اور کا ایڈریس لکھ دیں؟“ وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گئی پھر ایک دم بولی۔

”تو میڈم..... خط کا جواب آپ کو پھر نہیں آئے گا..... جس جگہ کا ایڈریس دیں گی خط وصول

کرنے والا اسی ایڈریس پر خط کا جواب پوسٹ کرے گا۔“ اکرم نے قلم اپنے کان سے ہٹا کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

وہ اپنے ہاتھوں کو مسلنے لگی..... اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی..... وہ بھی اس کی کیفیت سے بچھ سا گیا۔

”کیا آپ اپنے گھر کا ایڈریس دے سکتے ہیں؟“ لڑکی نے فکر مندی سے پوچھا..... اور اپنی چادر کو سنبھالا..... جو سر سے اتر گئی تھی۔

”کیا.....! میں؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا..... پہلے ادھار اور پھر گھر کا ایڈریس اس کے لیے دونوں باتیں بہت عجیب سی تھیں۔

”پلیز..... آپ میری مدد کر دیں..... میں اپنے گھر کا ایڈریس نہیں دے سکتی۔ آپ پلیز میری بات کو سمجھیں۔“ اس نے بے بسی سے بتایا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اکرم کے لبوں پر ابھری اور اس نے خط پر قلم چلا دیا..... وہ اب سکون میں دکھائی دینے لگی۔

”جی آپ کا کام ہو گیا.....“ اکرم نے رسید کاٹ کر اس کے حوالے کی..... اس نے شکریہ کر کے رسید پرس کی اندرونی جیب میں حفاظت سے رکھی اور پھر شائستگی سے بولی۔

”خط کا جواب..... پلیز ذرا خیال رکھیے گا۔“ اس نے بات کو ادھورا چھوڑا۔

”جی..... جی ضرور..... آپ کی امانت ہوگی، آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔“ اکرم نے اسے تسلی دی۔ لڑکی کے وہاں زیادہ دیر کھڑے ہونے سے باقی پوسٹ آفس کے ملازم اسے تنگھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شکریہ..... ادا کر کے وہ چادر سنبھالے باہر نکل گئی۔ اکرم نے دور جاتی لڑکی سے نظریں نہ ہٹائیں۔

”بیٹا..... بیٹا!“ خیر دین کی آواز نے اسے

اس سحر سے آزاد کیا۔

”جی..... جی چاہا۔“ اس نے شرمندگی سے نظریں چرائیں۔

”چائے بیٹا.....“ خیر دین نے ٹیبل پر کپ رکھا۔

”رحما آئی تھی کیا؟“ وہ پوسٹ آفس کے گیٹ پر تھی تو خیر دین نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کون..... رحما..... چاہا؟“ اس نے چائے کا سپ لے کر حیرانی ظاہر کی۔

”ارے وہی لڑکی جو ابھی ابھی گیٹ سے باہر نکلی ہے۔“ خیر دین نے کہا۔

”ہاں چاہا..... ایک لڑکی آئی تھی، کون ہے وہ؟“ آپ اسے جانتے ہیں؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔ وہ اس ابھی ابھی لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے بے قرار تھا۔

”رحما نام ہے اس کا..... بڑی پیاری بچی ہے، ہر ہفتے ایک خط ڈال کر جاتی ہے، بہت پریشان نظر آتی ہے۔ جیسے کوئی کمبخت روگ اسے نگل رہا ہو۔“

خیر دین نے اک آہ بھری اور پھر صفائی والا کپڑا اتھام لیا۔ اکرم نے چائے کا سپ لیا اور رحما کے خط پر لکھا ایڈریس بار بار پڑھنے لگا۔

☆☆☆

رحما کی بھی عجب کہانی تھی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ باپ بچپن میں فوت ہو گیا۔ اس کی ماں ثریا نے اسے پالا پوسا..... وہ اٹھارہ سال کی تھی جب اسے ارمغان نے پروپوز کیا۔ ارمغان اس کے کالج کا بہترین اسٹوڈنٹ تھا۔ دونوں میں دوستی ہوئی اور پھر وہ لندن جاتے وقت رحما سے اپنی محبت کا اظہار کر گیا..... کہ وہ اس کی منتظر رہے..... رحما نے بھی اس کی دوستی کو محبت کا رنگ دے دیا..... اور اس کا شدت سے انتظار کرنے لگی مگر اب چار سال سے

وہ مسلسل خط لندن بھیج رہی تھی مگر دوسری جانب سے ارمغان نے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ جس سے آہستہ آہستہ وہ بکھرنے لگی۔ رحما اپنی ماں سے اپنی دلی کیفیت چھپائے اپنے لیے آنے والے ہر شے کو ٹھکرادیتی..... ثریا، رحما کی نفی کو اپنی تنہائی کا سبب سمجھیں..... کہ ان کی بیٹی انہیں شادی کے بعد تنہا رہنے دنیا نہیں چاہتی..... مگر ثریا کو رحما کی فکر تھی.....

اس کے گھر کی فکر..... وہ ایک ماں تھیں..... ان کے بڑوس میں رہنے والی عظمت خالہ جو ثریا کی پرانی سہیلی تھیں..... وہ ہمیشہ دلاسا دیتی رہتیں..... کہ رحما اور نورین انشاء اللہ جلد ہی اپنے پیا گھر رخصت ہو جائیں گی..... اللہ کا کرم رہا..... تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عظمت خالہ کی ایک بیٹی نورین، رحما کی ہم عمر تھی۔ نورین کے ابا کا انتقال دو سال پہلے ہوا تھا..... اب ان دونوں ماں، بیٹی کی کہانی بھی بالکل ثریا اور رحما جیسی تھی۔ ان کے گھر میں کوئی تکلیف آتی تو ثریا دوڑی دوڑی جاتیں..... اور ثریا کے گھر کچھ ہوتا..... تو عظمت اور نورین بھاگے چلے آتے۔

دونوں گھروں میں بہت پیار تھا۔ نورین ایک اسکول ٹیچر تھی..... مگر ثریا کے جوڑوں کے درونے رحما کو گھر سے باہر جانے نہ دیا..... وہ گھر پر ہی سلائی کا کام کرتی..... ثریا بڑی بڑی دکانوں سے سلائی کا کام لے آتی تھیں۔ جس سے ان کا گزارہ ہوتا..... اب یہ ساری ذمے داری رحما نے سنبھال لی تھی..... اب وہ ماں کو زیادہ کام نہیں کرنے دیتی تھی اور خود ہی تمام دکانوں سے سلائی کا کام لے آتی تھی..... آج بھی وہ گھر سے سلائی کا کام لینے آئی تھی اور راستے میں پوسٹ آفس میں اسے دیر ہو گئی۔ اسے گھر جلد پہنچنا تھا..... اس لیے اس نے اپنے قدموں کو تیز کر لیا تھا..... جو جانتی تھی کہ اس کی بوڑھی ماں بے چین ہو جائے گی۔

وہ سارے راستے ارمغان کی سوچوں میں گم رہی..... گھر اداسی لے کر پہنچی..... ثریا تخت پر بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں..... رحما کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی..... جو کئی بار گھڑی کو دیکھ چکی تھیں۔

”رحما میری بچی..... اتنی دیر کہاں کر دی.....؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”اماں..... امجد بھائی دکان پر نہیں تھے..... ان کے چھوٹے بھائی سہیل نے کام دینے میں دیر کر دی۔“ اس نے کپڑوں کا شاپر تخت پر چھوڑا..... اور بین میں ہاتھ منہ دھونے لگی۔

”رحما..... تو نے صاف صاف بات کر لی..... کہ ہر قیص کے گلے کے پچاس روپے لیں گے۔“ ثریا نے شاپر کھولا..... اتنے زیادہ کپڑے دیکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

”جی اماں..... میں نے بات کر لی.....“ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے جواب دیا۔

”ان کی طرف سے کیا جواب آیا.....؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔ مہنگائی جو بہت تھی..... بے چاری کیا کریں..... تنہا ماں، بیٹی کیسے گھر کا خرچ نہیں روپے فی قیص کے گلے پر چلا سکتی تھیں۔

”سہیل بھائی نے بات تو سن لی..... مگر کوئی جواب نہیں دیا۔“ اس نے تو لیے سے منہ پوچھا اور ماں کے پاس تخت پر آ بیٹھی۔

”انہیں جواب تو کوئی دینا چاہیے تھا۔“ وہ مزید فکر مندی ہو گئیں..... ان کے گھر کا سہارا تو صرف سلائی کے کام پر تھا۔

”اماں..... کوئی نہ کوئی جواب دے دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں.....“ اس نے ماں کے ساتھ مٹر چھیلے ہوئے کہا۔

”تو رہنے دے..... میں مٹر چھیل رہی ہوں..... میری بیٹی بہت زیادہ تھک گئی ہے، ثریا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا..... جو رات دیر تک سلائی کرتی رہی اور اب باہر کا کام کر کے لوٹی تھی۔

جان جان

”اماں..... میں بالکل نہیں تھکی ہوں اور یہ مٹر..... کی پرات مجھے دیجیے..... میں چاول بنا لیتی ہوں۔“ اس نے تخت سے مٹر..... کی پرات اٹھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... نہیں رحما..... باہر اور اندر دونوں کا کام کرو گی..... تو بیمار پڑ جاؤ گی.....“ ثریا نے پرات مضبوطی سے پکڑی۔

”اوہو..... اماں..... آپ میری فکر چھوڑیں.....“ اس نے ماں سے پرات پکڑی..... تو رحما کا ہاتھ ثریا سے چھو گیا جو تپ رہا تھا۔

”اماں! آپ کو پھر بخار ہو گیا کیا؟“ اس نے ماں کو فکر مندی سے دیکھا۔

”نہیں..... نہیں..... بخار کب ہے.....“ ثریا نے خود کو چھو کر نفی کی..... درحقیقت وہ اپنی بیماری سے اپنی بیٹی کو مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

”اماں..... آپ آرام کیوں نہیں کرتیں.....“ صحن سے اسے نظر آ رہا تھا کہ ثریا نے سارے گھر میں جھاڑ دی ہے پھر وہ منہ بسورے بولی..... ”اماں جلدی سے جا کر دوائی لے آئیں.....“ اس نے ماں کو پیار سے کہا تھا۔

”معمولی بخار ہے..... دودھ پی کر سو جاؤں گی..... تو بھلی چنکی.....“ ثریا نے پیار سے جواب دیا اور تخت پر لیٹ گئیں۔

وہ ماں کی حرکت پر خفا سی ہوئی۔ ”نہیں اماں..... بس میں عظمت خالہ کو بلا لاتی ہوں، آپ جلدی سے دوا لے کر آئیں۔“ اس نے ماں کا بازو پکڑ کر جانے پر زور دیا۔ ثریا ہنس دیں اور اپنی بیٹی کی محبت کی خاطر اٹھ بیٹھیں۔

”اچھا، اچھا..... ماسٹر نی..... گھر سے مجھے بھیج کر نورین کے ساتھ گپ شپ کا ارادہ ہے۔“ ثریا نے مسکراہٹ سے نورین کا نام لے کر چھیڑا۔

”اماں..... سہیلی ہے میری۔“ وہ مسکرائی۔

”اچھا لا اپنی چادر دے..... میں خود ہی چلی جاتی ہوں.....“ ثریا نے اپنا دوپٹا رجمہ کو دیا..... اور اس کی کالی چادر اوڑھ لی۔

”اماں پیسے ہیں کیا.....؟“ اس کے پرس میں خود پیسے نہیں تھے پھر بھی اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں وہ غزالہ سوٹ کے پیسے دے گئی.....“ ثریا نے تخت کی چادر کا کونا پلٹ کر اس کے نیچے سے دو سو روپے نکال کر اسے دکھائے۔

اس نے دل میں لاکھ لاکھ خدا کا شکر ادا کیا..... کہ اگر ثریا اس سے پیسے طلب کر لیتیں۔

”یہ رکھ لے.....“ ثریا نے سو کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں دبایا۔

”اماں..... یہ بھی اپنے پاس رکھ لیں..... اس نے ماں کو پیسے واپس کر دیے۔“ انہوں نے مسکرا کر نوٹ رجمہ کے پرس میں ڈال دیا۔

”نورین کے ساتھ کل گول گپے کھانے چلی جانا.....“ وہ مسکرا کر بولیں۔ ماں کی بات سن کر اس نے آنکھیں نکالیں۔ ثریا مسکراتے ہوئے گھر سے نکل گئیں اور وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

اس نے کچن میں چیزیں سمیٹیں..... اس کے ذہن پر ارمغان کی سوچ سوار تھی..... ”کیا وہ مجھے خط کا جواب دے گا..... شاید اس دفعہ ضرور..... میں نے اس دفعہ رجسٹری کی ہے..... اسے ضرور میرا خط وصول ہوگا۔“ دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی سوچ ٹوٹی..... وہ جانتی تھی کہ نورین کو اس کی ماں نے بھیجا ہے۔ شام جو ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے نورین کو کھڑا پایا۔

”آئیے..... آئیے۔“ رجمہ نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا..... وہ منہ بسورے اندر چلی آئی۔

”خفا ہو کیا؟“ رجمہ نے ہنسی دبا کر پوچھا..... جو

جانتی تھی کہ پچھلے ہفتے ان دونوں میں ارمغان کی وجہ سے جنگ چھڑ گئی تھی۔

”نہیں تو.....“ اس نے خفا سا جواب دیا۔

”اچھا..... ویری گڈ.....“ رجمہ کچن میں گھر گئی۔ نورین بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ وہ پیاز چھیلنے لگی..... ثریا نے چاول بھگوئے ہوئے تھے۔ نورین نے خاموشی سے اسٹول پر قبضہ جمایا۔

”کوئی کام ہے..... تو مجھے دے دو..... میں کروں.....“ اس نے نظریں چرا کر اسے مخاطب کیا۔

”پہلے یہ جو موڈ آف ہے اسے آن کرو۔ لبوں پر مسکراہٹ لاؤ، اتنی افسردہ، افسردہ بہت خطرناک لگ رہی ہو۔“ رجمہ نے اسے چھیڑا..... تو وہ بھی ہنس دی۔

”خدا کا شکر ہے..... کہ بچی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی.....“ رجمہ نے خوشی خوشی کہا اور دیکھی میں تھوڑا سا آئل ڈال کر جو لھے رکھ دی۔

”میں تم سے خفا تھی..... مگر اب خفگی دور ہو گئی..... زیادہ خفا رہ جو نہیں سکتی۔“ نورین نے معصومیت سے اس دن کی ناراضی کے متعلق بتایا۔

”اچھا..... جی خفا کیوں..... خفا تو مجھے ہونا چاہیے..... جب بھی آتی ہو..... پہاڑ طنزوں کا اٹھالاتی ہو۔“ رجمہ نے منہ بسورا۔

”اپنی پیاری سہیلی کو سمجھانے کے لیے طنزوں کا پہاڑ اٹھالاتی ہوں کہ آپ محترمہ جس راستے پر چل پڑی ہیں..... آپ کے لیے وہ راستہ اچھا نہیں.....“

اب بھی وہ سمجھانے سے باز نہیں آئی۔

اس کی بات پر رجمہ خاموش رہی بلکہ سنجیدہ ہو گئی۔

”اب کون خفا ہو رہا ہے.....؟“ اس نے رجمہ کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر جواب دیا۔

رجمہ نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنا کام کرتی رہی۔

”نورین..... نورین..... چاول تو کھاتی جاؤ..... رکو تو.....“ اس نے تڑپ کر پکارا۔

”چاول لندن اپنے نواب کو بھیجو..... جس کے علاوہ تمہارے لیے ہر رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے مڑی اور تیکھے لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکل

رہی۔

”چلو بے شک خفا رہو..... مگر میں تو مٹر پلاؤ کھا کے ہی جاؤں گی۔“ اس نے پیار سے کام لیا۔

”دل جلاتی رہو گی..... تو کیسے کجخت موڈ ٹھیک رہے گا۔“ رجمہ نے ایک خفا نظر اس پر ڈالی۔

”ایسا کرو مٹر..... کی جگہ چکن ڈال لو.....“ نورین نے دھلے مٹر..... کو سنک کے پاس پڑا دیکھ کر اپنی رائے دی۔

”چٹوری..... سبزیاں صحت کے لیے زیادہ مفید ہوتی ہیں.....“ رجمہ نے پیاز گولڈن کر کے مٹر دیکھی میں ڈال دیے اور چٹچ چلاتی رہی۔

”اور محبت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے..... وہ انسان کونا کارہ نہیں بنا دیتی.....؟“ اس نے اداس لہجے میں پوچھا..... مگر رجمہ نے کوئی جواب نہیں دیا بدستور کام میں مگن رہی۔

”سب باتوں کا جواب ہے..... مگر اس سوال کا کیوں نہیں؟“ نورین نے اپنی بات پر زور دیا.....

رجمہ نے آنکھیں نکالیں۔

”وہ نہیں آنے والا..... اس کا خواب چھوڑو۔“ نورین نے سختی سے کہا۔

”وہ آئے گا اور ضرور آئے گا.....“ اس نے بھی تلخی سے جواب دیا۔

”پچھلے چار سالوں سے خط لکھ رہی ہو..... کوئی جواب نہیں آیا تم کس امید پر ہو.....“ اس نے اپنا غصہ ظاہر کیا۔

”تمہیں مجھے رلانے میں مزہ آتا ہے کیا.....؟“ نورین کے یوں طنزیہ لہجے پر وہ بھڑک گئی۔

”ہاں..... بہت مزہ آتا ہے۔“ نورین بھی سختی سے بولی۔

”تمہیں ارمغان کے علاوہ اور کوئی بات نہیں سوجھتی.....؟“ رجمہ نے تڑپ کر کہا..... اور چاول دیکھی میں آہستہ آہستہ ڈالنے لگی۔

”نورین..... نورین..... چاول تو کھاتی جاؤ..... رکو تو.....“ اس نے تڑپ کر پکارا۔

”چاول لندن اپنے نواب کو بھیجو..... جس کے علاوہ تمہارے لیے ہر رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے مڑی اور تیکھے لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکل

جان جان

”تم جو ہر وقت اس کی یاد میں کھوئی کھوئی رہتی ہو..... پچھلے چار سالوں سے اس نے کوئی خبر نہیں لی..... وہ تم سے دل لگی کر گیا..... اور تم اس کی دوستی کو سچی محبت مان بیٹھی ہو.....“ اس نے ہر لفظ چبا چبا کر کہا۔

”ارمغان جانے سے پہلے مجھ سے وعدہ کر گیا تھا کہ میں اس کا انتظار کروں..... وہ میرا ہے۔“ اس نے اپنی آخری ملاقات یاد کر کے اسے بتایا۔ جو بات پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکی تھی۔

”تمہارے ارمغان نے اس دن کوئی رو مینٹک مووی دیکھ لی تھی، نہ خط کا جواب نہ ہی کوئی فون نمبر..... کم از کم ایک میسج ہی میرے نمبر پر کر دے۔“ اس نے تیکھے لہجے سے ارمغان کو مجرم قرار دیا..... جس کے گھر کا ایڈریس..... اور فون نمبر رجمہ نے دے رکھا تھا۔

رجمہ کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔ وہ تو اس سے سچی محبت کر رہی تھی..... کیسے کوئی محبوبہ اپنے محبوب کو بے ایمان کا لقب دے سکتی تھی..... رجمہ بھی ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھی..... جہاں ارمغان کی کوئی برائی اسے برائی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”تم اچھی طرح سے اپنے ذہن میں یہ بات گھسا لو..... ارمغان صاحب دل کے بے ایمان ہیں۔“ اس نے رجمہ کے آنسوؤں کو دیکھ کر اپنے غصے کا اظہار کیا..... اور پاؤں پیچ کر باورچی خانے سے نکل گئی۔ رجمہ نے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھے..... اور اس کی طرف لپکی..... جو باہر کے دروازے سے نکلنے والی تھی۔

”نورین..... نورین..... چاول تو کھاتی جاؤ..... رکو تو.....“ اس نے تڑپ کر پکارا۔

”چاول لندن اپنے نواب کو بھیجو..... جس کے علاوہ تمہارے لیے ہر رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے مڑی اور تیکھے لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکل

رہی۔

”نورین..... نورین..... چاول تو کھاتی جاؤ..... رکو تو.....“ اس نے تڑپ کر پکارا۔

”چاول لندن اپنے نواب کو بھیجو..... جس کے علاوہ تمہارے لیے ہر رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے مڑی اور تیکھے لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکل

رہی۔

”نورین..... نورین..... چاول تو کھاتی جاؤ..... رکو تو.....“ اس نے تڑپ کر پکارا۔

”چاول لندن اپنے نواب کو بھیجو..... جس کے علاوہ تمہارے لیے ہر رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے مڑی اور تیکھے لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکل

رہی۔

”نورین..... نورین..... چاول تو کھاتی جاؤ..... رکو تو.....“ اس نے تڑپ کر پکارا۔

”چاول لندن اپنے نواب کو بھیجو..... جس کے علاوہ تمہارے لیے ہر رشتہ بے معنی ہو گیا ہے۔“ وہ غصے سے مڑی اور تیکھے لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکل

رہی۔

گئی اور رحما اداس نظروں سے دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اکرم نے تمام خطوط ڈبے میں ڈال دیے۔ اور پھر رحما کے خط کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے ہو رہی تھی۔

”وہ لڑکی اتنی پریشان کیوں تھی۔۔۔۔۔ یہ خط اس کے لیے اتنا ضروری تھا کہ اس نے مجھ انجان انسان سے ادھار مانگ لیا۔۔۔۔۔ وہ کس مشکل میں ہے۔۔۔۔۔ شاید اس خط میں اس نے اپنی مشکل لکھی ہو۔۔۔۔۔ چاچا خیر دین بھی تو بتا رہا تھا کہ وہ ہر ہفتے لندن خط ڈالتی ہے، اس کا کیا راز ہے۔۔۔۔۔ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا۔۔۔۔۔ اس کے پاس موبائل نہیں۔۔۔۔۔ شاید اس کے پاس نمبر نہیں ہوگا۔۔۔۔۔“ اکرم کے سر پر رحما سوار تھی۔ آخر کار اس نے خود کی بے چینی دور کرنے کے لیے رحما کا خط ڈبے میں نہیں بلکہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور اس کے دل میں سکون سا چھا گیا۔

☆☆☆

”اتنا کام کرنے کی ضرورت کیا تھی۔۔۔۔۔ اب تمہارے اندر وہ پہلی جیسی طاقت نہیں رہی۔۔۔۔۔ بی بی کافی لو ہے۔۔۔۔۔ دودھ روز لیا کرو۔۔۔۔۔“ عظمت اور ثریا ڈاکٹر کے کلینک سے دوائی لے کر نکلی تھیں۔ عظمت نے انہیں نصیحت کی۔۔۔۔۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے ثریا کو چیک کر کے ہدایت دی تھی۔

”گھر کا تھوڑا بہت کام دیکھتی ہوں۔۔۔۔۔ بے چاری رحما پر بہت بوجھ ہے۔۔۔۔۔ رات کو سلائی۔۔۔۔۔ اور دن میں ہنڈیا۔۔۔۔۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔۔۔۔۔ چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد رحما کی شادی کر دوں۔“ ثریا نے چلتے چلتے عظمت سے اپنے دل کی بات کی۔

”تو رحما کی فکر کرتی ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے تو بی بی اوپر نیچے ہوتا ہے۔ خدا پر چھوڑ دے۔۔۔۔۔ میں ماسی کلثوم سے نورین اور رحما کی بات کر چکی ہوں۔“

عظمت نے اس کے ساتھ چلتے چلتے بتایا۔۔۔۔۔ جو خود بھی دے کی مریضہ تھیں۔

”ماسی کلثوم بہت عجیب رشتے لاتی ہے۔۔۔۔۔ جہیز سے ہر دفعہ بات رہ جاتی ہے۔“ ثریا نے افسردگی سے بتایا۔

”کوئی تو دنیا میں ہوگا۔۔۔۔۔ جو ہماری بچیوں سے بیاہ کرے گا۔۔۔۔۔ تم فکر کرنا چھوڑ دو۔۔۔۔۔ فکریں انسان کو کھا جاتی ہیں۔“ عظمت نے اپنی سہیلی ثریا کو دلاسا دیا۔۔۔۔۔ جو خود اپنی بیٹی کے لیے دن رات سوچتی رہتی تھیں۔۔۔۔۔ عظمت، ثریا کے ساتھ ان کے گھر آگئیں کہ وہ نورین کو بھی ساتھ گھر لے جائیں۔

”نورین نہیں آئی کیا۔۔۔۔۔؟“ ثریا نے نورین کو کہیں نہ پا کر بیٹی سے پوچھا۔

عظمت تخت پر ثریا کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ انہوں نے حیرانی سے رحما کی طرف دیکھا۔

”اماں۔۔۔۔۔ وہ ابھی ابھی نکلی ہے۔۔۔۔۔ خالہ عظمت آپ کے لیے چاول لاؤں۔۔۔۔۔“ اس نے نظریں چرا کر کہا۔

”اے۔۔۔۔۔ ثریا۔۔۔۔۔ یہ دونوں ہر روز کسی نہ کسی بات پر منہ سُجالیتی ہیں۔۔۔۔۔ تم ذرا پوچھو اپنی بیٹی سے۔۔۔۔۔ کہ ان دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہوتا ہے؟“ خالہ عظمت نے سر پر ہاتھ رکھ کر ثریا کو اطلاع دی۔

”ہائے۔۔۔۔۔ ہائے رحما۔۔۔۔۔ ایسی کیا بات ہے؟“ ثریا نے فکر مندی سے پوچھا۔۔۔۔۔ وہ بوکھلا سی گئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں اماں۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ میں چاول آپ کے لاتی ہوں۔“ وہ وہاں سے کھسکتا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اس کے چہرے کی رنگت پہلی پڑ گئی۔

”نورین چاول کھا کر گئی کیا۔۔۔۔۔؟“ ثریا نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں اماں۔۔۔۔۔“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

”تو پھر ایسا کرتی ہوں کہ چاول گھر لے جاتی ہوں۔۔۔۔۔ تو مجھے پلیٹ میں نکال دے۔۔۔۔۔“ خالہ عظمت تخت سے اٹھ گئیں۔۔۔۔۔ اور مسکرا کر بولیں۔

”جی خالہ۔۔۔۔۔ میں لاتی ہوں۔۔۔۔۔“ رحما کچن کی طرف بڑھی۔۔۔۔۔ کچن میں آکر وہ اپنی سانسیں بحال کرنے لگی۔ جو ڈر گئی تھی کہ اس کے دل کا راز اماں نہ جان لیں۔

☆☆☆

اکرم بستر پر لیٹا۔۔۔۔۔ تو اسے وہ خط یاد آیا۔۔۔۔۔ اس نے فوراً اٹھ کر بے تابی سے خط کو کھولا۔۔۔۔۔ تو ایک خوب صورت تحریر اس کے سامنے تھی۔

”ارمغان۔۔۔۔۔!“

آداب۔۔۔۔۔ تم کیسے ہو؟ اور کہاں ہو۔۔۔۔۔؟ مجھے یقین ہے کہ تم خیریت سے ہو گے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں مگر تم ہو کہاں۔۔۔۔۔ پچھلے چار سال سے ہزار خط تمہارے نام لکھ چکی ہوں۔۔۔۔۔ مگر تمہارا کوئی جواب نہیں ملا۔۔۔۔۔ تم نے وہاں جا کر کوئی فون بھی خیریت کا نہیں کیا، نورین کے سیل پر ایک میسج ہی کر دیتے۔ میں ایک میسج کے سہارے زندہ رہ لیتی۔۔۔۔۔ اب تو بے جان سی ہو کر زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ تمہاری کیسی محبت ہے۔۔۔۔۔ جو تم میری آنکھوں کو آنسوؤں کا سیلاب دے رہے ہو۔۔۔۔۔ ہر روز اپنے دل کو بہلاتی ہوں کہ تم میرے ہو، صرف میرے۔۔۔۔۔ مگر دل و دماغ میں ایک تکرار چھڑ جاتی ہے، اگر تم میرے ہوتے تو میرے خط کا جواب دیتے۔۔۔۔۔ تمہاری آخری بات کے سہارے ہر رشتے کو ٹکرا رہی ہوں، تمہارا انتظار کر رہی ہوں، جیسا کہ تم چاہتے تھے کہ میرے ہاتھوں میں صرف تمہارے نام کی مہندی سجے۔۔۔۔۔ میرے لیے تم ہی میری زندگی ہو، کیسے کسی کا ہاتھ تھام لوں۔ میرے ہاتھوں میں تمہاری مہک سائی ہے مگر اماں کی بے بسی مجھ سے

جان جان

دیکھی نہیں جاتی۔ وہ میرا بیاہ دیکھنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔ اماں کا خواب پورا کرنے کا سوچتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے روح جسم سے نکل رہی ہو، تمہاری دوستی تمہارا پیار جو میرے دل میں بسا ہے، خود کو کب تک زمانے کی نظروں سے بچاؤں گی جو میری سونی سونی آنکھوں میں تمہاری محبت، تمہاری دید کے منظر دیکھ کر مجھ پر ہستی ہیں۔ تم کیا سمجھو گے میری اذیت کو۔۔۔۔۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو مجھے سچ سچ خط میں لکھ کر اپنی محبت سے آزاد کرو اور یہ خط میرا تمہارے لیے آخری ہوگا۔۔۔۔۔ اور میرا خط پھر بھی نہیں ملا۔۔۔۔۔ تو سمجھ لینا۔۔۔۔۔ کہ تمہاری رحما یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی۔۔۔۔۔ میں زہر کھالوں گی۔۔۔۔۔ شاید زہر سے مجھے اتنی اذیت نہ ہو۔۔۔۔۔ جتنی تمہاری بے پروائی مجھے دے رہی ہے۔“ خط کے آخر میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

”اس نے اپنی ساری قیمتی چیزیں سنبھال کر رکھ لیں سوائے میرے“ اور آخر میں اس کا نام رحما لکھا ہوا تھا۔

اکرم کے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ خط میں جان دینے کی بات نے اس کو سُن کر دیا۔ اس نے بار بار خط کو پڑھا۔۔۔۔۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔۔۔۔۔ اور چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔۔۔۔۔ جان دینے کی بات پڑھ کر اسے اپنی بہن فاطمہ یاد آ گئی۔۔۔۔۔ فاطمہ نے بھی تو محبت کی خاطر جان دے دی تھی۔۔۔۔۔ فاطمہ اس کی بہن اپنے کو لیگ مشتاق سے پیار کر بیٹھی مگر اُن کے والد قیوم صاحب نے ان کی محبت کو تسلیم نہ کیا۔۔۔۔۔ اور فاطمہ کی شادی اپنے ایک عزیز دوست اسلم کے بیٹے ذیشان سے طے کر دی۔۔۔۔۔ اکرم نے بہن کے حق میں آواز بھی اٹھائی۔۔۔۔۔ مگر ابا نے ایک نہ سنی۔۔۔۔۔ اور فاطمہ کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔۔۔۔۔ فاطمہ نے جب اپنے ابا کے فیصلے کو بدلتا نہ دیکھا۔۔۔۔۔ تو اس نے خود کشی کو اپنا نصیب سمجھا۔۔۔۔۔ اور دنیا سے چل

ہی۔ رحما کے خط نے اس کے پرانے زخم تازہ کر دیے۔ اس نے خط کو دراز میں رکھ دیا اور پھر سے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اسے اپنی بہن فاطمہ کا چہرہ نظر آنے لگا جو بستر پر بے جان پڑی تھی اور اس کے منہ سے سفید جھاگ نکل رہا تھا۔ اماں کی چیخ و پکار کہ اس کی جوان بیٹی نے زہر کھا لیا۔ ابا کا یوں فاطمہ کو مردہ پا کر دل پر ہاتھ رکھ کر گر جانا۔ اس نے ڈر کے مارے آنکھیں کھول دیں۔ اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے پاس پڑا پانی کا جگ منہ سے لگا لیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے بھاگ گئی تھی۔ اسے رحما کی فکر لگی ہوئی تھی۔ کہ کہیں وہ لڑکی بھی اپنی جان نہ دے دے۔

☆☆☆

وہ رات کے آخری پہر سلائی مشین پر کام کر رہی تھی۔ آخر کار وہ کرتے کرتے وہ تھک گئی تو صحن میں بچھے تخت پر مشین ایک سائڈ پر رکھ کر لیٹ گئی۔ چاند اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اسے چاند کی آب و تاب ارمغان کی یاد میں لے گئی۔ ”میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“ وہ کانج کینٹین میں بیٹھی تھی۔ اور ارمغان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو سرخ و سفید کڑھائی والا سوٹ پہنے بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”سو۔۔۔سو۔۔۔“ ارمغان نے بیزاری سے جواب دیا۔ اور دوسری ٹیبل پر بیٹھی لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔

”ارمغان۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے تم کہو تو میں چلی جاتی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ خفگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ یار۔۔۔۔۔ مذاق کر رہا ہوں، بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ اس نے اپنے کان پکڑ کر اس کی تعریف کی۔

”بہت پیاری۔۔۔۔۔؟ میری تعریف کرو گے تو

میں رکتی ہوں۔۔۔۔۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے چہرے پر مصنوعی خفگی سجا کر کہا تھا۔

”تعریف۔۔۔۔۔ رحما پلیز کوئی آسان کام دے دو۔۔۔۔۔ مجھے تعریف کرنی نہیں آتی۔“ ارمغان نے معصوم بن کر ہنستے ہنستے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ میں چلتی ہوں۔“ رحما نے اپنے قدموں کو حرکت دی۔

”ٹھہرو۔۔۔۔۔ یار پلیز ایک منٹ تو دو، شاعر تھوڑی ہوں۔۔۔۔۔ جو ایک ہی پل میں نظم سنا ڈالوں۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے سر پر چپت لگا کر خود کو بے وقوف ظاہر کیا۔ رحما ہنس دی مگر اس نے سیٹ نہ سنبھالی۔

”یار! بیٹھ جاؤ، ریلی میں بہت اچھی تعریف سوچ رہا ہوں۔“ اس نے رحما کو بیٹھنے کے لیے کہا اور اپنی کینٹی پر انگلی رکھ کر سوچ میں ڈوب گیا۔

”ارمغان۔۔۔۔۔ تعریف کے لیے اتنا وقت۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ میں پیاری نہیں لگ رہی ہوں۔“ اس نے ارمغان کی ویری کو منفی رنگ دیا اور بجھ سی گئی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ میڈم۔۔۔۔۔ آپ چاند ہیں چاند۔۔۔۔۔“ اس نے بتیسی نکال کر جملہ پھینکا۔

”یہ بہت پرانی تعریف ہے۔ میں جا رہی ہوں۔“ اس نے ٹیبل پر سے کتابیں اٹھالیں رحما نے آنکھیں نکالیں اور چیخی۔

”یار! پوری تعریف تو سنو۔۔۔۔۔ پھر چلی جانا۔“ ارمغان نے ایک دم اس کا ہاتھ تھاما اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”بولیں۔۔۔۔۔“ وہ واپس کرسی پر بیٹھ کر خفگی سے بولی۔

”تم چاند ہو۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ ارمغان سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا۔۔۔۔۔ اور اور۔۔۔۔۔؟“ رحما نے آنکھیں

نکال کر پوچھا۔ جو مذاق مذاق میں اب سچ سچ خفا ہو گئی۔

”تم چاند ہو..... اور میں تمہارا گرہن۔“
ارمغان نے سوچ کر جملہ مکمل کیا اور پھر ہنسنے لگا۔
”گرہن.....؟“ رحما ہنس دی۔ ”یہ تعریف مجھے اچھی لگی۔“ رحما نے ہنستے ہنستے تالی بجائی اور ارمغان نے رحما کے ہنسنے پر ایک لمبی سانس لی..... اور مسکرائے لگا..... اس کے لبوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی..... جب بارش کی بوندیں اس کے چہرے پر پڑیں..... تو وہ واپس ارمغان کی یاد سے باہر آ گئی۔

”ارمغان تم کہاں چلے گئے ہو۔“ رحما کی آنکھیں بھر آئیں..... بارش نے تیزی دکھائی..... اس کے آنسوؤں کی رفتار بھی تیز ہو گئی..... اور ارمغان کی یاد اسے اذیت میں مبتلا کر گئی۔

☆☆☆

وہ کب سو گیا تھا..... اسے خود بھی پتا نہیں چلا..... اس کی ماں سیکینہ نے جگایا..... تو وہ چیخ مار کر اٹھا۔

”ہائے..... ہائے..... اکرم کیا ہو گیا ہے بیٹا۔“ سیکینہ بیٹے کی چیخ سے دل تھام کر بولی۔
”وہ..... وہ.....“ اکرم کچھ بھی نہ بول سکا..... وہ رات رحما کی بات سے کافی پریشان ہو کر سویا تھا۔
”میرا بیٹا گھبرا گیا ہے..... کوئی برا خواب دیکھ رہے تھے کیا؟“ سیکینہ نے اس کے سر پر پیار دے کو پوچھا۔

”ہاں..... ہاں.....“ اکرم نے نظریں جڑالیں اور وال کلاک کی طرف دیکھا..... اسے آج پھر دیر ہو گئی تھی۔ ”اوہو..... صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔“ اس نے جلدی سے چل پھن لی۔

”میرے بچے کو یہ ملازمت اچھی نہیں لگ رہی۔“ سیکینہ نے مسکرا کر اکرم کے دل کی بات بیان کی۔

”نہیں اماں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ اکرم نے مسکرا کر جواب دیا۔
قیوم صاحب بھی اکرم کے کمرے میں بوجھل قدموں سے آکھڑے ہوئے۔
”سرکاری ملازمت میں پیسہ مناسب ہے اور تھوڑے دن کی اور بات ہے..... میں صحت مند ہو جاؤں تو اکرم کے یورپ جانے کا دوبارہ بندوبست کرتا ہوں۔“ انہوں نے بیوی کی بات سن لی تھی، وہ سنجیدگی سے بولے۔

”نہیں، ابا جی.....“ اکرم نے ادب سے نفی کی..... سیکینہ، شوہر کی بات پر مرجھاسی گئی۔ جو بیٹی کی موت کے بعد اب اکرم کی جدائی نہیں چاہتی تھی۔
”کیوں..... بیٹا..... تیرا خواب یورپ تھا.....؟“ قیوم صاحب کھانتے ہوئے حیرت میں پڑ گئے۔

”رہنے دیں..... اگر اکرم کا دل نہیں چاہتا.....“ سیکینہ نے منہ بسور کر جواب دیا۔
”اچھا..... اچھا..... اپنی ماں کے لیے نہیں جانا چاہتا.....“ انہوں نے سیکینہ کے خفا چہرے کو دیکھ کر ہنستے ہنستے بات کی..... اکرم بھی مسکرائے لگا۔
”چلیں اپنے کمرے میں آرام کیجیے..... بیٹے کو پہلے ہی ملازمت سے دیر ہو گئی ہے۔“ سیکینہ نے قیوم صاحب کو اکرم کے بستر سے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اکرم کو تیار ہونے کی تاکید کر کے وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔

☆☆☆

وہ گھر سے جلدی نکل آیا..... اس نے ناشتا بھی بے دلی سے کیا..... وہ رحما کا خط بھی جیب میں ڈال لایا تھا..... پوسٹ آفس آکر اس نے رحما کے خط کو بار بار پڑھا..... جتنی دفعہ وہ خط پڑھتا..... اسے رحما کا اداس چہرہ نظر آتا..... وہ سوچ سوچ کر تھک

گیا..... کہ وہ رحما کی جان کیسے بچا سکتا ہے..... اس نے نیند بھی کل مکمل نہیں لی تھی..... اس نے آنکھیں موند لیں تو فاطمہ کی طرح رحما کے منہ سے جھاگ نکلتا دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا اور پھر سوچوں میں گم ہو گیا کہ وہ کیسے رحما کی جان بچائے..... کیسے ارمغان سے رابطہ کرے۔ کیسے رحما کی مدد کرے اس نے خط پڑھ کر اپنی جان کو عذاب میں ڈال دیا تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا..... تب ہی خیر دین کی آواز نے اسے چونکایا۔

”بیٹا..... بیٹا چائے پیو گے کیا.....؟“ خیر دین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
”ہاں..... چاچا.....“ اکرم نے ایک لمبی سانس بھری۔

”کوئی بات ہے کیا؟ بہت فکر مند دکھائی دے رہے ہو۔“ قیوم صاحب خیریت سے ہیں ناں؟“ خیر دین نے گھبراہٹ سے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... چاچا..... ابا ٹھیک ہیں، بس چاچا..... سر درد نہیں جاتا.....“ اکرم نے افسردگی سے بتایا۔

”ابھی ایک تیزی چائے لاتا ہوں، سر درد بھاگ کھڑا ہوگا.....“ خیر دین نے ٹیبل صاف کی اور مسکرا کر کہا..... خیر دین کمرے سے جانے لگا تو اکرم نے اسے مخاطب کیا۔

”چاچا! چاچا! ایک بات پوچھنی تھی؟“ اکرم نے سنجیدگی سے کہا جو رحما کی مدد کے لیے سوچ رہا تھا۔

”ہاں..... بیٹا! پوچھو۔“ خیر دین نے پیار سے کہا۔

”چاچا! کسی کی جان بچانے کے لیے چاہے راستہ صحیح نہ ہو..... مگر اس راستے سے جان بچ جائے تو کیا یہ صحیح عمل ہوگا؟“ اکرم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نیک کام ہے..... اور تمہاری نیت تو جان

جان جان

بچانے کی ہے پھر راستہ جیسا بھی ہو..... تمہیں یہ نہیں سوچنا چاہیے۔“ خیر دین نے اس کے سر پر پیار دے کر جواب دیا..... جو انہیں بہت الجھا الجھا دکھائی دے رہا تھا۔

”شکریہ چاچا!“ اس نے ایک لمبی سانس بھر کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں چائے لے کر آتا ہوں۔“ خیر دین نے بھی مسکرا کر قدموں کو حرکت دی۔

”چاچا..... چائے کے ساتھ ناشتا بھی کروادیں.....“ اس نے ہنستے ہنستے کہا..... جسے اچانک بہت بھوک لگ گئی تھی..... خیر دین کی بات سے وہ کافی مطمئن ہو چکا تھا..... خیر دین مسکرا کر کمرے سے نکل گیا..... اور اس نے قلم سنبھال لیا۔

☆☆☆

دوپہر میں وہ سلائی مشین لیے بیٹھی تھی..... ثریا کدو چھیل رہی تھیں تو دروازے پر دستک ہوئی اس سے پہلے ثریا دروازے کے لیے اٹھیں..... رحما اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ بیٹھی رہیں اماں، میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے دوپٹا سنبھالا..... اور باہر دروازے کی طرف لپکی۔

”کون.....؟“ رحما نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”ارے ثریا میں ہوں..... کلثوم بی بی.....“ کلثوم بی بی نے اپنی تیز آواز کو مزید تیز کر کے جواب دیا۔

”اُف خدایا..... یہ مصیبت کہاں سے آئیگی.....؟“ رحما منہ ہی منہ میں بڑبڑائی..... مگر مجبوراً اسے دروازہ کھولنا پڑا..... ماں جو گھر پر موجود تھی۔ ورنہ وہ کبھی دروازہ نہ کھولتی..... اس نے دروازہ کھجے دل سے کھول دیا..... کلثوم بی بی برقع اتار کر فوراً اندر داخل ہوئی۔

”توبہ..... توبہ..... اس عذاب برساتی گرمی

”رحما..... کپڑے دھور ہی تھی..... شاید وہ چھت پر کپڑے ڈالنے لگی ہو۔“ ثریا نے نورین کو اطلاع دی۔

”اچھا..... خالہ میں چھت پر چلی جاتی ہوں۔“ اس نے تیزی دکھائی۔

”ارے نورین..... ایک پکوڑے سے مجھے کچھ نہیں ہوگا..... لا ذرا دے.....“ ثریا کے منہ میں پانی بھر گیا..... نورین کے ہاتھ کے گرم پکوڑے سے کوئی کجبت ہی انکار کر سکتا تھا۔

”خالہ ایک چپکے سے کھائیں..... رحما اور اماں کو خبر مل گئی تو دونوں میری جان کے پیچھے پڑ جائیں گی۔“ اس نے بتیسی نکال کر ایک پکوڑا ثریا کے ہاتھ میں تھما دیا جسے ثریا نے جھٹ سے منہ میں رکھ لیا..... کئی دنوں سے وہ بغیر نمک کا کھانا کھا رہی تھیں۔

نورین پکوڑوں کی پلیٹ سمیت چھت پر پہنچی..... رحما کپڑے نچوڑ کرتا پر ڈال رہی تھی۔

”میڈم کام ختم ہو گیا کیا؟“ نورین نے مسکرا کر پوچھا۔

”نورین..... تم..... آہا اور یہ پکوڑے.....“ رحما خوش ہو گئی۔

”ناراضی دور کرنے کے لیے پکوڑے تو بنا کر لانے ہی تھے.....“ اس نے ہتے ہتے ایک پکوڑا رحما کے منہ میں ڈالا۔

”اف..... اتنی مرچ.....“ رحما نے پکوڑا لھاتے ہوئے کہا..... اور باقی کپڑے تار پر پھیلانے لگی۔

”اچھے نہیں ہیں کیا؟“ نورین نے منہ لٹکا کر پوچھا۔

”مزے کے ہیں..... میری جان..... بہت.....“ رحما نے خالی بالٹی اٹھائی اور ایک پکوڑا اس کے منہ میں ڈالا۔

”میں تمہاری جان ہوں..... واہ..... مجھے

امانت ہو پھر تمہیں اپنی جان لینے کا کوئی حق نہیں، میں باہر صرف تمہارے لیے آیا ہوں..... تمہیں دنیا کی ہر خوشی دینے کے لیے..... میں نے یہاں کبھی کسی کو نظر بھر کر نہیں دیکھا..... کیونکہ تم میری زندگی ہو۔ اور اپنے دل و دماغ کو سمجھا دو کہ میں صرف تمہارا ہوں، صرف تمہارا..... تمہاری دعاؤں سے مجھے یہاں اچھا کام مل گیا ہے مگر چھٹی نہیں ملتی..... بہت جلد لوٹ آؤں گا..... تم خود کو نقصان دینے سے پہلے میرا سوچ لینا..... اپنا خیال رکھنا..... تمہارے اگلے خط کا منتظر رہوں گا۔

فقط تمہارا

ارمغان“

اس نے خط مکمل کیا اور پھر خط کو پڑھ کر ایک مرتبہ تسلی کی..... کہ یہ خط رحما کی زندگی کو دوبارہ سے امید پر قائم کر دے گا..... اور وہ جان دینے کا خیال دل سے نکال پھینکے گی..... وہ مطمئن ہو گیا جس کا چین خط نے چھین رکھا تھا۔

☆☆☆

”خالہ..... خالہ..... رحما کدھر ہے؟“ نورین ہاتھ میں پلیٹ تھاے ثریا کے کمرے میں پہنچی۔

”کیا لائی ہو.....؟“ ثریا جو دوپہر کو کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹی تھیں خوشی خوشی اس سے پوچھا۔

”پکوڑے بنائے تھے..... رحما کو پسند ہیں ناں.....“ نورین نے ہتے ہتے کہا۔

”میرے لیے نہیں ہیں کیا؟“ وہ منہ بسور کر بولیں۔

”خالہ آپ کے لیے نہیں..... پہلے ہی بی بی ہائی رہتا ہے..... اماں نے ہدایت دے کر مجھے گھر سے بھیجا ہے کہ آپ سے پکوڑے دور رکھوں..... نمک، مرچ تیز ہے۔“ نورین نے فکر مندی سے عظمت کی بات بیان کی۔

لے کر اس کی تعریف کی۔ وہ خاموشی سے واپس باورچی خانے میں آگئی..... اس نے غصے سے چوٹھا جلایا..... اور فریج سے آٹے کی پرات نکالی..... کلثوم بی بی دوپہر میں اس لیے ان کے گھر پہنچی تھی کہ دوپہر کا کھانا کھا کر جائے گی۔ یہ تقریباً تین سال سے ہو رہا تھا..... جس کی اسے عادت ہو چکی تھی۔ وہ کام سے جلد سے جلد فارغ ہو کر سلائی کا کام دیکھنا چاہتی تھی۔ باورچی خانے میں ثریا کی آواز آئی۔

”رحما! ماسی کے لیے آلیٹ پیاز والا بنا دینا..... کلثوم بی بی کا دل چاہ رہا ہے۔“ ثریا نے آواز دے کر ہدایت دی۔

”جانتی ہوں..... اس ماسی کلثوم کے کروت کو..... کہیں کھانا پینا نہیں ملتا..... تو ہمارے گھر کا رخ کر لیتی ہے۔“ وہ بڑبڑاتی رہی اور اپنا کام کرتی رہی۔ اسے کلثوم ماسی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی کیوں وہ اچھی لگتی..... اس کے دل میں ارمغان جو بسا ہوا تھا۔

☆☆☆

اکرم نے قلم اٹھایا اور رحما کو خط لکھنا شروع کیا..... ایک لفظ لکھ کر پھر اس نے صفحہ پھاڑ دیا۔

”کیا لکھوں..... کہاں سے شروع کروں۔“ وہ خود سے مخاطب ہوا..... اور پھر سوچ میں پڑ گیا..... اس نے آج سے پہلے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا تھا..... آہستہ آہستہ اس کا قلم چلنے لگا۔

”پیاری رحما! آداب..... تمہارا خط ملا، دل کو سکون ملا مگر یہ جان کر افسوس ہوا کہ تم پچھلے کئی سالوں سے خط لکھ رہی ہو..... مگر مجھے تمہارا کوئی خط موصول نہیں ہوا..... میں تو خود تمہارے خط کا انتظار کرتا رہا ہوں..... اور یہ سوچتا رہا کہ شاید تم مجھے بھول گئی ہو مگر اب تمہارا خط پا کر میری جان میں جان آئی..... یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ تم زہر کھا کر اپنی جان دے دو گی..... تم میری

سے خدا بچائے۔“ اس نے رحما سے بیزاری سے کہا۔

”کون ہے..... رحما؟“ کمرے میں سے ثریا کی آواز ابھری۔

”ارے ثریا میں ہوں، کلثوم..... ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیا تم نے..... دیکھ لو خود ہی تمہارے گھر حاضری لگوانے چلی آئی ہوں۔“ کلثوم بی بی نے اپنی تیز آواز سے بات کرتے کرتے چار پائی پر قبضہ جمایا..... جہاں ثریا بیٹھی ہوئی تھیں۔

”تم خود عید کا چاند ہو جاتی ہو۔“ وہ کدو کاٹتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

”اری رحما..... ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا تو لا دو..... حلق خشک ہو گیا ہے۔“ اس نے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے برا سامنہ بنایا۔

”رحما! شربت بنا دو.....“ ثریا نے رحما کو ہدایت دی..... اس نے بجھے دل سے باورچی خانے کا رخ کیا۔

”چوہدری صاحب کے گھر سے پیدل چل کر آرہی ہوں۔“ اس نے خود کو معصوم ظاہر کیا..... اور اپنی ٹانگیں دبانے لگی۔

رحما غصے سے شربت بنانے لگی..... باورچی خانے تک اسے چوہدری صاحب کا نام سنائی دیا۔

”توبہ ہے..... ہزار دفعہ رشتے کے لیے اماں انکار کر چکی ہیں..... پھر بھی یہ چوہدری صاحب کا نام لینا نہیں بھولتی..... کجبت.....“ رحما نے شربت کا گلاس پرچ میں رکھا..... اور کمرے میں آگئی..... کلثوم بی بی حسب معمول اس کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔

”بہت پیارا لڑکا ہے، سچ میں ہیرا ہے..... رحما کی شادی ہو گئی تو بہت خوش رہے گی..... انہیں رحما جیسی لڑکی چاہیے..... ماشاء اللہ سے ہماری رحما میں وہ سب خوبیاں ہیں جو چوہدری صاحب کے.....“ اس نے رحما سے شربت کا گلاس

بہت اچھا لگا کہ تم نے مجھے اپنی جان بنالیا..... اور باقی سب کو بھول گئی ہو۔“ نورین نے ہنستے ہنستے اس کو چھیڑا۔

”ہاں جی..... آپ کے علاوہ میری کوئی جان نہیں.....“ وہ اور نورین سیڑھیاں اتر کر کمرے میں آ بیٹھیں۔

رحمان نے ایک پکوڑا پھر اٹھایا جس سے نورین بہت خوش ہو گئی۔

”سچی میں ہر آنے والی ڈاک پر نظر رکھتی ہوں..... مگر ارمغان کا کوئی خط نہیں ہوتا۔“ اس نے رحما کو تسلی دے کر بات کی۔

”کوئی اور بات کرو یہ بات بھول جاؤ۔“ وہ پکوڑے کھاتے کھاتے بولی۔ وہ جو پچھلے چار سال سے نورین کو اپنے گھر کی ڈاک کا خیال رکھنے کی تاکید کرتی تھی اس نے بے پروائی سے بات ختم کی۔

”مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے حقیقت کو تسلیم کیا اور خوابوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا۔“ نورین بھی پکوڑا کھاتے ہوئے بولی ارمغان کے نام سے

رحما کو بے فکر دیکھ کر وہ مطمئن سی ہو گئی کہ اس کی سہیلی ارمغان کی جھوٹی محبت سے آزاد ہو گئی ہے۔

رحمان نے نورین کی بات پر نظریں چرائیں..... جس نے اکرم کا ایڈریس خط پر لکھوایا تھا اور نورین اس سے انجان تھی۔ اس نے مزید بات کو چلنے نہیں دیا اور نورین سے اس کے اسکول کے متعلق باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

اکرم نے بیس دن کے بعد رحما کو پوسٹ آفس میں آتے دیکھا۔ اس نے جلدی سے سیٹ سنبھالی اور اپنی الماری کے نچلے خانے کو کھولا اور اپنے لکھے

خط کو دیکھا جو لفافے میں بند تھا۔ اسے بس ڈر تھا کہ کہیں رحما اس لفافے پر ٹکٹ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر شک نہ کرے وہ رسک لے رہا تھا۔ صرف اس لیے

ماہنامہ پاکیزہ 228 جولائی 2013ء

کہ وہ اس کی جان دینے والی بات سے کافی ایب سیٹ تھا۔ وہ سفید چادر میں بہت پیاری لگ رہی تھی مگر اس کے چہرے پر رونق نہیں تھی۔ جوں جوں وہ اس کے پاس آتی گئی اکرم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس نے انجان بن کر خود کو کام میں مصروف کر لیا۔

”سینس.....“ اس نے اکرم کو مخاطب کیا۔

اکرم نے بے پروائی سے نظریں اٹھائیں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں رحما اس کی چوری نہ پکڑ لے۔

اس نے پرس سے نکال کر تیس روپے اکرم کی طرف بڑھائے۔ ”یہ اس دن کا ادھار.....“ وہ شائستگی سے بولی۔

”آپ کے خط کا جواب بھی آ گیا ہے۔“ اکرم نے تیس روپے پکڑے اور پھر نظریں چرا کر بولا۔

”سچ..... کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ اس نے چونک کر بڑی بے صبری سے پوچھا۔

”جی ہاں.....“ اکرم نے الماری کے نچلے خانے کو کھولا..... اور اس میں سے وہ خط نکال کر اسے تھما دیا۔

”شکریہ..... بہت بہت.....“ اس نے بے تابی سے خط... کھولا اور چلتے چلتے ہی خط کا لفافہ پوسٹ آفس میں پھینکا..... اکرم کے دل کو قرار سا آ گیا..... وہ خط پڑھتے پڑھتے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور خط کا لفافہ جس پر کوئی ٹکٹ چسپاں نہیں تھا وہ اکرم نے جا کر اٹھا لیا۔

”محبت کجخت اتنی ہی ظالم ہوتی ہے جو انسان کو ہر چیز سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ سوائے اپنے محبوب کے۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچی..... تو ثریا گھر پر نہیں تھیں..... اس نے دروازے کو لاٹک کیا، کپڑوں کا شاپروہیں تخت پر

چھوڑا اور کمرے میں آ کر بے صبری سے ارمغان کا خط کھول لیا۔ خط پڑھتے پڑھتے وہ منہ میں کہنے لگی ”مجھے یقین تھا کہ تم میرے ہو..... صرف میرے۔“

پھر اس نے خط کو سینے سے لگا لیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ چار سال کے بعد ارمغان نے اسے اپنی خبر دی تھی۔ وہ خط میں کھوئی ہوئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی..... اس نے خط کو اپنے بستر کے نیچے چھپا لیا اور خوشی خوشی جا کر دروازہ کھولا تو سامنے نورین کو اس کی قمیص پکڑے پایا۔

”تھینک یو رحما..... یہ لو اپنی قمیص.....“ اس نے مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔

رحمان نے جھٹ سے اسے گلے سے لگا لیا..... وہ حیرت میں پڑ گئی۔

”کیا ہوا.....؟ خیریت! نورین نے خوشی خوشی پوچھا۔

”اندر تو آؤ۔“ رحما اس کا ہاتھ تھامے اندر چلی آئی..... نورین کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

رحمان نے بستر کی چادر اٹھائی اور ارمغان کا خط اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور۔ مسکرانے لگی۔

”یہ..... خط کس کا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہارے بے ایمان بھائی کا.....“ رحمان نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

”سچ.....؟“ نورین نے خوشی سے پوچھا اور خط اونچی آواز سے پڑھنے لگی..... رحما کا چہرہ دمنے لگا۔

اس کا انتظار جو ختم ہو گیا تھا۔

”یہ خط کس کے گھر پر آیا ہے؟“ ایک دم نورین چیخ اٹھی۔

وہ ہنسنے لگی..... اور پیار سے نورین کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں۔

”میں پوچھ رہی ہوں، یہ کیا راز ہے..... کس کے گھر کا ایڈریس تم نے دے دیا اور مجھے خبر بھی نہیں

ماہنامہ پاکیزہ 229 جنوری 2013ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

جان جان

ہونے دی۔“ نورین نے اپنی قمیص کی آستین چڑھا کر کہا۔

”یہ راز راز ہی رہنے دو..... ورنہ تم میری جان کھا جاؤ گی۔“ رحمان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”ایسی بات ہے تو یہ خط واپس نہیں دوں گی۔“ اس نے خط اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا۔

رحما بے صبری سی ہو گئی..... اور اس سے خط چھیننے لگی..... نورین ہنستے ہنستے چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئی اور اس نے اوپر جا کر رحما کو منہ چڑا کر خط دکھایا تو رحما اس کے پیچھے بھاگی۔

☆☆☆

وہ تین دن کے بعد اسے نظر آئی..... اسے دیکھتے ہی وہ گھبرا گیا..... کہ کہیں اسے خط کے راز کا علم تو نہیں ہو گیا۔ اس نے اپنے کام پر توجہ کر لی اور اس سے انجان ہو گیا۔

”سینس.....! اس نے شائستگی سے اسے پکارا۔ وہ پیلے سوٹ میں بہت کھلی کھلی دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ خط پوسٹ کر دیں۔“ اس نے بیگ سے لفافہ نکالتے نکالتے کہا۔

اس نے خاموشی سے لے لیا..... رحمان نے اسے پیسے تھما دیے۔

”رجسٹری کر دوں؟“ اکرم نے نظریں چرا کر پوچھا۔

”جی ہاں..... آپ کا بہت بہت شکریہ.....“ رحمان نے آہستہ سے کہا۔

”شکریے کی کوئی بات نہیں.....“ اس نے نظریں بدستور جھکائے..... جواب دیا..... وہ اس سے نظریں ملانے سے ڈر رہا تھا۔ رجسٹری کی رسید کاٹنے کاٹنے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے..... وہ رسید لے کر پوسٹ آفس سے نکلی تو اس کی انکی سانس بحال ہوئی۔ اس نے رحما کے جانے کے بعد بے صبری سے خط نکالا اور پڑھنے لگا۔

ماہنامہ پاکیزہ 228 جولائی 2013ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

”پیارے ارمغان!“

آداب!

تمہارا خط ملا..... یوں لگا جیسے پوری دنیا میری مٹھی میں آگئی ہو، تم خیریت سے ہو، خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا..... اور تم میرے ہو اس پر خود کو خوش قسمت سمجھا کہ میری سچی محبت اب بھی تمہارے دل پر حکمرانی کر رہی ہے۔ تم کسی کو نظر بھر کر نہیں دیکھتے۔ خط میں پڑھا تو لبوں پر مسکراہٹ چھا گئی..... تمہیں ثبوت دینے کی ضرورت نہیں..... تم میرے ہو یہ میرا دل ہمیشہ گواہی دیتا رہا..... تمہارے خط کو یاد کر میری ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور اب زندگی اچھی لگنے لگی ہے۔ تم کب واپس آ رہے ہو، جلدی آ جاؤ، مجھے صرف تمہارے پیار کی ضرورت ہے، تم دنیاوی چیزوں کے لیے مجھ سے دور نہ رہو، مجھے پیار کے علاوہ کسی چیز سے کوئی غرض نہیں..... ایسا نہ سمجھ لینا کہ میں تمہارا انتظار کر کے تھک چکی ہوں..... میں تو ہمیشہ تمہاری منتظر رہوں گی..... خط کا جواب جلد دے دینا۔“

آخر میں اس کا نام رحما..... اور شعر لکھا ہوا تھا۔
”تیری محبت نے عجب اک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں“
اکرم نے خط کو پڑھا تو اک عجیب سا سکون اسے اپنے اندر اترتا محسوس ہوا..... اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور زریب کہنے لگا میں نے اس کی جان کو بچا لیا..... میں نے اس کی جان کو بچا لیا۔“

☆☆☆

صبح صبح وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی..... اس نے جلدی سے ہاتھ دھو کر نکلا بند کیا اور دروازے کی طرف لپکی۔

”کون ہے؟“ اس نے بیزاری سے پوچھا۔
”میں ہوں بیٹا خالہ عظمت.....“ عظمت نے ہنسنے ہوئے جواب دیا۔

”خالہ آپ.....؟“ اس نے حیرانی دکھائی۔

”نورین کا رشتہ پکا ہو گیا.....“ عظمت خالہ نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اطلاع دی۔
”کیا.....؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”بچ..... وہ میرا دیور احتشام جو لندن میں رہتا ہے اس نے کل رات فون کر کے اپنے بیٹے وہاب کے لیے نورین مانگی ہے۔“
”خالہ..... نورین کدھر ہے؟ کبخت خود نہیں آئی؟“ اس نے خوشی خوشی پوچھا۔

”وہ تو آرہی تھی، میں نے اسے روکا کہ ثریا کو اچھی خبر میں سناؤں گی۔“ عظمت نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور ثریا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں..... رحما بھی خوشی خوشی ان کے پیچھے چل دی۔

ثریا سو رہی تھیں..... عظمت ان کی چارپائی پر ہی بیٹھ گئیں۔

”اماں..... اماں!“ رحما نے ماں کو آہستہ سے جگایا۔

”ہاں..... ہاں۔“ ثریا آنکھیں ممل کر بولیں۔

”اماں، خالہ عظمت آئی ہیں..... دیکھیں تو.....“ رحما نے خالہ عظمت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ثریا نے پھر آنکھیں موند لیں..... اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

”اٹھ بھی جاؤ..... میری لاڈلی سہیلی۔“ عظمت ثریا کا کندھا ہلا کر ہنس کے بولیں۔

”ہاں..... ہاں..... اٹھ رہی ہوں..... ایسی کیا بات ہے..... جو تم صبح صبح مجھے جگانے آ گئی ہو۔ محلے میں کوئی فوت تو نہیں ہو گیا۔“ ثریا انگڑائیاں لیتے لیتے اٹھیں۔ رحما ہنسنے لگی..... عظمت نے بھی قہقہہ لگایا..... ثریا حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”لگتا ہے کوئی اچھی خبر ہے..... جو تم دونوں کبھی کبھی کر رہی ہو۔“ ثریا نے ہنسنے ہنسنے پوچھا۔

”ثریا میں نے تیری بیٹی کا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ عظمت نے ثریا کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”کیا مطلب ہے..... رحما کا رشتہ؟“ ثریا کا چہرہ فق ہو گیا..... رحما بھی ماں کے جواب پر الجھی گئی۔

”تیری نورین بیٹی کا رشتہ میں نے طے کر دیا..... احتشام کے بیٹے وہاب کے ساتھ۔“ عظمت نے وضاحت کی۔

”بہت، بہت مبارک باد۔“ ثریا نے مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔

”عظمت خالہ بہت شاندار پارٹی مجھے دیجیے گا..... میں نے بہت دعائیں کی تھیں۔“ رحما نے خالہ عظمت کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”نورین کے ساتھ ساتھ میں تیرے لیے بھی ہزار دعائیں کرتی ہوں۔“ خالہ عظمت نے ہنس کر کہا۔

”بس رحما کے لیے بھی اچھا سا رشتہ مل جائے..... تو دونوں کی شادی جلد از جلد کر دیتے ہیں۔“ ثریا اپنے دل کی بات زبان پر لے آئیں۔
”خدا اکرم کرے۔“ عظمت نے سنجیدگی سے کہا۔

”اماں میں نورین کے پاس جاتی ہوں۔“ اس نے وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا..... اس کے چہرے کا رنگ جوفق ہو رہا تھا..... وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ ثریا لڑکے کے متعلق بات چیت کرنے لگیں..... اور عظمت خوشی خوشی بتا رہی تھیں۔

☆☆☆

”میری پیاری بہنیا..... بنے گی دلہنیا..... ج کے آئیں گے دولہے راجا.....“ رحما نے نورین کو دیکھا تو زور زور سے گلا پھاڑنے لگی۔

”ہا ہا ہا..... تو خوش ہو جا، میری آزادی کو غلامی کی جو شکل مل رہی ہے۔“ نورین نے منہ بنا کر اس کے گانے پر جواب دیا۔

”چل جلدی سے اچھا سانا شتا بناؤ..... میرے خیال میں حلوا پوری منگوا لو..... منہ میٹھا ہو جائے گا۔“ رحما اس کے پاس بستر پر آ بیٹھی..... اور شوخی سے حکم دیا۔

”اچھا جی..... پہلے اپنی ٹریٹ دو..... پھر میں اپنی دوں گی۔“ نورین نے ہنسنے ہنسنے کہا۔
”میری کب منگنی ہوئی ہے؟“ اس نے حیرانی دکھائی۔

”ارمغان کا خط جو آیا ہے۔ اس کی ٹریٹ مانگ رہی ہوں۔“ نورین نے وضاحت کی۔
”اچھا بابا..... دے دوں گی۔ کنجوس مت بنو..... اور حلوا پوری کھلاؤ۔“ رحما نے منہ بسور کر تکیہ بانہوں میں سنبھالا۔

”اچھا میڈم..... حلوا پوری منگوا دیتی ہوں۔ اماں تو گھر آ جائیں۔“ نورین نے ہنس کر کہا۔ ”تم بتاؤ جناب! ارمغان کب تک آرہا ہے..... اس نے کچھ بتایا؟“ اب کے نورین نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”بہت جلد آرہا ہے۔“ رحما نے خوشی سے کہا۔

”ریٹلی..... اس کا مطلب ہے کہ دونوں سہیلیوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ تم بھی باہر چلی جاؤ گی اور میں بھی۔“ اس نے خوشی خوشی جواب دیا۔
”ہاں..... مگر ہماری اماؤں کا کیا ہوگا؟“ رحما نے فکر مند سا چہرہ بنا لیا۔

”اوہو..... یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا۔“ نورین کا چہرہ بھی مرجھا سا گیا۔

”تم لوگوں کو سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہر لڑکی نے اپنے گھر جانا ہوتا ہے۔“ شکر ہے عظمت خالہ نے ان دونوں کی آخری باتیں ہی سنی تھیں جو اپنی ماں کی جدائی کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔

دیکھا۔

”بس تیرے ابا اور میں سوچ رہے تھے..... بلکہ تیرے ابا نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تیری نظر میں کوئی لڑکی ہے تو بھی صاف صاف ہمیں بتادے ہم اسے بڑی خوشی کے ساتھ گھر لے آئیں گے۔“

سیکنہ نے ہنستے ہوئے بیٹے سے کہا۔

”اماں..... میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

یہ کہہ کر وہ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

”کیوں.....؟“ سیکنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ابھی میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا ہوں.....“ اس نے جواب دیا۔

”گھر میں بہو آجائے گی تو ہم دونوں بوڑھے لوگوں کو بھی خوشی مل جائے گی اور پھر تیرے بچے ہوں گے تو گھر میں دوبارہ سے خوشیاں لوٹ آئیں گی۔“

سیکنہ نے افسردگی سے اپنی بیٹی کو یاد کیا۔ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔

”اماں..... آپ فکر نہ کریں بہت جلد آپ کو اپنا فیصلہ سنا دوں گا۔“ اس نے ماں کو تسلی دی جبکہ اس نے شادی کا سوچا تک نہیں تھا۔

☆☆☆

اس نے رات کو پھر خط کھول لیا..... اور پڑھنے لگی۔

”پیارے رحما.....!“

آداب! تمہارا پیارا سا خط ملا..... دل خوشی سے جھوم اٹھا..... کہ میں نے تمہاری مسکراہٹ واپس کر دی..... مجھے اندازہ ہے کہ تم نے میرے لیے کتنے آنسو بہائے ہیں، مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی اداس نہیں رہو گی اور تمہیں معلوم ہے کہ میں جب اداس ہوتا ہوں تو تمہیں سوچتا ہوں، اداسی بھاگ جاتی ہے کہ پاکستان اڑ کر آ جاؤں..... بس کچھ کام ادھورے ہیں..... بہت جلد انہیں مکمل کر کے تمہارے پاس لوٹ آؤں گا پھر ہم اپنا نیا گھر بسائیں

تو پیار سے بولتی ہوں۔“ نورین کہتے ہوئے گلاس میں پانی انڈیل کر جلدی جلدی پینے لگی۔

”آہستہ پانی پو..... کہیں سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔“ رحمان نے ہنس کر کہا۔

”نہیں جاتا جناب..... پکی ہڈی کی بنی ہوئی ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”جیسے ماسی کلثوم پکی ہڈی ہے.....“ رحمان نے کام کرتے ہوئے ماسی کلثوم کو یاد کیا۔

”یاد آیا..... وہ ماسی کلثوم اماں اور خالہ ثریا سے تیرے لیے چوہدری صاحب کے رشتے پر اصرار کر رہی ہیں۔“ نورین نے اسے بتایا۔

”ہاں، ہاں میں جانتی ہوں..... اماں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔“ رحمان نے بے پروائی سے کہا۔

”اچھا..... مگر میں نے تو اماں کی زبانی سنا ہے کہ خالہ ثریا کہہ رہی تھیں کہ چوہدری صاحب کو دیکھنے میں کیا حرج ہے۔“

”کیا.....؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”رنگی..... رحما..... میں نے سمجھا شاید تمہیں سب معلوم ہوگا۔“ نورین نے حیرانی سے جواب دیا۔

رحما فکر مند ہو گئی کہ اماں کو اس نے صاف صاف انکار بھی کر دیا تھا پھر وہ کیوں چوہدری صاحب کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

”کچھ نہیں ہوگا..... بس تم ارمغان سے کہہ دو کہ وہ پاکستان آ کر تم سے شادی کرے..... یا کم از کم اپنے والدین کو ہی بھیج دے بات کرنے۔ باقی خالہ ثریا کو میں دیکھ لوں گی.....“ اس نے اپنی سیمپلی کو دلا سا دے کر گلے سے لگا لیا مگر رحما کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

”وہ تیری نمو خالہ کی بیٹی کرن کیسی لگتی ہے تجھے؟“ اس نے کھانا کھاتے ہوئے ماں کو حیرت سے

گا تو کیا ہوگا مگر اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں وہ خود کو فریش کرنے کے لیے لمبی لمبی سانس لینے لگا۔

☆☆☆

دو پہر کو وہ سلائی سے فارغ ہوئی تو اس نے ثریا کو کپڑوں کا شاپر تھمایا کہ امجد بھائی کو سلے کپڑے دے آئیں اور حساب کتاب بھی مکمل کر آئیں.....

ثریا گھر سے نکل آئیں اور وہ باورچی خانے میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے برتنوں کو صاف کیا تو اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی..... اس نے مڑ کر دیکھا تو نورین کو پایا۔

”تم نے مجھے ڈر دیا۔“ رحما دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”اچھا..... ایسی بھی بد صورت نہیں ہوں۔“ وہ منہ بسور کر کہنے لگی۔

”ہا..... ہا.....“ اس کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

”یہ جناب کیا پکایا جا رہا ہے؟“ اس نے ہنڈیا میں ڈوئی چلائی تو نورین نے چکن کو بھونٹتے دیکھ لیا۔

”چکن قورمہ بنا رہی ہوں۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”خیریت تو ہے ناں..... کوئی آ تو نہیں رہا.....“ اس نے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی تو کھیر کا ڈونگا دیکھا جسے رحمانے بادام پستے سے سجایا ہوا تھا۔

”آج ارمغان کی سالگرہ ہے.....“ رحما ہنس کر بولی۔

”واہ جی واہ..... بے ایمان بھائی کی سالگرہ ہے..... پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”تمہیں کیوں بتائی..... اور پلیز اب تو اسے بے ایمان بھائی کہنا چھوڑ دو۔“ رحمانے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

”یار میں گفٹ لے کر آتی اور بے ایمان بھائی

اماں..... آپ تنہا کیسے رہ سکتی ہیں؟“

نورین نے افسردگی ظاہر کی۔

”اتنے اچھے موقع پر اداسی اچھی نہیں لگتی۔“

عظمت نے اس کا ماتھا چوما۔

”خالہ جان دیکھ لیں..... رونے کا بہانہ بنا کر حلوا پوری کھلانے سے بچ رہی ہے۔ چل جلدی سے پیسے خالہ کو دے، وہ بازار سے جا کر حلوا پوری لے آئیں۔“ رحمانے اس کی اداسی کا موضوع پلٹ دیا۔

”ہاں، ہاں اماں حلوا پوری لا دیں، رحما کو ٹریٹ دینی ہے۔“ اس نے جلدی سے اپنے بیگ کو سنبھالا اور اماں کو پیسے دیے۔

”تم دونوں گپ شپ کرو، میں ابھی جا کر لاتی ہوں۔“ خالہ عظمت نے چادر اوڑھی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

وہ پھر بیس دن کے بعد پوسٹ آفس پہنچی.....

اکرم نے خاموشی سے خط اسے دے دیا۔ اس نے خط لے کر شکریہ ادا کیا۔ وہ مزید بات کرنا چاہتی تھی مگر اکرم نے معذرت کی کہ اسے کسی سے ملنے جانا ہے۔ وہ سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا..... اس نے رحما سے بے پروائی ظاہر کی جیسے وہ اس کے خط آنے یا دینے کے مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا ہے۔ جب وہ پوسٹ آفس سے باہر نکلی تو اکرم نے سیٹ سنبھالی اور سوچنے لگا۔

”کیا میں رحما کے احساسات سے کھیل رہا ہوں..... اسے جب سچ کا علم ہوگا..... تو اسے کتنا دکھ ہوگا..... شاید وہ مجھے غلط آدمی سمجھے..... کہ میں نے اس کی زندگی کو مذاق بنایا..... مگر میں تو صرف اس کی جان بچانا چاہتا تھا..... صرف جان..... کیونکہ میں اپنی بہن کی جان نہ بچا سکا.....“ اس نے اپنی کینٹی اپنے ہاتھ سے مسکنی شروع کر دی۔ وہ رحما کے یوں خطوط کے سلسلے سے ڈر رہا تھا کہ سچ جب سامنے آئے

ماہنامہ پاکیزہ 232 جنوری 2013

WWW.PAKSOCIETY.COM

233 جنوری 2013

”مائی فٹ..... یہ لڑکی خود کو کیا سمجھتی ہے.....“
اس کا میں وہ حال کروں گا کہ بس دیکھتی رہ جائے گی۔“ اس نے استغنیٰ پھاڑتے ہوئے کہا..... ماہم آفس میں نئی لڑکی آئی تھی جو ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، عیاش طبیعت حبیب احمد کی نظر اس پر پڑ گئی تو اسے ڈنر کی دعوت دے دی۔ معصوم ماہم نے ڈنر پر جانے سے انکار کیا کر دیا..... حبیب پاگل ہی ہو گیا..... اور اسے بار بار اپنے روم میں بلانے لگا..... ماہم نے حبیب کی حرکت کو نوٹ کیا پھر تنگ آ کر اس نے استغنیٰ دے دیا..... جو حبیب کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے ماہم چاہیے..... اپنے آفس میں..... جاؤ اور اسے بلا کر لاؤ.....“ اس نے غصے سے حکم دیا۔

”سر..... وہ نہیں آئے گی۔“ سکیرٹری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”تو اٹھا کر لے آؤ.....“ حبیب کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔

”سر..... اگر آپ کو مناسب لگے تو اک بات کہوں؟“ اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”ہاں..... بولو..... کیا کہنا چاہتے ہو.....“

حبیب نے غصے سے سیل فون پر پھر ماہم کا نمبر پرپس کیا..... دوسری طرف نیل جا رہی تھی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔

”سر آپ ماہم کے مسئلے کو بھول جائیں..... کہاں آپ..... اس مڈل کلاس لڑکی کے ساتھ آپ کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔“

”حیدر..... اپنی حد میں رہو.....“ وہ چیخا۔

”جی سر..... جیسا آپ کا حکم..... میں اسے اٹھا کر کہاں لے کر پہنچوں..... آپ اپنا ٹائم ٹیبل بتادیں.....“ حیدر نے سر جھکا کر پوچھا۔

”پرانی حویلی میں۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”جی، میں کل حاضر ہوتا ہوں.....“ حیدر نے

لندن آ جاؤں گی..... پھر خوب مزے کریں گے۔“
اس نے نورین کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”ارمغان پاکستان کب آئے گا؟“ نورین نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”آجائے گا..... بہت جلد..... اور موڈ ٹھیک کرو..... اور بتاؤ کہ تم نے کون سا رنگ اپنے نکاح کے لیے سوچا ہے۔“ وہ دونوں کپڑوں اور زیور کی باتیں کرنے لگیں کہ کیسا زیور اور کیسے جوڑے وغیرہ.....

☆☆☆

وہ ہنڈ اسٹی سے اتر اور غصے سے اپنے آفس میں آ پہنچا..... اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی..... سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے مگر اس کی سیٹ خالی تھی۔ وہ غصے سے اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔

اس نے کال ملائی..... دوسری طرف نیل جا رہی تھی۔

”خود کو کیا سمجھتی ہے..... ایسی لڑکیوں کو تو میں اپنے جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔ مجھے بھلا مجھے انکار کر دیا..... میں اس کی ایسی کی تیبی کر دوں گا.....“ وہ غصے سے منہ میں بڑبڑاتا رہا مگر دوسری طرف سے کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

”سر کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اس کے سیکرٹری نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں آ جاؤ، پہلے کون سا باہر کھڑے ہو.....“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”جی سر.....“ وہ شرمندہ سا ہوا اور پھر ایک بند لفاقہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے خفی سے پوچھا اور نمبر دی ڈال کرنے لگا۔

”سر..... مس ماہم نے استغنیٰ دے دیا ہے۔“ سیکرٹری نے سر جھکا کر بتایا۔

”کیا.....“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا..... اس نے سیل فون چھوڑا اور ماہم کا استغنیٰ پڑھنے لگا۔

آ رہی تھی۔ اس نے آواز تیز کر دی۔

تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آ کر تو دیکھو
یہ عشق نہیں آساں..... بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
میوزک پر اس کے ہاتھ خود بخود رقص کرنے لگے..... اسے اپنی کیفیت قوالی جیسی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد نورین نے اسے اطلاع دی کہ اس کے چچا نکاح کی رسم کرنے پاکستان آرہے ہیں۔

”واہ کیا خبر دی..... یار تم لندن چلی جاؤ گی..... وہاں تم اپنے میاں کے ساتھ پلینز پلینز ارمغان سے ملنے ضرور جانا..... میں اگلے خط میں ارمغان سے تمہاری شادی کا ذکر ضرور کروں گی۔“ رحمان نے ایک ہی سانس میں بات ختم کیا۔

”تمہیں..... میری جدائی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ منہ بسور کر بولی..... اور اس کے بستر پر بیٹھ گئی..... رحمان نے دوپہر کو بہت سلائی کا کام کیا تھا..... اس لیے وہ کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹی ہوئی تھی مگر نورین کے نکاح اور لندن جانے کی اطلاع نے اسے تازہ دم کر دیا۔

”یار! فرق پڑے گا..... مگر خوشی ہوگی کہ تم اچھے گھر جا رہی ہو، مجھے لندن سے چیزیں بھیجیگی کیا؟“ رحمان نے خوشی خوشی پوچھا۔

”آف رحمان..... مت تنگ کرو..... میں اداس ہوں، اماں..... اور تمہیں چھوڑ کر کیسے رہ پاؤں گی..... اور پھر لندن کے مائوں میں ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل ہے۔“ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”اوہو..... میری پیاری سہیلی رونا نہیں..... میں بھی تو بہت جلد ارمغان کے ساتھ بیاہ کر کے

گے۔ صرف میں..... اور تم اپنی سچی محبت کے ساتھ..... تمہارے خط کا منتظر رہوں گا۔

تمہارا ارمغان“

اس نے مسکرا کر خط سینے سے لگا لیا اور خوابوں میں چلی گئی۔ ایسا گھر جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ وہ اپنے گھر کے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی..... کہ ثریا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”رحما..... رحما..... چھت سے کپڑے اتار لاؤ، لگتا ہے بہت زور کی آندھی آنے والی ہے۔“ رحما نے خط جلدی سے الماری میں چھپایا..... پھر تیزی سے چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ بستر پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ رحما کا مسکراتا چہرہ اس کی نظروں میں چھا گیا۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں..... اور پھر میز کی دراز میں سے رحما کے سارے خط نکال کر پڑھنے لگا۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ چھا گئی..... پھر آہستہ آہستہ اس کی مسکراہٹ اڑ گئی..... اس نے افسردگی سے خود کو مخاطب کیا۔

”اکرم اگر رحما کوچ کا علم ہو گیا تو وہ ٹوٹ کر بکھر جائے گی..... میں تو اسے خوابوں کی دنیا دے رہا ہوں..... میں ایسا کب تک کرتا رہوں گا.....“

اس نے اپنے دل سے پوچھا اور پھر دراز میں سے ایک کاغذ اور قلم نکال لیا..... اسے رحما کے لیے خط لکھنا تھا..... اس کا دل جو اس کے قابو میں نہ تھا اور پھر اکرم نے کب خط لکھنا شروع کیا..... اور کب ختم..... اسے معلوم نہ ہوا..... وہ عجیب نظروں سے خط پڑھنے لگا..... اسے لگا جیسے ہر لفظ اس کے دل سے نکلا ہو..... مگر خط کے آخر میں ارمغان کا نام پڑھ کر اس کا دل یک دم بجھ سا گیا کہ وہ اکرم ہے ارمغان نہیں۔

اس نے اپنی اداسی دور کرنے کے لیے ٹی وی آن کیا..... ٹی وی پر نصرت فتح علی خان کی قوالی

دوایا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی بین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

میں، میری اماں، میرے ابا مر جائیں گے..... پلیز مجھے یہاں سے جانے دیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ..... وہ بری طرح رورہی تھی

”کیوں جانے دوں..... تم نے مجھے بے عزت کرنے سے پہلے سوچا تھا۔“ وہ چیخا۔

”سرسر مجھے معاف کر دیں..... سر پلیز..... میرے والدین کو دنیا والے مار ڈالیں گے اگر میں آج گھر نہ پہنچی..... پلیز مجھے جانے دیں۔“ ماہم نے کانپتے ہونٹوں سے اپنے لیے فریاد کی۔

”میں یہی تو چاہتا ہوں کہ تم اس معاشرے میں ایک لعنت بن جاؤ.....“ وہ ہنسا۔

”سرسر! آپ پلیز مجھے جانے دیں..... آپ جیسا کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گی۔ پلیز مجھے آزاد کر دیں، میرے گھر نہ جانے سے میری باقی بہنوں کا مستقبل ڈوب جائے گا۔“ اس نے بے تحاشا روتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری ذات تک محدود ہوں..... تمہارے گھر والوں کا میں نہیں سوچنا چاہتا..... اور ہاں، مجھے تم سے کوئی غرض نہیں رہی..... بس تم دو دن تک یہاں ہی رہو گی، جب تمہارے گھر اور محلے والوں کو تمہاری غیر موجودگی کا احساس ہو جائے گا اور لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگیں گے تو حیدر تمہیں آزاد کر دے گا۔“ اس نے اونچی آواز سے جواب دیا۔

”سرسر..... خدا کے لیے مجھے چھوڑ دیں۔“

”فون حیدر کو دو۔“ حسیب نے غصے سے کہا۔

”سرسر! مجھے چھوڑ دیں..... سر مجھے چھوڑ دیں۔“

دوسری طرف سے حسیب نے فون کٹ کر دیا..... وہ مطمئن دکھائی دینے لگا۔

ماہم نے دیوار کا سہارا لے لیا..... وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ حیدر نے سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

مطمئن ہو کر کہا۔ ”پھر میں ماسی کلثوم سے تیرے لیے اچھا سا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے بول دوں گی..... ویسے چوہدری صاحب کا گھر بھی بہت اچھا ہے۔“

”آپ..... وہاں گئی تھیں کیا؟“ وہ سہم سی گئی۔

”ہاں..... کلثوم ماسی نے بہت زور لگایا تو سوچا کہ دیکھ لیتی ہوں..... لڑکا بہت پیارا ہے..... اور ماشاء اللہ سے کماتا بھی خوب ہے۔“ وہ کچھ پرجوش ہو گئیں۔

”اماں..... چلیں آپ سو جائیں..... زیادہ دیر تک آپ کے لیے جاگنا مناسب نہیں۔“ اسے ماں کی بات پر کچھ اور نہ سوچا بس بیزار سامنے بنالیا۔

”ثریا اس کے زور پر خاموش ہو گئیں..... رحما کے چہرے پر فکر کے آثار چھانے لگے کہ کہیں اس کی ماں کو اور مغان کی محبت کا شک نہ ہو جائے۔“

”سرسر..... وہ ماہم کو ہم حویلی لے آئے ہیں.....“ سیکرٹری حیدر نے ادب سے اپنے کارنامے کا اظہار کیا۔ وہ جو چند ساتھیوں کے ساتھ ماہم کو زبردستی راستے سے اٹھا کر حویلی لے آیا تھا۔

”اوہ..... گریٹ.....“ اس کی آواز میں خوشی بھرا آئی۔

”سرسر آپ کب تک آئیں گے..... اچھا اور کوئی حکم.....؟“

”پلیز مجھے یہاں سے جانے دیں.....“ ماہم نے تڑپ کر کہا..... جس کی آواز فون پر حسیب نے سن لی۔

”ماہم کو فون دو.....“ حسیب نے فخریہ انداز میں کہا۔

”جی سر.....“ حیدر نے فوراً حکم مانا..... اور سیل فون ماہم کو تھما دیا۔

”سرسر..... پلیز مجھے یہاں سے جانے

سر جھکا کر کمرے سے باہر نکلتا چلا۔

”حیدر..... کل نہیں..... آج رات کو.....“

حسیب نے اپنے ہاتھوں کو ملتے ملتے حکم دیا۔

”جیسی آپ کی مرضی.....“ حیدر کا چہرہ پیلا پڑ گیا..... اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ حسیب احمد نے آنکھیں موند لیں اور لمبی لمبی سانس لے کر اپنے غصے کو قابو کرنے لگا۔

☆☆☆

اس نے اماں کو کھانا کھلایا اور دوائی ہاتھ میں پکڑا دی۔

”چلیں..... جلدی سے کھالیں.....“

”بس یہ دوائی دینا تو نہیں بھولتی..... باقی سب باتوں سے بے پروا رہتی ہے۔“ ثریا نے آہ بھر کر روٹ دوسری طرف کی۔

”کون سی باتوں سے بے پروا ہوں میں؟“

رحمانے مسکرا کر پوچھا۔

”اپنی شادی کے حوالے سے کیوں نہیں سوچ رہی..... دیکھ..... اگلے ہفتے نورین کا نکاح ہو رہا ہے پھر تو بھی اپنے متعلق سوچنا شروع کر دے۔“ ثریا نے اپنے دل کی بات ظاہر کی۔

”اچھا..... اچھا..... تو میرے متعلق سوچ سوچ کر آپ بلڈ پریشر بڑھا رہی ہیں۔“ اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ ثریا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”بیٹی میں چاہتی ہوں کہ تو جلد اپنے گھر کی ہو جائے..... میرے سوا اس دنیا میں کون ہے تیرا..... اگر خدا نخواستہ مجھے کچھ ہو گیا..... تو تیرا کیا ہوگا۔“ ثریا نے معصومیت سے سمجھایا۔

”اماں..... ایسی غلط باتیں مت کیا کریں..... خدا کا کرم ہمیشہ اس گھر پر رہے گا..... اور میں بہت جلد شادی کا سوچ لوں گی..... آپ فکر کرنا چھوڑ دیں اماں۔“

”بس جلد ہی کوئی جواب دینا.....“ ثریا نے

شاید فریج میں دیکھو..... انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر سوچتے ہوئے کہا۔

رحما باورچی خانے کی طرف بڑھی..... اس نے فریج کھولا..... اور گلاب کے تازہ پھولوں کی ٹوکری نکالی اور باورچی خانے میں ہی گجرے بنانے کا کام کرنے لگی۔

خالہ عظمت اوپر کا کام سمجھا کر نیچے آ پہنچیں..... اور تھکے لہجے میں بولیں۔

”نورین نہیں آئی کیا؟“ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر فکر مندی سے کہا۔

”اوہو..... خالہ عظمت دلہن کے نخرے سمجھیں..... آجائے گی۔“ رحمانے تیسرے گجرے کے لیے سوئی میں دھاگا ڈالا۔

”تم بھی بیوٹی پارلر چلی جاتیں..... آج تھوڑی انہوں نے نورین کو دلہن بنانا ہے..... نکاح کی تقریب میں تین دن ہیں ابھی۔“ خالہ عظمت نے منہ بسور کر جواب دیا۔

”خالہ عظمت! میری پیاری خالہ..... فیشل، اسکن پالش وغیرہ آج ہوگی تو پھر ہماری نورین رانی کی طرح دکے گی۔“ اس نے دھاگا ڈال لیا اور پھول پرونے لگی۔

”ہمارے وقتوں میں یہ سرخی پاؤڈر نہیں تھا..... اور یہ سرخی پاؤڈر سے بھی کوئی بھلا خوب صورتی بڑھتی ہے۔“ خالہ عظمت نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی..... اور پانی کا گلاس بھر کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”خالہ جی، آپ کا داماد لندن سے آیا ہے اور لندن میں تو گوری گوری رنگت کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے تو نورین ہماری اسکن پالش کروا رہی ہے۔“ اس نے کھی کھی کر کے جواب دیا۔

”ہاں..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ وہاب کو نورین پسند آتی چاہیے۔“ خالہ عظمت آہستہ آہستہ

بہنیں تھی اس کا اس نے اکرم سے اظہار کر دیا۔

”اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے، اس نے یہاں آپ کی پریشانی حل کرنے کو شاید مجھے بھیج دیا۔“ وہ مسکرایا۔

”کیا..... آپ ڈاک خانے کی پوسٹ سے خوش ہیں؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں۔“ اکرم نے خود کو سنبھالا..... وہ بوکھلا سا گیا کہ رحما کو اس کے دل کا حال کیسے معلوم ہو گیا۔

”میں جب بھی آتی ہوں..... آپ کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات ہوتے ہیں..... اس لیے خود ہی اندازہ لگالیا.....“ کئی دنوں سے اکرم جو اس سے نظریں چرا کر خود کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ آپ چہرہ پڑھ لیتی ہیں.....“ اکرم نے خوش دلی سے کہتے ہوئے رسید اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

”شکریہ..... مگر میں چہرہ نہیں پڑھ سکتی۔“ مذاق کر رہا تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

”جی“ میں چلتی ہوں..... اس نے چادر سنبھالی..... اور پوسٹ آفس کے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اکرم کی نظروں نے دور تک اس کا خائب کیا..... اور وہ پھر سارا دن مسکراتا رہا۔

☆ ☆ ☆

نورین کا گھر بہت پیارا سجا ہوا تھا..... عظمت خالہ نے اپنی ساری جمع پونجی اس دن کے لیے رکھی ہوئی تھی، وہ جامنی کالر کے سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی اور انتظامات میں آگے آگے تھی۔

”خالہ عظمت“ تازہ پھول آگئے ہیں تو نکالیں..... وہ گجرے بنانے میں ناں اُٹا اس نے نہت پر کھڑی عظمت خالہ سے پوچھا جو اوپر چھت کی کنڈیروں کی سجاوٹ کروا رہی تھیں۔

”ہاں رحما..... باورچی خانے میں دیکھو.....

تمہارے دل کی بات پڑھنے کا بھی سننے کا شدت سے انتظار ہے۔

قائل نہیں میں رونے کی پھر بھی کبھی کبھی تنہائی میں کچھ دیر رونا اچھا لگتا ہے فقط تمہاری رحما“

☆ ☆ ☆

اکرم نے صبح صبح پوسٹ آفس میں اسے دیکھا..... اسے دیکھتے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”سنیں.....“ وہ کام میں مصروف ہو گیا تو وہ پاس آ کر بولی۔

”جی.....“ اس نے سر اٹھا کر بیزاری سے جواب دیا۔

”یہ خط پوسٹ کر دیں.....“ رحمانے مسکرا کر کہا..... وہ ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”جی.....“ اس نے لفافہ ہاتھ میں پکڑ لیا اور نکٹ چسپاں کرنے لگا۔

”میں آپ کی بہت مشکور ہوں.....“ اس نے شائستگی سے کہا..... اور اپنی چادر ٹھیک کرنے لگی۔ وہ خاموش رہا۔

”آپ ڈاک خانے میں نئے آئے ہیں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں.....“ وہ مسکرایا۔

”آپ کی ملازمت میرے لیے مبارک ثابت ہوئی.....“ اس نے تھوڑا مسکراتے ہوئے کہا۔

”شکریہ کہ میں کسی کے کام تو آیا۔“ اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

”میں آپ کے لیے دعائیں کرتی ہوں..... آپ میرے لیے فرشتے جیسے ثابت ہوئے۔ آپ نے میری امانت کو سنبھال کر ہمیشہ میرے حوالے کیا۔“ وہ خوشی سے اپنے دل میں جو مان اسے دے

”ہمارے مالک کو جو چیز پسند آجائے وہ چھین لیتے ہیں، تمہیں سوچ سمجھ کر حبیب صاحب کو جواب دینا چاہیے تھا..... اب یہاں سڑتی رہو..... حیدر نے یہ کہہ کر اپنے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔“

”پلیز مجھے جانے دو..... پلیز مجھے چھوڑ دو.....“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتی اس کے پاؤں پڑ گئی۔ حیدر نے ٹھوکر سے اسے دور پھینکا اور کمرے سے باہر آ کر دروازے کو باہر سے لاک لگانے لگا۔

☆ ☆ ☆

آدھی رات کا وقت تھا اور وہ بستر پر لیٹی سخت بے چین تھی۔

”مجھے ارمغان سے شادی کی بات کرنی چاہیے۔“ اس نے گویا خود سے پوچھا اور اٹھ کر لائٹ جلا کر خط لکھنے بیٹھ گئی۔

”پیارے ارمغان!

آداب!

تم کیسے ہو.....؟ میں خیریت سے ہوں..... اور خوش بھی ہوں..... میری پیاری سہیلی نورین کی شادی ہونے والی ہے اور تمہیں پتا ہے کہ وہ لندن تمہارے شہر جا بے گی..... میں نے تو اسے تم سے ملنے کے لیے پہلے سے کہنا شروع کر دیا ہے مگر نورین کا کہنا ہے کہ میں بھی لندن آسوں..... میں لندن کیسے آ سکتی ہوں..... میں نے تو لندن آنے کا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا..... اماں نے بھی میری شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا ہے..... اماں چوہدری صاحب کے گھر بھی جا چکی ہیں۔ میرے رشتے کے لیے اور انہیں پسند بھی آ گیا ہے مگر میری خاموشی کی وجہ سے وہ چپ رہتی ہیں۔ ارمغان کیا تم مجھے اپنا نا چاہتے ہو یا پھر..... نورین کا کہنا ہے کہ میں سچ اپنے دل کی بات تمہیں بتا دوں اور میرے دل میں کیا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ خط کے جواب کی منتظر رہوں گی..... اپنے دل کی بات لکھ دی ہے،

پانی کے گھونٹ لینے لگیں۔

☆☆☆

”اماں! یہ، یہ..... یہاں میں نے اپنا والٹ رکھا تھا.....“ اکرم نے خفگی سے تکیہ اٹھا کر کہا۔ سیکنہ نے ادھر ادھر دیکھا..... مگر والٹ کہیں نہیں ملا۔

”بیٹا تجھے یاد ہے نا..... کہ تو نے یہاں ہی رکھا تھا.....“ سیکنہ نے بستر کی چادر ادھر ادھر الٹا کر فکر مندی سے پوچھا۔

”جی..... اماں۔“ وہ مجھ سا گیا۔ قیوم صاحب بھی کھانتے کھانتے کمرے میں آ پہنچے۔

”بیٹا والٹ میں زیادہ پیسے تو نہیں تھے؟“ قیوم صاحب بھی تھوڑا پریشان ہوئے۔

”نہیں..... پیسے زیادہ نہیں تھے..... مگر کچھ ضروری کاغذات والٹ میں تھے.....“ اس نے رحما کا خط یاد کر کے جواب دیا۔

سیکنہ نے سارا کمر اچھا مارا..... مگر اکرم کا والٹ کہیں بڑا نہ ملا۔

”باہر کہیں گرا دیا ہوگا..... کچھ نہیں ہوتا اللہ مالک ہے.....“ قیوم صاحب نے بیٹے کو تسلی دی۔

”باہر یہ لڑکا نہیں گرا کر آیا..... کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ کل اس کے جوتے نہیں مل رہے تھے، آدھے گھنٹے کے بعد اسے یاد آیا کہ جوتے تو موچی کو دے کر آیا ہے۔“ سیکنہ نے بیڈ کے نیچے دیکھتے ہوئے بتایا۔

”ہا ہا.....“ قیوم صاحب ہنس دیے۔ ”تمہارا کیا مطلب ہے، ہمارے بیٹے کو بھولنے کی بیماری ہو گئی ہے۔“

”نہیں..... بھولنے کی نہیں..... مگر آج کل اس کا ذہن کہیں اور کھویا، کھویا رہتا ہے۔“ سیکنہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”نہیں اماں ایسی ویسی کوئی بیماری مجھے نہیں لگی ہوئی..... آپ پلیز جلدی سے مجھے والٹ ڈھونڈ دیں..... میرا دوست کافی شاپ میں میرا منتظر

ہوگا۔“ اکرم الماری میں سرگھسا کر والٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بولا۔

”دوست..... کون سا دوست؟“ قیوم صاحب نے ہنسی دبا کر پوچھا۔

”ابا..... مذاق مت کریں..... حمزہ کراچی سے ملنے آیا ہوا ہے.....“ اکرم نے اپنے پرانے دوست کے متعلق بتایا۔

”اچھا..... تو گھر پر آ جاتا..... ہم سے بھی مل لیتا..... ہم نے کون سے اس سے پیسے چھین لینے تھے۔“ سیکنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اماں! میں ایسا کرتا ہوں..... آپ کی حمزہ سے فون پر بات کروادیتا ہوں۔“ اس نے سیل فون جیب سے نکالا تو اس کے ہاتھ میں اس کا والٹ آ گیا۔ سیکنہ اور قیوم صاحب دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے..... سیکنہ نے قہقہہ لگایا۔

”بچہ بغل میں..... اور ڈھنڈورا شہر میں.....“ قیوم صاحب ہنس کر بولے دونوں کے قہقہوں سے کمر اگونج اٹھا..... اور وہ دم دبا کر اپنے گھر سے باہر نکلا۔

☆☆☆

”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ نورین تو پہچان میں نہیں آرہی.....“ نورین ان کے گھر آئی تو ثریا اس کی بلائیں لینے لگیں۔

”واہن..... آئی ہے، رحما کدھر ہو۔“ ثریا نے اسے باہر سے آواز دی۔ وہ اپنی قمیص سی رہی تھی جو اس نے نورین کے نکاح پر پہنی تھی۔

”اماں..... نورین کو کمرے میں بھیج دیں..... میں اپنی قمیص سی رہی ہوں۔ ابھی لائٹ چلی جائے گی۔“ رحمانے اپنی مجبوری بتائی۔

”خالہ..... اماں نے آپ کو گھر بلوایا ہے۔“ نورین اور ثریا ہنس دیں۔

”اچھا..... میں جاتی ہوں، دروازے پر کنڈی

لو۔“ ثریا نے دوپٹا سنبھالا اور گھر سے باہر نکلتے ہوئے کہہ گئیں..... نورین نے کنڈی لگائی..... اور کمرے میں رحما کے پاس جا پہنچی..... رحما کا سارا ایمان سلائی مشین پر تھا۔

”اسکن کلر..... واہ جی..... واہ..... مجھ سے زیادہ روپ تمہارا نکھرے گا.....“ رحما کے سوٹ کا پتلا اس نے سر پر اوڑھ کر ہنستے ہنستے کہا۔

”جی..... کیا.....؟“ رحمانے مشین روک کر پیار سے پوچھا۔

”جی ہاں..... اب میری طرف دیکھو.....“

نیشل ٹھیک طرح سے ہوا؟ نورین نے سائڈ ٹیبل سے آئینہ اٹھا کر اپنے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں..... اچھی لگ رہی ہو..... چہرہ بہت کھلا کھلا لگ رہا ہے۔“ رحمانے پیار سے جواب دیا مگر

تمہارا چہرہ تو بغیر فیشل کے دمک رہا ہے..... کیا ارمغان کا خط آیا ہے..... جس میں تم سے شادی کرنے کی اطلاع ہے؟“ نورین نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں..... اس کا خط نہیں آیا..... مگر میں نے اپنے دل کی بات لکھ دی اسے..... اب اس کے جواب کی منتظر ہوں۔“ وہ بدستور سلائی کرتے ہوئے بولی۔

”اچھا..... تو بے ایمان بھائی کو تم نے بتایا..... کہ میں ان کے پاس لندن آرہی ہوں۔“ اس نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

”اب وہ بے ایمان نہیں رہا.....“ وہ بھی ہنس کر بولی۔

”شادی جب کرے گا..... تو ایمان دار بھائی بے لقب دوں گی.....“ اس نے رحما کا دوپٹا لگا کر ہنستے ہنستے اسے چھیڑا۔

”توبہ ہے..... شرم کرو..... کتنے خطوں کے قلاب دے چکا ہے۔ تمہیں تسلی نہ جانے کب ہوگی۔“ رحمانے مشین پر ہاتھ چلایا۔

جان جان

”تم پہلے اپنا سوٹ مکمل کر لیتیں..... اب مجھے مہندی کون لگائے گا.....“ اس نے منہ بسور کر پوچھا۔

”اچھا..... تو کام سے آئی ہوں.....“ رحمانے اس کی بات پکڑی۔

”جی نہیں..... کام سے نہیں آئی ہوں..... بلکہ تم سے حق سے کام کروانے آئی ہوں.....“ اس نے قہقہہ لگا کر زور سے جواب دیا۔

”وہاب کا فون آیا ہے کیا؟“ رحمانے پیار سے پوچھا۔

”جی..... آیا ہے۔“ اس نے بظاہر بے پروائی سے جواب دیا۔

”بھائی کا مزاج کیسا ہے؟“ رحمانے بے تابی سے پوچھا۔

”جیسا دیس ویسا بھیس..... اچھی طرح سے بات کی.....“ نورین نے نظریں چڑا کر جواب دیا۔

”اچھا..... جی اس کا مطلب ہے کہ مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے..... بتاؤ کیا باتیں ہوئیں۔“

رحمانے نورین کو چٹکی کاٹی۔ ”آف توبہ..... کوئی بات نہیں..... بس ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔“

”یار شادی کے بعد اپنا سیل فون مجھے دے دینا..... میں ارمغان سے بات کر لیا کروں گی.....“ اس نے منہ بسور لیا۔

”تم سیل فون بھی رکھ لو..... مگر بے ایمان بھائی فون نہیں کرے گا..... کنجوس جو ٹھہرے.....“ نورین نے اسے چھیڑا۔

”اور وہاب بھائی کون سا شہزادہ چارلس نہیں؟ وہ منہ بسورے بولی۔

”بہنوئی کی عزت کرو..... کہیں اس نے سن لیا تو تمہاری پیاری بہن کی ہڈیاں نہ توڑ دے.....“ اس نے معصوم چہرہ بنا کر کہا۔

”ہڈیاں توڑ کر تو دکھائے..... جان نہ نکال

”آپ نے دودھ والی رسم کب کرنی ہے.....“
مجھے کسی کام سے کہیں جانا ہے..... کیا آپ ابھی
کر سکتی ہیں.....؟“ حسیب احمد نے معذرت کرتے
ہوئے کہا۔

”دودھ والی رسم آپ کے لیے نہیں..... وہ
خاص دولہا بھائی کے لیے ہے..... اگر آپ جانا
چاہتے ہیں تو چلے جائیں.....“ رحمان نے بے رنجی سے
کام لیا۔

”آف..... آپ غصے میں بہت پیاری لگتی
ہیں..... کسی نے آپ کو کبھی بتایا.....؟“ حسیب احمد
مسکرا کر بولا..... اس کا دل رحمان کے لیے عجیب انداز
سے دھڑکا تھا۔

”شٹ اپ.....!“ اس نے غصے سے کہا.....
اور اسٹیج سے اتر گئی۔

”یار میری سالی ہے، کیوں اپنی بھابی سے
مجھے جوتے لگوائے گا۔“ وہاب نے ہنس کر کہا۔
”میری گرل فرینڈ اچھی رہے گی..... تمہارا کیا
خیال ہے؟“ اس نے دور کھڑی رحمان کو دیکھ کر وہاب
کے کان میں آہستگی سے پوچھا۔

”شٹ اپ یار..... یہ تمہارے ٹائپ کی لڑکی
نہیں ہے..... بہت شریف لڑکی ہے..... اس کا خیال
دل سے نکال دو..... میں اس کا بہنوئی ہوں، مجھے
سب پکڑ لیں گے۔“

”اوکے..... نہیں خیال لے کر آتا..... مگر اس
کا خیال اگر دل نے دوبارہ جگایا تو پھر کچھ نہیں کہہ
سکوں گا۔“ اس نے ہنس کر وہاب کو جواب دیا.....
وہاب مسکراتے لگا..... حسیب احمد کی نظریں رحمان سے
ہٹ نہیں رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ رو رہی تھی..... وہ اس کے پاس آکھڑا
ہوا..... اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا۔

”یہ رومال رکھ لیں۔“ حسیب نے رومال اپنی

”وہاب..... اور پھر اسٹیج کی جانب چل پڑی..... وہاب
سکین کلر کی شیریوانی میں بہت پیارا لگ رہا تھا.....
اس کے آس پاس دوست بیٹھے ہوئے تھے جو اس
کے ساتھ گپ شپ کر کے تھپتھے یہ قہقہے لگا رہے تھے۔
پہلے گھبرائی..... مگر خود پر قابو پا کر اسٹیج پر چڑھ گئی۔

”دولہا بھائی..... آپ کو کسی چیز کی ضرورت
ہے؟“ وہاب کے ہاتھ میں گولڈ ڈرنک تھی۔ وہاب
نے اس کی طرف مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اس سے پہلے کہ
وہ اسٹیج سے اترتی..... کسی نے اسے مخاطب کیا۔

”سنیں میڈم.....“ اس نے پلیٹ کر دیکھا تو
وہاب کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک شخص نے اپنی
جانب اشارہ کیا۔

”جی..... کہیے۔“

”دولہے بھائی کی آپ کو فکر ہے..... ہماری کوئی
فکر نہیں۔“ اس نے کچھ طنزیہ انداز میں کہا۔

”رحمان! یہ حسیب احمد ہیں..... میرے بچپن کے
ساتھی اور بہت بڑے بزنس مین ہیں.....“ وہاب
نے اس کا تعارف کروایا..... وہ اسے اکڑو سا لگا۔

”جی، آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے؟“ رحمان
بڑی خوش اخلاقی سے بولی۔

”جی ہاں..... مجھے ہر چیز کی ضرورت ہے.....
آپ بتائیں..... آپ میری کون سی ضرورت پوری
کر سکتی ہیں۔“ حسیب نے ہنس کر جواب دیا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی..... اس نے اپنا دوپٹا
سنہالا..... باقی اس کے دوست مسکراتے لگے۔

”رحمان..... اس پاگل کی کوئی بات دل پر نہ
اگلیں..... یہ شروع سے چھیڑ چھاڑ میں خوش رہتا
ہے۔“ وہاب نے حسیب کا کندھا دبا دیا۔

”یار باز آؤ میری اکلوتی سالی ہے.....“ وہاب
نے آنکھیں دکھا کر اس سے کہا۔ رحمان مڑی تو حسیب
نے پھر اسے مخاطب کیا۔

”میڈم سنیں! وہ مجبور آرکی۔“

چار سال تمہیں اپنا منتظر بنائے رکھا..... میں تمہارا
مجرم ہوں..... تم مجھے جو سزا دینا چاہتی ہو مجھے
منظور ہے مگر خود کو اذیت مت دینا..... میں خود کو کبھی
معاف نہیں کر سکوں گا۔ خط کے جواب کا منتظر رہوں
گا۔“

اس نے ارمغان کے نام سے اختتام کیا اور پھر
لقافے میں خط ڈال کر رکھ دیا مگر اس کے اندر
ایک کشکش جاری تھی۔

”میں رحمان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا
ہو جاؤں گا۔ وہ کیا سوچتی ہے کیا کرتی ہے..... اس
سے بے خبر ہو جاؤں گا مگر میں اس سے جدا نہیں ہونا
چاہتا..... تو کیا میں رحمان سے محبت کر بیٹھا ہوں.....
نہیں..... نہیں..... میں یہ خط اسے دے کر یہ سلسلہ
بند کر دوں گا۔“ اس نے خط کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

پھر اسے نہ جانے کیا ہوا اس نے خط کے
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے..... اور لمبی لمبی سانسیں اپنے
اندر اتارنے لگا..... اسے رحمان سے محبت ہو چکی
تھی..... جس سے وہ بے خبر تھی۔

☆☆☆

وہ تمام مہمانوں کے پاس جا، جا کر ان سے
کھانے پینے کے متعلق پوچھ رہی تھی کہ خالہ عظمت
نے اسے پکارا۔

”رحمان! دولہے میاں سے پوچھو اسے کسی چیز کی
ضرورت تو نہیں۔“ عظمت خالہ نے فکر مندی سے
کہا۔

”اچھا خالہ، میں اماں سے کہتی ہوں، آپ فکر
نہ کریں۔ آپ باقی مہمانوں کے لیے گولڈ ڈرنک کا
انتظام دیکھ لیں۔ میں دولہا بھائی کے پاس جاتی
ہوں۔“ رحمان نے بڑی ذمہ داری سے جواب دیا۔

اس نے ہال میں نظریں دوڑائیں..... اسے
اپنی ماں شریا کہیں نظر نہ آئیں۔

”یہ اماں کدھر گئیں۔“ اس نے فکر مندی سے

لوں.....“ رحمان نے ہنس کر کہا۔

”اچھا..... اچھا..... اب کام چھوڑو..... اور
مہندی لگا دو لگے گی تو سوکھے گی تو ہی رنگ آئے گا۔“
نورین نے فکر مندی ظاہر کی..... گھڑی نے رات
کے نو بجو بجادیے تھے۔

”لاؤ..... مہندی دو۔“ رحمان نے سلائی مشین
ایک طرف کی..... اور اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”کیا..... مہندی تم نہیں لائیں؟“ وہ چیختی۔

رحمان نے معصوم چہرہ بنا کر نفی کی کہ وہ مہندی نہیں
لا سکی۔ ”ارے بابا مہندی فریج میں رکھی ہے.....
فریج میں۔“ اس سے پہلے کہ نورین اس پر ہاتھ
چلاتی اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ نورین مسکراتے
لگی..... اور رحمان نے بھی مسکراہٹ میں اس کا ساتھ
دیا۔

☆☆☆

اسے غیند نہیں آرہی تھی کہ وہ اب کیا جواب
دے گا..... نورین کی شادی کا حال پڑھ کر وہ پشیمان
تھا..... کہ رحمان کو کب تک وہ انتظار میں رکھے گا.....
پھر سوچنے لگا کہ وہ کیوں رحمان کے لیے فکر مند ہے.....
اسے کیوں نہیں خود سے الگ کر دیتا..... اب اسے
خط کا کوئی جواب نہیں دینا چاہیے..... اسے ارمغان
کے خواب سے نکالنا ہوگا..... اس نے لائٹ آن
کی..... اور رحمان کے لیے خط لکھنے لگا۔

”پیاری رحمان!

آداب!

میں خیریت سے ہوں..... اور چاہتا ہوں کہ تم
مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ خود کو خوش رکھو گی.....
رحمان میں پاکستان واپس نہیں آ سکتا..... میری کچھ
مجبوریاں ہیں..... میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا
چاہتا..... اس لیے صاف صاف لکھ رہا ہوں..... میں
تم سے شادی نہیں کر سکوں گا..... تم کسی اور کا ہاتھ
تھام لو..... جو تمہیں ہمیشہ خوشیاں دے..... میں نے

جیب سے نکال کر اسے دیا۔

”ضرورت نہیں.....“ نورین گاڑی میں وہاب کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ خالہ عظمت، ثریا کے گلے لگی ہوئی تھیں..... ان کی لاڈ و بیٹی آج جو انہیں چھوڑ کر پیا گھر جا رہی تھی۔

”یہ میرا کارڈ رکھ لیں..... آپ کو کسی چیز کی ضرورت یا کوئی کام ہو..... پلیز مجھے یاد کر لیجیے گا۔“ حبیب نے اسے اپنا کارڈ دکھایا۔ اس نے کارڈ پکڑا اور پھر غصے سے ایک طرف پھینکا۔

”یہ..... کیا..... آپ کو تمیز نہیں.....“ وہ تقریباً چیخ پڑا۔

”مجھے تمیز ہے..... مگر آپ شاید اپنی حد بھول رہے ہیں۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”تم غریب لڑکیاں ہر وقت اپنی عزت کا ڈھول کیوں بجاتی رہتی ہو..... اس سے تم لوگوں کو کیا فائدہ ملتا ہے.....“ اس نے طنز یہ مسکراہٹ لبوں پر لا کر پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے..... آپ کو عزت بے عزت لفظ میں کوئی فرق نہیں لگتا..... اس لیے آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں.....“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”میرا دل کر رہا ہے..... کہ تمہیں۔“ اس نے بات کو ادھورا چھوڑ کر قہقہہ لگایا۔

”آپ کا دل کرتا رہے گا..... مگر آپ کا کوئی خواب پورا نہیں ہونے والا ہے..... آپ اپنی امیری کا ڈھول کسی اور کے گلے میں باندھیں۔“ وہ یہ کہہ کر خالہ عظمت کی طرف بڑھی..... اس نے رحما کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سنو تو ڈیر.....“ وہ شوخ ہوا۔

رحما نے زور سے طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا..... اور ہاتھ چھڑا کر خالہ عظمت اور اپنی ماں کی طرف بھاگی..... حبیب نے اپنے ارد گرد دیکھا.....

اور کسی کو نہ پا کر فوراً ہال سے غصے میں باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ صبح صبح اٹھی..... اسے خالہ عظمت کے گھر جانا تھا اور گھر کی صفائی کرنی تھی..... اس لیے فجر کی نماز پڑھ کر اس نے پہلے اپنے گھر کا کام نمٹایا اور خالہ عظمت کی طرف جا پہنچی۔ خالہ عظمت چائے بنا رہی تھیں اور کسی سوچ میں غم تھیں۔

”خالہ! یہ کیا آپ نے اکیلے اکیلے چائے پی لی..... میرا انتظار تک نہیں کیا.....“ اس نے جھاڑو سنبھالی اور صحن کی صفائی کرنے کا ارادہ کیا۔

”بس سوچ رہی ہوں بیٹی تو اپنے اور میرے گھر کا کام کیسے سنبھالے گی..... اس لیے چھوٹا موٹا کام خود ہی کر لوں۔“ خالہ عظمت نے پیار سے جواب دیا۔

”نورین کا فون آیا تھا کیا؟“ وہ جھاڑو دے کر پوچھنے لگی۔

”ہاں..... آیا تھا..... تمہارا پوچھ رہی تھی..... تم سے کوئی ضروری بات کرنی تھی اسے..... مگر پھر رات کی وجہ سے اس نے کہا کہ کل فون کر لوں گی۔“

”مجھے یاد کر رہی ہوگی.....“ رحما نے اسے یاد کر کے مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

”ہاں..... ہاں مجھ سے بات کر کے تو رو پڑی تھی..... وہاب اسے مری لے کر گیا ہے۔“

”سچ..... خالہ۔“ اس نے خوشی سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں..... ایک ہفتے کے بعد گھر کا چکر لگائے گی۔“ خالہ عظمت نے سنجیدگی سے بتایا۔

”خالہ وہ ہم سے ملنے آ جاتی..... وہاب بھائی نے تو گھر کا چکر بھی نہیں لگایا.....“ رحما نے صحن کا کچرا سمیٹ کر ٹوکری میں ڈالتے ڈالتے افسردگی ظاہر کی۔

”بس بیٹی..... جیسے ان لوگوں کی مرضی.....“ خالہ عظمت نے سنجیدگی سے جواب دیا..... رخصتی کو

جان جان

آئی تھی۔“ وہ مسکرا کر بولا تو نورین بھی وہاب کو مسکراتا دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ اس وقت ایک ہوٹل میں ڈنر کر رہے تھے۔

”اچھا..... بھابی کدھر ہیں، مجھے بھابی سے بات کرنی ہے۔“ حبیب نے ہنس کر جواب دیا۔

”نہیں، نہیں تو نورین سے بات نہیں کر سکتا.....“ وہاب نے ہنس کر جواب دیا۔

”کون ہے؟“ نورین نے مسکرا کر پوچھا۔

”تمہارا پیارا دیور حبیب ہے..... جو تم سے بات کرنے کے لیے بے تاب ہے۔“ وہاب نے مسکرا کر سیل فون نورین کو دے دیا۔

”السلام علیکم! بھابی جی..... آپ کیسی ہیں؟“ میرا تحفہ پسند آیا.....؟“ حبیب نے اپنے ڈائمنڈ سیٹ کے متعلق پوچھا۔

”سچ بہت پیارا تحفہ تھا اور آپ کی چوائس بھی ویل ڈن ہے۔“ نورین نے اس کی تعریف کی۔

”تھینک یو بھابی جی..... وہ آپ سے اک انفارمیشن چاہیے تھی۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”انفارمیشن کیسی انفارمیشن.....؟“ نورین نے حیرت سے پوچھا۔

”رحما کے متعلق انفارمیشن چاہتا ہے شاید۔“ وہاب نے قہقہہ لگایا۔

”دیکھ لیں، میرے منہ کی بات میرے دوست نے چھین لی۔“ حبیب نے ہنس کر کہا۔ دوسری طرف فون پر وہاب کی آواز پہنچ گئی تھی۔

”رحما کے متعلق کیسی انفارمیشن.....؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”بھابی! اس کا کوئی بوائے فرینڈ تو نہیں..... یا پھر اس کی منگنی تو نہیں ہوئی ہے؟“ حبیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”مگر حبیب تم کیوں پوچھ رہے ہو..... کیا بات ہے؟“ وہ گھبرا سی گئی..... جو اپنی دوست رحما کی کوئی دریافت کی۔

”خیریت تو ہے جو میری خیریت پوچھنے کی یاد

نہیں دن ہو رہے تھے۔ نورین نے بس ماں سے فون پر ہی بات کی تھی۔

”آپ فکر مند نہ ہوں..... مجھے دیجیے فون.....“

”وہاب بھائی سے بات کرتی ہوں۔“ رحما نے خالہ عظمت کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے خوشی سے فون مانگا۔

”نہیں..... نہیں، جیسی اس کی سرال والوں کی مرضی ہوگی..... وہ مجھ سے ملنے آ جائے گی۔“

خالہ عظمت نے فون کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”خالہ یہ بیٹیاں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ رخصت ہونے کے بعد اپنے گھر کو ہی بھول جاتی ہیں۔“ اسے نورین پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے وہاب سے یہاں آنے کی ضد کیوں نہیں کی۔

”نہیں میری جان..... بیٹیاں ظالم نہیں ہوتیں..... بلکہ مائیں سخت دل ہو جاتی ہیں۔ جو بیٹیوں کو رخصت کرنے سے پہلے ہی یہ بات ذہن میں بٹھا کر رخصت کرتی ہیں کہ جیسے سرال والے کہیں ان کی بات کو آنکھوں میں سجالینا..... اور بس ان کا جنازہ ہی اس گھر سے نکلے..... ان کی مرضی کے بغیر میکے کا رخ کیا..... تو ان کے لیے میکے کے دروازے بند ہوں گے۔“ عظمت خالہ نے اپنے آنسوؤں کو چھپا کر رحما کے سر پر پیار دیا۔ رحما کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی۔

”خالہ میں بھی تو آپ کی بیٹی ہوں..... آپ نورین کو مت یاد کیجیے۔“ اس نے خالہ عظمت کو گلے سے لگالیا..... اور خالہ عظمت نے اپنے دبے آنسوؤں کو اس کی جھولی میں گرانا شروع کر دیے۔

☆☆☆

”وہاب..... تو کیسا ہے؟ بھابی کیسی ہیں؟“

حبیب احمد نے اسے کال ملائی اور وہاب کی خیریت دریافت کی۔

”خیریت تو ہے جو میری خیریت پوچھنے کی یاد

ماہنامہ پاکیزہ 244

ماہنامہ پاکیزہ 245

جنوری 2013

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات اپنے میاں اور اس کے دوست سے شیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”بھابی! مجھے رحما اچھی لگی ہے اور میں سوچ رہا ہوں..... کہ اس سے دوستی کی جائے.....“

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”رحما بہت حساس لڑکی ہے اور لڑکوں سے یوں دوستی نہیں کرتی۔“ نورین نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے اس کی محبت کو چھپالیا۔

”اچھا تو پھر کیا شادی اس سے کر لوں۔“ وہ شوخ ہوا۔

”شادی.....؟“ نورین کے منہ سے بے ساختہ نکلا..... حبیب ہر طرح سے ایک اچھا لڑکا نظر آ رہا تھا۔

”ہاں، ہاں..... نورین اس سے کہہ دو..... اگر شادی کرنا چاہتا ہے، گھر بسانا چاہتا ہے تو پھر رحما سے ہم بات کرتے ہیں۔“ وہاب نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اچھا حبیب بھائی..... میں آپ کو بعد میں جواب دیتی ہوں۔“ اس نے ارمغان کا سوچ کر بات کو ٹالا، دل میں تو وہ کافی خوش تھی۔

”بھابی! آپ جب واپس جائیں تو پلیز ضرور بات کریں۔“ اس نے فون رکھنا چاہا تو دوسری طرف سے حبیب نے پیار سے درخواست کی۔

”اوکے..... میں کوشش ضرور کروں گی۔“ نورین نے ہنس کر کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

”توبہ ہے اس طوفانی لڑکے کا بھی..... اس پر شادی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اب یہ رحما سے شادی کرنے کے لیے آسمان زمین ایک کر دے گا.....“ وہاب نے اس کی فطرت ظاہر کی۔

نورین خاموشی سے کھانا کھانے لگی..... اس نے کوئی جواب نہیں دیا..... جو جانتی تھی کہ رحما کی

محبت صرف ارمغان ہے۔

☆☆☆

”اکرم بیٹا..... یہ سوئی میں دھاگا ڈال دے.....“ سیکینہ ہاتھ میں اس کی شرٹ پکڑے اندر داخل ہوئی۔ اس نے بستر پر رحما کے خطر رکھے ہوئے تھے..... ماں کو دیکھ کر بوکھلا سا گیا..... اور خطوط کو سمیٹنے لگا۔

”یہ خط کس کے ہیں؟“ ایک خط بستر سے گر پڑا..... جس پر اس کی نظر پڑی..... اور اس نے رحما کا نام پڑھ لیا۔

”یہ رحما کون ہے؟“ اس نے ماں سے خط چھپٹ لیا تو سیکینہ نے ہنسی دبا کر پوچھا۔

”اماں! یہ خط میرے کسی دوست کے ہیں۔“ اس نے خط دراز میں رکھ دیے اور نظریں چرا کر بولا۔

”اچھا..... تمہارے دوست کے ہیں، ایسا کون سا دوست ہے..... جو اپنے ذاتی خط تمہیں دے جائے۔“ سیکینہ نے ہنس کر پوچھا۔

”اماں! سچ یہ خط میرے نہیں..... وہ شرمندہ سا ہوا۔

”رحما نام تو بہت پیارا ہے، دیکھنے میں کیسی ہے۔“ وہ اکرم کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور پیار سے بولی۔

”اماں! یہ سوئی اور نکلی دیجیے..... میں دھاگا ڈال دوں۔“ اس نے ماں کے ہاتھ سے سوئی اور نکلی تھام لی۔

”یہ سوئی میں دھاگا ڈالنا میری بہو کا کام ہے، رحما کو کب گھر پر لا رہا ہے؟“ سیکینہ نے پیار سے پوچھا۔

”اماں..... سچ میرے اور رحما کے درمیان کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس نے سوئی میں دھاگا ڈال کر ماں کو تھما دیا۔

”اچھا..... تو پھر تیرا چہرہ کیوں جھوٹ کی گواہی دے رہا ہے۔“ سیکینہ نے ہنس کر کہا۔

”نہیں تو.....“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سرخ ہوتے چہرے پر ملے۔

”بیٹا محبت چھپتی نہیں.....“ ماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا..... اور اس نے نظریں جھکا لیں..... اس کا دل رحما کے لیے دھڑک رہا تھا۔

”میں تیرے ابا سے بات کر دوں.....؟“ سیکینہ نے خوشی سے پوچھا۔

”نہیں..... اماں ابھی نہیں؟“ وہ ڈر سا کیا..... جانتا تھا کہ رحما تھوڑی اس کی محبت کے سینوں میں ڈوبی ہوئی ہے، وہ ہی اس کے خواب دیکھ رہا ہے۔

”کیوں.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اماں میں نے رحما سے ابھی اپنے دل کی بات نہیں کی ہے۔“ اس نے نظریں جھکا کر بتایا۔

”تو دیر کس بات کی ہے بیٹا.....؟“ سیکینہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

”اماں میں بہت جلد اس سے بات کر لوں گا۔“ آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا..... وہ مطمئن سا ہو گیا کہ اس کی ماں اس کے ساتھ ہے۔

”میں تو رحما کو اپنا وہی..... دو پٹا دوں گی..... جو تیری دادی نے مجھے دیا تھا..... ابھی تک میں نے حفاظت سے سنبھال کر رکھا ہے۔“ سیکینہ نے جوش ہو گئی..... اور شرٹ پر ہنسنے لگی۔

”اماں اگر رحما کو دو پٹا پسند نہیں آیا تو.....؟“ اس نے ہنسی دبا کر ماں کو چھیڑا۔

”کیوں نہیں پسند آئے گا..... کیا وہ میم ہے؟“ سیکینہ گھبراہٹ میں گئی۔

”ہاں اماں، میں تو یہ بتانا بھول گیا..... کہ رحما

جان جان

مسلم نہیں ہے۔“ اس نے ماں کو ہنستے ہنستے بتایا۔

”تو سچ کہہ رہا ہے کیا؟“ سیکینہ نے دل پر ہاتھ رکھ دیا..... اور اس کا چہرہ بچھ سا گیا۔

”نہیں اماں..... میں مذاق کر رہا ہوں۔“ اس نے ماں کی گھبراہٹ کو دیکھ کر ہنستے ہنستے نفی کی۔

”خدا کا کرم میرے گھر پر رہے..... میں تو ڈر گئی تھی کہ کیسے غیر مسلم لڑکی میرے خاندان کو سنبھالے گی.....“ سیکینہ نے منہ میں کچھ پڑھا..... اور پھر اکرم کے ارد گرد پھونکا۔

اکرم مسکرانے لگا..... اور سوچنے لگا کہ وہ اب سب سچ رحما کو بتا دے گا اور اسے اپنے گھر کی رانی بنا کر رکھے گا۔

☆☆☆

”آپ تین گنا زیادہ رقم دے کروہ زمین خرید لیں.....“ اس نے کمپنی کے منیجر کو حکم دیا اور پھر فائل پر نظر ثانی کرنے لگا۔

”سر اس سے کمپنی کو فائدہ نہیں ہوگا۔“ توصیف نے کمپنی کے حق میں بات کی۔

”میں آپ کا باس ہوں یا پھر آپ.....؟“ حبیب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی..... اور منیجر کو طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”سر.....! اس سے آپ کو بھاری نقصان ہوگا۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”نقصان مجھے ہوگا..... پیسہ میرے اکاؤنٹ سے جا رہا ہے آپ کے نہیں.....“ حبیب نے جیسے اسے جتایا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ حبیب کے دوست نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اوہو جواد..... کم ان..... تجھے اجازت لینے کی ضرورت کب سے پڑنے لگی ہے۔“ وہ اپنے دوست کو گلے سے لگا کر بولا۔

”جناب کے کیا حال ہیں؟“ جواد نے مسکرا کر

پوچھا۔

”فٹ فٹ“ اس نے ہنس کر کہا اور ساتھ ہی جواد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے کرسی سنبھالی تو حسیب بھی اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ تو صیف سر جھکائے کھڑا تھا۔

”جواد تو کیا لے گا..... چائے، کافی؟“ حسیب نے مسکرا کر پوچھا اور نیل بجادی۔

”کافی پلا دے یار..... مگر بہت مزے کی.....“ جواد نے ہنستے ہنستے کہا۔

”جی سر۔“ دو منٹ کے بعد ایک ملازم کمرے میں آ پہنچا..... اور ادب سے بولا۔

”نور بابا دو کافی کے کپ گرما گرم بھجوا دیجیے۔“ حسیب نے مسکرا کر کہا۔ بوڑھے ملازم نے سر ہلایا..... اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”کوئی ضروری بات تم لوگ کر رہے تھے؟“ اس سے پہلے کہ حسیب، جواد سے مزید بات کرتا..... جواد نے ہنس کر کہا۔

”اوہو..... ہاں..... تو صیف تم زمین خرید لو..... بے شک تمہیں چار گنا زیادہ رقم دینی پڑے، سمجھے۔“

”جی سر!“ اس نے سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”چار گنا زیادہ رقم کیوں دے رہے ہو؟“ جواد نے فکر مندی سے پوچھا۔

”یار وہ زمین ہماری فیکٹری کو سوٹ کرتی ہے۔ میں نے زمین پسند کر لی تھی مگر مصروفیت کے باعث اس کے مالک سے بات نہیں کر سکا۔ اس دوران اس نے کسی اور سے سودا طے کر دیا..... اس لیے ہماری رقم دے کر خریدنی پڑ رہی ہے۔“ حسیب نے اپنا مسئلہ بتایا۔

”کیا یہ نقصان نہیں ہوگا؟“ جواد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں..... نقصان کیسا.....؟ نقصان تب ہوتا جب وہ زمین میرے ہاتھ سے نکل جاتی۔“ حسیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تو ابھی تک نہیں بدلا..... جو چیز تجھے پسند آ جاتی ہے..... تو اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔“ جواد نے ہنس کر اس کی فطرت جتائی۔

”ہا..... ہا..... کون سی گاڑی پر آیا ہے؟“ حسیب نے ہنس کر پوچھا۔

”توبہ، توبہ میں گاڑی نہیں لایا ہوں، یاد ہے تجھے میری بائیک کالج کے دنوں میں پسند آ گئی تھی اور تو نے مجھے اس کے دو گنا پیسے زیادہ دے کر خرید لی تھی..... جبکہ میں چننا رہ گیا کہ میری بائیک جیسا ماڈل دوسرا لے لیتے ہیں مگر تو اپنی ضد پر اڑ گیا تھا۔“ جواد نے ہنستے ہنستے کالج کا واقعہ یاد کیا۔

”وہ بہت اچھے دن تھے..... دوستوں کی یاد آتی ہے، تجھے کوئی ملا؟“ حسیب نے تجسس سے پوچھا۔

”نہیں..... بس تیرے اور وہاب کے علاوہ کوئی بھی نہیں ملا۔“

”سارے سب کے سب مر تو نہیں گئے۔“ حسیب نے قہقہہ لگایا۔

”شاید.....“ جواد نے بھی اس کے قہقہے کا ساتھ دیا..... نور بابا کافی ٹرے میں سجا کر ٹیبل پر رکھ گئے اور دونوں نے گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔

☆☆☆

وہ اسے گرین رنگ کے سوٹ میں نظر آئی..... اکرم نے نیت کر رکھی تھی کہ آج وہ صاف صاف اسے ہر بات سچ بتا دے گا..... اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا..... جب وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے ادب سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام.....“ اکرم نے بھی شائستگی سے جواب دیا۔

”کیا میرا کوئی خط آیا.....؟“ اس نے تجسس سے پوچھا..... اس نے شادی کے حوالے سے رمغان سے جو بات خط میں کی تھی..... اب وہ خط کا اب شدت سے پڑھنا چاہتی تھی۔

”جی نہیں.....“ اکرم نے خط کی نفی کی۔ اس کا چہرہ مرجھا سا گیا۔

”اچھا..... آپ نے اپنے گھر کی ڈاک ٹھیک لے لیتے سے دیکھی تھی؟“ رحمان نے افسردگی سے پوچھا۔

”جی ہاں.....“ اکرم نے پھر نفی کی..... وہ سے رمغان کی یاد سے نکالنا چاہتا تھا..... اس سے پہلے کہ وہ اپنے لب کھولتا..... رحمان اس سے انجان ہو کر باہر کی طرف چل دی۔ اس کے خود سے یک دم بے پروا ہونے سے اکرم کا دل بھجھ سا گیا۔

”بیٹا تجھے رحمان کو سچ بتا دینا چاہیے تھا۔“ خیر دین اس کے پاس آ کھڑا ہوا..... اور اس نے اکرم کے کندھے کو دبایا۔

”جی..... کون سا سچ.....؟“ اکرم، خیر دین کی بات پر بوکھلا سا گیا..... جو بے خبر تھا کہ خیر دین کو اس کا نہیں پتا ہے۔ خیر دین نے اس کے سر پر پیار دیا۔

”تمہارا مقصد اس کی جان بچانا تھا..... اپنی جان کو عذاب میں ڈالنا نہیں تھا.....“ وہ افسردگی سے کہہ کر اپنے کام پر چلا گیا۔

اکرم اداس نظروں سے پوسٹ آفس کے باہر لے دروازے کو تنکے لگا..... جیسے رحمان پھر آ کر اسے صرف اسے اہمیت دے گی..... جو رمغان کا..... خط نہ لےنے پر اس سے لاتعلق ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ مرجھائی مرجھائی گھر پہنچی..... ثریا اس کا انتظار کر رہی تھیں..... اس نے گھر میں قدم رکھا..... تو ثریا نے اسے خوش خبری دی۔

جان جان

”نورین گھر آئی ہے..... کب سے تیرا سب انتظار کر رہے تھے..... ابھی ابھی وہ اپنے گھر گئی ہے..... وہاں رات کا کھانا کھانے آئے گا..... عظمت فکر مند تھی..... تجھے لینے چار دفعہ آئی تھی..... جاؤ جلدی سے کپڑے رکھ کر اس کے گھر چلی جاؤ۔“ ثریا نے اس سے کہا۔

”اماں..... یہ پیسے رکھ لیں۔“ اس نے ایک ہزار کا نوٹ ماں کو تھمایا۔

”ایک ہزار کیوں..... ہمارا حساب تو تین ہزار کا تھا.....“ ثریا نے فکر مندی سے پوچھا۔

”اماں! امجد بھائی نے جتنے پیسے دیے ہیں اتنے ہی لے آئی ہوں۔ آپ جا کر حساب کتاب کیجیے گا..... دکان پر کافی رش تھا..... اس لیے امجد بھائی ٹھیک طریقے سے بات نہیں کر سکے.....“ رحمان نے تھکے تھکے لہجے میں بات کی۔ اس کا دھیان رمغان کے جواب کی طرف تھا جو نہیں آیا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... تو جلدی سے جا اور میں بیٹھے میں آٹس کریم لے آتی ہوں..... نورین میری بھی بیٹی جیسی ہے۔“ ثریا نے اس سے رائے لی۔

”ہاں..... اماں آپ ان پیسوں میں سے آٹس کریم لے آئیں..... میں خالہ عظمت کو میٹھا بنانے سے منع کرتی ہوں.....“ اس نے ہاتھ منہ دھویا..... اور تویلیے سے منہ خشک کرتے ہوئے بولی۔

”کپڑے تبدیل کر لے..... دیکھ کتنا پرانا سوٹ پہن رکھا ہے۔“ ثریا نے اسے نصیحت کی۔

”اماں! میں ان کپڑوں میں ٹھیک ہوں..... اور مجھے کیا کوئی دیکھنے آرہا ہے؟“ وہ ہنسی۔

”نہیں بیٹا..... تجھے دیکھنے تو کوئی نہیں آرہا..... مگر تیرے ایسے کپڑوں کی وجہ سے نورین پر کوئی انگلی نہ اٹھا دے.....“ ثریا نے نورین

جوڑوں کے درد سے نجات پائیے!

ہزاروں لوگوں کی طرح اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کے مسائل سے نجات حاصل کیجئے

JOINTA

HERBAL ANALGESIC CREAM

جوڑوں پر روزانہ چھ لگائیے

درد سے جان چھڑائیے

- بے حد موثر ہر بل فارمولا = Rs.300/
- PCSIR سے تصدیق شدہ
- ہر بل ہونے کی بدولت کوئی سائنڈ ایفکٹ نہیں
- ماہرین کی نگرانی میں تیار کردہ

جوائنٹا کریم

جوڑوں کے درد سے نجات کا پیغام آپ کے نام!

جوائنٹا کریم بذریعہ کوریئر/وی پی پی

اپنے گھر منگوانے کیلئے فون کیجئے

0315-3830001, 0315-3830002

کراچی میں جوائنٹا کریم حاصل کرنے کیلئے

مراد میڈیکو اسٹیڈیم روڈ، نزد آغا خان ہسپتال 0213-4943664

786 میڈیکل اسٹور بلاک 17 گستان جوہر نزد جوہر چورنگی 0213-4010647

یاد رکھیے، جوائنٹا کریم کسی اور دوسرے میڈیکل اسٹور یا

رابطہ نمبر کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتی

نورین نے سر پر ہاتھ مارا۔

”کیا ہوا..... وہ آنا چاہتا ہے تو آنے دو.....“ وہاب بھائی سے بار بار اسے نہ لانے کی ضد کرو گی تو کہیں ان کا بھی موڈ آف نہ ہو جائے.....“ رحمان نے پیاز گرم تیل میں ڈال دی اور چبچ چلانے لگی۔

”اوکے..... اگر تم کہتی ہو تو پھر منع نہیں کرتی۔“ نورین نے وہاب کو میچ ٹائپ کرنا شروع کر دیا..... وہ مطمئن ہو گئی کہ رحمان کو کوئی اعتراض نہیں۔

”یار شادی شدہ لائف کا حال تو سناؤ..... کہاں کہاں گھوم کر آئی ہو؟“ اس نے کام کرنے کے ساتھ ساتھ نورین سے شیریں لہجے میں پوچھا۔

”بہت اچھا تجربہ رہا۔“ نورین نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

”ہا ہا ہا..... وہاب بھائی کیسے لگے؟“ اس نے چھیڑا۔

”بہت اچھے..... بہت خیال رکھنے والے ہیں..... میری تو دعا ہے کہ تمہیں بھی ایسا ہی شوہر نصیب ہو..... تم نے ارمان بے ایمان بھائی سے شادی کا پوچھا؟“ نورین نے یک دم اس کے اور ارمان کے متعلق پوچھ لیا۔

”میں نے خط میں تمام بات لکھ دی ہے۔“ وہ مرجھاسی گئی۔

”خط کا جواب آیا کیا؟“ نورین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں.....“ اس نے نظریں جھکا لیں۔

”اگر اس نے شادی کے متعلق پھر کوئی بات نہ لکھی..... تو کیا کرو گی؟“ نورین کے چہرے پر خفگی ظاہر ہونے لگی۔

”میں نہیں جانتی.....“ اس نے افسردگی جواب دیا۔

کھلانا چاہتی ہیں۔“ اس نے اپنی ماں کے دل بات بیان کی۔ خالہ عظمت نے گھڑی پر نظریں ٹکائیں..... سہ پہر کے جارنج رہے تھے..... وہ چادر سنبھالے تیزی سے نکل گئیں..... رحمان نے ٹوکری سے پیاز اٹھا کر چھیلی شروع کر دی۔ اس نے نورین کو کچھ غصے میں پایا۔

”کیا ہوا.....؟ کس کو میچ کر رہی ہو؟“ اس نے پیاز کاٹتے کاٹتے پوچھا..... نورین اس سے بے پروا ہو گئی۔

”وہاب کو میچ کر رہی ہوں..... کہہ رہے ہیں کہ ان کا دوست حبیب بھی ڈنر یہاں ہی کرے گا..... اور میں منع کر رہی ہوں۔“ نورین نے پھر میچ ٹائپ کر کے وہاب کو نفی کی۔

”حبیب..... کون حبیب؟“ رحمان کو یک دم یاد آیا..... کہ اس نے نورین کی شادی پر ایک لڑکے کو تھپڑ مارا تھا..... کہیں وہ لڑکا تو نہیں۔

”حبیب..... وہاب کا بیسٹ فرینڈ ہے..... شادی پر جو وہاب کے ساتھ ساتھ تھا۔“ نورین نے اسے یاد دلایا۔

”نہیں..... نہیں حبیب؟“ اس نے انجان بن کر جواب دیا۔

”کیا تمہاری اس سے کوئی بات چیت ہوئی تھی۔“ نورین نے یک دم پوچھا..... وہ حبیب کے دل کی بات رحمان سے کرنا نہیں چاہتی تھی..... جو جانتی تھی کہ رحمان غصے میں آکر اس سے خفا ہو جائے گی اور سارا موڈ خراب ہو جائے گا۔

”نہیں.....“ رحمان نے اس سے سچ چھپا لیا کہ کہیں وہ اس سے خفا نہ ہو جائے کہ اس نے وہاب کے بیسٹ فرینڈ کو طمانچہ مارا تھا۔

نورین کے سیل فون پر پھر میچ آیا..... وہ خود سے بولی۔

”توبہ ہے میری بات کو سمجھ نہیں رہے.....“

کے سرال والوں سے ڈر کر کہا۔

”اچھا..... اماں..... پھر میں کپڑے تبدیل کر لیتی ہوں.....“ اس نے ماں کے ماتھے پر بوسا دیا..... جو بہت فکر مند دکھائی دے رہی تھیں کہ وہاب کے گھر والے آگئے..... تو کہیں کسی بات پر نقص نہ نکال دیں۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچی..... تو اپنے بستر پر سرخ رنگ کا استری شدہ سوٹ پڑا دیکھا..... اسے ثریا کی آواز آئی۔

”میں بازار جا رہی ہوں..... تیرا سوٹ استری کر کے رکھا تھا اسے پہن لینا.....“ ثریا یہ کہہ کر چلی گئیں..... اور رحمان جلدی سے تیار ہونے لگی۔

☆☆☆

”چکن قورمہ..... اور نان منگوا لیتے ہیں۔“ رحمان نے ہدایت دی۔

”نہیں..... نہیں..... وہاب کو چکن پلاؤ اچھا لگتا ہے..... اماں چکن پلاؤ بنالیں۔“ نورین نے میچ کرتے کرتے جواب دیا۔

”چکن پلاؤ مجھ سے اچھا نہیں بنتا..... رحمان تو بنا دے۔“ عظمت خالہ فکر مندی سے بولیں۔

”ہاں، ہاں رحمان تیرا چکن پلاؤ لا جواب ہے..... وہاب بہت خوش ہوں گے۔“ نورین موبائل پر بزی تھی۔

”خالہ عظمت آپ وہی اور تھوڑا چکن اور لے آئیں.....“ اس نے مرغی کا گوشت دیکھ کر بتایا۔

”میں بازار جانے والی تھی..... ثریا کے ساتھ چلی جاتی ہوں..... اور بیٹھے میں نورین کیا رکھیں.....؟ خالہ عظمت نے بیٹی سے پوچھا۔ جس کا وہ بیان سیل فون پر لگا ہوا تھا۔

”اماں رحمان سے پوچھ لیں۔“ وہ چونکی۔

”خالہ آپ فکر نہیں کریں..... اماں آئیں کریم لینے گئی ہیں..... وہ اپنے داماد کو بیٹھے میں آئیں کریم

ہاں ملائی۔

”بس اب بار بار چیزوں کا تذکرہ مت کریں..... بھابی اس میں سوٹ ہیں..... آپ کے لیے بھی لایا ہوں خالہ۔“ اس نے ثریا کو مخاطب کیا۔
 ”نہیں..... نہیں بیٹا اس کی ضرورت نہیں۔“
 ثریا بوکھلا سی گئیں۔

”آپ بھی تو میری ساس جیسی ہیں۔ آپ یہ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔“ وہاب نے ایک قیمتی سوٹ ثریا کے ہاتھ میں تھمایا..... اور ایک سوٹ عظمت خالہ کے حوالے کیا..... باقی دو سوٹ بچے تھے..... نورین نے دونوں سوٹ اٹھا کر کمرے میں رکھ دیے کہ خالہ ثریا کو علم نہ ہو کہ حبیب کی مہربانیاں رحما کی وجہ سے ہیں..... سامان سمیٹ کر وہ کچن میں آگئی۔

”چلو وہاب سے ملو..... تمہارے متعلق پوچھ رہے ہیں.....“ نورین نے نظریں چرا کر کہا۔
 ”تم چولھے کے پاس کھڑی رہو..... پلاؤ دم پر ہے..... اور سالن تیار ہے..... سلاڈ بھی بن گیا ہے..... بس رستے کے لیے یہ سلاڈ کاٹ لو..... میں ابھی آتی ہوں..... پھر تمہاری مدد کرتی ہوں۔“ اس نے نورین سے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی..... ثریا کچن میں آکھڑی ہوئیں..... ان کے ہاتھ میں ڈبوں سے بھرا لک شاہ تھا۔

”اماں یہ کیا ہے.....؟“ رحمانے حیرت سے پوچھا..... ثریا سے جواٹھایا نہیں جا رہا تھا۔
 ”بیٹا یہ حبیب احمد لایا ہے..... کھانے کا سامان ہے.....“ ثریا نے کچن کی ٹیبل پر رکھا۔

نورین نے شاہ کھولا اور ڈبے نکالے..... کسی ڈبے میں شامی کہاں تو کسی میں مٹن چانپ کسی میں چائینز چاول..... تو کسی میں لیگ پیسز..... اتنی چیزیں دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔

”تو جلدی سے اپنی محبت کے بارے میں اسے بتا دے۔“ سیکنہ نے اس کے نبھے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا..... اور پھر اس کے سینے سے لگ گئی..... وہ ماں کو دلاسا دیتا رہا..... جو بری طرح سے کانپ رہی تھی کہ کہیں فاطمہ کی طرح اکرم بھی اسے چھوڑ کر چلا نہ جائے۔

☆☆☆

”حبیب بھائی..... یہ اتنا کچھ لے کر آنے کی کیا ضرورت تھی.....“ اپنے گھر میں پھلوں کے ٹوکڑے، مٹھائیاں اور سوٹ دیکھ کر وہ حیرت زدہ سی ہو گئی۔

”پہلی دفعہ اک بھائی اپنی بہن کے گھر آیا ہے.....“ اس نے مسکرا کر سیٹ سنبھالی۔

”وہاب آپ نے بھی منع نہیں کیا؟“ نورین نے آنکھیں دکھائیں..... عظمت اور ثریا اپنے گھر میں اتنا کچھ دیکھ کر پشیمان سی ہو گئیں۔

”بھابی! یہ اس ڈبے میں رس ملائی ہے، یہ فریج میں رکھ دیں۔“ حبیب نے جلدی سے بتایا۔

”یہ رس ملائی ہم دونوں کی بہت فیورٹ ہے..... خاص طور پر تمہارے لیے لائے ہیں.....“ وہاب نے نورین کو اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

حبیب نے چاروں طرف نظر دوڑائیں..... وہ وہاں نہیں تھی۔

”اماں یہ حبیب احمد ہیں، وہاب کے بہترین دوست اور حبیب بھائی یہ میری اماں..... اور یہ میری خالہ ثریا ہیں، رحما کی والدہ.....“ نورین نے آپس میں سب کا تعارف کرایا۔

ثریا نے خوشی خوشی دونوں کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا۔

”بیٹا اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی..... یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ ثریا نے بھی عظمت کی ہاں میں

”اماں بھوک نہیں ہے.....“ اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

”تیرا رحما سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ سیکنہ اس کے پاس آ بیٹھی..... اور سر پر پیار دے کر پوچھنے لگی۔
 ”اماں..... میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ رحما اور میرے درمیان جو آپ سمجھ رہی ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس نے تلخ لہجے میں بات کی۔

”تو پھر تم دونوں کا کیا رشتہ ہے..... مجھے بتا کیوں نہیں دیتے، اپنی بیٹی فاطمہ کو کھو چکی ہوں، تجھے کھونے کا حوصلہ میں نہیں رکھتی..... کیا رحمانے تیری محبت کو ٹھکرا دیا ہے؟“ سیکنہ نے بے صبری سے پوچھا۔
 ”نہیں..... اماں..... ایسی بات نہیں ہے۔“

اس نے ماں کو تسلی دی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کیا وہ تجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی.....؟“ اس نے تجھ سے دل لگی کی ہے۔ تو مجھے اس کے گھر کا پتا دے..... میں خود جا کر اس کا رشتہ لیتی ہوں، وہ نا سمجھ ہے..... جو میرے پیارے بیٹے کی محبت کو ٹھکرا رہی ہے۔“ سیکنہ بولتی چلی گئی۔

”اماں..... ایسی ویسی کوئی بات نہیں..... آپ غلط سوچ رہی ہیں..... آپ مطمئن رہیں، میں رحما سے جلد بات کرتا ہوں۔“ اس نے ماں سے ساری بات کو چھپا لیا۔

”تو سچ کہہ رہا ہے؟ اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہتی ہے تو میں اس کے گھر جا کر اس کی ماں سے ساری بات کروں گی کہ اس نے میرے معصوم بچے کو دھوکے میں رکھا.....“ سیکنہ کی آنکھیں پر غم سی ہو گئیں..... وہ غلط سوچتی جا رہی تھی..... اس کی وجہ فاطمہ کی موت بھی تھی۔

”اماں..... رحما نہیں جانتی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں..... پلیز آپ مطمئن رہیں..... اس طرح تو آپ اپنی صحت خراب کر لیں گی۔“ ماں کو روتے دیکھ کر اس نے سچ بول دیا..... وہ اپنی ماں کو

نہیں..... تو خالہ ثریا کا سوچو انہیں کس بات کی سزا دے رہی ہو۔“ نورین نے غمی سے کہا۔

”پلیز..... مجھ سے ارمغان کے ٹاپک پر بات مت کیا کرو.....“ اس نے چاول پانی میں بھگوئے اور اپنی بات کہہ کر پھر خاموش ہو گئی۔ نورین بھی اس کے نبھے چہرے پر خاموش ہو گئی..... کافی دیر کی خاموشی کے بعد نورین نے چپ توڑی۔

”تمہارے پاس ارمغان کا نمبر ہے کیا.....؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں.....؟“ اس نے تیزی سے جواب دیا۔

”تم اس سے دو ٹوک بات کر لو۔“ نورین نے اسے مشورہ دیا..... اس سے پہلے کہ وہ لب کھولتی.....

خالہ عظمت شاہ پر پکڑے کچن میں آکھڑی ہوئیں۔

”جلدی کرو..... جلدی..... کہیں دو لھا بیٹا گھر پہنچ جائے اور تم لڑکیوں کا کام ہی نہیں ہو۔“ اتنے میں ثریا بھی آکس کریم اٹھائے آ گئیں۔

”یہ لو..... نورین اسے فریج میں رکھو..... اور کوئی کام ہے تو مجھے بتاؤ، میں دیکھتی ہوں۔“

”خالہ ثریا آپ نے تو ریڈی میڈ کام کیا ہے..... اماں کی طرح گھر میں شکر ہے بیٹھے کا کام نہیں لیا.....“ نورین آکس کریم پیک فریج میں رکھتے ہوئے بولی۔

”بازار سے اور کچھ وہاب کی پسند کا منگوانا ہے تو بتا دے..... میں لے آتی ہوں.....“ ثریا نے مسکراہٹ کے ساتھ اس سے فرمائش پوچھی۔ نورین نے خالہ ثریا کو گلے سے لگا لیا..... خالہ عظمت اپنی بیٹی کو خوش دیکھ کر بلند آواز میں خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگیں کہ رحما کو بھی وہاب جیسا ہم سفر مل جائے..... جس پر رحمانے نظریں چرا لیں۔

☆☆☆

”یہ کیا.....؟ کھانا ویسے کا ویسا بڑا ہے۔“ سیکنہ نے اکرم کے کمرے میں کھانا رکھا دیکھ کر کہا۔

ارمغان نام کے شخص سے محبت کرتی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے پوسٹ آفس نہیں آئی تھی۔ وہ خط ڈالنے آئی تھی۔“ اکرم نے اسے تفصیل بتانی شروع کی۔

”تجھے کیسے پتا چلا۔۔۔۔۔ کہ وہ ارمغان سے محبت کرتی ہے۔۔۔۔۔؟“ فہد نے حیرت سے پوچھا اور اکرم نے رحما کے پہلے خط سے آخری خط تک کے تمام حالات فہد کو بتا دیے۔ فہد بھی تمام بات سن کر فکر مند ہو گیا۔

”اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اس کی جان بچاتے بچاتے اپنی جان اس کے ہاتھوں میں دے بیٹھا ہوں۔۔۔۔۔ اور وہ بے چاری اس بات سے بے خبر ہے۔“ اکرم نے افسردگی سے بتایا۔

”یار۔۔۔۔۔ تمہاری کہانی سن کر میں خود اپ سیٹ ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ اس لڑکی سے نہ تو تم محبت کا اظہار کر سکتے اور نہ ہی تم اس سے جدا ہو سکتے ہو۔۔۔۔۔ تمہیں اپنی محبت کے لیے رسک تو اٹھانا پڑے گا۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟ کبھی نہ کبھی تو سچائی کھلے گی۔“ فہد نے بات کرتے ہوئے اپنی جیب سے رومال نکال کر ماتھے سے پسینے پونچھا۔ وہ اکرم کے لیے بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

”تو پھر یار میرے لیے دعا کرو۔۔۔۔۔ کہ خدا مجھے کوئی راستہ دکھا دے جس سے میں رحما کو پالوں۔۔۔۔۔“ اکرم نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے اپنی محبت کا اعتراف کیا۔

”تو فکر نہ کر۔۔۔۔۔ اللہ بہت عظیم ہے۔۔۔۔۔ سب بہتر ہو جائے گا۔۔۔۔۔ میں کچھ سوچ لوں۔۔۔۔۔ پھر تجھے جواب دوں گا۔“ فہد نے اسے تسلی دی۔۔۔۔۔ جبکہ اس سے اکرم کے لیے کوئی بات سوچی ہی نہیں جا رہی تھی۔۔۔۔۔ اکرم نے پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون بند کر دیا اور کافی دیر تک پریشان رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

سے بھی پوچھ لیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یار ماشاء اللہ سے ایک عدد بیوی کے خرچے جھیل رہا ہوں۔“ اس نے قہقہہ لگا کر بتایا۔

”تو نے شادی کر لی۔۔۔۔۔ مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔۔۔“ اکرم چیخا۔

”ہاں یار۔۔۔۔۔ شادی یہاں نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ شادی تو جرمنی میں ہوئی تھی، بس جرمنی ماموں نے بلوایا تھا اور پھر اپنی بیٹی کا ہاتھ مجھے تھما دیا۔۔۔۔۔ سعدیہ بہت پیاری عادت کی مالک ہے تو کسی دن ملنے گھر پر آجا۔“ فہد نے خوشی خوشی اسے دعوت دی۔

”انشاء اللہ۔۔۔۔۔ ضرور چکر لگاؤں گا۔“ اس نے خوشی سے کہا۔

”اور سنا۔۔۔۔۔ تو کب شادی کر رہا ہے؟“ فہد نے شرارتا پوچھا۔

”میں ابھی پتا نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کوئی تلاش کر کے رکھی ہوئی ہے۔“ فہد نے اسے چھیڑا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہے تو؟ مگر اک مشکل میں پھنسا ہوا ہوں۔۔۔۔۔ اس لیے تو تجھے فون کیا۔“ اکرم نے سنجیدگی سے بتایا۔

”کیا بات ہے۔۔۔۔۔ سب خیریت تو ہے ناں؟“ فہد نے سیل فون کو مزید کان کے پاس کیا۔۔۔۔۔ اور شائستگی سے بولا۔ اسے فاطمہ کی موت کا علم تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنے دوست اکرم کے لیے پریشان سا ہو گیا۔

”رحما کی ملاقات مجھ سے پوسٹ آفس میں ہوئی تھی۔“ اکرم نے ہلکے سے بتایا۔

”ملاقات ہو گئی۔۔۔۔۔ تو پھر اپنے دل کی بات کر لے۔۔۔۔۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“ فہد نے پوری بات سننے بغیر کہا۔

”یار پر اہم یہ ہے کہ وہ مجھ سے نہیں، کسی

ہوں۔۔۔۔۔ اور پلیز مجھے یہ لپ اسٹک نہیں لگانی۔۔۔۔۔“ اس نے نورین سے اپنا بازو چھڑا لیا۔۔۔۔۔ اور کچن سے باہر نکل گئی۔۔۔۔۔ نورین دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگی کہ کہیں حبیب اور رحما کی کسی بات پر جھڑپ نہ ہو جائے اور یہ ڈنر کسی بڑی جنگ کے نام نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ اس لیے کام کرتے کرتے اس کے لب دعا کے لیے مل رہے تھے۔

☆☆☆

”مجھے اماں کو سچ نہیں بتانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ مجھے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے تھا اگر رحمانے مجھے انکار کر دیا تو میں کیا جواب اماں کو دوں گا۔۔۔۔۔“ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا مگر اس کے ذہن پر یہ باتیں سوار تھیں۔ اس نے ٹی وی بند کیا اور اپنے ایک پرانے دوست فہد کو فون ملا یا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔“ فہد نے شائستگی سے کہا۔

”یار۔۔۔۔۔ میں اکرم۔۔۔۔۔ کیسا ہے تو۔۔۔۔۔؟“ اکرم نے افسردگی کو دور کیا۔۔۔۔۔ اور پیار سے بولا۔

”بہت دنوں کے بعد میری یاد آئی۔۔۔۔۔“ فہد نے طنز پر جملہ پھینکا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں بس پوسٹ آفس کی نوکری میں پھنس گیا ہوں۔“ اکرم نے سنجیدگی سے بتایا۔

”یار تم نے ایم اے کیا ہے۔۔۔۔۔ کہاں پوسٹ آفس میں بیٹھے ہوئے ہو۔۔۔۔۔ میرے ساتھ میری فیکٹری میں آ جاؤ۔۔۔۔۔“ فہد نے اس کی قابلیت کے مطابق نوکری کے لیے اسے رائے دی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں بس پوسٹ آفس کی نوکری ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اور پھر ابانے کافی ادھار لیا ہوا ہے۔

ادھار اتر جائے گا تو شاید پھر بزنس کی طرف آؤں۔“ اکرم نے اپنی مشکلات سے اسے آگاہ کیا۔

”چلو خوش رہو۔۔۔۔۔ اور سناؤ، شادی ہوئی کیا؟“ فہد نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ اور تیری کیا۔۔۔۔۔؟“ اکرم نے اس

”خالہ حبیب دل کا بہت اچھا لڑکا ہے۔“ نورین نے مسکرا کر بتایا اور ریک سے پلیٹیں لیں اور سب چیزیں پلیٹوں میں سجانے لگی۔۔۔۔۔ ثریا مسکرا کر کچن سے باہر چلی گئیں۔

”اگر اتنی چیزیں اس نے لے کر آئی تھی تو ہمیں فون کر دیتا۔۔۔۔۔ ہم پلاؤ نہ بناتے۔۔۔۔۔“ رحمانے منہ بسور کر کہا۔

”یار! اپنی خوشی سے لایا ہے۔۔۔۔۔ اب کیا ساری چیزیں فریج میں رکھ دوں۔۔۔۔۔ اور اس کے سامنے خالی پلاؤ رکھوں۔۔۔۔۔“ نورین نے ہنس کر جواب دیا۔

”تمہیں پتا ہے اس سے ہماری انسلٹ ہو رہی ہے کہ ہم نے اسے دعوت دی۔۔۔۔۔ اور وہ ہی کھانے پینے کا سامان اٹھا لیا۔۔۔۔۔“ اس نے شاپر میں جوس کی بوتلیں دیکھ کر خفا خفا لہجے میں کہا۔

”یار۔۔۔۔۔ کوئی انسلٹ نہیں۔۔۔۔۔ وہ اب بھی تو ساتھ تھے۔۔۔۔۔ شاید پیسے وہ اب نے دیے ہوں۔۔۔۔۔“ نورین نے اس کے کچھ چہرے کے لیے جھوٹ بول دیا جبکہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب حبیب نے اس کے لیے کیا ہے۔

”اچھا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تمہاری سسرال ہے۔۔۔۔۔ تمہیں پتا ہوگا بھلا مجھے کیوں اعتراض ہو۔۔۔۔۔“ اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا اور کچن سے باہر نکلنے لگی۔

”یار۔۔۔۔۔ ٹھہرو تو۔۔۔۔۔“ نورین نے اس کا بازو تھام لیا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔ اب؟“ رحمانے غصے سے کہا۔

”یار! تھوڑی لپ اسٹک تو لگا لو، ایسے چہرے سے ملو گی۔۔۔۔۔ تو وہ دونوں بھاگ کھڑے ہوں گے۔“ نورین نے ہنستے ہنستے اس کے بکھرے بالوں کو سلجھایا۔

”آف نورین۔۔۔۔۔ میں جیسی ہوں۔۔۔۔۔ اچھی



ابھرتی ہوتی فنکارہ اور ماڈل
یعنی جعفری موجود ہیں جو نہ
صرف خوش شکل، خوش رو،
خوش مزاج ہیں بلکہ ان کی
بات چیت اور اطوار میں خوش
اخلاقی اور بلا کی معصومیت
ہے..... اور ان سے بالمشافہ
ملاقات کر کے ہمیں تو بے حد
مزہ آیا اور ان کی مہربان گفتگو
سے ہم بہت محظوظ بھی
ہوئے..... آئیے عینی جعفری
سے گفت و شنید کا آغاز
کرتے ہیں۔

پاکیزہ..... جی عینی
پاکیزہ کے قارئین کے
لیے آپ نے اپنی بے
پناہ مصروفیات میں سے
وقت نکالا۔ یہاں ہم اپنی
اور قارئین کی جانب سے
پیشگی شکریہ ادا کرتے ہیں۔
پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کو کسی
رسالے کے لیے انٹرویو دینا کیسا
لگتا ہے؟

یعنی جعفری..... نارمل لگتا

ہے، پارٹ آف دی جاب ہے۔ میرا
خیال ہے اگر Interviewer
خراب ہو تب Irritating
situation ہو سکتی ہے۔ ویسے ابھی تک اچھا لگ

رہا ہے۔ ابھی کم ہی انٹرویوز دیے ہیں۔
پاکیزہ..... کیا یہی آپ کا اصل نام ہے یا اس
شعبے میں آکر یہ نام رکھا؟

یعنی جعفری..... میرا نام قرۃ العین جعفری
ہے، ع حرف نکلا تھا تو دادا دادی نے یہ
نام رکھا اور عینی نام سے ہی پکارا گیا۔
پاکیزہ..... آپ کی تاریخ پیدائش،
جائے پیدائش اور برج؟
یعنی جعفری..... 9 جون، کراچی
جوزا.....
پاکیزہ..... اپنے فیملی بیک
گراؤنڈ کے بارے میں کچھ
بتائیے؟
یعنی جعفری..... میرے
والد اظہر جعفری نے
MBA امریکا سے کیا، ساری عمر وہ
بینکنگ کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں اور اسی سلسلے میں وہ
ملکوں ملکوں فرائض انجام دیتے رہے جیسے سنگاپور، سعودی
عرب، ملائیشیا اور یہاں پاکستان وغیرہ..... میرے گرینڈ
پیرنس یہیں کراچی میں ہوتے تھے۔ میری ماما گل رعنا
جعفری نے کراچی یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے
انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا کچھ عرصہ وہ ایڈورٹائزنگ کے



عینی جعفری

سے دلچسپ ملاقات

نرہت اصغر

دلکش قارئین پاکیزہ! آج ان صفحات پر آپ
سے ایک ایسی ہی ہستی سے ملاقات کروائی جارہی ہے
جو میر تقی میر کے ان اشعار کی جیتی جاگتی تصویر ہے.....
جی ہاں! آج ہمارے ساتھ ٹیلی وژن اسکرین کی

نازکی اُن کے لب کی کیا کہیے
پگھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے



ماڈلنگ کے لیے ضروری ہے کہ کانفیڈنس بہت ہو اور جو خوبیاں ایک ماڈل کے لیے ضروری ہیں وہ ہوں اگر ایجوکیشن کی بات ہے تو اس فیلڈ میں لو ایجوکیٹڈ ماڈلز بھی دیکھی ہیں جو کامیاب بھی ہیں۔ ان میں ماڈلنگ کے بہت guts ہیں۔ تعلیم انسان کو groom کرتی ہے آپ کو ہر ماحول میں move کرنا آ جاتا ہے۔ ہاں اگر بات brand ambassador کی ہو تو اسے ویل انفارمڈ اور کو ایفائنڈ ہونا چاہیے کیونکہ وہ ایک پروڈکٹ represent کر رہی ہوتی ہے face ویلیو تو میٹر ضرور کرتی ہے مگر آپ کی over all physical

پاکیزہ H..... یعنی ماشاء اللہ آپ کو خدا نے حسن اور معصومیت دونوں سے نوازا ہے اور کردار بھی اس کے حساب سے ملے، شو بزم میں آنے کی اصل وجہ یہ تو نہیں؟ یعنی جعفری H..... حقیقت ہے کہ پوری دنیا میں looks do matter لیکن صرف اسی کے بھروسے پر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ صرف beauty کامیابی کی ضمانت نہیں ہاں کسی حد تک تو صحیح ہے۔ میں نے جتنی بھی ماڈلنگ کی ہے مجھے تو مشکل لگی کہ لوگ آج کل بے وقوف نہیں ہیں صرف چہرہ دکھانا مقصد نہیں بلکہ آپ کو expressions بھی لانے ہیں۔ body language matter کرتی ہے اس میں بھی سب کافی محنت سے کام کر رہے ہیں۔ بھرہ نہیں کہ face value سے آپ ہٹ ہو گئے جب تک محنت سے کام نہیں کیا جائے تو آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ایسا نہیں کہ صرف خوب صورتی کی بنا پر آگے آیا جائے اس کے پیچھے محنت اور اپنے پروفیشن میں لگن سے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس میں آپ کو patience بھی چاہیے یعنی بیوی تو ہو

looks بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس شعبے میں ٹریننگ بھی ضروری ہے۔ پاکیزہ H..... اداکاری کے شعبے میں آنے کا کیا سبب ہوا؟ اس سے پہلے آپ کی فیملی سے کوئی اس جانب آیا؟

یعنی جعفری H..... یہ سمجھ لیں کہ شروع سے ہی شوق تھا۔ اصل میں، میں اپنی پرسنل لائف میں بھی بہت loud، energetic اور dramatic ہوں تو germs تو یقیناً بچپن سے ہی ہوں گے۔ میرے فیملی ممبرز یہی کہتے ہیں جیسی تم تھیں اسی طرح کے شعبے میں آ گئی ہو۔ شوق تو تھا ہی رہا بابا مجھے کہتے تھے کہ صرف ایکٹنگ کی تعلیم حاصل نہ کرو، ہاں تم اپنی اسٹڈیز مکمل کر لو پھر اپنا یہ شوق بھی پورا کر لینا۔ ماما میں بھی کافی ٹیلنٹ تھا مگر وہ باقاعدہ اس طرف نہیں آئیں۔ ویسے ماما، بابا دونوں کی طرف سے میں پہلی فرد ہوں جو اتنی بیک اتج میں شو بزم میں آئی۔ اس سے پہلے میری دو خالائیں نشاط کاظمی اور عذرا محی الدین اسی شعبے سے وابستہ ہیں۔

میرے پرنسپل پاکستان آگئے کچھ نیلی میں home sick ہو گئی تھی اس لیے میں وہاں نہیں رہ سکی۔ کام تو خیر اچھا چل رہا تھا مگر اتنے دنوں سے گھر والوں سے دور تھی تو میں بھی ان کے پاس کراچی چلی آئی۔ ویسے اگر آپ کا کسی کام میں دل نہ لگ رہا ہو تو پھر اسے کرنے میں مزہ نہیں آتا نہ ہی کام ٹھیک طریقے سے ہو پاتا ہے پھر یہاں آ کر ایکٹنگ کی طرف آ گئی۔ تھوڑا تھیر کیا ہوا تھا۔ میں اپنی دوستوں سے کہتی رہتی تھی کہ مجھے ایکٹنگ کرنی ہے۔

پاکیزہ H..... اگر ہم غلط نہیں تو آپ نے چند سال پہلے ایک ایڈ میں کام کیا تھا پھر آپ غائب ہو گئیں اور اب اداکاری کرتی نظر آئیں۔ ماڈلنگ کرنا کیسا لگا؟

یعنی جعفری H..... اصل میں مجھے ایکٹنگ کے شعبے ہی میں آنا تھا اس دوران ماڈلنگ کی آخر ہوئی دراصل اشارت میں نے ایکٹنگ سے ہی کیا مگر ہوا یوں کہ سیریل آن انیر دیر سے آیا اور ایڈ پہلے آ گیا اس وجہ سے لگتا ہوگا۔ اصل میں آپ جب کسی شعبے میں کسی سسٹم میں آ جاتے ہیں تو یہ سب ساتھ ساتھ چلتا ہے، ماڈلنگ، ایکٹنگ وغیرہ۔ ویسے میں اپنے آپ کو ماڈل نہیں کہوں گی، میں ایکٹر لیس ہی ہوں کیونکہ جتنے بھی شوٹ میں نے کیے شاید چار پانچ ہی ہوں گے وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ جنہیں میں یا میری فیملی پرسنل جانتے تھے۔

even جو designers کے لیے بھی کام کیا ہے ان سب کو میں پہلے سے جانتی تھی۔ اتنا پروفیشنل اس شعبے میں کام نہیں کیا ہے جو out fits مجھے سمجھ آئے جو decent بھی لگے اسی کے لیے کام کیا۔

پاکیزہ H..... ایک ماڈل کے لیے کیا ہونا ضروری ہے؟ تعلیم کس حد تک ضروری ہے اور کیا ایک کامیاب ماڈل ایک کامیاب ایکٹر لیس ہو سکتی ہے؟

یعنی جعفری H..... بالکل بھی ضروری نہیں کہ ایک کامیاب ماڈل کامیاب ایکٹر بھی ثابت ہو۔

شعبے سے وابستہ رہیں ہم لوگوں کا چونکہ abroad جانا رہتا تھا اس لیے مستقل جاب نہ کی اب وہ سوشل ورک کرتی ہیں مختلف جگہ volunteer کرتی ہیں اور ایک اچھی ہاؤس وائف بھی ہیں۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں مہر جعفری اور سارہ..... مہر نے فلم میکنگ کے شعبے میں تعلیم حاصل کی اور اس نے حال ہی میں seedling کے نام سے ایک فلم پروڈیوس کی ہے جسے نیویارک کے سٹی فلم فیسٹیول میں دو ایوارڈز ملے ہیں اس میں بیسٹ ایکٹر لیس کا ایوارڈ آمنہ شیخ کو ملا ہے، اب ساؤتھ ایشین فلم فیسٹیول کے لیے بھی جا رہی ہے۔ اسے ڈائریکشن کا بہت شوق ہے..... سب سے چھوٹی بہن سارہ ابھی لندن سے ماسٹرز کی ڈگری لے کر آئی ہے۔

پاکیزہ H..... اپنے تعلیمی کیریئر کے متعلق کچھ بتائیں؟

یعنی جعفری H..... میں نے اپنا O/Alevel تو کراچی سے ہی کیا ہے پھر بچلرز مائنریال کینیڈا سے کیا اس میں major subject میرا مارکیٹنگ تھا۔

پاکیزہ H..... جب آپ نے اتنی اچھی تعلیم حاصل کی تو وہیں یا پاکستان میں آ کر جاب کرنے کا کیوں نہیں سوچا؟ ایکٹنگ اور ماڈلنگ کی طرف ہی کیوں آئیں؟

یعنی جعفری H..... (اس سوال کا جواب یعنی نے خاصی تفصیل سے دیا) ایجوکیشن کمپلیٹ کرنے کے بعد پہلے میرا ارادہ وہیں کینیڈا میں جاب کرنے کا تھا میری کینیڈین نیشنلٹی بھی ہے تو میں نے وہاں کام کرنے کا سوچا۔ میرے parents اس وقت سنگاپور میں تھے انہوں نے اسٹڈیز مکمل ہونے کے بعد مجھے وہاں بلا لیا کہ گھر سے کافی عرصہ دور گزار لیا اب ہمارے پاس آ جاؤ۔ سنگاپور میں بھی fresh graduates کے لیے کافی مواقع ہیں مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزنگ میں..... سو میں وہاں چلی گئی اور وہاں میں نے دو سال تقریباً کام بھی کیا پھر اسی دوران

میں involve ہوں تو جیسے ایک سین میں، میں بالکل ڈوب گئی۔ دل سے feel کیا اور حقیقت میں روئی بھی ہوں مگر بعض دفعہ glycerine کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔

پاکیزہ H..... آج کل نامور رائٹر حسین معین کے ایک ڈرامے میں آپ کو ایک مرکزی کردار دیا گیا ہے۔ آپ کو ان کے لکھے ڈرامے میں کام کرنا کیسا لگ رہا ہے؟

عینی جعفری H..... یقیناً بہت اچھا! جب پتا چلا کہ مجھے اس پروجیکٹ کے لیے بلایا ہے تو میں بہت ایکسائٹڈ تھی۔ وہاں آفس میں سب بیٹھے تھے تو یہ ڈسکشن ہو رہی تھی کہ کرباؤں کی کہ نہیں کیونکہ اس وقت میں نے کوئی مرکزی کردار strike کر دینے والا نہیں کیا تھا مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہوگی

کیونکہ یہ کیریئر بڑا تھا ایک پوری journey ہے مایا کی بہت مختلف چویشنز ہیں مجھے پورا اسکرپٹ بتایا گیا تھا ایک indentivity crisis ہے بہت کچھ دکھانا ہے اب حسینہ آپا کا کئی مرتبہ فون آیا ہے کہ بیٹا جو میں سوچ رہی تھی جیسا میں چاہتی تھی تم نے ویسا ہی پر فارم کیا ہے کافی سراہا جا رہا ہے اقبال انصاری نے بھی کہا ویل ڈن ہم خوش ہیں تم نے جنس کیا کہ ان کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی یا تو پلے کو destroy کر سکتی ہے یا

..... بنا سکتی تھی تو critics کے حلقے سے بھی پذیرائی مل رہی ہے۔ میں بھی بہت ڈری ہوئی تھی۔ ویسے مجھے اس وقت کہا گیا تھا کہ اردو پلے دیکھو اور حسین معین کے لکھے ڈرامے میں نے دیکھے ان کا اسٹائل ٹریٹ منٹ وغیرہ۔

پاکیزہ H..... کیا اداکاری کرنے کے لیے کسی اکیڈمی سے تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے؟

عینی جعفری H..... ویسے تعلیم تو ہر شعبے میں اہم ہے اور آپ کے لیے ہر قدم پر helpful ہوتی ہے مگر تربیت بھی matter کرتی ہے۔ کچھ

اگر میرا کیریئر بھی مضبوط ہو مگر دیگر چیزیں غیر اطمینان بخش ہوں؛ جب بھی کام نہیں ہو پاتا۔ بہت سارے ٹیکٹرز ہوتے ہیں جنہیں دیکھنا پڑتا ہے۔ سب کچھ correct ہونے کے بعد even ایک lighting کے upsets یا کسی بھی معمولی چیز کی وجہ سے کبھی پروجیکٹ بیٹھ بھی سکتا ہے۔ اس لیے تمام چیزوں کو دیکھ اور تسلی کر کے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ Co artists کے ساتھ کیمسٹری اور کیمرا ورک کیسا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ ایک ٹائپ کے ہی روٹز کروں گی۔ ابھی تو initial stage ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو بھی کردار ملے اس میں کام کرنے کی گنجائش ہو اور مزہ آئے۔ میں پورا 360 دیکھ کر ہی کردار لیتی ہوں۔

پاکیزہ H..... اب تک کے ادا کیے گئے کرداروں میں سے کون سا کردار نبھانا مشکل لگا۔ اور کون سب سے اچھا لگا؟

عینی جعفری H..... مایا مشکل بھی اور بہت اچھا بھی۔

پاکیزہ H..... اسکرپٹ میں جیسا کردار لکھا ہوتا ہے وہی ادا کرتی ہیں یا خود بھی کچھ variations دیتی ہیں؟

عینی جعفری H..... جی بالکل discussions ہوتی ہیں کہ اس act میں کتنی گنجائش ہے emotion کو کس حد تک لاؤڈ کرنا ہے۔ جیسے ایک سین میں رونا ہے تو کس intensity سے پھر ہر دفعہ رونے کا سین کس طرح کرنا ہے۔ ظاہر ہے ہر مرتبہ تو گلا نہیں پھاڑ سکتے ہیں۔

چویشن کے حساب سے expressions دینا اور emotions کو portray کرنا ہوتا ہے دونوں کی out put ہوتی ہے۔ اچھا ڈائریکٹر سننا ہے پھر باقاعدہ سین کے حساب سے کچھ ایڈ یا کٹ کرنا ہوتا اس کی گنجائش ہوتی ہے یہ ایک ٹیم ورک ہے سین

بات یہ ہے کہ ہمارے پرانے رائٹرز ابھی تک لکھ رہے ہیں جیسے حسین معین کے پلے آج کل آرہے ہیں پھر اردو کے اچھے ناٹلز dramatize کیے جا رہے ہیں۔ عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، فرحت اشتیاق، محمد احمد وغیرہ لکھ رہے ہیں اور اب تو نئے ڈائریکٹرز اس شعبے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، سو ہمارا ڈراما تو ہمیشہ سے اچھا ہے جیسے p tv کے ڈرامے وغیرہ اور جدید ٹیکنالوجی اور تربیت کے ساتھ مزید اچھا ہوتا جا رہا ہے۔ TV dramas کی respect کا لیول کافی ہائی رہا ہے۔

پاکیزہ H..... اس شعبے میں کن سینئرز سے متاثر ہیں؟ اور کیوں.....؟

عینی جعفری H..... اب تک جتنے سینئر آرٹسٹ کے ساتھ بھی کام کیا ہے جیسے جاوید شیخ، بہروز... ہزدار صبا پرویز..... تو بہت اچھا لگتا ہے۔ پرانے ڈراموں کی اگر بات کریں تو جہاں تک میں نے دیکھے ہیں ان میں شہناز شیخ، مرینہ خان، ثانیہ سعید، نادیا جمیل، بشری انصاری اور حنا دلپذیر وغیرہ اس کے علاوہ ایک لمبی فہرست ہے ظاہر ہے ان کے کام کی وجہ سے پسند ہیں۔ لگتا ہے میں بھی ان جیسا کام نہیں کر پاؤں گی..... even کامیڈی کرنا بھی اتنا مشکل ہے جیسے حنا دلپذیر کی کامیڈی..... کامیڈی کرنا عام ڈراما کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ سیریس ایکٹنگ میں کافی گنجائش ہوتی ہے..... روتے ہیں، ہنستے ہیں، ایکسپریشن دیتے ہیں مگر کامیڈی میں ٹائمنگ اور abrupt action کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سینئر آرٹسٹ بہت ٹیلنٹڈ ہیں کہ سب کچھ بڑے آرام سے کر لیتے ہیں۔ کامیڈی ہو یا سیریس۔

پاکیزہ H..... اسکرپٹ میں کیا چیز دیکھ کر کسی کردار کو نبھانے کی ہامی بھرتی ہیں؟

عینی جعفری H..... بہت ضروری ہے ہر چیز کو دیکھنا صرف رائٹر یا ڈائریکٹر کو نہیں دیکھنا اسکرپٹ میں

اور کوئی کوالٹی نہ ہو اور ہٹ ہو جائیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔

پاکیزہ H..... ناظرین میں آپ کی پہچان کون سے کردار سے ہوئی؟

عینی جعفری H..... ویسے میں نے بہت زیادہ کام تو کیا بھی نہیں ہے، ابھی ڈھائی تین سال ہی ہوئے ہیں آج کل تو مایا کا کردار پہچان بنا ہوا ہے۔ ویسے ”آگ“ چینل پر dreamers ڈراما آتا تھا وہ خالص یوتھ یہ تھا۔ اسے لوگ ابھی تک یاد کرتے ہیں اس کے حوالے سے ملتے ہیں وہ کافی پاپولر تھا کیونکہ انٹرنیشنل بھی دیکھا جا رہا تھا۔ لوگ 2 dreamers کے انتظار میں ہیں، شاید مایا کے اس کردار کو میری پہچان کہہ سکتے ہیں۔ حسین معین کا لکھا اقبال انصاری کی زیر نگرانی بنا..... پروجیکٹ مجھے ملا شاید میں اس لحاظ سے کافی blessed ہوں کہ اتنا بڑا گیپ بھی آیا اور پروجیکٹ بھی ملا۔ میری پہچان بنا، کافی appreciation مل رہی ہے۔

پاکیزہ H..... آپ کا بچپن پاکستان سے باہر گزرا اب آپ کو یہاں ایڈجسٹ کرنا کیسا لگتا ہے؟

عینی جعفری H..... تھوڑا تو مشکل ہوتا ہے کہیں سے آکر رہنا وہ بھی کینیڈا، سنگا پور وغیرہ سے... مگر جیسا میں نے کہا کہ 6th grade سے ہائی اسکول تک یہیں تھے اور ویسے بھی گرینڈ پیرنس اور دیگر فیملی بھی تھی تو پاکستان آتے جاتے رہتے تھے۔ حالات سے واقفیت رہتی تھی۔

پاکیزہ H..... آپ کا سب سے پہلا پلے؟

عینی جعفری H..... اصل میں کئی پلے ایک ساتھ آن ایئر گئے، زپ بس چپ رہو، بدتمیز، dreamer اور عید کا لانگ پلے بھی تھا۔

پاکیزہ H..... پاکستانی ڈرامے کے معیار کے متعلق کیا کہیں گی؟

عینی جعفری H..... بہت ہی اچھا ہے، اچھی

پاکیزہ H..... آپ کا بچپن پاکستان سے باہر گزرا اب آپ کو یہاں ایڈجسٹ کرنا کیسا لگتا ہے؟

عینی جعفری H..... تھوڑا تو مشکل ہوتا ہے کہیں سے آکر رہنا وہ بھی کینیڈا، سنگا پور وغیرہ سے... مگر جیسا میں نے کہا کہ 6th grade سے ہائی اسکول تک یہیں تھے اور ویسے بھی گرینڈ پیرنس اور دیگر فیملی بھی تھی تو پاکستان آتے جاتے رہتے تھے۔ حالات سے واقفیت رہتی تھی۔

پاکیزہ H..... آپ کا سب سے پہلا پلے؟

عینی جعفری H..... اصل میں کئی پلے ایک ساتھ آن ایئر گئے، زپ بس چپ رہو، بدتمیز، dreamer اور عید کا لانگ پلے بھی تھا۔

پاکیزہ H..... پاکستانی ڈرامے کے معیار کے متعلق کیا کہیں گی؟

عینی جعفری H..... بہت ہی اچھا ہے، اچھی

پاکیزہ H..... آپ کا سب سے پہلا پلے؟

عینی جعفری H..... اصل میں کئی پلے ایک ساتھ

آن ایئر گئے، زپ بس چپ رہو، بدتمیز، dreamer اور عید کا لانگ پلے بھی تھا۔



رومانس بھی ہو سب فیلنگز ہوں تو مجھے ادا کرنے میں مزہ آئے گا مجھے اسی لیے مایا کے رول میں بہت مزہ آیا کہ اتنا کچھ ایک کردار میں کرنے کو ملا۔ غصہ، رونا، چیخنا، چلانا، مارنا، پیٹنا وغیرہ I am very happy اتنا کچھ کرنے کو ملا ہے مگر اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

پاکیزہ: آپ یہاں شو بزنس کے ماحول سے مطمئن ہیں؟
عینی جعفری: اچھا ماحول ہے اور بھی بہتر ہو سکتا ہے۔

پاکیزہ: کیا آج کی پڑھی لکھی بونٹھ کو اس شعبے میں آنا چاہیے؟
پاکیزہ: ضرور آنا چاہیے اسپیشلی مووی میکنگ میں اس لیے کہ یہ انڈسٹری بالکل بیٹھ چکی ہے۔ بونٹھ آئے گی تو ہر لحاظ سے بہتری آئے گی۔ آج اس میں پیسہ انویسٹ کرنے سے لوگ گھبراتے ہیں۔ سینما دیکھنا بالکل ختم ہو گیا ہے تو ان حالات کی بہتری کے لیے لوگ نئے ٹاپکس لائیں، نئے ٹیلنٹ کے ساتھ آئیں تو بہت اچھا ہے وہ بالکل discourage نہ ہوں بلکہ آگے بڑھیں اب تو اس شعبے میں تعلیم اور ٹریننگ کی سہولیات بھی بہت ہیں۔

پاکیزہ: شہرت ملنے کے بعد کیا لگتا ہے؟
عینی جعفری: شہرت ملنے کے بعد کیا لگتا ہے؟
عینی جعفری: (بڑی معصومیت سے) میں اتنی famous ہوں ہی نہیں باہر بھی کم جاتی ہوں مگر ظاہر ہے جب لوگ کام کے حوالے سے آپ کو پہچانتے ہیں، جانتے ہیں، پسند کرتے ہیں، آپ کے کام پر بات کرتے ہیں تو یقیناً اچھا لگتا ہے۔ ویسے اب عادی ہو گئی ہوں لوگ آٹو گراف لیتے ہیں مگر ایسا بالکل

رہے تو کوئی حرج نہیں مگر شارٹ کٹس یا odd means ایڈاپٹ کرنا سستی شہرت کے لیے یا صرف glamour کے لیے کام کرنا..... تو ہرگز نہیں کروں گی۔ بالی ووڈ میں بھی ہر طرح کا کام ہو رہا ہے جیسے آرٹ موویز میں ابھی recent مووی ”برنی“ مجھے بہت اچھی لگی اس طرح کا کوئی کیریئر ہو۔

پاکیزہ: یہاں کن لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں مزہ آیا؟ کس ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟
عینی جعفری: ابھی تو اتنا کام نہیں کیا مگر جتنا بھی کام کیا ہے اچھی ڈائریکشن میں کیا ہے اور ابھی تو بہت کام کرنا ہے تو اچھے ڈائریکٹرز کے ساتھ موقع ملتا رہے گا۔

پاکیزہ: اپنے ساتھی آرٹسٹ میں کون پسند ہے؟
عینی جعفری: یہ بھی بہت لمبی فہرست ہے، ویسے جن کے ساتھ اب تک کام کیا ہے سبھی اچھے ہیں۔

پاکیزہ: کیا ایک ایج میں کوئی اولڈ رول ملے تو کر لیں گی؟
عینی جعفری: ہاں کر تو سکتی ہوں بلکہ ابھی فیلڈ میں بات ہو رہی تھی تو مجھے کہا گیا کہ آپ ابھی 16 سے 28 سال تک کی عمر کے رول آرام سے کر سکتی ہیں یعنی پہلی قسط میں اگر پندرہ سولہ سال کی لڑکی دکھائی جائے اور آخر تک وہ بچوں کی ماں بھی بن جائے تو وہ کیریئر میں کر سکتی ہوں اس سے اولڈ تو معلوم نہیں.....

پاکیزہ: کس قسم کا کردار ادا کرنے کی خواہش ہے؟
عینی جعفری: مجھے fairy tales بچپن سے ہی بہت پسند ہیں جیسے کوئی کردار ہو سنڈریلا، سلپنگ بیوٹی وغیرہ..... اس میں چاہے

technicalities سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے..... ہمارے جتنے بھی سینئر آرٹسٹ ہیں وہ کہیں سے ٹرینڈ نہیں ہیں مگر اتنا اچھا کام کیا اور کر رہے ہیں میرا خیال ہے یہ God gifted ہوتا ہے۔ تربیت شاید پالش کر دیتی ہے یہ آپ کے اندر کے ایموشن کا اظہار ہے۔

پاکیزہ: شوٹنگ کے دوران پیش آنے والا کوئی دلچسپ واقعہ؟ کوئی بات؟
عینی جعفری: ایسا کچھ خاص نہیں ابھی فوری تو کوئی واقعہ یاد نہیں آرہا ہاں بارش میں بھگنے کا سین تھا تو اس کی وجہ سے طبیعت خراب ہو گئی تھی بخار ہو گیا تھا۔

پاکیزہ: بیرون ملک بھی آپ نے شوٹنگ کیں وہاں کام کرنا کیسا لگتا ہے گھر سے دوری وغیرہ کا احساس.....؟

عینی جعفری: میں نے ویسے بھی ابھی تک کافی زندگی تو باہر گزاری ہے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے خاص طور پر جب کسی نئی جگہ جانا ہو۔ اگر زیادہ عرصہ رہنا پڑے تو الگ فیلنگز ہوں گی۔

پاکیزہ: آپ کے خیال میں پاکستانی نوجوانوں میں شو بزنس کے حوالے سے کتنا ٹیلنٹ ہے؟
عینی جعفری: بہت زیادہ ٹیلنٹ ہے، ہمارے سینئرز تو ہیں ہی باصلاحیت مگر ٹیکسٹرز بھی کم نہیں۔ بہت اچھا کام کر رہے ہیں اور کافی پروفیشنل ہو کے کر رہے ہیں۔

پاکیزہ: اگر پڑوسی ملک سے کام کرنے کی آفر ہوئی تو کیا لگے گا؟ accept کریں گی؟
عینی جعفری: کام کی آفر..... نارمل لگے گا، میں پہلے یہ سوچوں گی میرا تعلق کہاں سے ہے اگر میں اپنے رول کے ذریعے اپنے کچر کو represent کر پاؤں being a muslim and being a pakistani میری شناخت قائم

نہیں ہے کہ جیسے کوئی بڑا آرٹسٹ چلا جائے اور مجمع لگ جاتا ہے۔
پاکیزہ: ایکٹنگ کے معاوضے سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ اور پہلے معاوضے کا کیا کیا تھا؟
عینی جعفری: ہاں ٹھیک ہے..... ویسے ابھی یاد نہیں کیا کیا تھا شاید بہنوں کے لیے کچھ لے لیا ہو کچھ اپنے لیے شاپنگ وغیرہ۔

پاکیزہ: اپنی بہنوں یا پرنٹس کے لیے گفٹ خریدتی ہیں؟
عینی جعفری: بہنوں کے لیے کبھی کچھ لے لیتی ہوں کبھی ماما کے لیے ویسے بابا کے پاس تو خود ہی سب کچھ رہتا ہے ہاں بس ٹوکن گفٹس سمجھ لیں۔
پاکیزہ: ایکٹنگ کے علاوہ آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟
عینی جعفری: I love to read



ہیں انگلش موویز کی بات ہے تو مجھے یاد ہے میں کافی چھوٹی تھی جب Titanic دیکھی تھی کوئی بیس دفعہ تو ضرور دیکھی ہوگی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ مووی دیکھنے کے بعد میں گھٹنا بھر تو ضرور روئی ہوں گی لیونارڈو کے ڈوبنے کے سین پر مجھے لگتا تھا میں بھی مرجاؤں گی، میں اتنا روئی تھی کہ pillow بھیگ گیا تھا کہ شاید میں ختم ہی ہو جاؤں گی۔

پاکیزہ H..... فرصت کے لمحات میں ٹی وی چینلز پر کیا دیکھنا چاہتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... میں ٹی وی یا مووی دو طرح سے دیکھتی ہوں یعنی جب بہت تھکی ہوئی ہوں تو صرف

ریلیکس ہونے کے لیے یہ میرے relaxing hours ہیں کہ تھکی ہوئی ہوں، اکیلی ہوں تو ٹی وی لگا لوں، کوئی مووی ہو یا شو ہو بس خوب آرام سے انجوائے کروں اور دوسرے میں سیکھنے اور ایکٹنگ پر غور کرنے کے لیے یہ دیکھتی ہوں کہ آج کل کس طرح کے ڈرامے، شووز وغیرہ چل رہے ہیں۔

پاکیزہ H..... پسندیدہ تفریح اور تفریحی مقام کون سا ہے، پسندیدہ ملک؟

یعنی جعفری H..... میوزیکل تھیٹر جانا، آؤٹ ڈور جانا کوئی نئی جگہ ڈسکور کرنا ویسے اب تک جہاں گئی ہوں سب اچھے ہیں، اب ساؤتھ امریکا جانا چاہوں گی۔

پاکیزہ H..... ناپسندیدہ شخصیت / جملہ / نصیحت؟

یعنی جعفری H..... مجھے آرٹی فیشل اور جھوٹے لوگ ناپسند ہیں اور جو خود کو سمجھیں کہ ہم سب جانتے

ہیں ان کی الگ حیثیت ہوتی ہے مگر میرا خیال ہے آپ کسی بھی وقت کسی بھی ایجنٹ فرینڈز بنا سکتے ہیں، میرے ہمیشہ اچھے دوست رہے ہیں، کیا پتا کیا وقت ہو، کیسا دور ہو زندگی ہمیں کہاں سے کہاں لے کر جائے تو بچپن کے دوست ساری عمر نہیں رہ پاتے۔

پاکیزہ H..... بچپن کی کوئی دلچسپ شراکت؟ کیا ڈانٹیں بھی کھائیں؟

یعنی جعفری H..... (بے اختیار ہنستے ہوئے جواب دیا) اتنی زیادہ مجھے ڈانٹیں پڑی ہیں کوئی ایک تو بتا ہی نہیں سکتی، میں بہت شرارتی تھی۔

پاکیزہ H..... اپنی childhood میں پلے لینڈ یا ڈزنی جیسی جگہوں پر گئیں؟ کیا اب بھی دل چاہتا ہے؟

یعنی جعفری H..... بہت زیادہ..... میں تو اب بھی جاتی ہوں یہاں بھی اور ڈزنی ورلڈ بھی اور جب فیملی ہوگی تو اسے بھی لے جانا چاہوں گی میں تو خود بھی ابھی بچی ہی ہوں۔

پاکیزہ H..... ایک زمانے میں Jurassic Park مووی کا بہت چرچا تھا آپ نے کتنے شوق سے وہ دیکھی؟

یعنی جعفری H..... ہاں میں نے ضرور دیکھی ہے 3D میں بھی بہت مزہ آتا ہے ظاہر ہے اتنی بڑی اسکرین پر دیکھنے کا اپنا ہی لطف ہے۔

پاکیزہ H..... اپنی کوئی پسندیدہ مووی کس اداکار اور اداکارہ سے متاثر ہیں؟

یعنی جعفری H..... کوئی ایک نہیں ہے بس سائنس فکشن پہ aliens کے ٹاپکس سے ہٹ کر سب پسند ہیں۔ بہت موویز دیکھیں انڈین، پاکستانی، انگلش..... جب چھوٹی تھی تو ایسا بھ بچن بہت پسند تھے میں کہتی تھی کہ یہ میرے ابو سے ملتے ہیں پھر عامر خان کی ساری موویز دیکھیں جو جیتا وہ سکندر بہت پسند آئی۔ پاکستانی بھی دیکھتی ہوں بہت سارے آرٹسٹ پسند

میرے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی جگہ رہتی ہے۔ کہیں travel کرنا ہوتا ہے تو جگہ پڑھتی رہتی ہوں اور اپنے فیلڈ کی وجہ سے movies کی وی شووز اور ڈرامے وغیرہ دیکھنے کا شوق ہے۔ بہت زیادہ موویز دیکھتی ہوں چاہے انگلش، انڈین یا پاکستانی..... اور ٹریولنگ کا بھی بہت شوق ہے۔ جب بھی موقع ملتا ہے آؤٹنگ پر جاتی ہوں۔ I love swimming۔

پاکیزہ H..... گھر والے آپ کی پرفارمنس پر کیا کہتے ہیں؟

یعنی جعفری H..... سب ہی اپنی اپنی جگہ critics ہیں، بتاتے رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ تو ماما critically ہیں اگر کوئی دوسرا برائی نہ بھی ڈھونڈے تو ماما میرے کام میں ڈھونڈ لیتی ہیں کہ تم نے ایسا کیا، ایسا کرنا چاہیے تھا ویسے ماما، بابا، پچھو، خالہ بہنیں سب ہی supportive ہیں۔

پاکیزہ H..... اپنی فیملی میں سب سے زیادہ دوستی کس سے ہے؟

یعنی جعفری H..... دوستی تو ظاہر ہے بہنوں سے ہے اور کزنز سے بھی ہے۔

پاکیزہ H..... دوستی کے بارے میں کیا کہیں گی؟ کیا بچپن کے دوست ہمیشہ رہنے چاہئیں یا الگ الگ دور کے؟

یعنی جعفری H..... (گہرائی سے سوچتے ہوئے) دوستی بہت پیارا اور بے غرض ایک خوب صورت رشتہ ہے۔ فرینڈز وہ ہوتے ہیں جو آپ کو judge نہیں کرتے ان میں expectations نہیں ہوتیں ان سے آپ ہر چیز، ہر بات شیئر کر سکتے ہیں اور بلا کسی جھجک، پریشانی اور خوف کے..... فیملی بھی جج کرتی ہے اپنے اپنے رشتوں کے حساب سے..... بچپن کے دوست بچپن کے ہوتے ہیں ان کے ساتھ پرانی یادیں وابستہ ہوتی

ہیں اور وہ بھی جن کے پاس sense of humour سے ہی نہ ہو اور یہ جملہ..... ”تم یہ نہیں کر سکتیں تم لڑکی ہو بیٹا! اس لیے یہ نہیں کر سکتیں“ یہ سننا کبھی کبھی بہت برا لگتا ہے۔

پاکیزہ H..... گھومنے پھرنے کی کس حد تک شوقین ہیں؟

یعنی جعفری H..... بہت، بہت زیادہ۔

پاکیزہ H..... sun set کا نظارہ کرنے کس کے ساتھ جانا پسند کریں گی؟ اور لانگ ڈرائیو پر کس کے ساتھ جانا چاہیں گی؟

یعنی جعفری H..... (قہقہہ لگاتے ہوئے) ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی جن کے ساتھ sun set پر جانا پسند کروں گی اور لانگ ڈرائیو پر تو ظاہر ہے ابھی تو اچھے دوست ساتھ ہوں مگر ابھی کراچی میں

لانگ ڈرائیو سیکورٹی رسک ہے۔

پاکیزہ H..... فطری طور پر محفل پسند ہے یا

تہائی پسند؟

یعنی جعفری H..... gemini دوڑنی پر سٹائی کے مالک ہوتے ہیں اس لحاظ سے کبھی ہر وقت لوگوں میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ فرینڈز ہوں، فیملی ممبرز ہوں، فینز ہوں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی شکل نہیں دیکھتی بس اکیلے تہائی، سکون میں رہنے کو دل چاہتا ہے (ایسا شاید سب کے ساتھ ہی ہوتا ہے قارئین آپ کا کیا خیال ہے؟)

پاکیزہ H..... آپ کی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش خوشگوار لمحہ؟

یعنی جعفری H..... ماشاء اللہ ابھی تک اتنے خوشگوار لمحات گزرے ہیں کہ کوئی ایک چھٹنا مشکل ہے۔ یوں سمجھ لیں جب بھی ہماری ساری فیملی اکٹھا ہوتی ہے، ہم سب خوب مزہ کرتے ہیں، خوب رونق لگاتے ہیں، وہی moments میرے لیے قیمتی بھی ہیں اور ناقابل فراموش بھی۔

پاکیزہ H..... اپنی شاپنگ خود کرتی ہیں؟ کیا خریدنا اچھا لگتا ہے؟

یعنی جعفری H..... زیادہ تر خود ہی کرتی ہوں اور میں ہر لڑکی کی طرح بہت شوقین ہوں اس معاملے میں..... کپڑے، جوتے، accessories خوب لیتی ہوں۔ ظاہر ہے گھر کا سامان تو ابھی نہیں لیتی۔ (ہنستے ہوئے جواب دیا)

پاکیزہ H..... قریبی لوگوں کی سالگرہ یاد رہتی ہے؟ اگر ہاں تو کیا گفٹ دینا پسند کرتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... اب اتنی اچھی یادداشت بھی نہیں ہے میری۔ ہاں گفٹ دینے کی بات ہے تو لڑکیوں کو دینے کے لیے چوائس ہوتی ہے، لڑکوں کو میرا خیال ہے چاکلیٹس ٹھیک ہیں ویسے سمجھ نہیں آتا کہ کیا دیں مکے بھی صحیح ہے۔

پاکیزہ H..... گھر میں کچھ سلیمیرٹ کرنا اچھا لگتا ہے یا باہر پارٹی کرنا؟

یعنی جعفری H..... دونوں جگہ اچھا لگتا ہے۔ اپنی برتھ ڈے تو گھر پر ہی منانا اچھا لگتا ہے مگر کبھی کبھی convenient نہیں ہوتا تو باہر بھی چلے جاتے ہیں۔

پاکیزہ H..... اچھا ذرا اپنی ڈریننگ کے متعلق بتائیے، کیسے ڈریس پسند کرتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... ویسے ویسٹرن ڈریسز میری وارڈروب میں زیادہ ہیں، casual بھی ہیں مگر گرمیوں میں یہاں میرا خیال ہے لان سوئنگ ہی زیادہ بہتر رہتی ہے۔

پاکیزہ H..... آج کل کے فیشن کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فیشن کس حد تک اختیار کرنا چاہیے؟

یعنی جعفری H..... اچھا ہے گرمیوں کے لحاظ سے تو loose ہی کپڑے ہوں ویسے میں اتنا follow نہیں کرتی بس وہی اپنائی ہوں جو مجھے سوٹ کرے، کمفرٹ دے اور پسند آئے۔ کرنٹ ٹرینڈز میں جو اچھا لگ رہا ہو ضرور پہنیں لیکن اندھا دھند نہیں۔

پاکیزہ H..... اپنی اسکن / ڈائٹ اور اسمارٹ نیس کا کس حد تک خیال رکھتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... ابھی recently خیال رکھنا شروع کیا ہے ورنہ کوئی بھی سوپ، فیس واش یا بیوٹی کریم وغیرہ استعمال کر لیتی تھی اور اب تو میری ماما نے اسکن کیئر وغیرہ کے حوالے سے برانڈڈ چیزیں لا کر دی ہیں کیونکہ شوٹنگ کے لیے میک اپ، لائٹنگ اور unrest کی وجہ سے آپ کی اسکن ڈائریکٹ متاثر ہوتی ہے ظاہر ہے پہلے تو اتنا میک اپ نہیں کرتی تھی۔

زیادہ ڈائٹ کالشن نہیں ہوں جنک فوڈ پسند ہے اپنے پاکستانی روایتی کھانے اور سمو سے پکوڑے وغیرہ بھی چلتے رہتے ہیں۔ ویسے weight کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں جم جاتی ہوں۔

پاکیزہ H..... گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنے

ساتھ کیا ضروری چیز رکھنا چاہتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... سیل فون۔ hand sanitizer اور lipgloss

پاکیزہ H..... اپنی شخصیت کو متاثر کن پرجشش بنانے کی تین ٹپس.....

یعنی جعفری H..... ہمیشہ بڑوں کی بات کو غور سے سنیں جو ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ یہی میں نے اب تک سیکھا ہے اور جیسے کہ آج کل ہر کوئی جلدی میں ہے تو اپنے آپ کو روک کر اپنے elders کو اپنی فیملی کو ٹائم دینا چاہیے۔ ایجوکیشن تو ظاہر ہے پہلی ترجیح ہونی چاہیے اور اگر آپ کر سکتے ہیں تو ٹریولنگ ضرور کریں دہائی جگہ، نئے لوگوں سے مل کر بہت کچھ آپ سیکھتے ہیں اور اب تو انٹرنیٹ کی سہولت ہے اس کے ذریعے آپ پوری دنیا دیکھ سکتے ہیں اور سیکھ سکتے ہیں اور اپنی شخصیت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

پاکیزہ H..... زندگی گزارنے کے لیے پیسے کی کیا اہمیت ہے؟

یعنی جعفری H..... زندگی گزارنے کے لیے پیسے کی اہمیت تو ہوتی ہے مگر ہر رشتے پر یا ہر جذبے پر پیسہ ترجیح نہیں ہونی چاہیے۔ یہ reality ہے مگر ایسا نہ ہو کہ آپ millionaire ہو کے بھی painful life اور miserable گزار رہے ہوں۔ ایک حد تک ضروری ہے۔

پاکیزہ H..... ان چار الفاظ کو اہمیت کے حساب سے ترتیب دیں۔

شہرت، دولت، عزت، محبت۔

یعنی جعفری H..... 1۔ محبت 2۔ عزت 3۔ دولت 4۔ شہرت

پاکیزہ H..... رشتے داری نبھانا کیسا لگتا ہے؟

کیا خاندانی تقریبات میں جاتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... بہت اچھا لگتا ہے سب فیملی ممبرز سے ملنا، تقریبات میں جانا۔ سب سے ملنا جلنا

وہ آئے بزم میں.....

اچھا لگتا ہے۔ سب کزنز سے بھی دوستی ہے۔ بچپن بھی ساتھ ساتھ گزرا اور blood relation کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ دوستوں کی اہمیت اپنی جگہ مگر آپ کی فیملی اور relatives آپ کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ کو دلی خوشی فیملی کے درمیان ہی رہ کر ملتی ہے۔

پاکیزہ H..... ذرا بتائیے کہ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا آیا..... مطلب دوست سے بڑھ کر کوئی.....؟

یعنی جعفری H..... (سوال کو تھوڑی دیر بعد سمجھ کر بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے بولیں) نہیں..... نہیں کوئی نہیں ملا بھی crushes وغیرہ تو ہوتے رہتے ہیں سب لڑکیوں کی طرح مگر جس سینس میں آپ پوچھ رہی ہیں وہ نہیں..... ہاں لوگ اچھے لگتے ہیں پسند بھی آتے ہیں مگر..... بس

پاکیزہ H..... لائف پارٹنر میں کیا خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں؟

یعنی جعفری H..... ایجوکیشن اور Strong career respect ful ہو اس میں generosity sense of humour بھی میری نظر میں کافی important ہے adventurous ہو، بہت زیادہ سو پر نہ ہو۔

پاکیزہ H..... اچھا یہ بتائیں ان خوبیوں والا لائف پارٹنر کب آپ کی زندگی میں شامل ہوگا؟

یعنی جعفری H..... یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو پتا ہوگا۔

پاکیزہ H..... شادی تو میرج ہو یا رائج؟

یعنی جعفری H..... سچ بتاؤں جب میں ذرا چھوٹی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ شادی تو صرف تو میرج ہی ہونی چاہیے اس کے علاوہ نہیں۔ اس وقت ظاہر ہے زیادہ سمجھ نہیں تھی مگر اب لگتا ہے ایسا بالکل ضروری نہیں۔ آپ جن پر trust کرتے ہیں ظاہر ہے وہ

267 جنوری 2013



پاکیزہ: گاڑی میں کس سگر کی
CD یا کیسٹ ہر وقت موجود رہتی ہے؟
صوفیانہ کلام سننا کس حد تک پسند ہے؟
عینی جعفری: کسی کی بھی نہیں
میں زیادہ ریڈیو سنتی ہوں۔ صوفیانہ کلام
بھی اچھا لگتا ہے۔ coke
studio میں صوفیانہ کلام سنتی ہوں پھر
عابدہ پروین، نصرت فتح علی، راحت فتح
علی خان اور بھی بہت سارے نام ہیں۔

پاکیزہ: آپ نے ہمیں بتایا
ہے کہ مطالعے سے آپ کو کافی دلچسپی ہے
کن رائٹرز کو پڑھا؟

عینی جعفری: ہر ٹاپک
پر تمام رائٹرز کی بکس پڑھتی ہوں، اب تو
مجھے اردو ناولز اور شارٹ اسٹوریز پڑھنے
کے لیے بھی کہا گیا ہے اردو پڑھنا تھوڑا
مشکل لگتا تھا مگر کافی کوشش کی ہے تو
بہتری آگئی ہے۔

پاکیزہ: علامہ اقبال کا کوئی شعر سنائیں؟
عینی جعفری:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں کہ پہ جو ڈالتے ہیں کند
وہی جہان ہے تیرا جو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

پاکیزہ: اچھا آپ جتنی کھانے کی شوقین
ہیں تو خود بھی کبھی بیکنگ یا کوئنگ کی ہم نے سنا ہے آپ کی
ماما دیسی، چائیز کا ٹی نیشنل سب بہت اچھا بناتی ہیں؟
عینی جعفری: وہ تو خیر بہت اچھا بناتی ہیں

مگر میں نے ابھی تک ایسا کچھ نہیں کیا لیکن مجھے اپنے
آپ پر پورا یقین ہے کہ جب موقع آیا تو میں کوئنگ کر
لوں گی۔ جیسے میری بہت ساری فرینڈز جو بالکل بھی
اس کا شوق نہیں رکھتی تھیں اب شادی کے بعد اتنی اچھی

پیار کرتے ہیں۔“
پاکیزہ: اپنے چاہنے والوں کے لیے کوئی
بات؟

عینی جعفری: شکریہ کہ مجھے پسند کر رہے
ہیں، میرا کام دیکھتے رہیں مجھے feedback دیں
اور اپنی زندگی میں بہتر سے بہتر کریں کہ آپ سب کچھ
کر سکتے ہیں۔

پاکیزہ: میوزک کیسا سننا پسند ہے؟ کوئی
پسندیدہ گانا؟

عینی جعفری: ہر قسم کا میوزک اچھا لگتا
ہے۔ لائٹ، پاپ، راک، انگلش یا اردو کوئی بھی ہو آج
کل تو میری بہن مایا کا ٹائٹل سونگ ہی میری زبان پر
ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گی کہ ابھی کسی دن میں اور
میری بہن مہرنے تین گھنٹے یہی سونگ گا گا کر اپنی چھوٹی
بہن سارہ کے کان پکا دیے۔

پاکیزہ: پسندیدہ گلوکار / موسیقار؟
عینی جعفری: کوئی ایک نہیں سب پسند

ہیں۔ ابھی صنم ماروی کو بھی سنا ہے اور قرۃ العین بلوچ
جس نے ہم سفر کا گیت گایا ہے وہ پسند آیا ہے۔ یہاں
تو بہت بینڈز ہیں، coke studio اچھا لگتا ہے
اس میں بہت سے اچھے سگرز آتے ہیں۔

پاکیزہ: ہمارے علم میں آیا ہے کہ آپ کی
خالہ عذرا محی الدین خود بھی بہت اچھی سگر ہیں خاص
طور پر گیت اور غزل گانے میں..... آپ ان سے متاثر
ہو کر گلوکاری کی طرف کیوں نہیں آئیں؟

عینی جعفری: ہاں وہ بے شک ہیں جبکہ
مجھے انہوں نے بھی اور دیگر لوگوں نے بھی کہا ہے کہ
تمہاری آواز بہت اچھی ہے، تم اسے waste نہیں
کرو اور بس تھوڑا سا ریاض کرنے کی ضرورت ہے اگر
میں ٹریننگ کر لوں تو اچھا گاسکتی ہوں ویسے ابھی وقت
ہے کرنا چاہیے ورنہ تو وقت نکل جائے گا۔ اس فیلڈ
میں جتنا ریاض ہو، شوق ہو، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

لوگ آپ کے لیے اچھا ہی سوچیں گے تو صرف لو
میرج تو بالکل نہیں ضروری..... ہاں تھوڑی بہت انڈر
اسٹینڈنگ ایک آدھ میٹنگ کے بعد ہو سکتی ہے۔ ہم
دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کسی ایک کو بھی مکمل کامیاب یا
نا کام نہیں کہہ سکتے دونوں ہی میرج ہو یا رنچ چلتی
بھی ہیں اور نہیں بھی..... رنچ میرج میں فیملی سپورٹ
بہت ہوتی ہے اور کبھی تو میرج بھی بہت کامیاب ہوتی
ہے۔

پاکیزہ: اپنی موجودہ زندگی سے کس حد
تک مطمئن ہیں؟

عینی جعفری: یہ سمجھ لیں کہ اپنی لائف میں
ابھی بہت کچھ achieve کرنا ہے..... کہہ سکتے
ہیں کہ ابھی journey میں ہوں total
satisfaction تک جانا ہے۔

پاکیزہ: اپنے پیاروں سے اظہار محبت
کیسے کرتی ہیں؟

عینی جعفری: میری excitement
سے، میرے attitude سے اظہار ہو جاتا ہے۔
میں اتنا گفٹ وغیرہ سے اظہار نہیں کرتی۔ میرے
emotions میرے behaviour سے پتا
چل جاتے ہیں۔

پاکیزہ: آپ کی رائے love اور
romance کے بارے میں کیا ہے؟

عینی جعفری: john lennon کے
مطابق۔ ”It matters not who you
love, where you love, why
you love, when you love or
how you love, it matters only
that you love“

”یہ اہم بات نہیں ہے کہ آپ کس سے پیار کرتے
ہیں، کہاں کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں، کب کرتے
ہیں اور کیسے کرتے ہیں صرف یہ ضروری ہے کہ آپ

کوئنگ وغیرہ کرتی ہیں شاید میں بھی کر لوں جب
ضرورت پڑے گی تو.....

پاکیزہ: کھیلوں سے کتنی دلچسپی ہے ان
ڈوریا آؤٹ ڈور..... پسندیدہ کھیل، کھلاڑی؟

عینی جعفری: ہاں بورڈ گیمز بھی،
اسپورٹس میں مجھے کرکٹ اور فٹ بال دیکھنا بہت اچھا
لگتا ہے اور Ice skating بہت پسند ہے
swimming دیکھنا اور کرنا بھی اچھا لگتا ہے، فٹ
بال پلیئر رونالڈو۔

پاکیزہ: اللہ تعالیٰ سے کتنی دوستی ہے؟
عینی جعفری: بالکل جی..... بہت زیادہ.....

میں پوری پوری باتیں کرتی ہوں اللہ تعالیٰ سے اور جیسے انسان
کی سائنڈ نیچر ہوتی ہے ناں کہ یہ کرنا ہے تو یوں سمجھ لیں کچھ بھی
ہو جائے میری لائف میں تو اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ہوں کہ
کیوں ہوا، ایسا کیوں ہے اور کچھ اچھا ہو جائے تو پروردگار کا
فورا شکر ادا کرتی ہوں۔ ٹھیک یو اللہ تعالیٰ بس یہ سمجھ لیں کہ



بیاد علامہ محمد اقبال بین المدارس مقابلہ تحت اللفظ

شہناز

خاص تشریف لائے۔ مقابلہ تحت اللفظ کے منصفین میں محترمہ نشاط نقوی اور محترمہ مسز محمد علی شامل تھیں۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جہاں میزبان اسکول کے حافظ عبد المتین نے تلاوت کلام پاک سے دلوں کو منور کیا وہیں رانیل بجارانی نے نعت رسول مقبول سے سماں باندھ دیا۔ میزبان اسکول کی پرنسپل محترمہ اسما صدیق صاحبہ نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے انہیں نوجوان نسل کے لیے متشعل راہ قرار دیا۔ طلبہ نے نہایت دلکش انداز میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی نظمیں پڑھیں۔ تقریب میں شامل ہر شخص طلبہ کے پُر اعتماد لہجے اور خوب صورت انداز

مورخہ 15 نومبر 2012ء کو ڈی اے ماڈل ہائی اسکول بیچ ویو کراچی میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی ۱۳۵ ویں سالگرہ کی خوشی میں ”بین المدارس مقابلہ تحت اللفظ“ کا انعقاد کیا گیا۔ اس خوب صورت تقریب کی مہمان خصوصی ماہنامہ پاکیزہ ڈائجسٹ کی ایڈیٹر محترمہ انجم انصار صاحبہ تھیں۔ مقابلے میں ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے تحت چلنے والے تمام اسکولوں کے طلبہ نے حصہ لیا۔ طلبہ کی درجہ بندی اس طرح کی گئی تھی کہ پہلے درجے میں جماعت دوم اور سوم کے طلبہ کو رکھا گیا جبکہ دوسرے درجے میں جماعت چہارم اور پنجم کے طلبہ شریک ہوئے۔ ڈی ایچ اے ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ کے ایڈیشنل ڈائریکٹر کرل (ریٹائرڈ) مروت حسین بطور

مامادونوں کا اثر ہے۔
پاکیزہ..... کس قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟
پہلی ملاقات میں کیا دیکھتی ہیں؟
یعنی جعفری..... دوسروں کی عزت کرنے والے ہوں۔ down to earth ہوں، بہت زیادہ اکڑو اور روڈ لوگ پسند نہیں، لائٹ موڈ ہوں over all ہی شخصیت کا جائزہ لیتی ہوں۔
پاکیزہ..... اپنی شخصیت کو مختصراً کس طرح بیان کریں گی؟

یعنی جعفری..... میں ایک پُر اعتماد، صاف گو، ہلکا گلا پسند کرنے والی خالصتاً ایک پاکستانی لڑکی ہوں اور میں ایک مکمل Gemini ہوں جیسا کہ پہلے بھی بتا چکی ہوں موڈ کے حساب سے کبھی extrovert اور کبھی کبھی ارد گرد سے بے نیاز ہو کر اپنے خول میں بند۔
پاکیزہ..... یعنی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے مصروف شیڈول سے وقت نکالا۔ آپ سے مل کر اور آپ کے خیالات جان کر بہت اچھا لگا۔
یعنی جعفری..... مجھے بھی اچھا لگا اور تمام پڑھنے والوں کے لیے میری طرف سے ڈھیر ساری دعائیں۔

جی پُر ذوق قارئین! امید ہے یعنی جعفری سے...
بھرپور ملاقات آپ کو پسند آئی ہوگی۔ اگلی مرتبہ کسی اور ہر دلعزیز ہستی کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اس سلسلے میں آپ کی فرمائشوں کا بھی پورا خیال رکھا جائے گا۔ اب اجازت دیجیے اس بات کے ساتھ کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیے، آپ کی قیمتی آرا کا انتظار رہے گا۔
خدا حافظ!

جنوں کے راستے یوں تو کنھن سے لگتے ہیں مگر یہ راستے منزل تک نکلتے ہیں زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

میں اللہ کو ہر وقت یاد رکھتی ہوں۔
پاکیزہ..... اپنے ملک کی ترقی کے لیے کیا کچھ سوچتی رہتی ہیں؟

یعنی جعفری..... سب سے پہلے تو ایجوکیشن لیول اُپرو ہو۔ ابھی بہت زیادہ ضرورت ہے اس کی اور کوئی ایسا آئے جو لانگ ٹرم میں ملکی خوش حالی اور ترقی کا سوچے اور اس ملک کی آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے بھی کام کرے اور کچھ ایسا ہو کہ ملک دشمن عناصر کی سرگرمیاں ختم ہوں، غیر ملکی قرضوں سے نجات ملے اور پاکستان کے اپنے resources جو قدرت نے ہمیں وافر عطا کیے ہوئے ہیں ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے جیسے solar power oil, gas, minerals وغیرہ

پاکیزہ..... سیاست میں کس حد تک دلچسپی ہے، نیوز چینلوں دیکھتی ہیں۔ نیشنل یا انٹرنیشنل کون سا لیڈر پسند ہے؟

یعنی جعفری..... اب کچھ حد تک دیکھتی ہوں۔ پہلے تو مجھے کچھ نہیں پتا ہوتا تھا اور لیڈر تو کوئی خاص نہیں۔
پاکیزہ..... ابھی تو خیر آپ خود کافی یکم ہیں مگر کیا نئے آنے والوں کے لیے اداکاری کا کوئی انسٹی ٹیوٹ کھولنے کا ارادہ ہے؟

یعنی جعفری..... ہاں ہونا تو چاہیے، جیسے باہر agents ہوتے ہیں۔ پوری پوری managements ہوتی ہیں چلیں وہ تو خیر بڑے لیول کی بات ہے مگر یہاں بھی ایسا ہونا چاہیے ویسے ٹریننگ کے لیے بھی، اب یہاں کام ہو رہا ہے اور ہونا چاہیے۔

پاکیزہ..... آپ کی شخصیت پر والدین میں سے کس کا اثر زیادہ ہے؟
یعنی جعفری..... ویسے میرے جاننے والے تو یہی کہتے ہیں کہ بالکل تم اپنی ماما ہو، شکل سے بھی عادتوں سے بھی۔ ویسے میری شخصیت پر میرے بابا اور



بہنوں کی محفل

مدت

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ
☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر
جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

لیجیے نیا عیسوی سال بھی شروع ہونے کو ہے۔ ہم بفضلِ خدا 2013ء میں داخل ہو رہے ہیں۔ زندگی کا نیا دائرہ شروع
ہونے کو ہے کہ وقت آگے بڑھ رہا ہے، آگے اور آگے۔

وقت کی یہ خوبی ہے کہ کسی صورت رکنا نہیں ہے اس لیے ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے مگر ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہم وقت
ضائع کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں کبھی رو کر کبھی سو کر۔ ہم خوب وقت برباد کرتے ہیں۔ عزیز بہنو! وقت
کی قدر کیجیے یہ کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ تو آئیں آج اپنے آپ سے یہ وعدہ کریں کہ کبھی وقت کا زیاں نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنی
ذات سے کسی کو کوئی دکھ پہنچائیں گے..... ٹھیک ہے ناں!

اللہ کے کرم سے عکس ناول اپنے اختتام کو پہنچا اور ہمارے قارئین نے اسے پسندیدگی کی سند دی۔ اس ماہ میرے پاس اس
قدر فون آئے ہیں کہ میں تعداد نہیں بتا سکتی۔ اسی طرح ڈاک کا بھی یہ عالم ہے کہ ہر خط عکس کی تحریقوں سے بھرا ہوا ہے۔ عمیرہ احمد
ہماری مایہ ناز مصنفہ ہیں اور وہ بہت جلد دوسرا ناول لے کر آئیں گی۔ بس تھوڑا سا انتظار کر لیں۔ اس ماہ سے ہم اپنی بے حد پیاری
مصنفہ رفعت سراج کے نئے ناول امانت کی پہلی قسط شائع کر رہے ہیں یقیناً یہ ناول آپ کو بہت پسند آئے گا۔ رفعت سراج بھی
ہماری بڑی خوب صورت لکھاری ہیں اور لفظوں کو کلیوں کی طرح گوندھنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ یہ نیا ناول آپ کو کیسا لگا،
آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ عزیز بہنو! پاکیزہ میں خط لکھنے کے لیے ہمارا ایڈریس نوٹ کر لیجیے۔ آپ کسی بھی سلسلے میں شامل
ہونے کے لیے خط لکھیں۔ ایڈریس ایک ہی رہے گا وہ یہ ہے مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ C-63 فیز III ٹیکس ٹینشن۔ ڈیفنس کمرشل ایریا،
مین کورنگی روڈ، کراچی۔

اور اب آئیں اپنے کھٹے میٹھے چٹارے دار خطوط پڑھنے سے پہلے درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔
اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے
ضرور دعا کریں (ابھی پڑھ لیجیے)

لا الہ الا انت سبحانک انی كنت من الظالمین

پہلے سرگرمیوں پر ایک نظر۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ معاشرے میں قلم کی امانت کو عبادت و دیانت کے رشتے میں جوڑنے کا عزم لیے ویمن رائٹرز فورم کراچی کے
زیر اہتمام چوتھا سالانہ رائٹرز کنونشن منعقد کیا گیا۔ جس کے مذاکرے کیا تحریر بذریعہ انقلاب ہے میں شرکت کرنے والوں
کے نام مصنفہ عطیہ عمر، ڈاکٹر عزیزہ انجم، حمیرہ قریشی اور صائمہ اسامیہ۔ رائٹرز فورم پاکستان کی صدر فرحت طاہر نے
جن رائٹرز کو انعامات دیے ان کے نام یہ ہیں۔ آسیہ بنت الاسلام، حلیمہ عثمان، اسرہ غوری، نصرت یوسف، راحمہ
خان، طلعت نفیس، شمیم فاطمہ، آمنہ رحمت، حمیرہ خالد، نگہت یاسمین، ڈاکٹر سلیم سلطانی، فرح نعیم۔ اس
کنونشن میں خواتین کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ میں اپنی مصروفیات کے باعث اس میں بطور
مہمان اسپیکر شرکت نہیں کر سکی۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ سیما مناف کا نیا سیریل میں گناہ گار نہیں خوب دھوم دھام سے شروع ہو گیا ہے۔ (مبارک!)

سماں پاکستان 273 جنوری 2013



دائیں سے اسکول ٹیچرز۔ پرنسپل اسما صدیق اور انجم انصار

بیاں پر جھومے اور داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مقابلے
کے دوران اسکول ہذا کے طلبہ نے کلام اقبال کا کر
حاضرین کے دل موہ لیے۔ پروگرام کے آخر میں
مہمان خصوصی محترمہ انجم انصار صاحبہ نے اپنے
خطاب میں علامہ محمد اقبال کو زبردست خراج تحسین
پیش کیا۔



دائیں سے ڈائریکٹر (کرنل) مروت حسین پرنسپل اسما صدیق اور مہمان خصوصی انجم انصار

سماں پاکستان 272 جنوری 2013

انتقالِ مُرملال

☆ ہماری مصنفہ سلمیٰ غزل کراچی کے بھائی بدیع الزمان خان انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار جمین ہاشمی، بھیرہ کے کزن ضمیر شاہ سعودی عرب میں انتقال کر گئے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ذکیہ ایوب کی بہن یا سمین، لاہور میں انتقال کر گئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے ایک بار سورۃ فاتحہ اور تین بار سورۃ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے ساتھ یہ دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین..... ثم آمین۔

کچھ ماہ پارہ نسیم، کراچی سے۔ ”پتیل کا پیالہ سب سے خوب صورت افسانہ رہا۔ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عکس کی آخری قسط نے جی خوش کر دیا، بہترین لگی اور میری جان رفعت سراج کا انٹرویو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ جوانی کی رفعت سراج اور تین بچوں والی رفعت سراج کی تصاویر میں بہت فرق محسوس ہوا۔ رفعت لگتا ہے تم کھانا بہت اچھا پکائی ہوگی۔ جب ہی تو تمہارے میاں بھاری بھر کم نظر آئے۔ رفعت تمہاری باتیں مجھے بہت اچھی لگیں کہ تم جو اچھی لگتی ہو۔ شیریں حیدر نے بھی کمال کی تحریر دی ہے اور جلتنگ پڑھ کر تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ کیسے نئے آئیڈیاز دیے ہیں تم نے۔ میری بہن رضوانہ بھی تمہاری تحریروں کی فین ہے۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ اور رضوانہ سے کہنا کہ وہ اپنی رائے مجھے ارسال کرے)

کچھ سیمنا مناف، کراچی سے۔ ”شدید مصروفیات کے باعث بھی پاکیزہ پڑھے بنا نہیں رہ سکتی۔ عکس کی آخری قسط لا جواب رہی۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا اور رفعت سراج تمہارا انٹرویو تو کئی بار پڑھا وہ بھی تصویریں بھی بہت اچھی ہیں مگر مزید ہونی چاہیے تھیں۔ تمہاری لمبے بالوں والی تصویر تو ہے ہی نہیں۔ دیگر تحریریں ٹھوڑی ٹھوڑی دیکھیں مگر بہنوں کی محفل پوری پڑھی کہ اس کے توسط سے بھی تو سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس لیے پیاری بہن خوش رہیں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“ (سیمنا، تم بھی خوش و خرم اور صحت مند رہو اور نیوی سے فرصت ملے تو افسانے بھی لکھ لیا کرو)

کچھ عذرا بیگ، لاہور سے۔ ”رضیہ بٹ اور حاجرہ مسرور کے انتقال کی خبر پڑھ کر دکھ ہوا۔ آپ ان کے خاندان کے اراکین اور ان کے چاہنے والوں تک میری تعزیت پہنچا دیں۔ میں نے ان کی تحریریں پڑھ کر لکھنا شروع کیا تھا۔ خاص طور پر میں رضیہ بٹ کے ناول بے حد شوق سے پڑھا کرتی تھی اور ان کے ڈرامے جب ریڈیو پر آتے تھے وہ سن کر رویا بھی کرتی تھی۔ اردو ادب کے دو بڑے ستارے غروب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔“ (آمین)

کچھ نگہت پروین، کراچی۔ ”پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اس ماہ عکس کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ آخری قسط بہترین رہی۔“ (نوازش)

کچھ فوزیہ خان، جدہ سے۔ ”میں پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔ انجم آپ پاکیزہ کے توسط سے بہت سوشل سروس کر رہی ہیں۔ خاص طور پر مجھے آپ کا سمجھانا بے حد پسند آتا ہے۔ جوان لڑکیوں کے بہت سے مسائل ہوتے ہیں اور عمیرہ احمد نے بہت خوب صورت انداز میں ناول لکھا ہے۔ لڑکیوں کا حوصلہ بڑھایا ہے، مشکل وقت کا سامنا کرنا سکھایا ہے۔ انہیں مضبوط بنایا ہے۔ اس ناول کا نسیم بے حد اسٹرونگ اور خوب صورت رہا ہے اور یہ پہلی قسط سے اسے اختتام تک بے حد خوب صورتی سے چلا ہے۔ میری مبارک باد آپ عمیرہ احمد تک پہنچا دیں۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ، عمیرہ احمد بھی شکریہ کہتی ہیں)

کچھ یاسمین رشید، کراچی سے۔ ”میں تو عرصہ دراز سے عمیرہ احمد کی تحریروں کی فین ہوں۔ یہ ناول بھی بہت شاندار رہا۔ آخری قسط اور آخری سین نے تو کمال کر دیا۔ عکس جیسی لڑکیاں ہمارے معاشرے میں نظر نہیں آتیں مگر اب آنی چاہئیں۔ اس ناول نے قربانی کا درس دیا ہے جو بہت اچھا ہے بہت ہی اچھا۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ)

کچھ فریدہ اشفاق، کراچی سے۔ ”ایک عرصے بعد جلتنگ میں بہت روانی اور آمد محسوس ہوئی۔ محاروں کے محل استعمال نے اسے بہت خوب صورت بنادیا۔ ظاہر ہے کہ کرداروں کو لے کر چلنا تو انجم انصار کے قلم کا کھیل ہے۔ رفعت سراج کا انٹرویو اچھا لگا مگر انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی بہت مختصراً انداز میں بیان کی ہے۔ ناہیدہ سلطانہ اختر بہت اچھا لکھ رہی ہیں مگر اس مرتبہ شاید روانی میں غالب کے شعر میں کچھ بوجھ ہو گیا ہے۔ عکس کا انجام بہت تیزی کے ساتھ ہوا مگر اچھا لگا۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ)

کچھ سمیرا حمید فاروقی، کراچی سے۔ ”اس ماہ کا ناپ آف وی لسٹ افسانہ شیریں حیدر کا رہا۔ بہترین لکھا، پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ناہیدہ سلطانہ اختر بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ معذرت کے ساتھ قصہ حیات کا ناول مجھے پسند نہیں آ رہا، پسند تو مجھے گزشتہ ماہ ام مریم کا ناولٹ

☆ ہماری پیاری مصنفہ ریخ چوہدری کی بہن ریحانہ نصیر کا بہت جلد نکاح ہو رہا ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری قرۃ العین عبداللہ، کراچی کے ہاں تین بیٹوں کے بعد بیٹی ہوئی ہے۔ جس کا نام نور عائشہ رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی پرانی تبصرہ نگار پروین قاسم کے ہاں نواسی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ اسلام آباد میں مقیم میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سہیل انصار کا پروموشن ہو گیا ہے۔ اب وہ گریڈ 20 میں آ گئے ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ ہماری مستقل تبصرہ نگار ڈاکٹر ممتاز ضیا کی بھانجی کاشفہ کی شادی گزشتہ دنوں عزیز زیدی انتخاب کے ساتھ ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ شہلا خاں، ایبٹ آباد ج کی سعادت حاصل کر کے آ گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ ناہیدہ بنت نور، واہ سینٹ ورکس کے ہاں بیٹی ہوئی ہے جس کا نام عرقہ مقبول رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ آپ سب کی دعاؤں کے طفیل ہماری شاعرہ اور تبصرہ نگار شگفتہ شفیق کی طبیعت اب بہتر ہونا شروع ہو گئی ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ ہماری مستقل تبصرہ نگار رخسانہ امجد، ملکووال اسپتال سے اب گھر آ گئی ہیں اور ان کی طبیعت بھی ٹھیک ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ ہماری افسانہ و ناول نگار عذرا بیگ، لاہور کی طبیعت بھی اب بالکل ٹھیک ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ اس ماہ ہماری مصنفہ عقیلہ حق کے حوالے سے کئی پیاری خبریں ہیں۔ پہلی یہ کہ ان کی نو سالہ بیٹی کائنات حق نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہے اور وہ آل کراچی فہم القرآن کے مقابلے کے لیے بھی منتخب ہوئی ہے۔ دوسری خبر یہ کہ ان کا بیٹا اور بیٹی وجیہ حق اور کائنات حق پاکستان ٹیلی ویژن سے شروع ہونے والے بچوں کے پروگرام چلڈرن انسائیکلو پیڈیا کے میزبان منتخب ہو گئے ہیں اور تیسری خبر یہ کہ وہ دبیر کی چھٹیوں میں بچوں کے ساتھ ملک سے باہر جا رہی ہیں۔ (مبارک باد مگر شادی کی سالگرہ کی دعوت نمٹا کر جانا) عقیلہ حق کی شادی کی سالگرہ تو نومبر میں ہوتی ہے مگر وہ دبیر یا جنوری میں تقریب کریں گی۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ ہماری پیاری شاعرہ اور پاکیزہ کی بے حد پرانی تبصرہ نگار شمسہ الماس اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ ان دنوں ناروے سے پاکستان آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ ہماری پیاری مصنفہ، شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا ایک پیارے سے بیٹے کی ماما بن گئی ہیں۔ بچے کا نام مصطفیٰ فیصل رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ امریکا میں مقیم پاکیزہ کی مستقل قاری نگہت خان زادہ کی طبیعت اب کافی بہتر ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ دبیر اور جنوری میں ہماری ان بہنوں کی سالگرہ ہے۔ (بے حد مبارک باد)

☆ میری بھوسیدہ آرزو نسیم کی شادی کی سالگرہ اور بیٹی عظمیٰ آفاق کی بھی دبیر میں ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار پروین وحید کی سالگرہ ہے۔

☆ سبین فیصل کی شادی کی سالگرہ ہے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار جمین ہاشمی کی سالگرہ ہے دبیر میں۔

☆ مصنفہ سہیل ملک، لاہور کی سالگرہ ہے دبیر میں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار صبا نور، لہ آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری نعمہ، بلوچن آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صفیہ بیگم، لالہ موی آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔

☆ 11 جنوری کو نسیم مجید کی شادی کی گیارہویں سالگرہ ہے مور میں۔ (مبارک باد)

☆ ضادق آباد کے گھرانے میں سمیرا مجاہد، احمر مجاہد اور شاہ رخ مجاہد کی سالگرہاں ہیں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار شمینہ وحید کی تینوں تندوں صائمہ، شازیہ اور منیرہ کی سالگرہاں ہیں۔

قادری کی فیصلے کی صلیب بہت سی آنکھیں کھولنے کی بہترین کوشش ہے۔ مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ زندگی میں حجاب کو کورٹ میں جو کچھ سنے کو ملا خدا کسی دشمن کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا نہ کرے۔ صائمہ اکرم کا پہلی بارش بہت اچھا تھا۔ ہلکا پھلکا انداز ان کا زیادہ پسند آتا ہے۔ شیریں حیدر کا میرا پیارا موتی واقعی بہت پیارا تھا۔ شوکت رانا الطاف کی تحریر دل کو ہلانے والی تھی، مبارک باد۔ عالیہ جیسی بیٹیوں کو سلام مگر سسرال والوں کو کچھ تو سزا ملتی۔ شیخ خانم کی بھی بس ٹھیک تحریر تھی۔ رفعت سراج کا انٹرویو اچھا لگا۔ رفعت کی ایک تصویر جس میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ سمندر کے کنارے کھڑی ہیں وہ سلطانہ مہر سے بہت مل رہی ہیں۔ رفعت کی باتوں میں صرف سنجیدگی نمایاں تھی جبکہ ان کے ناولوں میں ہر طرح کی ورائٹی ہوتی ہے۔ بہنوں کی محفل پاکیزہ کا ڈرائنگ روم ہے جس میں ہر بہن اپنے آپ کو خاص مہمان سمجھتی ہے کیونکہ میزبان بھی تو خاص ہے۔ جلتنگ میں وارداتیں میں کھانے کا نقشہ پڑھ کر دکھ بھی ہوا۔ پاکیزہ ڈائری میں فرح امجد کا ہم تم کو بھول گئے بہت پسند آیا ہے۔ عظمیٰ کا افسانہ کب آ رہا ہے؟ (تبصرے کا شکریہ)

کچھ مائرہ کپور، شکلیہ یا سکین، چکوال سے۔ ”پاکیزہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ ہمارے بھائی علی رضا کو بھی یہ ڈائجسٹ بہت پسند ہے۔ ہم پورے ماہ اسی کو پڑھتے رہتے ہیں۔ سب سے اچھا سلسلہ شاعری کا ہے، اس میں خوب مزے کے شعر پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ بہنوں کی محفل بہت اچھی لگتی ہے۔ اس میں شریک سب بہنوں کو ہمارا سلام پہنچا دیں۔ میرا اور میری بہن کا پسندیدہ ناول عکس ہے۔ اس کی بے حد تعریف۔“ (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف اور سلام پہنچایا جا رہا ہے)

کچھ مدحت، لاہور سے۔ ”باجی پاکیزہ پڑھ کر اور آپ سے بات کر کے بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ آپ سے ہم دور رہتے ہیں۔ ناول عکس کی آخری قسط پڑھی ہے، بہت لطف آیا ہے۔ میری ڈیڑھ ساری مبارک باد پہنچا دیں۔“ (آپ کی مبارک باد پہنچائی جا رہی ہے)

کچھ رخسانہ امجد، ملکوال سے۔ ”میں پاکیزہ سے ایسی محبت کرنے والی ہوں آپریشن کے بعد اسپتال سے آئی تو آتے ہی پاکیزہ دیکھا اور اس کی سطر سطر پڑھ کر ایک خوشی سی اندر اتر آئی۔ بہنوں کی محفل میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اس کے صفحات کم نہیں ہونے چاہئیں میں تو بار بار پڑھتی ہوں اور ایسا لگتا ہے کہ سب سے ملاقات ہو گئی ہو۔ باجی میں گئی کہہ رہی ہوں کراچی آ کر آپ سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوتی ہے اور آپ نے اپنی کتاب کا جو مجھے تحفہ دیا تھا وہ میں نے سنبھال کر رکھا ہے اور روزانہ اسے دیکھتی ہوں، پڑھتی ہوں۔“ (پیاری رخسانہ مجھے بھی تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی)

کچھ مسز رابعہ وقار، راول پنڈی سے۔ ”عمیرہ احمد کا ناول عکس بہترین انجام کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ ان کے ناول پڑھ کر لڑکیاں، خواتین بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ ان کے ناول زندگی کے تجربات سکھاتے ہیں۔ ویل ڈن بے حد خوب صورت بے حد یونیک انجام ہوا۔ میری مبارک باد قبول کریں۔“ (عمیرہ احمد شکریہ کہہ رہی ہیں)

کچھ نرہت اشفاق، کراچی سے۔ ”میں کوشش کرتی ہوں کہ ہر ماہ اپنا تبصرہ بھیجوں مگر بعض مرتبہ دیر ہو جاتی ہے۔ نومبر کے شمارے میں ام مریم کا ناول مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے پہلے بھی آپ کو یہ مشورہ دیا تھا نئی رائٹرز کی تحریریں کم سے کم لگایا کریں۔ دبیر کا ناول اچھا ہے۔ عکس اچھا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کے ناول کی قسط اچھی ہے۔ اسما قادری نے اچھا لکھا ہے۔ شیریں حیدر نے تو کمال ہی کر دیا۔ خوب صورت ترین افسانہ ہے۔ شوکت رانا الطاف کا ناول اوسط درجے کا رہا۔ صباح یوسف، شیخ خانم اور عقیدہ حق کے افسانے بس ٹھیک ہی رہے۔“ (ام مریم، ہماری نئی مصنفہ ہیں۔ ہم نے انہیں سمجھایا بھی ہے کہ آئندہ بولڈ موضوعات پر لکھنے کے بجائے معاشرتی موضوعات پر قلم اٹھائیں۔ آپ کی طرح ہماری تبصرہ نگار بہنوں کو بھی ان کا انداز تحریر پسند نہیں آیا ہے مگر ام مریم نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اس بات کا خاص خیال رکھیں گی اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اپنی نئی مصنفات کو موقع بھی دینا چاہیے اور انہیں سمجھانا بھی چاہیے۔ ہم تو ابھی سیکھنے کے عمل سے گزر رہے ہیں تو یہ نئی مصنفات بھی یقیناً ضرور سیکھیں گی اور آئندہ بہت اچھا لکھیں گی)

کچھ فرحت احمد، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کے معیار کا گراف ماشاء اللہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس دفعہ پورا رسالہ ہی بہت اچھا لگا۔ کوئی افسانہ بھی ہلکا نہیں لگا۔ عکس اور زندگی کے تو کیا کہنے۔ عکس کی آخری قسط پڑھ کر خوشی کے ساتھ ایک عجیب سا افسوس ہوا کہ اب رسالے کے انتظار کی بہت سی وجوہات میں سے ایک ختم ہونے جا رہی ہے۔ ہم تو بہنوں کی محفل اور اپنے پسندیدہ سلسلوں اور جلتنگ کا بھی اسی شدت سے انتظار کرتے ہیں اور یہ بھی ہمیں اتنے ہی اچھے لگتے ہیں جتنے ناول اور افسانے۔ ایک مرتبہ کہیں بات ہو رہی تھی تو میں نے بہنوں کی محفل کے بارے میں کچھ کہا اور ایک رسالہ پڑھنے والی دوست نے بڑی حسرت

بھی نہیں آیا تھا مگر اس ماہ خطوط کی محفل میں خاصا پسند کیا گیا ہے۔ صائمہ اکرم ہمیشہ اچھا نہیں لکھتی ہیں مگر اس مرتبہ انہوں نے بہت اچھا لکھا ہے۔ عمیرہ احمد کے ناول کا اختتام اچھا رہا۔ رفعت سراج کی تحریریں ہمیں بہت پسند ہیں مگر انٹرویو میں لکھی سی رہی یا شاید مجھے مزید جاننے کی خواہش تھی۔ باقی سب تحریریں کوئی خاص نہیں لگیں۔“ (پیاری سمیرا ہر قاری کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے۔ کسی کو کچھ پسند آتا ہے تو دوسرے کو کچھ اور..... اور ہمیں سب کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ رہی بات رفعت سراج کے انٹرویو کی تو وہ بے خوف و خطر بولنے والی خاتون ہیں اور انہوں نے ہر سوال کا جواب بڑی عمدگی سے اور بھرپور دیا ہے)

کچھ مسرت رانی، حیدر آباد، کراچی سے۔ ”رفعت سراج کا انٹرویو بہت پسند آیا مگر تصویریں بے حد کم تھیں۔ رفعت تو بالکل نازک سی لڑکی ہیں لگتا ہی نہیں ماشاء اللہ تین بچوں کی ماں ہیں۔ وہ تو ان کی بہن لگ رہی ہیں مگر انٹرویو میں انہیں اپنی ہم عصر رائٹرز اور سہیلیوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا پھر بھی پڑھ کر بہت پسند آیا۔ شوکت رانا الطاف، اسما قادری اور شیریں حیدر کے ناول و افسانے بہترین رہے۔ عمیرہ احمد نے تو کمال ہی کر دیا۔ بڑی ٹاپ کی قسط رہی۔ میری جانب سے انہیں مبارک باد پہنچا دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے، عمیرہ احمد شکریہ کہہ رہی ہیں)

کچھ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ”پچھلے شمارے حسب روایت مجموعی طور پر اچھے تھے۔ اللہ لفظ جفت الفاظ میں پڑھا جائے یا طاق میں اصل بات یہ ہے کہ بس اس اسم مبارک کا ورد ہونا چاہیے زیادہ سے زیادہ اور دیکھو تم نے بھی یہی کہا۔ عطیہ عمر، غزالہ رشید، مجتبیٰ اعظمی کی تحریریں بھی اچھی اور بامقصد تھیں۔ انجم تمہیں دل پر دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی اچھی تحریروں کے لیے درہل ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔ عقیدہ بہن آپ نے کیسے کہہ دیا کہ آپ کی تحریریں پڑھتی ہیں پاکیزہ کی ہر تحریر پڑھتی اور ان پر بامقصد تبصرہ بھی کرتی ہوں۔ اچھی نیت کے ساتھ۔ دبیر کے شمارے میں تم نے بہت اچھا پیغام دیا ہے۔ عکس بہت اچھی طرح اختتام پذیر ہوا۔ عمیرہ نے شہر یا نو کو عکس کی سوکن بنا کر مجھے تو خوش کر دیا، ہماری بہنیں جس طرح دوسری شادی (شوہر کی) پرری ایکٹ کرتی ہیں میں اسے صحیح نہیں سمجھتی، حالات کے مطابق رد عمل ہونا چاہیے اور ذہن و دل کشادہ رکھنے چاہئیں یہ میری رائے ہے آپ ناراض نہ ہوں اور ہاں اب عمیرہ احمد کا انٹرویو آنا چاہیے۔ قیصرہ حیات اچھا لکھ رہی ہیں مگر تو قیر کا کردار اچھا نہیں لگ رہا بہن کی دوست اگر پسند ہی آگئی ہے تو پروپوز کرنے کے بہتر طریقے بھی ہیں۔ مجھے منظور ہے عقیدہ کے اپنے انداز کی اچھی تحریر ہے اور فیصلے کی صلیب بھی بامقصد اچھی تحریر ہے۔ زندگی، زندگی کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کو اجاگر کر رہی ہے، نسیم پرترس آتا ہے۔ حجاب کے انجام سے خوف آ رہا ہے بہت بد طینت شخص سے بے جا رہی کا پالا پڑ گیا ہے۔ پہلی بارش گوارا لگی۔ شیریں حیدر بہت دلچسپ تحریر لائیں۔ ایک بہت تلخ حقیقت کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ شوکت رانا کی تحریر بہت دن بعد پڑھنے کو ملی۔ اچھی لگی۔ خازن عشق اچھی تحریر ہے اس میں ایک مثبت پیغام ہے اگر اس طرح کی سوچ ہو تو کافی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ نزہت اصغر کے لیے بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی بہانے بزم میں آئیں۔ رفعت سراج سے ملنا اور ان کے بارے میں جاننا بہت اچھا لگا اپنے پسندیدہ اور اچھے مصنفین کے بارے میں جاننا، ان کے حالات و خیالات سے آگاہی ایک دوسرے کو اور قریب لاتی ہے۔ یہ جان کر بہت اچھا لگا کہ اب ادیبوں کو اتنا اعزاز یہ ملنے لگا کہ وہ سترہ سال کی عمر سے خود مختار ہو جائیں، یہ ادیبوں کا حق ہے ہم روزگار سے نجات اچھی تخلیق کا باعث بنے گی۔ رفعت بہن اپنے مداحین کو دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک زندگی ہے ہر مل نئے موضوعات سامنے آتے رہیں گے۔ آپ کی شاعری بھی ٹھیک ہے مگر نثر کا مقابلہ نہیں۔ شائستہ زریں کا سروے اچھا ہے۔ نیلوفر عباسی کی کئی ان کہی کی تقریب تعارف اچھی لگی۔ نیلوفر پاکستان آرہی ہیں جان کر بہت اچھا لگا، ہو سکتا ہے ملاقات ہو جائے تو بہت ہی اچھا لگے گا۔ اب اپنی محفل میں آتے ہیں خدا کرے نیا سال ہم سب کے لیے اور تمام عالم اسلام کے لیے مبارک ثابت ہو، آمین۔ تمہارا پیغام سر آنکھوں پر انشاء اللہ اپنی برائیاں چھوڑنے کی کوشش کریں گے کامیابی کے ساتھ۔ شگفتہ کے لیے دلی دعائیں۔ جن بہنوں کو خوشیاں نصیب ہوئیں انہیں بہت مبارک۔ لکھی عروج، رضیہ بٹ اور حاجرہ مسرور کی وفات دکھ کا باعث بنی بہر حال اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہمیں اس نے لے لیں۔ عذرا کو ان کی کنجی پر شاباش ڈائری کے صفحات بھی بند کر دیے۔ پاکیزہ ڈائری اچھی ہے مگر عظمیٰ ہم تمہاری تحریر بھی پڑھنا چاہتے ہیں، وقت نکالو۔ جلتنگ کے دونوں خاکے بہت چٹخارے دار تھے دونوں میں کھانے پر دشمنوں کی طرح ٹوٹ پڑنے والوں کے لیے خاص طور پر، دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں۔“ (طویل تبصرے کا شکریہ)

کچھ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”عکس اختتام کو پہنچا۔ عکس کے حوصلے کی داد دیتی ہوں۔ انجام اچھا لگا۔ عکس کے دونوں بچوں کے نام پیارے لگے۔ عمیرہ کو اتنا اچھا ناول لکھنے پر اور آپ کو اتنا اچھا ناول چھاپنے پر مبارک باد۔ قیصرہ حیات کے ناول میں کئی کہانیاں ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ یعنی کو سمجھانے کا انداز بہت اچھا ہے۔ عقیدہ حق کے افسانے میں بھی فصاحت نظر آئی۔ اسما

ہوگا لیکن مجھے اعتراض ہے یہ دوزمانوں کی کہانی ہے اور اس وقت ریوٹ کہاں ہوتے تھے؟ شاہین رحمن کا شعر ٹھک سے جا کر دل پر لگا۔ روحانی مشورے بہت اثر انگیز ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے، آمین۔ سندیسے بھی اچھا سلسلہ ہے۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ اچھی سجاتی ہیں لیکن اس دفعہ صفحات ذرا کم گئے۔ آپ کا ادارہ یہ زبردست رہا اور بھنوں کی محفل میں آپ نے صحیح فرمایا کہ کم از کم ایک عادت تو ہم چھوڑ سکتے ہیں۔ اگر سب نے ایک، ایک بری عادت چھوڑ دی تو لاکھوں کروڑوں بری عادتیں ختم ہو جائیں گی۔ (اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے، آمین)

کچھ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ ”نیا قمری اور عیسوی سال مبارک ہو۔ اللہ کرے یہ سال سب کے لیے اچھا ہو اور ہمارے ملک کے حالات اچھے ہو جائیں۔ رفعت سراج کا انٹرویو اچھا لگا۔ انجم باجی سالانہ مہر شپ کر کے قسم سے ریسکون ہو گئی ہوں۔ صباح یوسف نے اچھے موضوع پر لکھا۔ ہر بندہ وقت آنے پر اس کیفیت سے گزر سکتا ہے۔ اللہ کسی کو آزمائش میں نہ ڈالے۔ شوکت رانا الطاف کی تحریر بہت عرصے بعد نظر آئی کہاں غائب تھیں۔ اچھا لگا ان کا ناول پڑھ کر۔ شیریں حیدر نے بہت اچھے موضوع پر لکھا۔ بعض رشتے کتنے نازک ہوتے ہیں اور ان میں ہی اگر کھوٹ ہو تو انسان کسی کو بتاتے ہوئے بھی کتنا کچا کچا سا لگتا ہے۔ قیصرہ حیات کا کہیں دیپ جلے کہیں دل اچھا جا رہا ہے۔ ہر رشتے میں توازن رکھا جائے تو دوسرے کی حق تلفی نہیں ہوتی۔ حاجرہ مسرور کے انتقال کی خبر پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور مرحوم کے لواحقین کو صبر دے، آمین۔“ (تبصرے کا شکریہ)

کچھ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اس بار دسمبر کا پاکیزہ یعنی سال 2012ء کا آخری شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ پچھلے ماہ کے سرورق کی طرح اس بار ماڈل نے سر پر حجاب کیا ہوا تھا کیا ہی اچھا ہو کہ پاکیزہ کے ہر سرورق پر اسی طرح حجاب والی ماڈل کی تصویر ہو۔ عکس کی آخری قسط عمیرہ احمد کے قلم کا نچوڑ تھی۔ اس کہانی کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ایڈیٹر سے بھرپور عکس نے کمال کر دیا ہے۔ عمیرہ احمد سے گزارش ہے کہ آئندہ بھی پاکیزہ کے لیے اسی طرح کا ناول شروع کریں۔ میرا سندیہ، شعر اور خط شائع فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔“ (یہ آپ کا اپنا ہنامند ہے۔ آپ اپنے مراسلات محبت سے ارسال کریں)

کچھ جبین ہاشمی، بھیرہ سے۔ ”پاکیزہ ڈائری میں ذوالنورین، انجم حنیف، امینہ عندلیب، نسیم کامران کے مراسلات پسند آئے۔ فریدہ خانم لاہور کی غزل اچھی لگی۔ جہلم سے کرن جہانگیر کا انتخاب بھی زبردست ہے اور ڈگری کالج لاہور کی پرنسپل صاحبہ فرح زبیا کی کیا ہی بات ہے۔ زبیا جی آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ سلسلے وار ناول میں عکس اور زندگی اچھے موز پر ہیں۔ ذکیہ خلیل کا ناول خواب، حقیقت اور سراب دل کو لگا۔ ناولٹ، افسانے سب اپنی مثال آپ ہیں اور آپ جی آپ کا خصوصی مضمون دل غم سے بوجھل ہے زبردست تحریر ہے۔ آپ تو میرے دل میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ خدا آپ کو زندگی کے ہر مقام پر کامیابیوں سے نوازے، آمین۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

کچھ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ ”رُمت بدل گئی ہے اور لاہور میں کافی سردی ہے۔ اللہ کرے کراچی میں امن قائم ہو۔ نیا سال سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ پاکیزہ پڑھتے ہوئے مدتیں گزر گئی ہیں یہ برسوں کی عادت ہے۔“ (اچھی عادت بدلنی بھی نہیں چاہیے۔ نیا سال سب کا پر امن اور پُر محبت گزرے، آمین)

کچھ فریدہ افتخار امریکا سے۔ ”میں بارہویں منزل سے سامنے نیویارک کے خوب صورت منظر سے محفوظ ہو رہی ہوں۔ سامنے دریائے ہڈن ہے۔ دن رات موٹر بوٹ چلتی ہیں رات کو یہ منظر الف لیلوی داستان کی طرح لگتا ہے۔ بیٹا بہو بے حد خیال رکھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ اچھا وقت گزرے گا۔ ورجینیا میں دو عدد بھانجیاں رہتی ہیں۔ ان کی طرف بھی جانے کا ارادہ ہے۔ وہی میں ایک ماہ رہی تو اسوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ مزے مزے کے کھانے بنانا کران کو کھلاتی رہی۔ میرے یہاں آنے پر میرا ساڑھے تین سالہ نواسہ کمروں میں مجھے تلاش کرتا رہا اور فرمائش بھی کہ نالو کو ابھی بلائیں۔ جیتے رہیں، خوش و آباد رہیں، آمین۔ وہی میں ویکم بک شاپ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر ڈھونڈ ہی لی اور ہم نے اپنا فروری کا پیارا پاکیزہ حاصل کیا۔ پڑھا اور لطف اندوز ہوئے۔ امریکا میں بھی تلاش جاری رکھیں گے۔ اتوار کے روز دیسی ریسٹورنٹ کھانے کے لیے گئے لاہوری بھائی کے تندوری لال آلے کی پتی روٹی اور پالک نے بے حد مزہ دیا۔ میرا بیٹا بتا رہا تھا کہ یہ کئی سال پہلے یہاں آیا اور بزنس کامیابی سے چلا رہا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کا ایک بیٹا میرے بیٹے کے ساتھ چنک میں جا رہا ہے۔ ماں باپ کی محنتوں کا پھل ان کی نیک اور قابل اولاد کی شکل میں سامنے آجائے تو اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا

سے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ یہ بھی پڑھتی ہیں۔ خیر اپنی، اپنی پسند اور دلچسپی کی بات ہے۔ ہم تو مرے جاتے ہیں رسالے کے لیے۔ ایک، ایک دن بھاری ہوتا ہے جب رسالہ نہیں ملتا۔ ہمارے شوہر روزانہ بک اسٹال پر جا کر معلوم کرتے ہیں کہ آیا کہ نہیں کیونکہ وہ خود بھی مطالعے کے بہت شوقین ہیں۔ ہمارے گھر میں جاسوسی، اردو ڈائجسٹ بھی آتے ہیں۔ مگر خواتین کے رسالوں میں صرف پاکیزہ ہی آتا ہے اور میں پاکیزہ کے علاوہ سسپنس، جاسوسی اور اردو ڈائجسٹ بھی بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ ہم دونوں ہی کو پڑھنے کا بہت شوق ہے اب بھی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور میرے شوہر سامنے بیٹھے سسپنس پڑھ رہے ہیں اور مرے کی بات یہ ہے کہ دوبارہ پڑھ رہے ہیں کیونکہ جاسوسی ابھی تک آیا نہیں اور دوسرا کوئی رسالہ ہے نہیں۔ اب تو لائبریری سے بھی کتابیں لالا کر اور وہاں جا جا کر سب پڑھ لی ہیں۔ اس لیے دوبارہ دوبارہ پڑھ کر مزے لیتے ہیں جبکہ رات کے دو بج رہے ہیں۔ ویسے تو ہم دیر سے سونے کے عادی ہیں۔ ویسے تمام افسانوں میں مجھے میمونہ خورشید کا نصیب کھول دے میرا بہت پسند آیا۔ دوسرے افسانے بھی بہت اچھے لگے اور ہاں دستک دردل پر میں انجام نے صرف دستک ہی نہیں دی بلکہ بری طرح دھڑو دھڑوایا یعنی اپنے چونکا دینے والے اور غیر متوقع انجام کے ساتھ بہت پسند آیا۔“ (نوازش)

کچھ نسیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ”یعنی عروج کے بعد فرزانہ سکیل چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو جہادی کا داغ دے کر اللہ سے جاملی، اللہ تعالیٰ اسے کروٹ کروٹ جنت عطا کرے، آمین۔ سب سے پہلے ادارے میں آپ کا دلہن بنی لڑکیوں کے لیے پیغام پڑھا خدا کرے ہمارے معاشرے کی ساس، بہوئیں ادارے کی طرح کی ہو جائیں تو ہمارے گھر خوف صورت کے بجائے خوب صورت ہو جائیں۔ قرآن پاک کا ترجمہ اور اسمائے محمد پڑھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھتی ہوں اور میری دعا ہے کہ کم از کم میرے کہنے پر میرے پیارے پاکیزہ کی ساتھی پیاری بیٹیس ترجمہ ہی پڑھنا شروع کر دیں، آمین۔ عکس مراد نے تو جھلانگ ہی لگا دکھا اور اتنے بڑے بچوں کی ممانیں لکھیں۔ واہ نام کیا اپنی ہی طرح کے منفرد رکھے۔ سسٹریٹس کے عکس کو یہ کہنے پر کہ میں نے تمہارے دوبارہ داخلے کے لیے بہت سے rules violate بھی کیے اور باقی پاس بھی اور تم rules کے خلاف کام کرنے سے انکار کر رہی ہو تو عکس نے کتنے خوب صورت طریقے سے لا جواب اور قائل کیا سسٹریٹس کو کہ اگر آپ سسٹریٹس کی اسٹوڈنٹ ہوتیں تو آپ کو بھی مشکل ہوتا۔ ٹھکت سیما کا کوئی شہر ایسا بساؤں میں نقشہ ہی رہی۔ گل کے نہ ملنے کی مگر حبیب خاں کے ایندھ کو دوبارہ اپنانے اور سکیل کے نو شیرواں کو ملنے کی خوشی ہوئی۔ یعنی عروج کا پرانا افسانہ دے کر بہت ہی اچھا کیا، شکریہ۔ زندگی میں، میں بھی شریا کی طرح یہی کہوں گی کہ ایمان سے دل خوش کر دیا وکیل اویس انصاری نے۔ نورالحین ساحرہ کی لومیرج کی گرہیں یہ کیا بات ہوئی لومیرج تو مرد کرتے ہیں اور بھانے بیوی کو اپنی اماں ابا کے آگے کر دیں۔ رابعہ نیازی کی چاندی بہو اور آپ کے جلتنگ ٹکے تیری تلاش میں، میں ایک ہی بات سے اتفاق کیا گیا کہ لڑکا خود ہی ڈھونڈ لے لڑکی۔ عقیدہ حق کی آئیڈیل پڑھی۔ آئی جب کبھی کوئی دہنی بیمار ہو تو ماہر نفسیات کے پاس لے کر جاتے ہیں جب ماہر نفسیات ہی آئیڈیل کے مانند ہو تو کیا حل ہے؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✉ بہن ایس، ایم، سندھ سے۔ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کرتی ہیں تو اپنی سچی کہانیاں بے شک ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ہی لکھ کر مجھے بھیج دیں اور اگر نہیں کرتیں تو نہ سمجھیں۔ یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ آپ اپنی کہانی شائع بھی کر دانا چاہ رہی ہیں اور ڈر بھی رہی ہیں۔ اس کے لیے میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ آپ کے بتائے ہوئے فرضی نام سے بھی کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ باقی آپ کا جو دل چاہے فیصلہ کریں۔ ویسے کہانی ہے کیا، جو ابھی تک مجھے معلوم ہی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا والا معاملہ ہو۔

کچھ عقیلہ حق، کراچی سے۔ ”مجھے غزالہ رشید صاحبہ کا افسانہ سارہ کی گڑیا بے حد پسند آیا، پوری کہانی میں غزالہ کا مزاج جھٹک رہا تھا۔ اب آتے ہیں دسمبر کے پاکیزہ کی طرف، ٹائٹل بہت خوب صورت رہا۔ ڈائجسٹ مکمل رہا ہر تحریر زبردست۔ عکس کی آخری قسط بہت مکمل رہی۔ عکس نے ہم سب کو ایک ڈور میں باندھ رکھا تھا۔ قیصرہ حیات بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ شوکت رانا الطاف کی یہ تحریر بھی ہمیشہ کی طرح خوب صورت رہی۔ نزہت اصغر صاحبہ نے رفعت سراج کا انٹرویو کیا بہت اچھا لگا۔ ناہید سلطانہ اختر کا ہر کردار ہمارے آس پاس موجود ہے۔ صائمہ اکرم کا مکمل ناول اب تک نہیں پڑھا کہ تبصرہ بھیجے کی جلدی ہے لیکن امید ہے اچھا ہوگا کیونکہ صائمہ ایک اچھی رائٹر ہیں۔ افسانوں میں شیخ خانم کی تحریر پڑھی، تحریر اچھی تھی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک میچور لڑکی کو صرف بھروسے کی بنیاد پر ایک انجام نے ملک بھیج دینا کم از کم اس کے علم میں تو آنا چاہیے تھا۔ شیریں حیدر کی تحریر پڑھی بہت اچھا لگا۔ ایک ایسا ہی طوطا مجھے بھی چاہیے۔ پتیل کا پیالہ وہی برسوں پرانی روایتی کہانی۔ دادا کے ساتھ کیا تو تمہارے ساتھ بھی

کے پاکیزہ میں سب سے پہلے عکس کی آخری قسط پڑھی۔ عمیرہ احمد میری فیورٹ رائٹر ہیں اور میں نے ان کی ہر تحریر ہمیشہ پڑھی ہے مگر معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ عکس میں وہ بات نہیں تھی جیسا کہ عمیرہ احمد کے اور ناولز میں تھی۔ قیصرہ حیات کا ناول میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں نے کبھی کسی رائٹر کے ناول میں مردوں کو بات بات پر روتے یا آنکھیں نم کرتے یا ان کی ہیروئنز کو منہ بتاتے نہیں دیکھا۔ قیصرہ حیات کے لکھنے کے اسٹائل میں وہ پختگی نہیں ہے۔ مرد کو ہمارے معاشرے میں مرد آہن کہا جاتا ہے مگر ان کے ہیروز کو رونے سے اور ہیروئنز کو منہ بتا کر یا شکل خراب کر کے بات کرنے سے فرصت ہی نہیں۔ بہر حال صائمہ اکرم نے بھی متاثر نہیں کیا۔ ان کی ہر کہانی کا ایک ہی نام ہونا چاہیے، اتفاق..... کیونکہ ان کی ہر کہانی ایک حسین اتفاق پر مبنی ہوتی ہے۔ کبھی ہیروئن کے لیے کبھی ہیرو کے لیے اور ایسے اتفاق عام زندگی میں ذرا کم ہی ہوتے ہیں۔ اس ماہ شیریں حیدر نے اچھا لکھا۔ اس کی کہانی کا موضوع پاکیزہ میں ہی چھپنے والی ایک رائٹر عابدہ رؤف صاحبہ کے ناول کلیاں سے مشابہت رکھتا تھا بہر حال پھر بھی انہوں نے بہت اچھا لکھا۔ باقی رائٹرز نے بھی اچھا لکھا جلتنگ اس مرتبہ اچھا تھا۔ (گڑیا! بعض مرتبہ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے کہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آپ کو عمیرہ احمد کا یہ ناول ان کے دوسرے ناولز کے مقابلے میں کم لگا۔ زیادہ تر بہنوں کو یہ ناول سب سے زیادہ اچھا لگا ہے، ہر بہن کی رائے مختلف ہوا کرتی ہے۔ کسی کو قیصرہ حیات کا ناول بہت پسند آ رہا ہے اور آپ کو بالکل پسند نہیں آیا۔ ہر شخص کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے۔ آپ نے عرصہ دراز بعد تبصرہ لکھا ہے اس کے لیے ممنون ہوں امید ہے کہ آئندہ بھی لکھتی رہیں گی)

عاصمہ ملک، کراچی سے۔ ”میں یوں تو 1998ء سے پاکیزہ کی قاری ہوں پر خاموش نہیں کافی وقت میں نے خطوط کے ذریعے شرکت بھی کی ہے پھر شادی ہو گئی اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب دوبارہ جوڑنے کا ارادہ ہے۔ عقیدہ حق نے بہت اچھے طریقے سے ایک اصلاحی افسانہ پڑھنے کا موقع دیا۔ صباح یوسف نے بھی جیسے سمندر کو کوزے میں بند کیا اور خاصی کامیاب بھی رہیں۔ بہت خوب، صائمہ اکرم نے یوں تو کسی خاص موضوع پر بات نہیں کی مگر چونکہ ہمیشہ سے ان کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ قاری یوں نہیں ہوتا۔ اس لیے ناول اچھا رہا اور واہ جی شیریں حیدر نے تو جیسے گولڈ میڈل حاصل کر لیا اس شمارے کا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ ہنگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ سچ مزہ آ گیا۔ بے حد شاندار شوکت رانا الطاف کے بارے میں کیا کہوں..... سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ آپ اپنی یقین کریں گی کہ ان کی کہانی پوری سچائی کے ساتھ تقریباً ساٹھ فیصد میری زندگی جیسی ہے۔ میں آج شادی کے چار سال بعد اپنی اماں جی کے گھر واپس آ گئی ہوں۔ میرے تینوں بچے جو تین، دو سال کے ہیں اور چھوٹی بیٹی شخص پانچ ماہ کی ہے۔ وہ وہاں اپنے دادا دادی کے پاس ہیں اور بقول ان کے وہ ان کے بچے ہیں۔ میرے پاس نہیں رہ سکتے اور میرے گھر ٹوٹنے کی وجہ بھی یہ سب کچھ ہی ہے اور بے شک وہ ذات برحق بھی اپنے بندوں کو تنہا نہیں چھوڑتی۔ میں بھی اس پاک ذات کی طرف سے ناامید ہرگز نہیں ہوں۔ آپ سے بھی دعا کی درخواست ہے۔ رفعت سراج سے مل کر اچھا لگا اور یقیناً بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور ہاں عمیرہ احمد کو بھی وہ آئے بزم میں لائیں۔ جلتنگ میں کم تر نے مزہ دیا۔ باقی سلسلے بھی مناسب ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ آپ کے لیے دعا گو ہیں)

سمین کنول راجپوت، پسرور سے۔ ”سب سے پہلے تو عکس کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ عکس کی آخری قسط رات دیر تک جاگ کر پڑھی۔ بہت مزہ آیا کہانی مختلف، حیران کن اور خوب صورت مراحل سے گزر کر بہت ہی اچھے انجام کو پہنچی۔ عمیرہ احمد مبارک باد کی شکر ہیں اور پاکیزہ بھی جنہوں نے اسے شائع کیا۔ دوسری مبارک باد یا سمین نشاط اختر کو بیٹے کی پیدائش پر ہے۔ دیر آید درست آید اللہ تعالیٰ نے گیارہ سال بعد انہیں اولاد دینے سے نوازا ابوی خوشی ہوگی۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے، بہت مبارک! اللہ تعالیٰ نو مولود کو رحمت و سلامتی کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ صائمہ اکرم کی پہلی بارش اچھی رہی۔ قیصرہ حیات کہیں دیپ جلے کہیں دل میں بہت کچھ کہیں گئیں۔ جلتنگ اچھا لگا۔ خازن عشق پسند آئی۔ بہنوں کی محفل میں جگہ دینے کا شکریہ۔ وہ آئے بزم میں رفعت سراج صاحبہ کا انٹرویو پڑھ کر دلی مسرت ہوئی اور مزہ بھی آیا۔ ان سے اتنی اچھی ملاقات کر دینے کا شکریہ۔ اس سال کا آخری شمارہ یعنی دسمبر 2012ء کا پاکیزہ بے حد اچھا لگا۔ سرورق کی ماڈل لگتا ہے نئے سال کو آتا دیکھ کر کچھ سوچ رہی ہے۔ جلتنگ مبارک باد۔ اللہ کرے نیا سال تمام انسانیت کے لیے امن اور خیر کا سال ہو۔ ہمارے نیک ارادوں کی تکمیل کا سال بھی ہو۔“ (آمین، ثم آمین)

قمر النساء، ہانگ کانگ سے۔ ”پہلی مرتبہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی کریں گی۔ پاکیزہ مجھے بہت ہی پسند ہے۔ باقی میں پاکیزہ کا ہر ماہ شدت سے انتظار کرتی ہوں۔ یہاں ہانگ کانگ میں پاکیزہ جس پاکستانی شاپ سے دستیاب ہے وہ ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر ہے۔ باقی سب سے پہلے میں اپنی پسندیدہ قسط عکس کا ذکر کروں گی۔ عمیرہ احمد کو

ہوسکتی ہے۔ آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ فی الحال میں اختر شماری کے بجائے کار اور موٹر بوٹ شماری کر رہی ہوں۔ دعا ہے کہ اپنے ملک میں امن، خوش حالی، سکون اور اللہ تعالیٰ کی لازوال رحمتوں کے طفیل بے شمار نعمتوں کی بارش ہو، آمین۔ ترقی یافتہ قوموں کی خوشحالی کا راز ہی دیانت، محنت میں ہے مفت خوری اور ہڈ حرامی میں نہیں۔ اللہ ہماری نسلوں کو شادماں و کامرانہ رکھے جو ملک و قوم کا نام روشن کریں۔“ (بس یہی کہہ سکتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے)

سمیرا جبار خان، آزاد کشمیر سے۔ ”انسان اپنے بچپن میں جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کے دماغ میں راسخ ہو جاتا ہے پھر وہ ساری عمر اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے جب شعور کی منزل پر قدم رکھا تو پاکیزہ کو اپنے آس پاس پایا۔ پہلے پہل اس کا خوب صورت سرورق توجہ کا باعث بنا لیکن اب پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں۔ میری خالہ طویل عرصے سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہیں۔ شاید جب سے اس کا پہلا پرچہ شائع ہوا تھا۔ پاکیزہ اپنے نام کی طرح پاکیزہ ہے۔ ایسی باتیں جو ہمارے بڑے ہمیں نہیں سمجھا سکتے، وہ اتنی عمدگی سے ہمارے ذہن نشین کروادی جاتی ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ یہ یقیناً آپ کی شانہ روز محنت کا نتیجہ ہے کہ پاکیزہ روز بروز پاکیزہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ انجم آئی، ہمارا آپ سے ایک مضبوط قلبی تعلق بن گیا ہے۔ اللہ آپ کو اور تمام مصنفین کو خوش و خرم سلامت رکھے تاکہ آپ یونہی تمام لڑکیوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیتی رہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ شائع ہونے ہو لیکن آپ اسے پڑھیں گی ضرور۔“ (گڑیا! اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ باقاعدگی سے تبصرہ کریں اور مراسلات بھی بھیجیں، حوصلہ افزائی لازمی ہوگی)

رضوانہ بدر، بہاول پور سے۔ ”حیران پریشان ہونا چھوڑیں اور ہمیشہ کی طرح گلے لگ جائیں۔ ساری خطائیں معاف کر دیں، مسکرائیں پلیز۔ آپ کی اپنی بہت پیاری رضوانہ بدر آپ کی خدمت میں حاضر سلام قبول کیجیے۔ آئندہ غیر حاضر نہیں ہوں گی۔ دراصل باجی کیا بتاؤں..... دل ڈھونڈتا ہی رہا فرصت کے رات دن۔ زندگی اتنی مصروف رہی کہ دن کا ہوش تھا نہ رات کا۔ ایک دن سوچا یا یہ کوئی زندگی ہے کہ اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے لہذا دو جاہ میں سے ایک کا انتخاب کر لیا۔ اب جناب ہم ہوں گے، پاکیزہ ہوگا، ٹی وی کے ڈرامے ہوں گے بھولی ہوئی سہیلیاں ہوں گی۔ شاعرہ رضوانہ بدر کو نئی زندگی دی جائے گی اور جناب رقص میں سارا جنگل ہوگا۔“ (گڑیا جم جم آؤ اور چھا جاؤ۔ ہاں اب غائب مت ہو جانا)

سمیرا مجاہد، صادق آباد سے۔ ”شیریں حیدر کی کہانی سب سے زیادہ اچھی لگی۔ پاکیزہ ڈائری اچھی لگی۔ غلطی آپنی مجھے مت بھلایا کریں۔ جلتنگ اچھا لگا۔ امینہ عندلیب، سلانوالی آپ کی صحت یابی کے لیے دعا کر رہی ہوں۔ معراج انکل کے لیے دعا مانگ رہی ہوں۔ آج کل میں روزے رکھ رہی ہوں۔ عکس کی آخری قسط پسند آئی۔ میری مبارک باد پہنچا دیں اور ان سے کہیں ایک مرتبہ اپنی تصویر پاکیزہ میں ضرور دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ایک بہن، پنجاب سے۔ آپ نے فون پر مجھ سے دل کی بندشیں انیں کھولنے کا نسخہ شائع کرنے کو کہا تھا۔ روحانی مشورے کا کام چاچکا ہے۔ اس لیے میں آپ کو اسی محفل میں بتا رہی ہوں کہ صبح نہار منہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اول گیارہ مرتبہ درود ابراہیمی پڑھیں۔ اس کے بعد 41 مرتبہ سورہ فاتحہ، ایک سو پندرہ مرتبہ یا سلام پڑھیں آخر میں گیارہ مرتبہ درود ابراہیمی پڑھیں۔ دودھ کی گلاب دھو کر ان میں ایک چھوٹی لالچی اور چار دانے سیاہ مرچ کے ڈال کر دم کریں اور پانی کی طرح چالیں۔ پورے چالیس دن کرنے کے بعد ٹیسٹ کروالیں۔ انشاء اللہ دل کی بندشیں انیں کھل جائیں گی۔ آپریشن کے میسے کسی غریب یا یتیم کو دے دیں اور شکرانے کے نفل پڑھنا اپنا معمول بنالیں۔ ہمارے بے شمار قارئین اس نسخے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں جس میں ڈاکٹر بھی شامل ہیں۔ اپنی دعاؤں میں اپنی باجی کو یاد رکھیں، آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔

مسز وقار، پنجاب۔ مسز احسن، کراچی۔ مسز امینہ احسن، لاہور سے۔ آپ سب نے نام تو ران کا مطلب پوچھا ہے جو عمیرہ احمد نے اپنے ناول میں استعمال کیا ہے۔ پیاری بہنوں اس نام کا مطلب عمیرہ احمد ہی بتائیں گی۔

نائل گل ابڑو، حیدر آباد سے۔ ”میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ میں ایک خاموش قاری ہوں پاکیزہ کی کیونکہ کافی عرصے تک میرا تبصرہ باقاعدگی سے پاکیزہ کی تربیت بن رہا ہے۔ ہاں یہ اور بات کہ کچھ عرصے سے میں نے لکھنا بند کر دیا تھا جس کی وجہ کچھ گھریلو معاملات تھے۔ اس عرصے میں نیچنگ کے شعبے سے منسلک ہو گئی اور کافی عرصے تک اس باعزت پیشے سے وابستہ رہنے کے بعد آج الحمد للہ میرا اپنا اسکول ہے۔ پاکیزہ ہر ماہ ہمارے گھر آتا ہے اور میں اسی شوق سے پڑھتی ہوں جس شوق سے شادی سے پہلے پڑھتی تھی۔ سوچا اس ماہ کے پاکیزہ کے بارے میں کچھ تبصرہ بھی ہو جائے۔ اگر میرا تبصرہ بے لاگ ہو جائے تو معذرت! دسمبر

✉ عذرا کنول، ڈی جی خان سے۔ اللہ کا شکر تم نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں تمہارے دیے گئے ایڈریس پر تم سے براہ راست رابطہ کر رہی ہوں۔ اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

✉ ڈاکٹر شگفتہ قیصر، کراچی۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ پیاری بہن، ہر ایک کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے۔ کسی کو کچھ پسند آتا ہے کسی کو کچھ..... آپ کے خط لکھنے کا بے حد شکریہ، ہمیں امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ہمیں خط لکھتی رہیں گی۔ ہاں آپ کی شکایات ہم نے نوٹ کر لیں۔

✉ ستارہ شیخ، سندھ سے۔ قاری بہنوں سے مشورہ مانگ رہی ہیں کہ رپوش کے مطابق ان کا پورک ایسڈ بڑھ گیا ہے جو کہ (6،2) آیا ہے، اس ضمن میں ہماری بہنیں انہیں کوئی آزمودہ مشورے دینے چاہیں تو بذریعہ پاکیزہ دے سکتی ہیں کہ وہ کھانے پینے میں کیا احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔ وہ ان دنوں خاصی پریشان ہیں۔ (توجہ دیں)

✉ سیدہ فرزانہ بخاری، لاہور سے۔ تمہاری جانب سے خصوصی مبارک بادناہید سلطانہ اختر، قیصرہ حیات اور غزالہ رشید کو پہنچا رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے آمین اور میرے قارئین ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو رہیں گے۔

✉ دی احمد، اٹک۔ گڑیا کیسی ہو، تمہارا اداس سا مختصر سا خط پڑھ کر پریشان ہو گئی ہوں۔ اللہ تمہیں اپنی عافیت میں رکھے۔ آمین۔

✉ سحر جاوید، جگہ نامعلوم۔ آپ کی ای میل ملی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی۔ ہمارے ہاں موصول ہونے والی تمام تحریریں پڑھی جاتی ہیں۔

✉ ثوبیہ علی، نامعلوم مقام۔ ابھی آپ کا افسانہ پڑھا نہیں گیا۔ پڑھنے کے بعد رائے دے سکوں گی۔
کچھ صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی سے۔ ”یوں تو پاکیزہ کے تمام سلسلے تمام کہانیاں بہت پسند ہیں مگر کبھی کبھی جو انٹرویوز لگ جاتے ہیں وہ بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ یہاں پاکیزہ دیر سے ملا اس لیے ابھی کہانیاں پوری نہیں پڑھ پائی ہاں اپنی پیاری رائٹر رفعت سراج کا انٹرویو پڑھا بہت اچھا لکھا ہے ایک تو عمر سے بعد نرہت اصغر کی تحریر نظر آئی دوسرے انٹرویو محسن پسند اور ناپسند پڑھتی نہیں تھا بلکہ معلوماتی اور..... اور بہت کچھ سکھانے والی باتیں تھیں۔ اس کے لیے پاکیزہ کو مبارک باد۔ امید ہے آئندہ بھی رائٹرز کے انٹرویو اسی طرح آتے رہیں گے۔“ (شکریہ)

کچھ زاہدہ پروین، میرپور خاص سے۔ ”سب سے پہلے آپ کا شکریہ کہ میرے بارے میں خبر شائع کی۔ میری پاکیزہ سے بہت برائی وابستگی ہے اس لیے اس کا ایک ایک حرف میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ عمیرہ احمد کے انٹرویو کا انتظار ہے۔ دیگر تمام رائٹرز کی تحریریں بھی پسند آئیں اب رفعت سراج کے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔ وہ آئے بزم میں اچھا سلسلہ ہے۔ اس میں رفعت سراج کا بہت بھرپور انٹرویو شائع ہوا۔ ان کی باتیں اور نزہت کے سوال پڑھ کر بہت لطف آیا۔ آپ نے کافی کچھ پوچھا اتنی بڑی اور کہنہ مشق رائٹرز کا انتخابی سنجیدہ انٹرویو ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے نزہت اصغر کو مبارک باد..... شوکت رانا الطاف کی تحریر ایک عمر سے بعد پڑھنے کو ملی۔ اس کا دوری کی تحریر موجودہ حالات کی غماز ہے۔ کچھ نئے نام بھی نظر آئے۔“ (تبرے کا شکریہ)

کچھ ارم احتشام، ملتان سے۔ ”ناہید سلطانہ آپ کا ناول بہت زبردست جارہا ہے لیکن ایک بات میں انہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ اب پاک فوج کے لفٹیننٹ اچھی خاصی تنخواہ لے رہے ہیں۔ کچھ یہی پینتالیس سے پچاس ہزار تک۔ اس لیے اب انہیں میں سے دو وقت کھانے کی ضرورت نہیں۔ شوکت رانا آپ نے بھی لکھا لیکن شاید اس کہانی کو کبھی کہانیاں یا سرگزشت میں شائع ہونا چاہیے تھا اور ویسے بھی وقت اور حالات کے ساتھ کہانیوں میں بھی فرق لانا چاہیے۔ اس کا دوری کی تحریر زبردست تھی۔ کراچی کے حالات کے تناظر میں پڑھ کر ایسے کئی خاندانوں کا دکھ اپنا ہی دکھ محسوس ہوا۔ صائمہ اکرم کے ٹھنڈے موسم سے بھرپور کھٹے میٹھے ناول نے مزہ دیا۔ پتیل کا پیالہ بھی اچھی تحریر تھی لیکن کچھ اور ہو گئی کتے کا پیالہ کچھ زیادہ ہو گیا۔ اپنے بڑھاپے کا سوچ کر خوف

عزیز قارئین عمیرہ احمد کے ناول کے بارے میں آپ لوگوں کے خطوط مسلسل موصول ہو رہے ہیں۔ انشاء اللہ قروری کے شمارے میں عمیرہ احمد آپ سے سیر حاصل گفتگو کریں گی اس سلسلے میں اپنی شرکت یقینی بنانے کے لیے جلد سے جلد اپنی آرا بھیج دیں۔

خراج حسین اتنی بہترین کہانی لکھنے پر۔ اللہ تعالیٰ عمیرہ احمد کو ہمت دے۔ عطیہ عمر کا صراط مستقیم بھی سبق آموز ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت نہیں خلوص نیت پسند ہے۔ قیصرہ حیات کا ناول کہیں ویں جگہ کہیں دل اپنی روانیوں کے ساتھ جاری ہے۔ سارہ کی گڑیا نغز الد رشیدی کی تحریر نے رُلا دیا۔ ماؤں کو ڈرتے دار ہونا چاہیے۔ باجی آپ کو بتاؤں ہانگ کا نگ میں بارہ سال سے کم عمر بچہ ماں کی غفلت سے گم ہو جائے یا ماں باپ گھر میں اکیلا چھوڑ دیں..... خدا نخواستہ گھر میں حادثہ ہو تو ماں باپ کو مزا ہو جاتی ہے۔ خواب، حقیقت اور سراب۔ ذکیہ خلیل کی بہترین تحریر ہے۔ ہمارے پاکستانی معاشرے کے لیے سبق آموز کہانی۔ باجی میری سبیلی ندا بھی لندن میں ہوتی ہے۔ بالکل یہی کہانی ہے۔ ندا ایم ایس سی ہے جبکہ اس کا شوہر کھنڈ اور کام چور ہے۔ میرا دل سبیلی کے حالات پر خون کے آنسو روتا ہے حالانکہ اس کے خاندان میں سب لڑکے ماشا اللہ کیپٹن، میجر ریک کے تھے لیکن اس کی امی نے انگلینڈ میں مقیم لڑکے کا سن کر سب رشتے رد کر دیے۔ باجی آپ میری سبیلی کے لیے ضرور دعا کریں۔ حسین اختر کی عید قرباں پڑھ کر دل خون کے آنسو روپا۔ آج کے دور میں مسلمان ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ حقوق العباد سے غفلت ہے۔ ہم جھوٹی نمود و نمائش کے پیچھے لگے ہیں۔ عید قرباں کے گوشت کے اصل مستحق ہی ہمارے نادار مسلمان بہن بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کا شاہکار ناول زندگی بہترین جارہا ہے۔ اللہ کرے اولیں انصاری اور تقدیم کی شادی ہو جائے۔ مدثر جیسے لوگ قابلِ رحم ہیں جو اللہ تعالیٰ سے بھی نہیں ڈرتے اور کسی کی بیٹی کی زندگی خراب کرتے ہیں۔ یہ کہانی بچیوں کے لیے سبق آموز ہے۔ قیامت سی قیامت نادیدہ جہانگیر کی بہترین تحریر تھی۔ ہمیں احتجاج کرنا چاہیے لیکن پُر امن طریقے سے تاکہ ہزاروں مریض بروقت اسپتال پہنچیں اور ان کی جان بچ سکے۔ ام مریم کی تحریر جیسے انہوں نے مکمل ناول کا نام دیا ہے انا کا سفر کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔ بالکل بے جان اور نا پختہ ذہن کی تحریر تھی۔ کہانی کا کوئی معیار نہیں تھا۔ ام مریم میری باتوں کا برا مت مانے گا۔ پاکیزہ نو جوان بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ آپ اپنی کہانی میں کیا پیغام دینا چاہتی ہیں؟ شادی گڈی گڈے کا ٹھیک نہیں ہوتا۔ پچاس ٹھگٹ انگلی کی بہترین تحریر تھی۔ ہمارے معاشرے میں سسرال والے خود جو مرضی کریں بہوؤں پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں۔ جلتی رنگ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔“ (پیاری بہن قمر اس محفل میں خوش آمدید۔ بھرپور تبرے کا شکریہ)

کچھ ڈاکٹر کول ستار، جام شورو سے۔ ”عمیرہ احمد کا پورا ناول بہت اچھا تھا۔ ایک فاصلہ مسلسل ایک رابطہ مسلسل، منٹل بلاک کیسے لگائے جاتے ہیں یہ سیکھا۔ زندگی میں ایک لڑکی ہو کر اپنی لڑکی ہونے کے وصف کو برقرار رکھتے ہوئے بھی آپ آگے جا سکتے ہیں۔ آپ لڑکتے ہیں آپ زندگی جی سکتے ہیں یہ سیکھا خیر دین کا بی پلان کا فارمولہ شاندار تھا۔ ایک جیسے لوگ میں نے اپنی یونیورسٹی میں بہت دیکھے ہیں۔ سب سے اچھا سین وہ تھا جب عکس شیر دل اور شہر بانو کے گھر آتی ہے اور اس نے بلیک سوٹ کے ساتھ ریڈ لپ اسٹک لگا لی ہوئی ہے اور شیر دل کا ٹیو پیروہ نامحسوس طریقے سے اسے والٹ میں رکھتی اور پھر گھر جا کر دیکھتی ہے۔ اس سے زیادہ خوب صورت کوئی محبت کو ڈیفائنٹ نہیں کر سکتا۔ سب سے اچھا ڈائلاگ جو مجھے لگا کہ میں اس کے لیے روٹی تھی پر اسے پانے کی خواہش نہیں تھی میری بھی۔ سب سے تفریحی سین جو ہوں والا تھا۔ سب سے اچھا لمحہ وہ تھا جب خیر دین، عکس کے اسی گھر آتا ہے اور اسے پتا نہیں ہوتا کہ یہاں عکس پوسٹڈ ہے۔ اسے اک لمحے میں سمجھ میں آ گیا تھا کہ عکس وہاں کس حیثیت سے کھڑی تھی۔ سب سے قابلِ تعریف چیز وہ تھی جب عکس اپنے کولنگز کے ساتھ دال کی دکان پر آتی ہے اور خیر دین جانے لگتا ہے اور وہ اسے نانا کہہ کر بلاتی ہے۔ ایک لڑکی کی نفاست سب کی ریڑھی پر نظر آتی ہے۔ ایک چیز جو مجھے عکس کے بعد نظر آنے لگی تھی اپنے آپ میں وہ نمایاں کارلریون تھی۔ وہ اور بات ہے کہ اس کے بعد میں نے زیادہ کارلر گلے پہننے شروع کر دیے ہیں۔ اس ناول میں کیا تھیں تھا۔ محبت اور انتہا کو چھوٹی محبت، معجزہ، جدوجہد، صبر، سمجھداری، طبقاتی تفریق، غصے میں کیے جانے والے فیصلے، پچھتاوے، غرور، تقدیر کا وار، شکر کا پھل۔ خیر دین ایک اچھا اور بہترین کریکٹر تھا مگر پھر بھی عکس آل ٹائم فورٹ رہی۔ شیر دل شاید ہیرو نہیں تھا۔ شاید اسی لیے ہیرو شپ نظر نہیں آئی اور شہر بانو کے پاس خوب صورتی کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور صرف خوب صورتی کچھ نہیں ہوتی۔ شیر دل سے زیادہ مجھے غنی انصاری پسند تھا۔ عکس کی دوستی غنی انصاری سے قابلِ رشک رہی۔ صبح و آہوا نہ ہوتا تو بہت تفصیلی تبصرہ لکھتی۔ ڈیپرساری دعائیں۔“ (آپ کی پُر محبت رائے سننے کے بعد عمیرہ احمد نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے)

کچھ سیمایا سمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ ”ہم نے رفعت سراج کی بے شمار تحریریں پڑھی ہیں اور ان سے مل بھی چکے ہیں مگر ان کا طویل ترین انٹرویو بے حد روکھا پچکا سا لگا۔ وہ تو ان کے جوابات، اس قدر سنجیدگی اور فلسفہ لیے ہوئے تھے کہ بڑی حیرت ہوئی۔“ (سیماجی! بعض مرتبہ سنجیدگی سے بات کرنے کو بھی تو دل چاہتا ہے)

تحریر لگی بھر پور مکمل..... جھٹک یو عمیرہ جی۔ قیصرہ جی دیپ تو بہت اچھے جلائے تھے لیکن اب لگتا ہے کہ باری دل جلنے کی ہے۔ ادھر تو قیر صاحب کے دل سے بھی دھواں نکلتا شروع ہو گیا ہے۔ دوسری طرف رو بھی جلنے کی تیاری میں لگتی ہے اور شمیمہ صاحبہ نے تو آتے ہی ساس، دیور کا دل جلانا شروع کر دیا ہے یا اللہ شمیمہ کو عقل دینا، اچھی تحریر ہے۔ اسما قادری کی تحریر بہت پر لطف رہی خاص طور پر انیلا اور عادل کی نوک جھونک کافی مزیدار تھی۔ شیریں حیدر کا پیارا مونی بظاہر تو لگا کہ عام سی کہانی ہوگی لیکن طوطے کی بولی اسے خاص بنا گئی اور اللہ بجائے ایسے سر سے جو قرآن گو میں رکھ کر جھوٹ بول رہا تھا سب تعلیم کی کمی ہے قیامت کے دن اللہ کے سامنے جھوٹ کا پردہ کھلنے پر شرم نہیں آئے گی۔ تو بہ تو بہ، استغفر اللہ من ذلک۔ تاہید سلطانہ اختر کی زندگی تو اب سانس روک کر پڑھتے ہیں۔ ہر پیرا ایک سے بڑھ کر ایک کے مصداق پر لطف ہوتا ہے۔ بہت مزے کی ہوگئی ہے زندگی لیکن حجاب کے لیے پریشانی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ جی اس کی حفاظت فرماتا الطاف سے۔ رفعت سراج کا انٹرویو پسند آیا۔“ (شکریہ)

کچھ نیکی آراء، کراچی سے۔ ”ہماری طرف سے عمیرہ اور پاکیزہ کی تمام ٹیم کو دلی مبارک باد۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ اور اب باری تھی عقیدہ حق کی مجھے منظور ہے جو ایک نافرمان اولاد کے لیے سبق آموز عبرت کا نشان تھی۔ صباح یوسف کی پینٹل کا پیالہ حقیقت کو چھوٹی ایک منفرد اور متاثر کن تحریر تھی جسے پڑھ کر مکافات عمل سے خوف آنے لگا اور اب باری تھی اپنی پسندیدہ رائٹر شیریں حیدر کی تحریر۔ میرا پیارا مونی کی جو میرے خیال میں اس ماہ کی سب سے خوب صورت اور اچھوتی منفردی تحریر تھی جسے پڑھ کر مزہ آگیا اور مونی کی یہ خوب صورت روداد اور تحریر سب کو سنانے کو دل چاہنے لگا۔ شیخ خانم کی خارزار عشق بس سوسور ہی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی اور اب باری... وہ آئے بزم میں ملاقات رفعت سراج سے ملنے کی جن کی خوب صورت تحریروں نے عوام میں تہلکہ مچایا ہوا ہے رفعت کی باتیں اور ان کے بارے میں پڑھ کر مزہ آیا سوائے ایک بات کے کہ جس سے مجھے ان سے اختلاف ہے وہ یہ کہ عورت کی خاطر اصول و وقار بھلا دینے والے مرد انہیں زہر لگتے ہیں۔ سروے میں حسینہ معین اور نیلوفر عباسی کے بارے میں 2012ء کا میاں بی کا سفر اور دیگر خواتین کے بارے میں پڑھ کر مزہ آیا۔“ (شکریہ)

کچھ فیصلہ آصف خان، ملتان سے۔ ”عمیرہ احمد کے عکس کی آخری قسط میں گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا۔ تمام کردار خصوصاً چڑیا نے اپنے نرم دل اور رحم و کرم پر مبنی جذبات کو کھج رنگ دیا۔ زندگی میں ہر طرح کے انسانوں سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ تنہم کی قسمت پر دکھ بھی ہوتا ہے اور حجاب کے مردانہ وار حوصلے کی داد دینی بھی پڑتی ہے۔ الطاف کو ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے حجاب کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے کیونکہ اب مسئلہ انا کا پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل بھی قیصرہ اچھے انداز میں آگے بڑھا رہی ہیں اصل تماشا تو تب شروع ہوں گے جب شمیمہ کا دلہنایا اترے گا۔ عقیدہ حق نے واقعی ماؤں کو بہت اچھے طریقے سے سبق دیا۔ فیصلے کی صلیب نے بہت افسردہ کیا۔ گھمنڈ و زعم انسان کے گھرا جاڑ دیتا ہے۔ اس تحریر سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔ اللہ پاک بری گھڑی سے بچائے، آمین۔ پینٹل کا پیالہ مکافات عمل کی روشن دلیل ہے۔ صائمہ اکرم کی پہلی پارش نے لطف کی پھوار میں بھگو ڈالا۔ ناگھی میں کیے گئے غلط فیصلے نے ماہ نور کو کانٹوں پر لا کھڑا کیا۔ شیریں حیدر نے بہت دلچسپ انداز میں ثبوت پیش کیا۔ شوکت رانا الطاف نے بہت عرصے بعد پاکیزہ کی رونق بڑھائی۔ مجھے رنگ دے خالفتا معاشرتی تحریر تھی۔ شیخ خانم کی خارزار عشق بھی انہونی تحریر لگی۔ صد شکر یہاں کوئی خود غرض نہ تھا اگر تھا بھی تو درست انداز میں۔ اس بار تمام تجارتی ایک سے بڑھ کر ایک لگیں۔ رفعت سراج میری پسندیدہ لکھاری ہیں۔ ان کا تفصیلی حال اور منفرد باتیں جی جان سے پسند آئیں، ہر کام محنت و لگن مانگتا ہے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

☆ عزیز قارئین کرام! قمری سال کا دوسرا مہینہ صفر شروع ہو چکا ہے۔ اس ماہ استغفار اور تیسرا کلمہ کثرت سے پڑھیں اور صدقات بڑھا دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیر و عافیت کے ساتھ رکھے، آمین۔ آئیے اس محفل کے اختتام پر سب ساتھ مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا ارحم الراحمین میرے جسم کو شفا، میرے دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے اور تو مجھ سے راضی رہے، آمین..... غم آمین۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب
دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

ضرور آیا اور سب سے مزے کی چیز رفعت سراج کا انٹرویو۔ رفعت میری پسندیدہ ترین رائٹرز میں سرفہرست ہیں۔ ان کی ہر کتاب مجھے حفظ ہے اور میری لائبریری میں موجود بھی ہے لیکن ایک شکایت نہت سے ہے انہوں نے انٹرویو کا حق ادا نہیں کیا۔ کچھ تفصیلی محسوس ہوتی رہی۔ سوالات اس سے بہتر طریقے سے بھی کیے جاسکتے تھے بہت ہی فلسفیانہ انداز تھا۔ جلت رنگ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ وارداتیں پڑھ کر تو ڈر سا لگ رہا ہے کسی بھی تقریب میں جاتے ہوئے۔ ویسے بھی کھانا کم پڑ جائے تو اب ہم گھر میں اس طریقے کو آزما کے دیکھیں گے، بابا بابا۔ کتر میں بھی بڑا ہی اچھا پیغام چھپا ہوا تھا۔ قیصرہ حیات بھی اشارت تو بڑا اچھا تھی ہیں اور پھر غیر ضروری طوالت کا شکار ہو جاتی ہیں جو یوریت پیدا کرتا ہے۔ میرے خیال سے تو کسی بھی ناول کی سات سے آٹھ زیادہ اقساط نہ ہوں تو بہتر ہے۔ باقی قارئین سے بھی رائے لیں۔“ (تجربے کا شکریہ)

کچھ عنبر و سیم، گوجرانوالہ سے۔ ”خیر دین کا کردار مجھے عکس ناول میں بہت بھایا۔ نہ اس نے پی ایچ ڈی کر رکھی تھی اور نہ ہی کسی تعلیمی ادارے سے کوئی شوقیت۔ ہاں مجھے اس میں سے تھوڑی تھوڑی اشفاق احمد کی خوشبو آئی۔ میرے خیال میں خیر دین اس ناول کی جان ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز بے ہمیں اور اپنی نواسی کو روشناس کروانے والی یہ سنی غالباً عمیرہ نے کسی کو ذہن میں رکھ کر ہی تخلیق کی تھی۔ میں بر ملا کہوں گی پیر کامل کے بعد عمیرہ کی یہ بیٹ تحریر ہے گو کہ زندگی گزار ہے سے لے کر عکس تک میں نے ہمیشہ عمیرہ کی ہر تحریر پڑھی ہے مگر ہمت نہیں کر پائی کہ عمیرہ کی کسی چیز کو سیلٹ پیش کروں۔ خداوند کریم کے عطا کردہ وسیع ذہن کو پُرکشش باتوں کو جن سے یہ الفاظ رقم طراز کرتی ہیں یا پھر ان آنکھوں کو جن سے گزر کر یہ تحریر ہم تک پہنچی۔ عمیرہ احمد کو غالباً ایک عدد نظر کا چشمہ تو لگا ہی ہوگا۔ دماغ کا کام اتنی باریک بینی سے..... واہ واہ۔ غرض تعریف اس خدا کی جس نے عمیرہ احمد کو بنایا۔ عمیرہ ویسے آپس کی بات کیا آپ سافٹ اسپون کن ہی ہیں؟ (ہاں ہیں) عکس کے ختم ہونے پر دل ادا ہے مگر رفعت سراج کے ناول کا پڑھ کر الگ خوشی ہوتی۔ مجھے ان کا طائر لا ہوتی، بھی نہیں بھول سکا۔ پاشا کا کردار ایک لازوال شاہکار تھا۔ خیر ان کی تحریر پر بقیہ تبصرہ ناول پڑھنے کے بعد کروں گی۔“ (جی ضرور)

کچھ شامکے سہیل جاوید، کراچی سے۔ ”عمیرہ کو خدا نے وہ صلاحیتیں دی ہیں جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ اس دفعہ آخری قسط نے ہمیں عورت کا ایک بے مثالی روپ دکھایا۔ سوکھوں کا یہ روپ، شیر دل بڑا ہی خوش نصیب مرد تھا مگر عکس جیسا وسیع ظرف خدا کسی کسی کو ہی ودیعت کرتا ہے۔ انسانوں کے روپ میں فرشتہ عکس اس معیار پر پوری اتری۔ میں ایک دفعہ پھر عمیرہ کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔ اسما قادری کی فیصلے کی صلیب ایک بہترین کاوش تھی۔ مکافات عمل کا ایک نمونہ۔ تاہید سلطانہ نے زندگی میں زندگی کے ہر روپ سے ملوایا۔ زندگی حقیقت میں ایک پھیلی ہے۔ ہماری عدالتوں کی بالکل صحیح منظر کشی کی۔ مرد جب اپنے اوچھے پن پر اترتا ہے تو ہر سطح سے نیچے گر جاتا ہے۔ خدا سب کو ان ذلتوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ وہ آئے بزم میں نزہت اصغر نے تو کمال کر دیا۔ رفعت سراج ہر روپ میں شاندار، ہماری تشنہ خواہش نزہت نے پوری کر دی۔ اللہ رفعت کو یونہی اوج کمال عطا کرے۔ آپ کے بچے عمیرہ کے ویسے میں روپ گارڈن میں رفعت سے ملاقات ہوئی۔ بہت ملنسار اور با اخلاق خاتون ہیں۔ مسکراہٹ مسلسل ان کے لبوں کا احاطہ کیے ہوئی تھی اور ایک مزے کی بات ہم جس ٹیبل پر بیٹھے تھے رفعت کے شوہر نامدار ہماری ٹیبل پر تھے۔ پاکیزہ میں تصویر دیکھ کر ہمیں یاد آیا تو جناب وہ بے چارے اپنے بچے کو لے کر واش روم گئے اور اپنی گاجر کے حلوے کی پلیٹ ٹیبل پر چھوڑ گئے۔ میں اور بیٹی یہ سمجھیں کہ شاید یہ چلے گئے ہیں ولیمہ میں رش زیادہ تھا میں نے کہا کون حلوے کے لیے اٹھے ان کی پلیٹ میں حلوہ جوں کا توں تھا ہم نے کہا یہ ضائع ہو جائے گا ہم نے وہ پلیٹ اپنی طرف سرکالی۔ جب ہم کھا چکے تو وہ بے چارے ٹیبل پر تشریف لائے ادھر ادھر نظر دوڑا رہے تھے کہ پلیٹ کہاں گئی۔ بے چارے شریف آدمی تھے۔ خاموشی سے صبر کر کے بیٹھ گئے اور ہم لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال..... بعد میں ہم نے ان سے معذرت کر لی۔ اگر اس وقت چاہتا ہوتا کہ رفعت سراج صاحبہ کے شوہر نامدار ہیں تو کبھی اس پلیٹ کو اپنی طرف سرکانے کی حماقت نہ کرتے۔“ (بہت خوب)

کچھ قمر عکس الحق، جھٹک سے۔ ”عمیرہ احمد کی تحریر عکس انتہائی شاندار کامیابی سے ہمکنار ہو کر انجام پذیر ہوئی حسب توقع اینڈ بھی شاندار تھا۔ عکس کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ اس نے کیا اور شہر بانو کو مزید ذلت و رسوائی سے بچا کر شیر دل کی چھاؤں میں بٹھا دینا صرف عکس کا حوصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ ساری اقساط میں وہ خاص تھی اور خاص رہی۔ چڑیا، فاطمہ اور عکس ہر کردار میں ہی بے مثال اور قربانی کی جھٹک تھی۔ عمیرہ احمد نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا عکس کے ذریعے اور یہ ایک بہت شاندار



اوگی

نئے سال میں
دل کے
روگیوں کے
دکھ
کیوں
پرانے نہیں ہوتے؟

مرسلہ: فصیحہ آصف، ملتان

دینار کا غلام

محفل میں ایک کنجوس آدمی کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔
بھئی برکی بھی محفل میں موجود تھے۔ کسی نے کنجوس پر
اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ لاکھوں دینار کا مالک
ہے لیکن اس میں سے ایک دینار بھی خرچ نہیں
کر سکتا۔“ بھئی برکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ اپنے
لاکھوں دیناروں میں سے ایک دینار بھی خرچ نہیں
کر سکتا تو وہ ان دیناروں کا مالک کہاں ہوا، اس کی
کنجوسی کی وجہ سے اب دینار اس کے مالک ہیں اور وہ
شخص دیناروں کا غلام ہے۔“

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

محبت کا حربہ

ایک عورت نے اپنے شرابی شوہر کو سدھارنے
کے لیے ڈانٹ پھنکار اور لڑائی جھگڑے کا طریقہ چھوڑ
کر محبت کا حربہ آزمانے کی ٹھانی۔ رات گئے جب اس
کا شوہر نشے میں دھت گھر آیا تو اس نے مسکرا کر اس کا
استقبال کیا۔ اس کے جوتے موزے اتارے۔ اسے
کھانا کھلایا۔ آرام سے بستر پر لٹایا۔ اس سے پیار
بھری باتیں کرنے لگی۔ پھر اس نے شوہر سے کہا۔

مدارج النور

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

نعت رسول مقبول ﷺ

حضور آپ ﷺ سا پیدا ہوا نہ ہوگا کوئی
آفت کے پار یہ نغمہ سنا رہا ہے کوئی
دھڑک دھڑک کے مراد دل یہ کہہ رہا ہے کہ سن
حضور پاک کا روضہ دکھا رہا ہے کوئی
فضا یہ کیسی معطر ہوئی مرے گھر کی
فلک یہ کہتا ہے نزدیک آ رہا ہے کوئی
در حبیب ﷺ پہ جانا میرا مقدر ہے
زہے نصیب یہ مژدہ سنا رہا ہے کوئی
در حبیب پہ جاؤں تو ایک نعت پڑھوں
جو دل میں سویا ہے جذبہ، جگا رہا ہے کوئی
عجب یہ شوق کا عالم عجب اسیری ہے
جنون عشق میں دنیا لٹا رہا ہے کوئی
پہنچ کے روضے پہ قدموں میں بیٹھ جاؤں گا
رموز عشق کی باتیں سکھا رہا ہے کوئی
یہ کون عاشق صادق چلا مدینے کو
وہ ہے رسول ﷺ کا پیارا، بتا رہا ہے کوئی
یہ کیسا نور ہے پھیلا جہان عالم میں
نگاہ شوق سے پردے ہٹا رہا ہے کوئی

شاعرہ: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

مرسلہ: ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

عادت طیبہ

حضور پاک ﷺ کی عادت تھی کہ آپ ﷺ
کھانے میں بھی نہ عیب بتاتے تھے۔ اگر چاہا تو کھالیا
ورنہ چھوڑ دیا اور یہ بھی نہ فرمایا کہ یہ کھانا برا ہے، ترش
ہے، نمک زیادہ ہے یا کم ہے، شوربا گاڑھا ہے یا پتلا
ہے۔ اتنا ہی نکالتے تھے جتنا کھانا ہوتا تھا۔

مدارج النور

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

”جان اب تم سو جاؤ۔“ شوہر گھبرا کر بولا۔ ”یہاں اور
میں؟ اگر میں ساری رات یہاں گزار کر گھر پہنچا تو
میری بیوی مجھے کچا چبا جائے گی۔“

از: فرحت احمد، بن قاسم، کراچی

انٹرویو کارنر

مند پور کا موکی سے شرکت کرنے والی شازیہ
رباب تو آپ کو یاد ہی ہوں گی۔ بہت عرصے کے بعد
حاضر ہوں۔ پیاری بہنو! میرے نام سے کچھ سہیلیاں
تو واقف ہوں گی اور بہت ساری نئی دوستوں کے لیے
میرا تعارف حاضر ہے۔ میں پاکیزہ کی بے حد برائی
قاری ہوں، تقریباً بیس سال سے پاکیزہ مستقل
میرے ساتھ ہے اور تقریباً اپنے پورے گاؤں کی
لڑکیوں کو پاکیزہ کا فین بنا چکی ہوں۔ شادی کے بعد
پاکیزہ سے بہت رہنمائی ملی۔ مسلسل کئی سال پاکیزہ
ایوارڈ ورت رہی ہوں۔ میرے ماشاء اللہ سے تین بیٹے
اور ایک لاڈلی سی بیٹی ہے۔ فخر، فیضان اور جاذب کے
بعد زینب نے آکر ہماری فیملی مکمل کر دی۔ بہنوں جیسی
سہیلیاں، سمعیہ، سمیرا اور فاخرہ کو آج بھی مس کرتی
ہوں اور گزری باتوں پر اکیلے میں ہنس لیتی ہوں۔ گھر
داری میں بے حد مصروف ہوں۔ پاکیزہ کے سارے
سلسلے اچھے بے حد اچھے ہیں۔ اب اگر میں نے قلم
اٹھایا ہے تو اپنے بڑے بیٹے فخر کے بار بار ہمت
دلانے پر لکھنے کا عزم کیا ہے۔ اللہ کرے کہ آپ کی مایوس
نہ کریں اور میں وقتاً فوقتاً لکھتی رہوں۔ دعا ہے کہ اللہ
تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین، اور
پاکیزہ ہم سب کے ساتھ یونہی شاد و آباد رہے۔

مرسلہ: شازیہ رباب، مند پور کا موکی

ان کے نام

ان سے کہہ دو کہ ذرا اب وہ گزارہ کر لیں
ہم ابھی ٹھیک نہیں ہم سے کنارہ کر لیں
زندگی طرز مروت سے ہے اکتائی ہوئی

مرسلہ: شازیہ رباب، مند پور کا موکی

میری بیزاری کو بے وجہ گوارا کر لیں
براہیں برباد، منزل بھی ہے بے نام و نشان
نئی زیست کا بے شک وہ نظارہ کر لیں
کون ظالم تھا یہاں اور کس نے ظلم سہا
آ کے خود ہی وہ کبھی روز اشارہ کر لیں
گفتگو خواب میں تفصیلی نہیں ہو پائی
وہ میری آنکھ کا یہ سفر دوبارہ کر لیں
شاعرہ: صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی

کاش

ایک نابینا شخص کی نئی نئی شادی ہوئی تو ان کی بیگم
نے کہا۔ ”کاش کہ آپ دیکھ سکتے اور میرے حسن کے
گن گاتے۔“

نابینا شوہر نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اگر تم اتنی حسین ہوتیں
تو یہ آنکھوں والے تمہیں میرے لیے چھوڑ دیتے کیا!“
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

بکھر جاتی ہیں جب ہر طرف گلوں کی رعنائیاں
خزاں میں بھی نظر آتی ہیں بہاروں کی پرچھائیاں
تشد میں ڈھل جاتی ہے جب انساں کی وحشت
کس طرح موت چھین کر لے جاتی ہے زندگائیاں
راحت دل مل نہ سکی اسی کی سوگوار ہے
مسکراہٹوں میں بھی چھپی ہوئی ہیں اداسیاں
جانے کس شے کی طلب میں کتنی ہے زندگی
مفلسی میں لیٹی ہوئی ملتی ہیں پریشائیاں
اشکوں کی روانی میں نظر آتی ہے کیفیت دل
زندگی کو درد ہی دے جاتی ہیں ویرائیاں
احساس غم تو بھی مٹ نہیں سکتا جمال
تمنائیں الجھ جاتی ہیں تو بن جاتی ہیں ناکامیاں
شاعرہ: عثمانہ اختر جمال، امریکا

جدید شیطان کی نشانیاں

ہاتھ میں موبائل ہوگا



میں بیوی پارلر جا کر اپنی بھویں اور مونچھیں بھی نچو سکتی ہیں۔ ملبوسات کی خریداری کے لیے بھی آج کا دن اچھا ہے۔ آج آپ کا کلی نمبر 5 اور 11 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شام پانچ بجے سے رات گیارہ بجے تک آپ سیر و تفریح اور ہونٹنگ وغیرہ سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔

منگل..... آپ کی خواہش پوری ہوگی۔ میاں مگیترا یا پسندیدہ ہستی آپ کے اشاروں پر چلیں گے..... بیاتھا عورتیں آج کے دن سسرال والوں سے منہ ماری نہ کریں۔ جس دن گوشت کا ناغہ ہوتا ہے اس دن گھریلو عورتیں اپنا مزاج خاصا برہم رکھتی ہیں۔ جائداد پر توجہ دیں۔ کوشش کریں کہ میاں جی جائداد آپ کے نام سے لیں اور اگر کسی وجہ سے نہ لے سکیں تو ظاہر یہی کریں کہ فلاں فلاں جگہ مکان یا فلیٹ بک کروایا دیا ہے۔ اس سے عزیز واقارب پر خاصا رعب پڑتا ہے۔ میکے والوں سے فائدہ پہنچے گا..... یہ حقیقت میاں جی کے دماغ میں بٹھادیں کہ... وہاں سے کسی وجہ سے نقصان نہ سمجھیں بلکہ اس میں اپنے لیے نئی مصلحتیں دریافت کریں۔ آج کلی نمبر 11 اور 12 ہے۔ کوشش کریں کہ آپ کی صبح ان ہی اوقات میں ہو۔

بدھ..... آج کے دن گھر کے مرد بغیر ناشتے پانی کے اپنی ملازمتوں پر جائیں تو خوشی کی بات ہوگی۔ (یہی کہ آپ کو ناشتا بنانے سے فرصت مل گئی) جدی پستی آپ کی تعریف کریں گے۔ سرطان سے بچ کر رہیں، اپنی سکیورٹی کا خاص خیال رکھیں۔ اپنی بچت اپنی خفیہ بچت..... اور میاں کے والٹ سے

نئے سال کا ہر ہفتہ کیسا رہے گا؟
ماہ جنوری ہو یا دسمبر..... ستمبر ہو یا اکتوبر..... غرض سال کا کوئی بھی مہینہ ہو آپ کا ہفتہ دنوں کے حساب گزر جائے گا..... جیسے اکثر خواتین ہفتے بھر کے پکانے کا مینو بنالیتی ہیں..... اتوار کو بریانی، پیر کو دال چاول، منگل کو سبزی، بدھ کو مچھلی، جمعرات کو مٹن، جمعے کو پلاؤ، ہفتے کو نہاری یا قورمہ وغیرہ..... اسی طرح ہم نے اپنے من موہنے قلم سے آپ کے ہفتے کی روداد مرتب کی ہے جس سے آپ کا متفق ہونا ضروری ہے..... ورنہ برجوں کا طلسم کدہ ٹائیں ٹائیں فٹ ہو جائے گا، اس ہفتے کی روداد پڑھتے پڑھتے یہ بات آپ کے لیے مزید دلچسپی کی حامل ہوگی کہ اس میں برج حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت سب کی شراکت داری برابر ہوتی ہے۔ یوں جیسے تمام جماعتیں متحد ہو کر جذبہ خیر سگالی کے بیانات دیا کرتی ہیں۔

پیر..... کھل کر اظہار کریں، کسی سے دبے کی ضرورت نہیں، اپنی موجودہ حالت بہتر بنانے کے لیے اماں، بہنوں کے خطابات کی فصل مزید پکا کر استعمال کریں۔ ان کے تجربات کو ہی زندگی کا اصل سبق سمجھا کریں..... ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت ہے نہ سننے کی..... اور نہ ہی کسی کی بات پر کان دھرنے کی۔

سب سے پہلے خود کھانا کھائیں..... پھر پانی ملا کر دیگر افراد کے لیے رکھ دیں۔ آج کے دن اپنی ظاہری شان و شوکت پر بھی زور دیں اس سلسلے

ننھا جذبہ

ایک چیونٹی بھاگی بھاگی بدحواسی کے عالم میں جارہی تھی۔ کسی جانور نے روک کر پوچھا: ”کدھر جارہی ہو؟“ چیونٹی جاتے ہوئے بولی۔ ”ہاتھی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے خون کی بوتل دینے جارہی ہوں۔“

سردیوں کے آزمودہ ٹوٹکے

☆ گلابیٹھ جائے تو گرم دودھ میں دو چٹکی ہلدی ڈال کر پیئیں۔ وزن بھی کم ہوگا طاقت بھی آئے گی اور گلابی صحیح ہوگا اور خون بھی تیزی سے بنے گا۔

☆ پھٹی اریڑیوں کو درست کرنے کے لیے چار چمچ گلیسرین میں ایک لیموں کا رس اور دو چٹکی پسلی ہوئی پھٹکری ملا لیں، دن میں دو مرتبہ لگائیں پاؤں نرم ہو جائیں گے۔

☆ ہونٹوں پر اگر دودھ کی بالائی میں زعفران ملا کر لگالی جائے تو ہونٹ نہ صرف گلابی ہوں گے بلکہ پھٹنے سے بھی بچ جائیں گے۔

☆ بال تیزی سے سفید ہو رہے ہوں تو رات سونے سے پہلے ایک پاؤ دودھ میں چند قطرے روغن بادام ملا کر تھوڑی چینی ڈال کر لی لیں روزانہ پینے سے قبض بھی ختم ہوگا اور سفید بال آہستہ آہستہ سیاہ ہو جائیں گے۔

☆ سردیوں میں نہانے سے قبل گرم پانی والی بالٹی میں تھوڑا سا مسٹرڈ پاؤ ڈال لیں تو ٹھنڈک کا اثر نہیں ہوگا۔

☆ آنکھوں کے گرد حلقے دور کرنے کے لیے لیموں کے چھلکے کو گرائنڈر میں پیس لیں اب کسی کولڈ کریم میں ملا کر پیسٹ بنالیں۔ رات کو حلقوں پر لگانے سے نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ اس کے علاوہ زیتون کے تیل کو سونے سے پہلے حلقوں کے گرد لگانے سے بھی حلقے ختم ہوتے ہیں۔

مرسلہ: عروج ذکی آفندی، کراچی ☆☆☆

انگوٹھا موبائل کے بٹن پر ہوگا
چہرے پر مسکراہٹ ہوگی
سج پڑھ کر سوچے گا کہ اب یہ میسج کس شیطان کو بھیجوں

خدا شہ

اب تو چینی لینے کے لیے بھی شناختی کارڈ کی ضرورت پڑتی ہے دوست۔ کہیں ایسا نہ ہو پیمبر لینے کے لیے نکاح نامہ دکھانا پڑے۔
مرسلہ: تمنا مشعل، گولارچی، ضلع بدین

غلطی

ایک صاحب ایک مووی دیکھ کر زور زور سے چلا رہے تھے۔ ”اوائے گدھے ہاں نہ کرنا، پھنس جاؤ گے اوائے پاگل سائن نہ کرنا ٹ جاؤ گے، ان کی بیوی نے ان کے پاس آکر پوچھا۔ ”آپ کون سی فلم دیکھ کر گالیاں دے رہے ہیں۔“ وہ صاحب بولے۔
”اپنی شادی کی فلم کو دیکھ کر۔“

از: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ لاہور

غزل

سائے پھسل رہے تھے درختوں کے درمیاں
ہم ساتھ چل رہے تھے درختوں کے درمیاں
سورج کی خود سپردگی، تاریکیوں کی گود
ارماں نکل رہے تھے درختوں کے درمیاں
مغموم سے کھڑے تھے وہاں ٹوٹے پھوٹے گھر
کچھ دیپ جل رہے تھے درختوں کے درمیاں
غربت کے چوہوں سے وہ نکلتا ہوا دھواں
ہولے اہل رہے تھے درختوں کے درمیاں
کچھ شام غم سا تھا سماں، کچھ الم بھی تھا
پہلو بھی جل رہے تھے درختوں کے درمیاں
بے نام سی اداسی، وہ بھیگی خنک سی شام
کھوئے سے چل رہے تھے درختوں کے درمیاں
لب بستہ ہو کے رہ گئے ڈسنے لگی تھی شام
بس سانس چل رہے تھے درختوں کے درمیاں
شاعر: مشیر طالب۔ مرسلہ: زمینی، مشیر، نیویارک

”یہ اپنا کمر تو وہیں پر ہے ہاں پرانا سامان چلا گیا جسے استعمال کرتے ہوئے اب تھک گئے تھے اور بور ہو گئے تھے۔“

”پھو ہڑ عورتوں کے یہی کرتوت ہوا کرتے ہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”احسن، یہ میں اپنے پاس سے لائی ہوں۔“

”کہیں سے بھی لائی ہو مگر پیسے کا زیاں کر دیا ناں.....“

”آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے اگر یہ بیڈ روم سیٹ لے آئی تو کیا ہوا.....؟“

”کیوں، پرانا فرنیچر تمہیں کاٹ یا مار رہا تھا یا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس کی موجودگی میں سالگرہ نہیں منائی جاسکتی؟“

”میرا تو خیال تھا کہ آپ خوش ہوں گے۔“ وہ روہانسی سی ہو گئی۔

”بانو..... اسی طرح کرتی رہیں نا تو میری ٹوپی بھی یک جائے گی۔ مجھے معلوم تھا تمہارے پاس تمہاری کمیٹی رکھی ہوئی ہے، دس کام سوچ لیے تھے میں نے اپنے..... مگر تم تو بغیر میاں سے پوچھے بغیر اجازت لیے اسے غارت کر آئیں..... نیلی جلا کر آگ لگا دی پیسوں میں۔“

”ہاں بھئی، حیرت تو ہمیں بھی ہوئی کہ خود ہی تن تنہا پھٹ پھٹ کرتے رکشے پر گئیں اور پھٹ پھٹ کرتا رکشا سوزو کی کے پیچھے لگاتے ہوئے آ بھی گئیں۔“ دیورانی بول رہی تھی جو بانو کا فرنیچر اپنے بچوں کے کمرے میں لے کر گئی تھی۔

”جب بیوی اپنے آپ کو شوہر سمجھنے لگے تو پھر گھر نہیں بنا کرتا۔“ احسن چلا رہا تھا گھر کے لوگ اس کی باتوں پر سر ہلارہے تھے اور وہ چپ چاپ کھڑی اپنے سر پرانے کی دھجیاں بکھرتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

چہرے جب اپنی بات بولتے ہیں تو انہیں پورا ہونے میں ٹائم نہیں لگتا..... سر جھاڑ منہ پھاڑ رکھنے والی بیویوں کی بات شوہر بھی رغبت سے نہیں سنتے..... طبیعت جب بھی خراب ہو تو آپ کہیں کہ آپ کو نظر لگی ہے۔ میاں جی سے ہزار کا نوٹ نظر اتارنے کے لیے فوراً لیں۔

سیرائز

فلموں میں ڈراموں میں یہی دیکھا تھا کہ بیوی اپنے شوہر کو کسی نہ کسی خاص موقع پر سر پرانے دیتی تو شوہر کھل جایا کرتے۔ ان کا خوشی سے سرشار چہرہ دیکھ کر ہیر و نرنز کے چہروں پر ایک عجیب سی سرشاری نظر آیا کرتی۔ یہی سب دیکھ کر بانو نے بھی یہی سوچا تھا کہ اپنی شادی کی سالگرہ مناتے ہوئے اپنے شوہر کو سر پرانے دے گی۔ اپنی کمیٹی اس نے کب سے سنبھال رکھی تھی اور یہی وہ اس کی واحد جمع پونجی تھی جسے وہ اس وقت خرچ کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح میاں جی کو شادی کی سالگرہ کا دن یاد نہیں رہے گا۔ اس لیے صبح ان کے جانے کے بعد اس نے اپنے بیڈ روم کا سامان نکال کر پھینکا اور قریبی فرنیچر مارکیٹ سے ایک درمیانے درجے کا بیڈ روم سیٹ لے آئی۔ نئی نوری مسہری پر خوب صورت بیڈ کور بچھایا، تین پٹ کی الماری میں میاں جی کے کپڑے ہینگ کر دیے۔ اس کا بیڈ روم واقعی بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ دیورانی نے آکر دیکھا تو بے حد تعریف کی اور اس کے رجحانیت کیے ہوئے بیڈ روم سیٹ کو اپنے بچوں کے کمرے میں لے گئی۔

شام کو احسن کمرے میں داخل ہوا تو ایک لخت یوں ٹھٹھک گیا جیسے غلطی سے کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہو گیا ہو۔

”کیا ہوا.....؟“ وہ احسن کو دیکھ کر مسکرائی۔

سکتے..... ہاں آج آپ آٹھ سو یا ہزار روپے صدقہ کر دیں تو بہتر رہے گا..... میاں سے یہ پیسے لے کر اپنی بھانجوں کو دے دیں..... ایک پنتھ دو کاج اسی کو تو کہتے ہیں۔

ہفتہ..... بچوں کو قابل اعتراض لوگوں سے بات نہ کرنے دیں..... (سرالیوں کی طرف واضح اشارہ ہے) آج کے دن عزیز واقارب اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ آپ ان سے دور دور رہیں۔ کوئی اپنا قرض واپس مانگ سکتا ہے، آپ اپنے شوہر کو ہمیشہ یہی بتائیں کہ ان کے دیے ہوئے پیسے ہمیشہ کم پڑ جاتے ہیں۔ میاں کے پاس جو بچت ہو اسے کسی زمین، مکان یا زیور میں لگوا دیں کہ ہر مہمان آپ کی بات سن کر صرف تالی بجائے گا..... اور یہ بات آپ کے لیے خاصی خوشی کی ہے۔

اتوار..... اتفاقی ملاقات رومان پرور رہے گی۔ پرانی باتیں اور پرانی یادیں آپ کو خوشی دیں گی، آج لکی نمبر آپ کی عمر کے حساب سے ہے۔ جتنی عمر آپ کی ہے..... وہی آج کے دن آپ کا لکی نمبر ہے۔ آج تیز دھاری چیز کو ہاتھ میں نہیں لیجیے گا۔ سبزی بنانے یا پیاز کاٹنے میں تھکن ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تمام تھکن آلود کاموں سے پرہیز کریں۔ سرخ ساڑی، گلابی سوٹ یا کسی بھی شوخ رنگ کے کپڑے آپ کو مزید دلفریب بنا دیں گے۔ کوشش کریں کہ ہر اتوار کو آپ شوخ کپڑوں میں رہا کریں۔ کلر کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے..... آپ اپنے من پسند رنگ پہنا کریں۔ اتوار کو جیولری بھی زیادہ لاڈا کریں..... گھر میں اس طرح تیار ہوں جیسے کسی دعوت میں جارہی یا وہاں سے آئی ہیں..... ایسے میں گھر کے دیگر لوگ آپ کے آگے صرف ٹرے ہی لگائیں گے..... اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔

یوں بھی یہ اصول پلو سے باندھ لیں شگفتہ

چوری کی گئی رقوم کا تذکرہ کبھی میاں کے سامنے نہ کریں۔ آج آپ کے دائرہ اثر میں اضافہ ہوگا۔ آپ اپنے راستے کی رکاوٹیں خود دور کریں..... جو شخص آپ کو ایک سنائے آپ اس کو گیارہ سنائیں کہ آج آپ کا لکی نمبر بھی 11 ہے۔ ہاں آج آپ کی کسی بھی بات پر میاں روٹھ کر اپنے میکے جاسکتا ہے تو پروا نہ کریں وہ خود ہی واپس آ جائے گا۔

جمعرات..... دوستوں کو مرعوب کرنے کے لیے سماجی تقریبات میں شرکت کریں مگر تنک سک سے درست ہو کر آج کوئی خوشخبری ملے گی..... دفتر سے واپسی پر میاں جی، مگلیتر یا پسندیدہ ہستی آپ کو کوئی گفٹ دے۔ کوئی گم شدہ چیز مل جائے گی۔ خیال یہی ہے کہ ناپسندیدہ خواتین کو جو ظاہر داری کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ تحائف دے دیے تھے آج شاید ان کی واپسی ہو جائے۔ آپ کو شک ہے کہ کوئی فرد ایسا ضرور ہے جو آپ کی فیملی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ آپ کا یہ شک سو فیصد درست ہے۔ میاں کے اطراف گہری نظر رکھیں۔ آج حمل ضائع ہو سکتا ہے۔ جی ہاں برج حمل سے تعلق رکھنے والی کوئی خاتون آپ کے سامنے منہ کی کھائیں گی۔

جمعہ..... شوہر کے ساتھ آرام کریں کسی ایسے فرد کو گھر کے اندر نہ آنے دیں جو آپ کی بوریٹ کو بڑھانے کا سبب بنے..... اس لیے گیٹ کے باہر تالا ڈال دیں۔ اسد اور ثور آپ کی تاک میں ہیں ان سے ہر صورت بچاؤ کریں، آج حالات ڈرامائی طور پر آپ کے حق میں ہو جائیں گے..... ظاہر ہے جب سارا دن میاں کے کانوں میں آپ من من کریں گی تو وہ آپ ہی کی زبان بولیں گے..... آج کے تمام اوقات لکی نمبر ہیں اور آپ ان سے خوب فائدہ اٹھا سکتی ہیں کہ میاں جی آپ کے آگے کچھ بول نہیں

☆ ماہ زیر..... صادق آباد
سوادِ تنگی کو کس قدر سیراب کرتا تھا
اب اس آبِ رواں کی ہر عنایت یاد آتی ہے
☆ عربہ ناز..... کوٹلی
میرے ہونے ہی سے تو مشروط ہے ہونا تیرا
دیکھنے والا نہ ہو تو آئینہ کچھ بھی نہیں
☆ پروین..... سیدر آباد
ہزاروں شوق و اراماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کر لوں
☆ عزیز نوشین..... گوجرانوالہ
نیا ہے سال خوشی یوں منائیں اب کے برس
کہ گیت امن کے سب مل کے گائیں اب کے برس
دلوں میں پھول اگائیں نئی محبت کے
کہ نفرتوں کو دلوں سے مٹائیں اب کے برس
☆ نفیسہ حسین..... لاہور
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
☆ فاطمہ بلال..... کینیڈا
تم تو کہتے تھے کہ سب قیدی رہائی پا گئے
پھر پسِ دیوارِ زنداں رات بھر روتا ہے کون
☆ صبا سجاد..... دہلی
اگر ہم واقعی کم حوصلہ ہوتے محبت میں
مرض بڑھنے سے پہلے ہی دوا تبدیل کر لیتے
تمہارے ساتھ چلنے پر جو دل راضی نہیں ہوتا
بہت پہلے ہم اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے
☆ جویریہ سہیل..... کراچی
پسا نہ کر سکی مجھے شب بھر ہوائے دار
ایسے میں وہ چراغِ سحر بھی نہ دے سکا
روشن خیال حکمران آنکھیں خرید کر
مفلس کو ایک لقمہ تر بھی نہ دے سکا
☆☆☆

عقل نے لاکھ کی عناں گیری
عشق آمادہ جنوں ہی رہا
☆ صبا کمال..... فیصل آباد
اک ناتمام خواب مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے
☆ یاسمین کنول..... پسرور
صرف اشک و تبسم میں الجھے رہے
ہم نے دیکھا نہیں زندگی کی طرف
رات ڈھلتے جب اُن کا خیال آگیا
تنگی بندھ گئی چاندنی کی طرف
☆ ممتاز خانم..... کراچی
نہیں ہے چشم کو اب فرصتِ نظارگی، ورنہ
کہیں رستہ بچھاتے اور تجھے رہ گیر کرتے ہم
☆ شائستہ رضا..... سرگودھا
دل اک خون کے قطرے سے زائد نہ تھا مگر
آنسوؤں نے اس کو بھی طوفاں بنا دیا
وہ قیس تھا کہ جس نے بیاباں کو گھر کیا
ہم نے تو اپنا گھر ہی بیاباں بنا دیا
☆ پروین افضل..... بہاول نگر
چراغِ حق پرستی کسی سے گل ہو نہیں سکتا
اندھیرا جیت جائے روشنی سے ایسا ہو نہیں سکتا
☆ فیصلہ آصف خان..... ملتان
ہمیں تو عمر کرنی ہے بسرِ رنجِ ملال میں
خدا کرے وہ خوش و آباد رہے نئے سال میں
☆ عزیز وسیم..... گوجرانوالہ
اب تو آنکھوں کے کنارے بھی سوکھ گئے
خزاں کا موسم بھی آیا اور پتے جھڑ گئے
رانا سال نیا اور انوکھا نشان چھوڑ گیا
چھڑنے والے ایک اور کسک دے گئے
☆ نفیسہ آرا..... دہلی
جس تمنا نے مجھے ضبط کی خوشی تھی
وہ تمنا لبِ فریاد تک آپہنچی ہے

صبحِ عشرت پریشان ہوئی سو ہوئی
شامِ غم تو نہ ویراں کرو دوستو
☆ سامعہ تبسم..... ملتان
میرے لیے حرفِ دعا ہو گیا وہ شخص
مارے دکھوں کے دور ہو گیا وہ شخص
پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کر اسے قتل
پھر یوں ہوا کہ مجھ سے قضا ہو گیا وہ شخص
☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر
کیا خاک لڑیں گی، مرے دل سے تری آنکھیں
جو جھکتی ہیں شرم سے، جو چھپتی ہیں حیا سے
☆ غزالہ طارق..... سرگودھا
فلک گر پینا ہی تھا تو ہم کو
بناتا خاک اس کے رہ گزر کی
ازل سے اپنی قسمت میں لکھی تھی
جدائی اور وہ بھی عمر بھر کی
☆ عرشہ جنید..... کراچی
کبھی جو جھانکنا چاہا کسی گریباں میں
تو آپڑی ہے نظر اپنے ہی گریباں پر
گئے تھے کر کے تبسم وہ مجھ سے وعدہ صبح
نہ جانے کون سے لمحوں میں کھو گئی وہ سحر!
☆ سدرہ کلثوم..... لکی مروت
بصارت کچھ نہیں کرتی بصیرت کام آتی ہے
نظر آتا نہیں خدا مگر محسوس ہوتا ہے
☆ جمیں نیاز..... ملتان
وہ دور بھی دیکھا ہے تاریخ کی آنکھوں نے
لمحوں نے خطا کی اور صدیوں نے سزا پائی
☆ سائرہ عباس..... کراچی
آگے مرا نصیب کہ کام آئے یا نہ آئے
اک بار بختِ خفته کو آکر جگا تو دو
☆ ماریہ فراز..... لاہور
علم کے تھے بہت حجاب مگر
حسن کا سحر پُرفسوں ہی رہا



میں اکثر گنگنائی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ فریدہ فری یوسف زئی..... لاہور
اگر وہ خوش ہے مجھے بھول کر تو یوں ہی کبھی
خدا کرے نہ میری یاد اس کو آئے کبھی
☆ کائنات حلیم..... میرپور خاص
آنکھوں نے سمیٹے ہیں نظروں میں ترے جلوے
پھر بھی دل مضطر نے تسکین نہیں پائی
یہ بزمِ محبت ہے، اس بزمِ محبت میں
دیوانے بھی شیدائی، فرزانے بھی شیدائی
☆ ماہ نور قیصر..... راولپنڈی
جو ہو سکے تو ہواؤں کا راستہ بدلو
چراغِ جلتے نہیں انجمنِ بدلنے سے
ٹھہر تو جائیں گے اک دوسرے کے سائے میں ہم
سفر تو کم نہیں ہو گا تھکن بدلنے سے
☆ فضہ بتول..... بہارہ کھو
سلیم حسن رخ یار ہی کا پرتو ہے
جو آسماں پہ ستارہ ہے دیکھنے کے لیے
☆ نگہت اعوان..... اسلام آباد
کیا ہوا جو ستارے چمکتے نہیں
داغِ دل کے فروزاں کرو دوستو

ابھی خاصا قرض چکانا ہے

کھ ۱۱۱

تخلیق کار کسی مجبور واز پرندے کی طرح گمان کی منزلیں طے کر ڈالتا ہے..... کبھی ہجر کی بارشوں میں بھیگ کر، کبھی تنہائی اوڑھ کر، کبھی اداسی کے ملبوس میں..... گمان کے یہ سارے روپ ہمیشہ تروتازہ رہتے ہیں..... رنگوں کے مانند کھلے ہوئے..... جن پر بھی اوس نہیں پڑتی..... حجاب عباسی، کی ان خواہشات کو نزہت رشید نے کراچی سے ارسال کیا ہے۔

غزل

آج مرے اعزاز میں اس نے کیا اچھا سامان کیا گھر میں برف کے پھول سجائے سورج کو مہمان کیا محفل میں دشوار تھا اُن سے بولنا بھی چپ رہنا بھی آنکھوں میں پہچان رہی اور لہجے کو انجان کیا اہل جنوں سے بات چلی تو قصہ دل کے بھید کھلے موسم جاناں چھوڑ فصول دار کو پھر عنوان کیا محفل میں ہر ایک سے ہنس کر باتیں کرنے والے نے ایک نظر ہم پر بھی ڈالی اتنا تو احسان کیا لگتی گھڑیاں گن گن کاٹیں کتنے موسم بیت گئے دل کا درد نہ ٹھہرا پل بھر لاکھ کسی کا دھیان کیا

کھ ۱۱۱

وقت گزرنے کے ساتھ ہر رنگ اپنی کشش کھودیتا ہے اور پرانا ہو جاتا ہے..... محبت میں بہت سے مواقع آتے ہیں جو انسان کو تُوڑ دیتے ہیں۔ افتخار عارف کی غزل میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے اس کا انتخاب عظمیٰ نے لاہور سے کیا ہے۔

غزل

عشق کیا کہ بھروسا بھی نہیں تھا شاید اس سے میرا کوئی رشتہ بھی نہیں، تھا شاید خلقت شہر میں جس ہار کے چرچے ہیں بہت میں وہ بازی کبھی کھیلا بھی نہیں تھا شاید زیست کرنے کے سب آداب اسے ازیر تھے

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لے کر وہ جو آسودہ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم اب کے موج آئی تو پلٹے گی کنارے لے کر ایسا لگتا ہے کہ ہر موسم ہجراں میں بہار ہونٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پہ تمہارے لے کر شہر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش پھرتا رہتا ہے جو گلیوں میں غبارے لے کر نقد جاں صرف ہوا کلفت ہستی میں فراز اب جو زندہ ہیں تو کچھ سانس ادھارے لے کر

کھ ۱۱۱

دبے پاؤں..... بنا کسی آہٹ کے وقت اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گزر جاتا ہے کہ احساس تک نہیں ہوتا..... اور پھر اس کو پکارنا پڑتا ہے..... آواز دینی پڑتی ہے..... جیسے ایک دروازہ حیرت ہے..... ایک خواب ہے..... ایک دیا ہے..... وقت کے پروں میں قید عمر رواں کے اُن گنت لمحوں میں سے ایک ایسا لمحہ کشید کرنا ہر حساس دل کی خواہش ہوتی ہے..... جس میں کچھ خوابوں کی تعبیر لازمی امر بن جاتی ہے..... اعتبار ساجد کی اس پکار کو کشف فاطمہ نے راول پنڈی سے منتخب کیا ہے۔

کچھ خواب ہیں جن کو لکھنا ہے

تعبیر کی صورت دینی ہے

کچھ لوگ ہیں اجڑے دل والے

جنہیں اپنی محبت دینی ہے

کچھ پھول ہیں جن کو چننا ہے

اور ہار کی صورت دینی ہے

کچھ اپنی نیند باقی ہے

جسے بانٹنا ہے کچھ لوگوں میں

ان کو بھی تو راحت دینی ہے

اے عمر رواں!

آہستہ چل



میرا انتخاب

محسوسات اور کیفیات جذبہ محبت کے تجھے ہیں..... معاملات دل میں یادوں کا ایک خزانہ مخفی ہوتا ہے..... لمحہ وصل کا ایک لمحہ ہجر کے ہزاروں لمحوں پر فوقیت رکھتا ہے..... فیض احمد فیض بھی رنگِ فرقت اور قربت میں ڈوبے نظر آ رہے ہیں فیض کی اس غزل کو آصفہ برکت علی نے لاہور سے ارسال کیا ہے۔

غزل

کبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا کبھی راتیں بھی کلفتیں کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں کبھی دوریاں بھی قربتیں یہ سخن جو ہم نے رقم کیے یہ ہیں سب حق تیری یاد کے کوئی لمحہ صبح وصال کا کئی شام ہجر کی مدتیں جو تیری مان لیں ناصحا تو رہے گا دامن دل میں کیا نہ کسی عدد کی عداوتیں نہ کسی صنم کی مروتیں چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں یہ مزار اہل صفا کے ہیں یہ ہیں اہل دل کی تربتیں میری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کا تب وقت نے کسی اپنے کل میں ہی بھول کر کہیں لکھ دی ہل مسرتیں

کھ ۱۱۱

محبوب کو ایک نظر دیکھ لینے میں جو احساس پوشیدہ ہے اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا..... مگر شاعری میں اس لمحہ نظر کو بیان کرنے میں ہزاروں ورق سیاہ نظر آتے ہیں..... تشبیہات و استعارات کا ایک سمندر ہے جو صرف وسیع ہوتا ہے..... سمندر نہیں..... اس ایک ساعت..... ایک لمحے کو سحر علی نے قلمبند کر دیا ہے۔ اس نظم کو سمیرا عاطف نے کراچی سے ارسال کیا ہے۔

ضرورت نہیں رہتی

نہ جانے کیا ہے تم میں

تمہیں جو دیکھ لوں تو کسی تصویر میں پھر رنگ بھرنے کی مکمل اس کو کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی سنہری راستوں کے روح پرور فاصلوں پر

پاؤں دھرنے کی

نگلوں سے بات کرنے کی

ضرورت ہی نہیں رہتی

تمہیں جو سوچ لوں تو

فلک پر چاند تکنے کی

کسی منظر میں کھونے کی

ضرورت ہی نہیں رہتی

تمہیں جو روک لوں تو

کسی بتے ہوئے دھارے کو مڑنے کی

کسی بارش کے قطرے کو بکھرنے کی

کسی بے تاب ساعت کو بھلنے کی

ضرورت ہی نہیں رہتی

کھ ۱۱۱

فراز کی شاعری کے اوصاف اور محاسن کی بنیادوں تک پہنچنے کی کوئی باضابطہ کوشش ابھی تک نہیں ہوئی۔ احمد فراز کو جیتے جی ایسی شہرت ملی ہے جو افسانہ لگتی ہے۔ غیر معمولی شہرت اور بے تحاشا مقبولیت فراز کی شاعری کا حجاب بن کر رہ گئی ہے۔ احمد فراز کی ایک منفرد انداز کی غزل کا انتخاب سعدیہ رحمان نے پھالیہ سے کیا ہے۔

غزل

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

جلدی آؤ

بھابی کے میکے سے
ڈھیر سارا میوہ آتا ہے
آپا، باجی، بے جی
سب آ جاؤ.....
سردیوں کا میوہ
فری میں کھا جاؤ

از: نور افشاں، شکارپور

صرف اتنا سن

میری آنکھوں میں بسنے والے
صرف اتنا سن
میری آنکھوں میں اب
موتیا اتر آیا ہے
اس لیے اب میں
تمام خاروں کو
پھینک رہی ہوں
اس لیے تو بھی کہیں
چلا جا.....

از: رفعت خادم حسنین، اوستہ محمد، بلوچستان

دشمن کھیں کا

اے دھونی
میں نے تجھے
اپنی ساس کے چار چیکٹ غرارے
اپنی نند کے دو غلیظ جمپر
دھونے کے لیے دیے تھے
تو سب کپڑے دھو کر لے آیا
اور مجھ دکھیا کا ایک رومال
جو دھلنے گیا تھا
اسے لے کر نہیں آیا
کیا تو بھی میرا سرالی دشمن ہے

(انجم انصار کے جلت رنگ سے)

از: ناہیدہ بنت نور، واہ سینٹ ورکس

سندیسے



پاکیزہ
بہنیں

وجہ خاص

سنو میرا رومال
میرا موبائل
اور بھائی کی بائیک
واپس کر دو
کہ اب تم مجھ سے
زیادہ میری سہیلی
میں دلچسپی لے رہے ہو۔

شاعرہ: عظمیٰ آفاق سعید
از: منور، گوجرانوالہ

پہچان

دوستی کر کے دیکھی
کچھ نہ پایا
احسان کر کے دیکھا
یا گل بنایا
کیسے پہچانوں میں
مردوزن سب نقاب
اوڑھا کرتے ہیں

از: صبا نور، لیہ

مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید
خاک اڑتے ہوئے بازوؤں میں دیکھا سب نے
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید
اس کی آنکھوں میں بشارت تھی نئے خوابوں کی
میں اسے دیکھ کے چونکا بھی نہیں تھا شاید
ایک بادل کہ مرے نام سے منسوب ہوا
مرے صحرا میں تو برسا بھی نہیں تھا شاید

جو شے آنکھوں سے اوجھل ہو..... جو منظر پس
منظر میں ہو..... عکس پس آئینہ ہو..... اس کی کشش کبھی
ختم نہیں ہوتی..... حقیقتیں منکشف سہی مگر اس کے
ابہام بھی خوب صورتی رکھتے ہیں..... ویرانے حسین
معلوم ہوتے ہیں۔ ان کیفیات کا اظہار نصرت مسعود
اپنی اس غزل میں نمایاں کر رہی ہیں۔ اس کا انتخاب
ماہین حنیف نے کراچی سے کیا ہے۔

غزل

چشم حیرت پہ کوئی در نہیں کھلنے دیتا
آنکھ کھل جائے تو منظر نہیں کھلنے دیتا
ایک خواہش مجھے پستی سے اٹھاتی ہے مگر
ایک ڈر ہے جو مرے پر نہیں کھلنے دیتا
ہاتھ کی ساری لکیریں ہیں جزیروں سے بھری
اور جزیروں کو سمندر نہیں کھلنے دیتا
تانا کھل جائے کوئی نقص پس نقش گری
آئینہ عکس کے اندر نہیں کھلنے دیتا
کون جانے، کسے معلوم حقیقت کیا ہے
بھید اپنا وہ کسی پر نہیں کھلنے دیتا
گھیر لاتا ہے محیط غم لا حاصل میں
پھر کوئی راستہ باہر نہیں کھلنے دیتا
پھیر دیتا ہے کبھی موج بلا خیز کا رخ
اور کبھی آگ کے جوہر نہیں کھلنے دیتا
دیکھ پھر خاک نشینوں کے خدائی دعوے
تو اگر دفتر محشر نہیں کھلنے دیتا

فریدہ خانم

مجھے تو آپ سب جانتے ہی ہیں فریدہ
خانم، پیارے پاکیزہ کی دلاری اور باجی انجم کی



اور آپ کی سب کی
پسندیدہ۔ پاکیزہ میرا
ہارٹ فیورٹ ہے۔
میرا اور اس کا ساتھ
بہت پرانا ہے اور اللہ
تعالیٰ یہ ساتھ سدا

سلامت رکھے، آمین۔ میں لاہور میں پیدا
ہوئی اور تعلیم ایم اے (اردو) شریلیٹ ان
لاہور رین شپ اور آفس مینجمنٹ کے علاوہ کئی
کورسز کیے ہیں۔ ریڈیو میں بے تحاشا انعامی
مقابلے جیتے۔ شاعری نشر ہوئی اس کے علاوہ ٹی
وی کے بہت سے پروگرامز میں شرکت کی۔
پاکیزہ سے ایک عدد شیلڈ بھی مل چکی ہے اور
مزید کی تمنا ہے۔ بہت سے مشاعروں میں
شرکت کر چکی ہوں۔ کتابیں اور جانور آپ کے
بہترین اور وفادار دوست ثابت ہوتے
ہیں۔ میری زندگی کی ایک بہت بڑی خوشی اور
کامیابی میری کتاب ”مختلف“ ہے۔ جس میں
میرا اپنا آپ جھلکتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ
میں کوئی ایسا کام کروں کہ ایک مثال بن
جاؤں۔ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہوں،
اپنے مذہب، ملک اور انسانیت کے لیے کوئی ایسا
کام کر جاؤں کہ میرا رب مجھ سے خوش
ہو جائے۔ اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا
کروں، اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کی موت دے،
میرا نام شہیدوں میں شامل کرے، آمین آپ
سب بھی دعا کیجیے گا۔ لازمی۔ جزاک
اللہ۔ آمین۔

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



گوشت میتھی پالک

اشیا: گوشت، آدھا کلو۔ پالک، ڈیڑھ کلو۔ میتھی، ایک پاؤ۔ سوئے، چند پتے۔ پیاز، دو عدد۔ لہسن، ایک گٹھی۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ سرخ مرچ، نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: پالک ایک، ایک پتہ چن کر باریک کاٹ لیں۔ میتھی کو علیحدہ چن کر اور کاٹ کر رکھ لیں۔ اس کے بعد دونوں کو الگ الگ پانی میں خوب اچھی طرح دھو لیں۔ اب گوشت کو پیاز، لہسن ڈال کر گھی میں بھون لیں۔ جب گوشت اچھی طرح بھن جائے تو اس میں میتھی ڈال دیں اور ہلکی آگ پر پکائیں یہاں تک کہ اس کا رنگ بدل جائے۔ کٹی ہوئی پالک کو علیحدہ برتن میں ڈال کر اس کے پانی میں چند منٹ ابالیں پھر اتار کر پانی نکال دیں اور اسے سل پر باریک پیس لیں۔ جب گوشت میں میتھی خوب بھن کر مل جائے تو اس میں پیس ہوئی پالک ڈال دیں اور تھوڑا سا بھون کر اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر پکنے دیں۔ جب پالک بالکل پک جائے اور گوشت کے ساتھ مل جائے تو بھون لیں تاکہ گھی چھوڑ دے۔ اب اس پر کٹے ہوئے سوئے اور ہری مرچ ڈال کر دم پر لگا دیں اور چند

منٹ کے بعد اتار لیں۔

ملائکہ طارق، کراچی

گاجر کی کھیر

اشیا: گاجر، ایک کلو۔ دودھ، دو کلو۔ چاول، ایک چھٹانک۔ چینی، ایک پاؤ۔ الائچی، آٹھ عدد۔ کیوڑہ، چار چمچ بڑے۔ بادام، ایک چھٹانک۔

ترکیب: گاجروں کو چھیل کر ان میں سے گٹھلی نکال لیں اور انہیں کدو کش کر لیں اور دودھ کو ایک برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیں۔ ایک ابال آجائے تو اس میں گاجر اور پہلے سے بھگوئے ہوئے چاول، ایک ساتھ ڈال دیں۔ آٹھ ہلکی کر دیں۔ گٹھنے ڈیڑھ گٹھنے بعد دیکھیں کہ گاجر میں گل گئی ہیں اور دودھ خشک ہو کر اندازے کے مطابق رہ گیا ہے تو اس میں چینی ساتھ شامل کر دیں اور چمچ سے اچھی طرح حل کریں تاکہ گٹھ کر کھیر کی شکل ہو جائے۔ اب اس میں الائچی پیس کر کیوڑہ ڈال دیں اور نیچے اتار لیں اور ڈش میں نکال لیں یا پلیٹوں میں ڈال کر پستہ بادام باریک کاٹ کر چھڑک دیں۔ پسند کریں تو اوپر چاندی کے ورق بھی لگا سکتے ہیں۔

ریحانہ وسیم الدین، حیدر آباد

چکن کارن سوپ

اشیا: چکن، ڈیڑھ کلو (ثابت رہیں چکن گل جائے تو ہڈیوں سے علیحدہ کر لیں)۔ کارن فلو، تین کھانے کے چمچ۔ کریم آف کارن، ایک چھوٹا ٹن۔ چکن کیوب ملا ہوا میدہ، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل کا تیل، چند قطرے۔ پنجنی، پانچ کپ (ایک کپ علیحدہ رکھ لیں)۔ چینی، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ انڈے، دو عدد۔ تیل، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: ایک بڑی دیگی میں پنجنی اور کریم آف کارن ڈال کر ہلکی آٹھ پر پکنے دیں۔ جب ابال آجائے تو میدہ، چینی، سفید مرچ اور چکن کے ٹکڑے ڈال دیں۔ چمچ چلاتے رہیں جب ساری چیزیں یکجان ہو جائیں تو تیل ڈال دیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر رکھ لیں۔ جب سوپ پینے

کے لیے تیار کریں تو کارن فلور ایک کپ پنجنی میں گھول لیں اور ڈال دیں لکڑی کا چمچ چلاتے رہیں اور جب مناسب گاڑھا ہو جائے تو گرم گرم اچلتے ہوئے سوپ کا چولھا بند کر دیں۔ دیگی کو چولھے سے اتار کر دو تین منٹ بعد انڈوں کو ڈال دیں۔ جلدی جلدی چمچ چلاتے رہیں دوبارہ چولھے پر رکھ دیں جب انڈے کے ٹکڑے بن جائیں تو تیل کا تیل ڈال کر گرم گرم پینے کے لیے پیش کریں۔

میمونہ عزیز، کراچی

دال مسور میتھی کے ساگ میں

اشیا: میتھی کا ساگ، آدھا کلو۔ وال مسور، آدھا پاؤ۔ پیاز، آدھا پاؤ۔ اورک، پیسا ہوا، دو چمچ۔ لہسن، پیسا ہوا، دو چمچ۔ لال مرچ پس ہوئی، ایک چمچ۔ ہلدی، آدھا چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔

ترکیب: ایک برتن میں گھی گرم کر کے اس میں پیاز باریک کتر کر تل لیں۔ سارے پے ہوئے مسالے ڈال کر خوب بھونیں، یہاں تک کہ مسالا اچھی طرح لال ہو جائے۔ میتھی کا ساگ دھو کر اور کاٹ کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی مسور کی دال بھی ڈال دیں۔ ان سب کو ملا کر اچھی طرح بھونیں کہ ساگ کا ہرا پن جاتا رہے۔ اب ایک پیالی پانی ڈال کر دیگی کو ڈھانپ دیں تاکہ دال اور ساگ دونوں اچھی طرح گل جائیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھکن اٹھا کر دیکھیں اگر پانی خشک ہو گیا ہو تو دھیمی آگ پر رکھ دیں۔ جب گھی چھوٹنے لگے تو اتار لیں۔ سالن تیار ہے۔

شبانہ مجید، پشاور

مولی کے پرائٹے

اشیا: مولی، ایک کلو۔ آٹا، ایک پاؤ۔ میدہ، ایک پاؤ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ مرچ، حسب ضرورت۔ ہرا دھنیا، حسب ضرورت۔ گھی، حسب ضرورت۔

ترکیب: مولی کو کدو کش کر لیں اور گھی کو کڑا کر اس میں نمک، مرچ ڈال دیں اور ساتھ ہی کدو کش کی ہوئی مولی شامل کر دیں۔ تھوڑا سا بھون کر دم پر لگا دیں۔ وہ

خوش ذائقہ

اپنے ہی پانی میں گل جائے گی۔ گل جانے پر خشک کر کے اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے پر ہر ادھنیا باریک کاٹ کر اس میں ملا دیں۔ اب آٹا اور میدہ ملا کر گوندھ لیں۔ اس میں آدھی چمچ نمک ملا لیں اور چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر آلو کے پرائٹوں کی طرح پرائٹے بنائیں۔

مسالا بھری مرچیں

اشیا: ہری مرچ بڑی، چھ عدد۔ (دھو کر لمبائی کے رخ شکاف کر لیں)۔ کالی پنے، دو چمچ۔ (دو گٹھنے تک پانی میں بھگوئیں)۔ پیاز، دو عدد۔ (باریک کاٹ لیں)۔ لہسن، چار جوئے۔ اورک، ایک انچ کا ٹکڑا۔ (سب کو پیس لیں)۔ ہری مرچ، حسب منشا۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ ہلدی، پاؤ چمچ۔ لال مرچ، حسب منشا۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: پہلے پیاز، پنے اور پیسا ہوا مسالا ملا کر تھوڑے سے گھی میں تل لیں اور پھر اسے مرچوں میں بھر دیں۔ اسی برتن میں گھی گرم کر کے مرچیں رکھیں اور ہلکی آٹھ پر ڈھکنا بند کر کے پکائیں۔ حسب ضرورت تھوڑا سا پانی بھی چھڑکتے جائیں۔ جب مرچیں گل جائیں تو تھوڑا اور گھی ڈال کر مرچوں کو تل لیں۔

کھیرے کا رائتا

اشیا: دہی، ایک کپ۔ کھیرا، آدھا کپ (چھیل کر باریک چوپ کر لیں)۔ نمک، حسب ذائقہ۔ کالی مرچ پس ہوئی، حسب ذائقہ۔ زیرہ پاؤ ڈر، 1/8 چائے کا چمچ۔ شکر، آدھا چائے کا چمچ۔ لال مرچ پس ہوئی، ایک چٹکی۔ ہرا دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: دہی کو پالے میں ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں اگر تھوڑا سا پانی ڈالنے کی ضرورت ہو تو ڈال لیں۔ چوپ کیا ہوا کھیرا، نمک، کالی مرچ، زیرہ پاؤ ڈر اور شکر دہی میں ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ کھیرے کے رائتے کو سرونگ بال میں نکالیں۔ باریک کٹا ہوا دھنیا اور لال مرچ کا پاؤ ڈر چھڑک کر پیش کریں۔

صائمہ امین، لاہور



دیکھ لیتا ہے تو وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں اب کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوں۔

یہ بات ہم سب کو خوب اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ خواب اپنی ذات میں نہ تو کسی کا درجہ بلند کرتا ہے اور نہ ہی اجر و ثواب کا موجب ہوتا ہے۔ بلکہ اصل دار و مدار... ہم سب کے بیداری کے اعمال پر ہے..... ہمیں ہر وقت یہ دیکھنا ہے کہ ہم بیداری میں کیا عمل کر رہے ہیں؟

لہذا اگر کوئی اچھا خواب دیکھے مثلاً اپنے بارے میں کوئی دینی یا دنیاوی ترقی دیکھیں تو اس صورت میں صرف اپنے جاننے والے اور اپنے محبت کرنے والوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کریں۔ دوسروں کو نہ بتائیں..... بعض اوقات کم علم لوگ خواب سن کر اس کی الٹی سیدھی تعبیر بیان کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اچھے خواب کی تعبیر اسی کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اس لیے اپنے خواب صرف اپنے محبت کرنے والوں کو سنائیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔

اگر کوئی شخص برا خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”تم میں سے کوئی برا خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے (بلکہ) چاہیے کہ وہ کھڑا ہو جائے اور (نفل) نماز پڑھے۔“

بُڑے خواب سے بچنے کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر پر عمل کرنا بہت مفید ہے۔

1۔ رات کا کھانا کھانے کے فوراً بعد نہ سوئے

بُڑے خواب سے بچنے کی تدابیر اور دعا انسان پر لازم ہے کہ عالم بیداری کی فکر کرے اور بیداری والی زندگی میں اللہ تبارک و تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے نورانی طریقوں پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کرے کہ آخرت میں سوال اسی زندگی سے متعلق ہوگا اگر یہ زندگی اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام اور رسول ﷺ کے طریقوں کے موافق ہو تو چاہے انسان اپنے آپ کو خواب میں کسی بھی حالت اور مقام پر دیکھے تو اسے پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے اور اگر اللہ نہ کرے اس کے اعمال میں کوتاہیاں ہیں تو خواہ اپنے آپ کو خواب میں اچھے سے اچھے مقام پر بھی دیکھ لے تو کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی اس پر مطمئن ہونا چاہیے۔

حضرت محمد بن سیرین کا ارشاد ہے۔ خواب کسی انسان کو دھوکے میں نہ ڈالے اور وہ یہ نہیں سمجھے کہ میں بہت پہنچا ہوا ہوں اور اس کے نتیجے میں بیداری کے اعمال سے غافل ہو جائے۔

خوابوں کے پیچھے بہت زیادہ پڑنا مطلوب اور مقصود نہیں، البتہ اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن اس پر نجات کا دار و مدار نہیں کیوں کہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔ ہمارے طبقے میں ایک بڑی تعداد ہے جو خوابوں کے ہی پیچھے پڑی رہتی ہے۔ آج یہ دیکھا تھا، کل وہ دیکھ لیا..... دن رات یہی فکر ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے۔ وہ اسی کو منتہا و مقصود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے اس لیے پھر ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے بارے میں اچھا خواب

بلکہ وقفہ رکھے کہ پیٹ بھر کر فوراً لیٹنے سے بخارات ذہن پر جمع ہو کر برے خواب نظر آتے ہیں اس لیے رات کو کھانے کے بعد ٹھنڈا آداب میں سے ہے۔

2۔ عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ ذکر و اذکار کر کے اور با وضو ٹھنڈا چاہیے اور جب تک نیند نہ آئے اللہ تبارک و تعالیٰ کا ذکر کرتے رہنا چاہیے۔ جو سورتیں یاد ہیں وہ پڑھتے رہیں۔ پہلا کلمہ، تیسرا کلمہ پڑھیں، چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھتے رہیں۔

3۔ کوئی ذہنی دباؤ یا غم کی صورت ہو تو اسے بھولنے کی کوشش کریں۔ بار بار اسے یاد نہ کریں اور تقدیر پر راضی رہیں۔ ہر حال میں اللہ کا شکر کرنے کی عادت ڈالیں یقیناً مصیبت بھی راحت میں تبدیل ہو جائے گی۔

اور اگر پھر بھی کوئی برایا ڈراؤنا سا خواب نظر آئے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی پناہ طلب کریں شیطان مردود سے اور بائیں جانب تھکریں اور کروٹ بدل کر بے فکر ہو کر سو جائیں۔

۱۴ ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جب برا خواب دیکھو تو اس دعا کو پڑھ لیا کرو۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ وَسَيِّئَاتِ الْأَحْلَامِ فَإِنَّهَا لَا تَكُونُ شَيْئاً

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطان کے عمل سے اور برے خواب سے کیونکہ وہ کچھ نہیں ہے۔“

اولاد کی اصلاح کے لیے

1۔ اگر اولاد میں کوئی برائی ہو تو یہ دعا ہر نماز کے بعد اور جب بھی اولاد پر نظر پڑے تو پڑھیں۔

(رَبِّ) وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي

ترجمہ: (اے میرے رب) میری اولاد کو نیک بنادیجیے۔“ (الاحقاف: 46: آیت 15)

خطا معاف کرنا

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ”قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا۔ وہ لوگ کہاں ہیں جو لوگوں کی خطائیں معاف کر دیا کرتے تھے وہ اپنے پروردگار کے حضور میں آئیں اور اپنا انعام لے جائیں کیونکہ ہر مسلمان جس کی یہ عادت تھی بہشت میں داخل ہونے کا حقدار ہے۔“

از: ارم کمال..... فیصل آباد

2: اگر اولاد بے نمازی ہو تو یہ قرآنی دعا

پڑھیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ

ترجمہ: (اے میرے رب) مجھے اور میری اولاد کو نماز کا (خاص) اہتمام کرنے والا بنادے۔

اے ہمارے رب، میری دعا قبول فرما۔“ (ابراہیم 14 آیت 40)

نوٹ: اس کے ساتھ آیت (ابراہیم 14: آیت 41) بھی ملا لیں تو بہت بہتر ہے۔

ایک پیاری دعا

فجر کی سنتوں سے فارغ ہو کر وہیں بیٹھے بیٹھے تین مرتبہ یہ پڑھیں۔

اللَّهُمَّ رَبِّ جِبْرِائِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ وَ مُحَمَّدٍ رَّبِّ النَّارِ

ترجمہ: اے اللہ! جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور محمد نبی ﷺ کے پروردگار! میں جہنم سے تیری پناہ

لیتا ہوں (تو مجھے بچالے) بحوالہ حسن، حصین۔

☆☆☆



رہتی ہوں۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے الرجی بہت زیادہ ہے۔ ذرا سی مٹی بھی اڑے تو بہت زیادہ نزلہ زکام کی شکایت ہو جاتی ہے۔ کئی کئی دن تک یہ مسئلہ میرے ساتھ رہتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صبح سوکر اٹھتی ہوں تو میرے چہرے پر بہت زیادہ سوجن ہوتی ہے۔ میری عمر 20 سال ہے، میرا وزن بھی بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور جسم بھی پھولتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے میں اپنی عمر سے زیادہ دکھائی دیتی ہوں۔ میں نے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک ہومیوپیٹھک ڈاکٹر کا علاج شروع کیا تھا۔ وہ میں نے 3 ماہ کا کورس کیا تھا لیکن مجھے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

تیسرا مسئلہ میرے پیٹ میں ناف کے اندر بھی بہت درد رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پیٹ کے اندر ناڑیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ میری ٹانگوں میں بھی ہر وقت درد رہتا ہے بلکہ پورے جسم ہی میں درد ہوتا ہے۔ پاؤں سوج جاتے ہیں کوئی بھی کام کرتی ہوں تو سانس بہت جلدی چڑھ جاتا ہے۔ چلنے میں بھی سانس پھولتا ہے اس لیے مجھ سے زیادہ دیر چلا نہیں جاتا اور نہ ہی کوئی کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ میں گھر کے سب ہی کام کرتی ہوں لیکن پھر بھی میرا وزن کم نہیں ہوتا۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ آج سے 3 سال پہلے میرے پاؤں میں جوتا لگا تھا چڑے کا جس کی وجہ سے پاؤں پر ایک چھوٹا سا زخم ہوا اور اس زخم سے پورے ہاتھ پاؤں یعنی دونوں بازوؤں اور دونوں ٹانگوں میں بہت زیادہ زخم ہو گئے۔ ایلوپیٹھک اور

موجودہ صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔
(۱)۔ گلی کا سائز تقریباً 3 سے 4 سم ہے، درد ہوتا ہے۔ معمولی سا کام کرنے سے کندھے اور گردن میں کھنچاؤ اور درد بڑھ جاتا ہے۔

(۲)۔ سر کے بال بھی بالکل اتر گئے ہیں۔
(۳)۔ کبھی کبھی بخار بھی ہو جاتا ہے اور کمزوری بھی محسوس کرتی ہے۔

(۴)۔ ہڈی (پیلوس کی ہڈی) جس پر چوٹ آئی تھی بائیں طرف ٹانگ میں بھی درد ہو جاتا ہے۔

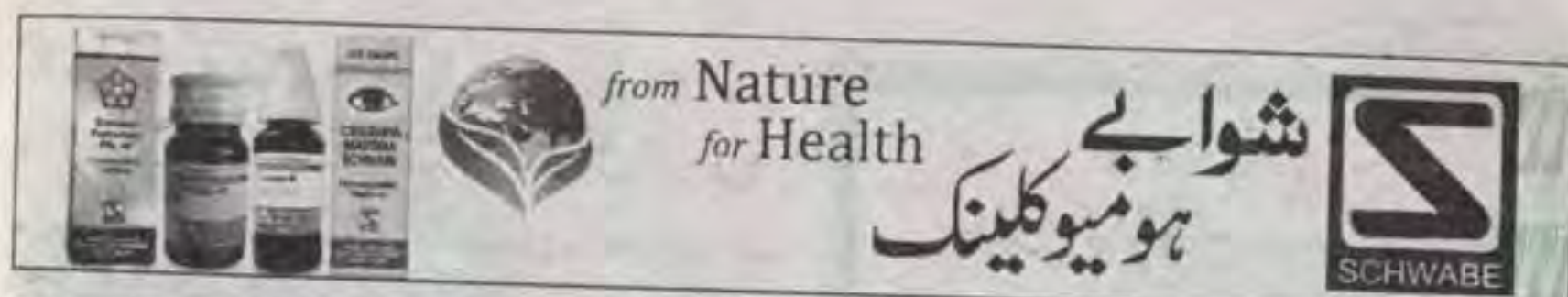
تمام ٹیسٹ کی نقول بھی ساتھ منسلک ہیں۔ آپ سے استدعا ہے کہ مہربانی فرما کر ان تمام علامات کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی نسخہ تجویز فرمائیں تاکہ آپریشن سے بچا جاسکے۔

جواب:- شروع میں بہت بڑی چوک ہو گئی اگر اسی وقت صحیح تشخیص اور علاج ہو جاتا تو معاملہ آگے نہ بڑھتا۔ اللہ خیر کا معاملہ فرمائے۔ آمین! Tuberculinum 1M کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ایک مرتبہ دیں، اس کے ایک دن بعد 30 Conium کے 5 قطرے دن میں دو مرتبہ آدھا کپ پانی میں 30 Kali Phos 30 Calc Fluor 30 کے 5، 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا کپ پانی میں دیں۔ 2 ہفتے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

چھوٹی عمر میں مسائل

عائشہ جاوید.....سیالکوٹ

سوال:- میں پاکیزہ میں آپ کا شواہے ہومیوپیٹھک کالم پڑھتی ہوں۔ میں بیمار بہت زیادہ



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

دائیں چھاتی میں اوپر والے حصے میں ایک چھوٹی سی گلی (بیر کے برابر گول) بنی۔ اس وقت درد نہیں تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کو چیک کروایا تو انہوں نے کچھ ادویات دیں اور فرمایا کہ یہ خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گی، وہم نہ کریں۔

ماہ فروری میں اس مریضہ کو گرنے کی وجہ سے پیلوس کی ہڈی پر چوٹ آئی اس کے علاج کے دوران جب ادویات استعمال ہوئیں تو اس کے بعد یہ گلی مزید بڑی ہونا شروع ہوئی اور درد بھی شروع ہوا۔ جون میں نشتر ہسپتال ملتان سے رابطہ کیا، پنم ہسپتال فیصل آباد سے رجوع کیا۔ 18 جولائی 2012 کو انہوں نے کینسر تشخیص کیا۔ پنم ہسپتال فیصل آباد سے علاج جاری ہے۔ انجکشنز کا پہلا کورس 30/7/12 دوسرا کورس 29/8/12 تیسرا کورس 24/9/12 کو لگا ہے۔ اب آپ کو

بریسٹ کینسر

محمد اختر جاوید.....لیہ

سوال:- جناب والا تقریباً ایک سال پہلے

ٹوکن

برائے شواہے ہو میوکلینک

فروری 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____
پتا: _____



ایک آتا ہے۔ ان گولیوں سے مجھ کو آرام ہے کچھ۔ دو تین مہینے ہو گئے ہیں استعمال کرتے ہوئے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ مجھ کو جوڑوں کے درد کے لیے شواہے کی دوا مل جائے۔

جواب:- گھٹنے کے درد کا جو ٹیسٹ ہوا وہ نہیں لکھا۔ Serum Calcium, RA Factor اور X-Ray Both Knee Joints A P & Lateral View رپورٹ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کے بعد صحیح علاج تجویز کیا جاسکے۔

پتے کی پتھری

نجمہ شاہین..... بہاولپور

سوال:- محترم میں اپنی بیماری کی تازہ رپورٹ بھیج رہی ہوں۔ اس کو پڑھ کر میرے لیے کوئی اچھی سی دوا تجویز کر دیں مہربانی ہوگی۔ مجھے پتے کا درد جب شروع ہوتا ہے تو ساتھ کبھی کبھی قے بھی ہوتی ہے۔ دو سال پہلے پتھری کا سائز چھوٹا تھا لیکن اب پہلے سے بڑھ رہی ہے۔ میری عمر چالیس سال ہے۔ شادی شدہ ہوں اور تین بچے بھی ہیں۔ دوسرا مسئلہ مجھے شدید نزلہ زکام بھی ہر وقت رہتا ہے۔ آٹا گوندھنے بیٹھتی ہوں تو دو درجن کے قریب پہلے چھینکیں آتی ہیں۔ آنکھوں سے پانی، ناک سے پانی بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی نزلہ حلق میں بھی گرتا ہے۔ سفید لیسڈار مادہ ہوتا ہے اور مجھے بار بار اٹھ کر

میں پس میکر لگا تھا۔ اُن کو دکھایا تو انہوں نے گردے کے ٹیسٹ کروائے جو نارمل تھے۔ ہومیو پیتھک کا علاج ایک سال تک کرتے رہے۔ پھر میں نے سرجن عباسی کو دکھایا اُن کا خیال تھا کہ کہیں Thrombosis نہ ہو۔ سو وہ ٹیسٹ بالکل ٹھیک تھا۔ کوئی Clot وغیرہ نہیں تھا۔ پھر انہوں نے کہا کہ پیٹ کی Scanning کروائیں۔ وہ کرانے کے بعد معلوم ہوا کہ پیٹ میں پانی ہے۔ انہوں نے پانی نکلوایا۔ پانی کا ٹیسٹ کلیئر تھا۔ یعنی کینسر وغیرہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ کو Spiromid دن میں دو دفعہ کھانے کو دی۔ اللہ کا شکر ہے اس دوا سے پانی سوکھنے لگا لیکن مجھ کو ہاتھ پاؤں میں Cramps پڑنے لگے۔ میں نے ڈاکٹر کو دکھایا انہوں نے بلڈ ٹیسٹ کروایا تو Potassium زیادہ تھی۔ انہوں نے Lasix 20mg بند کر دی اور 20mg Lasix شروع کروائی۔ 20mg Lasix کھاتی رہی تو میرے Cramps ختم ہو گئے۔ پانی بالکل کم ہو گیا ہے۔ اب میں Laxis 10mg کھا رہی ہوں۔ چیک کرواتی رہتی ہوں۔ پھر جوڑوں اور گھٹنوں میں درد ہوا ڈاکٹر کو دکھایا تو انہوں نے مجھ کو جوڑوں کی دوائی دی وہ یہ ہے Tab Dal C دن میں ایک صبح اور ایک شام۔ Tab Dalflex Sgrimutipihs دن میں دو دفعہ ایک گولی صبح اور ایک گولی شام کو۔ ایک انجکشن دیا جو ہر تین مہینے کے بعد لگوانا ہے Inj Dan Viva.lv. لگانا ہے جسے میں نے اب تک نہیں لگوا یا۔ بہت مہنگا ہے 6000 روپے کا

اندازہ کر سکتے۔ اور نہ ہی ٹیسٹ رپورٹس بھیجیں جو ڈاکٹروں نے کرائی ہیں۔ وزن اور قد کے ساتھ مندرجہ ذیل ٹیسٹ کروائیں HbA1C, CBC, Urine D/R پریش چیک کروائیں۔ کھانے پینے اور اُٹھنے سے سونے تک کی روٹین لکھیں۔ ڈاکٹر ولما ر شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Sulphur 200 کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ہفتہ میں ایک دفعہ صبح نہار منہ لیں۔ اس کے اگلے دن سے Teucrinum 30 Pulsatilla 30 Graphitis 30 کے 5، 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ جب یہ کورس مکمل کر لیں تو پھر مکمل حال لکھ بھیجیں۔ متوازن غذا استعمال کریں۔ تلی ہوئی، بھنی ہوئی اور مرغن اشیا سے پرہیز کریں۔ چہل قدمی کیا کریں، 10 منٹ سے شروع کریں۔

گھٹنے کا درد

جمیلہ بیگم..... گلشن اقبال کراچی

سوال:- میں پاکیزہ ڈائجسٹ کی مستقل خریدار ہوں۔ اس میں ڈاکٹرز کے بورڈ کا پڑھا تو میں اپنے گھٹنے کے جوڑوں کے درد کے لیے شواہے کی دوا استعمال کرنا چاہتی ہوں کیونکہ ایلو پیتھک میں Side effects ہوتے ہیں۔ بیوہ ہوں 80 کے قریب عمر ہے۔ گھٹنوں کا درد مجھے پرانا ہے۔ بہت علاج کرائے ایلو پیتھک بھی اور ہومیو پیتھک بھی۔ 2008ء میں مجھ کو پس میکر لگا ہے۔ اس کے بعد میں بالکل ٹھیک تھی کہ اچانک میرے پاؤں میں سوجن ہو گئی۔ آغا خان

ہومیو پیتھک دونوں ڈاکٹروں کو چیک کروایا، دم بھی کروایا۔ سب کہتے ہیں کہ یہ چنبل ہے۔ اتنی دوائیں کھا چکی ہوں اب میں نے ایلو پیتھک ڈاکٹر کی دوائی شروع کی ہوئی ہے۔ 3 ماہ ہو چکے ہیں دوا کھاتے ہوئے۔ دوا کھانے کے دوران کچھ آرام آیا تھا لیکن میں نے ایک ہفتہ دوا چھوڑ دی تھی جس کی وجہ سے تکلیف پھر ویسی کی ویسی ہی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے 6 ماہ کا کورس بتایا تھا۔ بہت زیادہ گرم دوائیں کھانے کی وجہ سے میرے چہرے پر دانے نکل آئے ہیں، کیل مہاسے بھی ہو گئے ہیں اور چہرے پر داغ بھی پڑ گئے ہیں۔ جسم کے اندر بہت زیادہ گرمی بھی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے چہرے پر لگانے کے لیے 3 عدد ٹیوب بھی دی تھیں جو میں روزانہ لگاتی تھی۔ لیکن کچھ دن ناغہ کی وجہ سے دوبارہ مسئلہ وہیں کا وہیں ہے۔ پانچواں مسئلہ میرا قد بھی بہت چھوٹا ہے۔ قد بھی نہیں بڑھتا۔ عام طور پر جتنا قد ایک لڑکی کا ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے۔

چھٹا مسئلہ میرا یہ ہے کہ دوائیاں کھانے کی وجہ سے مجھے پیریڈ کا بہت زیادہ مسئلہ ہوا ہے۔ 1 ماہ میں 4 مرتبہ یہ مسئلہ ہو رہا ہے۔ خون بھی بہت زیادہ ہی آتا ہے۔ اندر سے بوٹیاں بھی نکلتی ہیں خون کی شکل میں۔ اس چیز کی بھی میں نے لیڈی ڈاکٹر کی دوا کھائی ہے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ پلیز مجھے ایسی دوائیوں کا مشورہ دیں جس سے میرے یہ تمام مسائل (بیماریاں) حل ہوں اور مجھے آرام آجائے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ جواب:- بی بی آپ نے وزن اور قد نہیں لکھا کہ کتنا ہے جس سے ہم آپ کی جسامت کا

انچ بڑھ جائے۔ میری عمومی صحت بہت اچھی ہے اور میری خوراک بھی مناسب ہے۔ برائے مہربانی کوئی اثر انگیز دوا تجویز کر دیجئے۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رنگ وقت کے ساتھ ساتھ سانولا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے میرا رنگ صاف ہوتا تھا اور چہرے پر چمک بھی ہوتی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کوئی اثر انگیز دوا تجویز کر دیں جس سے میرا رنگ گورا ہو جائے اور مجھے کسی کے سامنے شرمندگی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ برائے مہربانی یہ بھی واضح کر دیجئے کہ ان دواؤں کے استعمال سے کوئی گائنتی کے مسائل تو پیدا نہیں ہو جائیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرے مسائل کا حل بتا دیجئے میں آپ کی بہت ممنون و مشکور ہوں گی۔

جواب:- تازہ پھل اور سبزیوں کا استعمال بڑھائیں۔ ورزش کیا کریں، متوازن غذا کھائیں۔ 19 سال میں قد بڑھتا تو نہیں لیکن کوشش کی جاسکتی ہے۔ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔
Thyroidinum 30 کے 5 قطرے چوتھائی کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ
Sarsaparilla 3x کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ
Calc Phos 30 کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ
3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر حالت بتائیں۔

تھوکنہ پڑتا ہے۔ نزلہ بہت پرانا ہے اور اس کا علاج بھی بہت کرایا ہے لیکن افاقہ نہیں ہوتا۔ تقریباً دس سال سے ہے۔ یہی حال میرے بچوں کا ہے۔ بیٹی کی عمر 18 سال، بڑا بیٹا 15 سال کا اور چھوٹا بیٹا 12 سال کا ہے۔ سب کو ہر وقت نزلہ رہتا ہے اور چھینکس بہت زیادہ آتی ہیں۔ ناک اور آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔ پلیز ہم سب کے لیے کوئی اچھی سی دوا لکھ دیں۔ ہم ہمیشہ آپ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

جواب:- نزلہ کے لیے Kaloba کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ 30 Marum Varum اور Nat.mur30 کے 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ پتھری کے لیے Chelidonium-30 کے 10 قطرے دن میں تین مرتبہ آدھا کپ پانی میں استعمال کریں۔ 3 ماہ بعد الٹراساؤنڈ کرا کر حال بتائیں۔ چکنائی اور کھٹی، ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں۔

لمبا قد گورا رنگ

علینہ گیلانی..... بہاولپور

سوال:- مجھے آپ سے اپنے دو مسائل بیان کرنے ہیں۔ میری عمر 19 سال ہے۔ میرا قد 5 فٹ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا قد تین سے چار



Dr. Willmar Schwabe , Germany.

Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores